تماشا میرے آگے

جمیل الدین عالی

شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ، پبلشرز

لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

www.taemeernews.com

جمیل الدین عالی

تماشا مرے آگے

سفرنامہ

شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ، پبلشرز
لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

www.taemeernews.com

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

طابع، شیخ نیاز احمد،
مطبع، غلام علی پرنٹرز، اشرفیہ پارک، فیروز پور روڈ، لاہور
سے چھپوا کر چوک انارکلی، لاہور سے شائع کیا۔

اشاعت اوّل : ۱۹۷۵ء

اشاعت دوم : ۱۹۸۵ء

مقامِ اشاعت :
شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور ۲

www.taemeernews.com

حرفے چند

یہ ایک الگ کتاب بھی ہے اور عابدؔی صاحب کے عالمی سفر نامے "دُنیا مرے آگے" کی دوسری جلد بھی۔ "دُنیا مرے آگے" شائع ہو چکی ہے اور اس میں ایران، عراق، لبنان، مصر، دہلی، رُوس، فرانس اور برطانیہ کے سفر ہیں۔

اِس جلد میں جرمنی، اٹلی، ہالینڈ، سوئٹزرلینڈ اور امریکہ کی کہانیاں ہیں۔

ناشر

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

پھر

اپنی گھروالی

طیّبہ بانو کے نام

کم تنخواہ اور پانچ چھوٹے چھوٹے بچّوں کے ساتھ
اُنھوں نے وہ روز و شب اکیلے گذارے جو مَیں نے
سیر و تفریح میں خرچ کیے۔
اگر وُہ ایسی نہ ہوتیں تو مَیں بھی ایسا نہ ہوتا۔

www.taemeernews.com

فہرست

جرمنی

- کولون سے بون تک ۱۱
- چینی صورت جرمن ماڈ ۱۷
- جزیرہ، خاتون اور ڈاڑھ ۲۱
- ہٹلر سے گفتگو ۳۳
- مشرقی برلن میں مشقِ تمنا ۴۱
- برلن ایک عالمی چیلنج ۴۶
- برلنوں کو وداع ۵۰
- نشان اور تصویریں ۵۵
- کون مارٹن لوتھر ۶۰
- ملبے سے یہ مُلک اُٹھا ۶۵
- قرائین - عظیم لوگ اور بحثیں ۷۳
- شہر ترقیٔ لسانِ المانیہ ۸۳
- آشخ مان، سامراج اور مارپیٹ ۸۸

اٹلی

- شیطان کی آنت میں افسرِ اعلیٰ ۹۶
- نکلنا خلد سے اور روم کا کھانا ۱۰۰
- دایاں، بایاں، تعمیرات ۱۱۰
- پرانے - شرابیں، بدن اور مناظر ۱۱۹
- مُردہ شہر اور زندہ شہر ۱۲۷
- کچھ سیاست کچھ سیاحت ۱۳۲

www.taemeernews.com

- جوتا۔ موچی۔ سڑک ۱۳۹
- ہم وطن بابر اور مصر کی آسٹریلوی دلہن ۱۴۵
- پی زر، تاریخ اور دے نے گن ۱۴۹
- لیمپ پوسٹ، نیرو، سینٹ پیٹر ۱۵۵
- ٹک دیکھ میاں اور آگے چل ۱۶۱

ہالینڈ

- پہلی نظر میں ۱۶۱
- بوقلمونی اور رزوئی ڈرزی ۱۶۴
- پھول۔ دن گاگ اور علامہ اقبال ۱۸۱
- ان تھک تھکی اور ٹوبہ باؤزن ۱۸۶
- مجبور عدالتِ عالیہ ۱۹۳
- بیوما اور روشن آرا بیگم ۱۹۸
- فلاحی جزرسی ۲۰۳

پھر کچھ گھنٹے پیرس میں

- وہ عجیب دن ۲۱۱

سوئٹزرلینڈ

- چُوں چُوں کا مربّہ ۲۲۰
- نون یا غنّہ ۔ غمزدہ گائیڈ ۲۲۴
- ایک شہر اور تین بندر ۲۳۰
- تحفے، ساس اور نند ۲۳۶
- دوڑ کتی پان اسلامک کانفرنس ۲۴۲
- ان خاتون کی سرگرمیاں ۲۴۸

www.taemeernews.com

- ہنری ملر ۲۵۳
- عاشق ہو کر بھاگ گیا ۲۶۳
- زیورک اور جُوتے ۲۶۷

امریکہ

- نیا کولمبس ۲۷۷
- یہ بھُول بھلیاں ۲۸۵
- یو این میں دِلّی والے ۲۹۳
- پاکستان اور بڑے تجاری ۳۰۱
- جنگل، سمندر اور اونچائیاں ۳۰۹
- میری، اقوامِ متحدہ اور کہانیاں ۳۱۸
- یہ نظر ہے طائرانہ ۳۳۰
- واشنگٹن، للّی اور وائیٹ ہاؤس ۳۳۵
- مناظر، کتابیں، کتابیں ۳۴۸
- خوش حالی کی خوش خیالی ۳۵۵
- موزلم ایکس مگر وائی ۳۶۲
- وہ کالی وہ گورا ۳۷۰
- پورٹوریکو کے قزّاق ۳۷۵
- یہ ماجرا کیا ہے ۳۸۴
- گرینچ، عظمتیں اور رَیں ۳۹۳
- سیاہ بستی ۳۹۹
- اِٹس اے ونڈرفل ٹاؤن ۴۱۷
- نو ملا، نرالا شکاگو ۴۲۶
- ہیروئن کی مادام ۴۳۵
- انسان سب پر غالب آجائے گا ۴۴۶

www.taemeernews.com

جرمنی

www.taemeernews.com

کولون سے بون تک

میں لندن سے بون جا رہا ہوں جو جرمنی (مغربی جرمنی) کا عملی دارالسلطنت ہے۔

انگلستان چھوڑتے وقت مجھے بہت خوشی ہوئی جیسے میں دوبارہ آزاد ہوا ہوں مگر پھر ہٹلر کا بھوت آنکھوں کے آگے ناچنے لگا۔ ہٹلر جس کا نام لے کر دتی کے گلی کوچوں میں بچے ایک دوسرے کو ڈراتے تھے ــــــ اور بڑے تو خود ہی ڈرتے رہتے تھے۔

یہ رودبار انگلستان گزر رہی ہے۔ ہم اسے سیدھا پار نہیں کریں گے کیونکہ اس طرح تو فرانس کا ساحل آجاتا ہے۔ ہم رودبار ہی سے بائیں طرف کو مڑ جائیں گے یعنی مشرق کی طرف جہاں سے وہ سمندر شروع ہو جاتا ہے جسے بحرِ شمال کہتے ہیں۔ بحرِ شمالی کا ساحل تقریباً فرانس سے شروع ہو کر بلجیم، ہالینڈ، مغربی جرمنی، مشرقی جرمنی اور پولینڈ سے گزرتا ہوا روس میں مدغم ہو جاتا ہے اور پولینڈ سے بحر بالٹک شروع ہو جاتا ہے۔ خیر بحر بالٹک کا قصہ دوسرا ہے بلکہ بحرِ شمالی کا قصہ بھی الگ ہونا چاہیے کیونکہ اس کے پانی ناروے، ڈنمارک اور سویڈن جیسے ملکوں کو چھوتے ہیں جو اپنی اپنی جگہ مثالی فلاحی ریاستیں یعنی ویلفیئر اسٹیٹس ہیں۔ فی الحال تو جرمنی پر ہی قناعت کی جائے۔

مگر کس جرمنی پر قناعت کی جائے جب "آزاد" دنیا کا باشندہ جرمنی کہتا ہے تو اس کی مراد مغربی جرمنی سے ہوتی ہے اور کمیونسٹ ملک کا آدمی جرمنی کے معنی مشرقی جرمنی سمجھتا ہے۔ بےچارہ جرمنی دو حصوں میں تقسیم ہے جیسے کشمیر دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک نسل، ایک زبان، ایک مذہب، ایک تہذیب، ایک تاریخ، ایک جغرافیائی وحدت اور پھر بھی دو ملک دو حکومتیں! مغربی جرمنی میں مغربی قسم کی جمہوریت ہے اور مشرقی جرمنی میں مغربی قسم کی اشتراکیت ہے! اصل نقصان جرمنی کا ہے جو کٹ گیا ہے۔ اصل نقصان کشمیر کا ہے جو کاٹ دیا گیا ہے۔

(وانی ذیر ہمدرد جرمنی۔ اگر جرمنی اقوام متحدہ کا رکن ہوتا تو کیا کشمیر کے معاملے پر اسی جرأت سے حق خودارادی کی بات کرتا جس طرح تم پاکستانی جرمنی کی تقسیم پر کرتے ہو)

www.taemeernews.com

شاید۔ شاید)

یہ کولون آگیا۔ میں بون جا رہا ہوں مگر وفاقی جرمنی کے دارالسلطنت میں کوئی ہوائی اڈہ نہیں ہے۔ بلکہ قریبی شہر کولون پر اترنا پڑتا ہے — کولون جس کے نام سے منسوب فرانسیسی خوشبو او ڈی کولون ہم سب پاکستانیوں کی ' وہ بڑے شوق سے استعمال کرتی ہیں' پتا نہیں یہ خوشبودار مقطر کولون سے کیوں منسوب ہے کوئی مل گیا " تو ضرور پوچھوں گا۔ مگر ایسا ہونا عجب نہیں۔ تاج محل بنایا شاہجہاں بادشاہ نے اور ہندوستان کے متعصب ہندو جب آنکھیں اور منہ پھاڑے ہوئے غیر ملکی زائرین کو اس کی سیر کراتے ہیں تو اسے "ہمارا ثقافتی ورثہ" کہہ کر پکارتے ہیں اور ادھر ہم بھی کچھ کم نہیں کیونکہ اب ہم بھی ٹیکسلا اور ہڑپا کے آثار قدیمہ کو آثار قدیمہ کی بجائے ہمارا ثقافتی ماضی کہنے لگے ہیں جب کہ اپنے ملک کو جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کہنے پر بھی اصرار کرتے ہیں۔

خیر یہ بڑوں کی باتیں ہیں آخر وہ تاجر بھی تو بڑے لوگ ہیں جو فرانس میں رہ کر اپنی بنائی ہوئی خوشبو کولون سے منسوب کرتے ہیں۔

کولون کا ہوائی اڈا بھی چھوٹا سا ہے۔ میں دلی کی زبان لکھتا تو کہتا کہ نام بڑے درشن چھوٹے' مگر شکر ہے کہ ابھی تک ان بیساکھیوں کے بغیر چل پھر سکتا ہوں۔ کہیں کہیں کسی روش پر اچھے خوشبودار مہکدار دلوں کے پھول نظر۔ آپ ہیں تو سونگھ لینے میں کوئی ہرج نہیں جیسے اس ہوائی اڈے پر اترنے میں کوئی ہرج نہیں جو اس شہر کا نہیں اور جہاں مجھے جانا ہے اور جہاں سے مجھے ایکبارگی محبت اور رقت دل کی خوشبو آتی ہے شاید یہ خوشبو نہ ہو بلکہ انگریزی کسٹم کی بدبو دماغ سے جانے کا اثر ہو کیونکہ انگریز کسٹم افسران ہم "کالوں" کے لیے بدترین خلائق ثابت ہوتے ہیں اور یہ کسٹم افسران شرافت کے پتلے بنے ہوئے ہیں۔

" ہر عالی " ایک سرخ رنگ کا موٹا تازہ کسٹم افسر پوچھتا ہے ہر کا تلفظ نہ در شاہ والی ہیر ہے نہ ہر کے وزن پر ہر ہے بلکہ ایک بچے کی سی آواز ہے جو ڈھیر چھپکلی سے کو مختصر کر دیا جائے تو ادا ہو جاتی ہے۔ اس کے معنی ہیں مسٹر۔ جناب "۔ ہر عالی۔ او ہو آپ پاکستانی ہیں ":

" جی ہاں میں بڑے تذبذب اور انکسار سے جواب دیتا ہوں۔ معلوم نہیں اب کیا پیش آئے۔

" کچھ نہیں۔ بالکل ٹھیک ہے۔ اجی آپ سامان کھولنے کی زحمت نہ کیجیے' آپ ہمارے دوست ہیں' پاکستان ہمارا دوست ہے مرحبا خوش آمدید' کیا آپ چائے پئیں گے کئی دن سے آپ کے وطن کے لوگ ادھر نہیں آتے ہیں کیا بات ہے "' انھوں نے کھٹ کھٹ میرے دونوں بکس بند کر دیئے۔ اور چاک سے میرے دونوں بکسوں پر دستخط لگا دی۔

www.taemeernews.com

"بھئی واہ" میں نے سوچا "نہ ہلدی لگی نہ پھٹکری (یہ خوشبودار محاورہ ہے اور اس زور سے آیا ہے کہ روکا نہیں جاتا) اور رنگ چوکھا آیا۔" پھر میں نے سوچا کہ اب انھی حضرت سے رہبرِ اوّل یعنی پہلے گائیڈ کا کام لیا جائے کیونکہ میں یہاں ان کی حکومت کا مہمان تو ہوں نہیں اور مجھے ان کی زبان بھی نہیں آتی۔ اندھیرا ہو چلا ہے بون نہ جانے کتنی دور ہو، سردی ہے کہیں رات تک یہاں پڑا نہ ہو جائے۔

وہ چند منٹ دوسرے مسافروں میں مصروف رہے اور اس کے بعد صرف دو منٹ میں انھوں نے یہ سب کام پورے کر دیے۔ بون ایک فون کیا کرنسی والے سے دو نوٹ بھنائے اور باہر کھڑی ہوئی ایک بس تک پہنچایا:
"یہ بس آپ کو دس منٹ میں سیدھی بون پہنچا دے گی۔ اڈے کے سامنے بان ہوف ہے۔ بان ہوف یعنی ریلوے اسٹیشن۔ بائیں ہاتھ ایک نائٹ کلب ہے مگر آج وہاں نہ جائیے یا جائیے لیکن بس سے اترنے کے بعد نائٹ کلب جانے کی بجائے یعنی بائیں ہاتھ مڑنے کی بجائے دائیں ہاتھ کو جائیے۔ دس قدم بعد ایک عمارت نظر آئے گی۔ وہ شٹل ہوٹل ہے۔ معمولی سا ہے اور سستا۔ کرایہ دس مارک کھانا تین چار مارک اور صبح اپنے مقررہ دفتر جائیے تاکہ آپ کے قیام کا بہتر انتظام کر دیا جائے۔ اگر ہو سکا تو آپ کو صبح بھی دیکھ لوں گا۔ اس دوران میں جس سے بات کرنی ہو بے دھڑک انگریزی بولیے 'نہیں' سمجھے گا تب بھی کچھ نہ کچھ جواب دے گا۔ ہم جرمنوں کو غیر زبانیں جاننے کا بہت شوق ہے اور انگریزی اور فرانسیسی سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ آپ چاہیں تو آپ کی زبان پاکستانی بھی سیکھنے پر تیار ہیں۔"
وہ ابھی اور کچھ کہتے مگر بس چل دی۔ میں نے شکر ادا کیا کہ اگر "پاکستانی" زبان کی بات چھڑ جاتی تو مجھے نہ جانے کیا کیا کہنا پڑتا۔

یہ راستہ بے مزا گزرا۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ اپریل کا مہینہ تھا مگر سردی شدید تھی یا مجھے زیادہ لگ رہی تھی۔ لندن سے بہت زیادہ تو نہ تھی مگر یہ سردی مصفّا اور بے کہر بے دھند تھی۔ لندن کی سردی سے آنکھوں میں چبھن سینے میں جلن تیوری پر شکن اور ۔۔۔ اور نالیوں میں گھٹن ہو جاتی ہے۔ یہ سردی تیز ہے مگر صاف شفاف ہے سیدھی سادی صرف سردی جیسے کوئی کوئی عورت صرف عورت ہوتی ہے جسے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

کولون سخت تاریخی شہر ہے۔ مگر یہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ یہ تفریح گاہ بھی ہے اور بون اس کے آگے قصبہ ہے، گاؤں ہے اور وہاں سے لوگ عیاشی اور تفریح کرنے ادھر آتے ہیں ۔۔۔ مگر یہ سب بعد دیکھا جائے گا۔ ابھی تو بون دیکھو۔ بون جو ان کا عارضی دارالسلطنت ہے (کیونکہ قانوناً ابھی تک برلن کو دارالسلطنت کہا جاتا ہے اور وہ اس لئے کہ برلن غیر منقسم جرمنی کا دارالسلطنت تھا اور ابھی مغربی جرمنی کی حکومت جرمنی کی تقسیم کو قانونی طور پر تسلیم نہیں کرتی اور وفاق کے لئے کوشاں رہتی ہے)

www.taemeernews.com

مگر! بون جو وفاقی جمہوریہ مغربی جرمنی کا عارضی دارالسلطنت کہا جاتا ہے، اصل میں خود بھی دارالسلطنت نہیں ہے جیسے ہمارا پنڈی ہے جس کا اسلام آباد اس سے تین چار میل دور ہے اور اس اسلام آباد کا نام ہے باڈگوڈس برگ۔ باڈگوڈس برگ میں تمام سرکاری دفاتر اور سفارتخانے اور سفیروں اور وزیروں کے مکانات ہیں۔ باڈگوڈس برگ امریکی طرز تعمیر کا ایک نمونہ ہے پہلے یہاں امریکی فاتح افواج رہتی تھیں۔ ان کے افسروں نے اپنے لیے بڑے ٹھاٹ دار دفتر اور گھر بنوائے جو ان کے جانے کے بعد جرمن حکومت اور دوسرے ملکوں کے سفارتی نمائندوں کے حصے میں آگئے۔ یہاں تک کہ پاکستانی افسر بھی جو کراچی کے ڈی ٹائپ لارنس روڈ والے کوارٹروں میں رہتے تھے، یہاں اس طرح براجمان ہیں کہ —

زیب دیتا ہے انھیں جس قدر اچھا کہیے

مگر ابھی جیسے وزیر اعظم مغربی جرمنی یعنی جناب ایڈنائر باڈگوڈس برگ میں بھی نہیں رہتے بلکہ اس کے قریب ایک گاؤں میں رہتے ہیں جس کا نام ہے روئنڈورف۔ ایک لطیفہ یہ بھی مشہور ہے کہ وزیر اعظم نے بون کو اس لیے دارالسلطنت کے لیے انتخاب کیا کہ ان کے اپنے گاؤں روئنڈورف میں اتنی گنجائش نہ تھی (یعنی اگر ممکن ہوتا تو وہ روئنڈورف ہی کو دارالسلطنت بنا لیتے) واللہ اعلم بالصواب — اور یہ معاملہ ذرا نازک بھی ہے۔

بون دریائے رائن کے کنارے ہے اور باڈگوڈس برگ بھی دریائے رائن کے کنارے واقع ہے اور ایڈنائر صاحب کا گاؤں روئنڈورف بھی دریائے رائن کے کنارے واقع ہے۔ اصل میں سارا مغربی جرمنی ہی ایک طرح دریائے رائن کے کنارے واقع ہے۔ رائن ان کا سندھ ہے گنگا ہے سب سے اچھی بیئر بھی رائن سے منسوب ہے، پھر بھی رائن کیچ کہہ دیا جاتا ہے۔ گو ثقہ جرمن اس کا برا مانتے ہیں۔

بون اور گوڈس برگ میں کوئی خاص بات نہیں سوائے اس کے کہ اس کی یونیورسٹی خاصی قدیم ہے۔ مشہور فلسفی اور اقبال کا مجذوب فرنگی نطشے بون یونیورسٹی کا طالب علم تھا یا یہ کہ دوسری جنگ عظیم کی مشہور سیگفریڈ لائن کی حدود میں یہ علاقہ بھی شامل تھا جسے اتحادی فوجوں نے توڑ کر اسے فتح کر لیا تھا۔ ویسے یہاں چند تاریخی لطائف ضرور پیش آئے مثلاً دوسری جنگ سے فوراً پیشتر برطانیہ کے وزیر اعظم چیمبرلین چھتری والے جب ہٹلر کی ہٹلرانہ تہذیب سے نمٹنے آئے تھے تو یہیں کے پیٹرشوف ہوٹل میں ٹھہرے تھے اور دوسری جنگ عظیم کے بعد یا اس واقعے کے کچھ برس بعد اتحادی فاتحین نے اسی پیٹرشوف ہوٹل کو اپنا صدر مقام بنایا تھا۔ بون شاید دنیا کے دارالسلطنتوں میں سب سے کم آبادی کا دارالسلطنت ہے کیونکہ یہاں کی کل آبادی کوئی ڈیڑھ لاکھ ہوگی۔ بعض گلیاں بھاٹی گیٹ کی اندرونی گلیوں سے بھی تنگ ہیں یعنی مذہبی چیزیں ہیں مگر ہیں نہایت صاف اور روشن۔ کھانا وافر اور سستا مگر بہ قسم

www.taemeernews.com

کا نہیں ہے یعنی کہیں سے خوشبوئے کچوری نہیں آتی۔

پاکستانی نو وارد کے لئے جرمنی غیر زبان (یعنی غیر کفو) سہی مگر ایک نہایت شفیق دوست کی طرح ہے جو بے تکلف بھی ہو جائے زبان نہ جاننے کے باوجود مجھے یہاں بہت کم تکلیف ہے۔ روٹی نہیں ملی بن مل گیا۔ بن نہ ملا مرغا مل گیا۔ سور کی پہچان ہو گئی ہے۔ سانپ بچھو کنکھجوروں کا یہاں رواج نہیں۔ اس لیے کھانے پینے کی کوئی دقت نہیں۔ ہر جرمن خلیق اور مہمان نواز نظر آتا ہے۔ اٹک اٹک کر بات کرنے میں وقت بھی لگے تو رہنمائی کرنے میں پتا بتانے سے یا کوئی مشورہ دینے سے گریز نہیں کرے گا۔ بون کا ہر شہری لندن کا بابی لگتا ہے مشہور مہربان شفیق دوست جو آپ کی مدد اپنا فرض سمجھتا ہے۔

اب مشکل یہ ہوئی کہ یونیسکو والوں نے جس دفتر سے میرا رابطہ قائم کرایا تھا وہ بالکل بوگس نکلا۔ میں اخلاقاً اس کا نام نہیں لوں گا کیونکہ اس کی نالائقی سے مجھے جو پریشانیاں ہوئیں وہ عام جرمنوں کی محبت نے دھو دی ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ وہ دفتر سخت بیکار ثابت ہوا۔

"میں کہاں سستے خرچ پر آرام سے ٹھیر سکتا ہوں؟"

"جہاں آپ چاہیں یعنی جو جگہ آپ پسند کریں۔"

"میرا پروگرام کیا ہو گا؟"

"جیسا آپ چاہیں گے۔"

"یعنی میں کس کس سے ملوں گا، کن کن اداروں میں جاؤں گا اور کس کس شہر میں اور کب کس دن۔"

"یہ سب آپ کی مرضی پر ہے، بہر حال میں ہم آپ کو بالکل آزاد رکھنا چاہتے ہیں۔ اے واہ بھئی آپ تو خود ہی پابندیاں قبول کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔"

کیا آپ کسی بے حد نوعمر حسینہ سے لڑے ہیں (جو آپ کی بیوی نہ ہو) کم از کم مجھے پہلے یہ سعادت حاصل نہ ہو سکی تھی، اور اب یہ موقع ملا تو وہ بھی ہاتھ سے جا رہا تھا میرا یہ مکالمہ مس ہیٹیسین (ہے ٹےسین) سے ہو رہا تھا جو بہت ہی نوعمر تھیں یعنی مغربی معیار سے کیونکہ ہمارے ہاں تو برس پندرہ یا سولہ کا سن آتے ہی جوانی کی راتیں مرادوں کے دن طاری کر لیے جاتے تھے (اب بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا) لیکن مغرب میں نوعمری انیس بیس تک پہنچتی ہے۔ یہ اٹھارہ کی ہوں گی اور بے حد حسین اور بے وقوف تھیں۔ بہت دن ہوئے ایک سلسلے میں جگر صاحب نے مجھے خط میں اپنا ایک شعر لکھا جس پر میں جھوم جھوم اٹھتا تھا۔

www.taemeernews.com

حسن جس رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے
اہلِ دل کے لئے سرمایۂ جاں ہوتا ہے

مگر اب معلوم ہوا کہ جگر صاحب اتنے بڑے آدمی ہونے کے باوجود سخت ناتجربہ کار بھی تھے کیونکہ اتنی پیاری ہونے کے باوجود مس بینیین مجھے وبالِ جان معلوم ہو رہی تھیں چنانچہ میں نے اپنے ساتھی اپنے آپ تلاش کیے جو زیادہ تر سیاست نویس انٹلکچول ثابت ہوئے۔ ادب و دب اور کتب خانوں کا پروگرام کم ہوا اور دیگر معاملات زیادہ۔

www.taemeernews.com

چینی صورت جرمن ہاڑ

جرمنی ہیگل کا وطن ہے، کارل مارکس کا وطن ہے، اور سب سے بڑھ کر گوئٹے کا وطن ہے اور نطشے کا بھی مگر شاید بہت سے لوگ انھیں نہیں جانتے، نہ جاننا چاہیں گے یا بہت سے جانتے ہوں گے بہرحال یہ ادب اور فلسفے کا چکر ہے، آپ اس میں آگئے تو یہ چکر بھی چل جائے گا لیکن فی الحال میں آج کی بات کروں گا ویسے جرمنی یا یورپ کا ماضی مشرقِ وسطیٰ اور چین اور خود ہمارے ماضی کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتا ہے۔ کیا پدی کیا پدی کا شوربہ۔ ہائیں ہائیں یہ محاورہ پلٹ کر تڑاخ سے ایک لات مارتا ہے نہیں جی بیچارہ محاورہ تو ایک شرمیلا سا چھوٹا سا محاورہ ہے، اس کے پیچھے ایک قوی ہیکل شخصیت نے اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر میرے منہ پہ مارا ہے، اور وہ ہے جرمنی کا حال۔ حال جس کے آگے ہماری کیفیت آج وہی ہے کہ کیا پدی کیا پدی کا شوربہ۔

سنہ اکسٹھ میں اس جرمنی کی قومی یعنی کل ملکی پیداوار پچیس ہزار ملین پونڈ سالانہ ہے، کیا سمجھے۔ شاید کچھ نہیں لہٰذا اسے چھوڑیے اور یہ سنیے کہ سنہ اکسٹھ میں اس کا گولڈ ریزرو یعنی اس کی کرنسی کے ضامن سونے کے ذخائر ساڑھے سات سو ملین پونڈ کے ہیں یعنی اس معاملے میں یہ دنیا بھر میں امریکہ کے بعد ہے جس کی زمین پر جنگِ عظیم نہیں ہوئی اور جس کی آبادی بیس کروڑ ہے اور جو فاتح ہے اور جس کی زمینیں اور صنعتیں یوں بھی سونا اگلتی ہیں۔ اب سمجھے کہ اس ملک کی صنعتی طاقت کہاں پہنچ گئی ہے کیوں پہنچ گئی ہے اس کا اصلی جواب دستوروں کے ماہرین دے سکیں گے۔ مجھے تو اس کے دو جواب نظر آئے اور ان کے نام ہیں کونارڈ ایڈناور اور ارہارڈ۔

کونارڈ ایڈناور جو وزیراعظم ہیں، اولڈ مین آف دی رائن بھی کہلاتے ہیں یعنی دریائے رائن کا بوڑھا یہ حضرت ایک زندہ کرامت ہیں، ہمارے ہاں تو یقیناً خواجہ خضر کہلاتے۔ یہ صاحب اٹھارہ سو چھہتّر عیسوی میں پیدا ہوئے اور انیس سو سترہ تک یعنی اکتالیس برس کی عمر تک ایک بالکل ہی غیر اہم آدمی رہے ہیں۔ اکتالیس کی عمر کو پہنچے تو شہر

www.taemeernews.com

کولون کے میئر ہوئے یعنی نواب شاہ یا گوجرانوالہ کی میونسپلٹی کے چیرمین ہو گئے۔ میں ابھی اکتالیس کا کیا چالیس کا بھی نہیں ہوا اور ریٹائر ہونے پر آمادہ ہوں (ابن انشا شاعری سے ریٹائر ہو ہی چکے ہیں) اور ایڈنائر صاحب اپنا عوامی یا سیاسی کیریر اکتالیس برس کی عمر سے شروع کرتے ہیں۔ بقول شیخ سعدی:

چہل سال عمر عزیزش گزشت

مگر سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ تھوڑے دن بعد نازی پارٹی یعنی ہٹلر والی ظالم پارٹی برسرِ اقتدار آگئی اور موصوف کو اپنے عہدے سے ہاتھ دھونے پڑے اور پھر خاموش اپنے گاؤں روہنڈورف میں باغبانی فرمائی یعنی صرف مشق سخن جاری رہی چکّی کی مشقت خیرباد کہہ دی گئی۔

پھر جنگ کے بم پھٹے اور پھر صلح کا بم پھٹا اور ۱۹۴۵ء میں امریکی فاتحین نے انھیں دوبارہ میئر آف کولون بنا دیا۔ مگر اصلی کیریر اب بھی شروع نہیں ہوا تھا کیونکہ بہت جلد موصوف پھر نوکری سے نکال دیے گئے۔ اس کا واقعہ لطیفے کی شکل میں یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۹۴۵ء میں کولون کا علاقہ انگریزی افواج کی تحویل میں دے دیا گیا تو ایک انگریز افسر نے آپ کے کام کا معائنہ کیا اور آپ کو نہایت نااہل پایا۔ اور برطرف کر دیا۔ گویا وہ شخص جسے تھوڑے عرصے بعد ہی ایک عظیم ملک و قوم کا سربراہ ہونا تھا ایک معمولی سے انگریز افسر کی نظر میں نواب شاہ میونسپلٹی کی صدارت کے لیے بھی "نااہل" تھا۔ بیوروکریسی پھر بیوروکریسی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر بھی تو آئی سی۔ ایس میں فیل ہوئے تھے اور جب وہ فیل ہوئے ہوں گے تو پاس ہونے والوں نے اور ہم چشموں نے اور خاندان والوں نے ان کا کیا کیا مذاق اڑایا ہوگا۔

پھر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ۱۹۴۹ء میں وہ جرمنی کے وزیر اعظم بنا دیے گئے۔ اس وقت وہ بنائے گئے تھے کیونکہ جرمنی اتحادیوں کے زیر نگیں تھا مگر بعد میں وہ دوبارہ الیکشن لڑ کر وزیر اعظم منتخب ہوئے اور سنہ اکسٹھ تک وزیر اعظم رہے۔ اور آج بڈھا بابا، مرد آہن، نجات دہندۂ جرمنی، یورپ کا پیمبر صلح، بڈھا مسیحا کہلاتے ہیں۔ کاش میں اس انگریز افسر سے مل سکتا جس نے انھیں نااہلی کی بنا پر برطرف کیا تھا۔ میں اس کے ہاتھ چومتا آنکھوں کو بوسہ دیتا اور دو زانو ہو کر کہتا اے بھائی بادشاہ تو کس ناقدرے ملک میں پڑا ہے جہاں لوگ تیرا نام تک نہیں جانتے۔ تیری اصلی جگہ تو ہمارا ملک ہے جہاں تیرے ہم خیال مرحوم غلام محمد جیسے لوگ موجود تھے اور جہاں دیگر اہل لوگ آج بھی ایڈنائر جیسے سیکڑوں "نااہلوں" کو الٹی چھری سے ذبح کرتے رہتے ہیں۔ خیر وہ انگریز افسر وہاں نہ ملے اپنے ملک میں مل جائے گا۔ یہ بات ایک فرد کی تو ہے نہیں، یہ تو ایک پورا طبقہ ہے، ایک مزاج ہے، ایک کردار ہے۔

www.taemeernews.com

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
(تو جس رنگ کا لباس چاہے پہن لے)
من انداز قدت را می شناسم
(میں تیرے قد کا انداز پہچانتا ہوں)

آسان ترجمہ: اے ایڈنائر وزیراعظم جرمنی کو نااہلی کی بنا پر برطرف کرنے والے محترم انگریز بیوروکریٹ تو جو چاہے وہ بھیس بدل لے مگر میں تجھے پہچان جاؤں گا اور پہچانتے پہچانتے تیرے ہی ہاتھوں نااہلی کی یا کسی اور بنا پر نواب شاہ یا گوجرانوالہ کی میونسپلٹی کی صدارت یا وزارت سے برطرف ہو جاؤں گا مگر یہ نہیں کہوں گا:

بچہل سال عمر عزیزش گزشت
(عمر کے چالیس سال ضائع ہو گئے)

بلکہ پھر ایڈنائر جیسی کوئی حرکت کروں گا کیونکہ ایڈنائر پہلی بار وزیراعظم ہوئے تو ان کی عمر تہتر یعنی ستّر جمع تین برس کی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہاں 'میں' سے مراد میں نہیں ہوں بلکہ سب پاکستانی بھائی ہیں۔

ہاں تو وزیراعظم ایڈنائر یعنی چانسلر ایڈنائر نے ۷۳ برس کی عمر میں جب عام لوگ اوپر بیٹھے نیچے والوں کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں ایک تباہ و برباد قوم اور معاشرے کی قیادت سنبھالی جس کے نتیجے میں آج جرمنی پھر دنیا کے نقشے پر ایک مضبوط اور خوشحال ملک کی حیثیت سے نمودار ہو گیا ہے اور یہ سب کچھ انھوں نے گھپلے بازی یا ڈکٹیٹر شپ کے ذریعے نہیں بلکہ جمہوری اقدار کو رواج دیتے ہوئے الکشن کراتے ہوئے الکشن لڑتے ہوئے مخالفوں سے اعتراض سنتے اور ان کا جواب دیتے ہوئے کیا ہے۔

دور سے ایڈنائر چینی بوڑھے نظر آتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ ناک پچکی ہوئی۔ ٹھوڑی جھکی ہوئی۔ یہ بھی مشہور ہے کہ وہ کئی بار اپنا چہرہ مشینوں سے چست کرا چکے ہیں۔ اصل کچھ ہو وہ ایک مضبوط اور فعّال حاکم اور سیاستداں ہیں بلکہ ان کی خوشامد کرنے والے تو کہتے ہیں کہ:

تو ابھی نوجوان ہے پیارے

وہ وقت کے سخت پابند ہیں ہر کام وقت پر اور ضابطے کے مطابق کرتے ہیں۔ عام طور پر اور کابینہ کے اجلاس کے وقت بھی چاکلیٹ چباتے رہتے ہیں۔ دوپہر کو تھوڑی دیر سوتے ہیں لیکن رات تک کام کرتے ہیں۔ ددستر بردر ہیں عقلمند ہیں منصوبہ بند ہیں۔ غصہ ور اور تنک مزاج بھی ہیں اور نہایت صلح پسند بھی۔

www.taemeernews.com

اگر قوموں اور ملکوں کو بگاڑنے کی ذمہ داری بھلا شخصیات پر رکھی جائے تو کہا جا سکتا ہے ہٹلر نے جرمنی کو تباہ کر دیا اور ایڈناؤر نے جرمنی کو حیاتِ نو بخش دی۔ ویسے یہ انداز فکر سائنسی نہیں اہر کی حماقت کا خوشہ چیں کہلائے گا۔

ایڈناؤر کے سات بچے اور اکیس پوتے پوتیاں ہیں۔ اس معاملے میں وہ میرے والد سے پیچھے رہ گئے لیکن میرے والد ستتر برس جئے تھے اور ایڈناؤر صاحب سنہ اکسٹھ میں پچاسی برس یعنی اتی جمع پانچ پچاسی برس کے چاق و چوبند فعال سیاستدان ہیں۔

ضرور ہمارے خاندان سے ان کی کوئی نہ کوئی پرانی عداوت ہے کیونکہ انھوں نے غالب کے ایک شعر کو بالکل جھوٹا کر کے دکھایا ہے۔ غالب نے کہا تھا:

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

مگر ایڈناؤر صاحب پچاسی برس کی عمر میں بھی نہ صرف یہ کہ چھپتے نہیں پھرتے بلکہ دھڑتے سے پارٹی بازی کر رہے ہیں، سیاست لڑا رہے ہیں اور حکومت کر رہے ہیں یہاں تک کہ یہ دیکھ کر مرزا غالب کے ہم جیسے نام لیوا بن میں چھپے چھپے پھرتے ہیں کہ بڑے میاں سے آنکھیں چار نہ ہونے پائیں۔

مگر ایڈناؤر کی سیاسی منصوبہ بندیوں، دور اندیشیوں اور تدبر کی عمارت ایک آہنی ستون پر کھڑی ہے اور اس ستون کا نام ہے ڈاکٹر ازہارڈ۔ جو لو ہے کی ایک موٹی اور چھوٹی لاٹھ کی طرح نظر آتے ہیں۔ ان کا رنگ سرخ ہے۔ گال پھولے پھولے ٹھوڑی چھوٹی سی آنکھیں گہری اور چمکیلی۔ یہ ڈاکٹر ارہارڈ جرمنی کے وزیر اقتصادیات ہیں جن کی رائے کو عالم اقتصادیات میں ایجاد و اجتہاد کا درجہ حاصل ہے۔ جرمنی کی موجودہ خوشحالی کے لیے سیاسی استقامت اور پائداری چانسلر ایڈناؤر نے مہیا کی اور اقتصادی منصوبہ بندی کے مصنف ڈاکٹر ارہارڈ ہیں۔

مگر یہاں سے مضمون پھر خشک ہو جائے گا۔ اقتصادی خوشحالی کے مضمون پر سوچنے کے لیے:

وہ تاب وہ مجال وہ فرصت کہاں مجھے

www.taemeernews.com

جزیرہ - خاتون اور ڈاڑھ

اتنی دیر سے کسی لڑکی وڑکی کا ذکر بھی نہیں آیا ہے بسفرنامے کا ذ ورکھ ہو رہا ہے۔ یار عالی صاحب ذرا پھر وہی چٹ پٹا کام شروع ہو جائے قسم ہے بڑا مزا آتا ہے۔

گائیڈ بک کہتی ہے ' بون سے چل کر فرینکفرٹ جاؤ جسے جرمن فرینکفورت کہتے ہیں (اور انگریز ہمیں فرینکفرٹ ہی کہنے پر مجبور کرتا ہے) چھپا ہوا پروگرام بھی یہی کہتا ہے مگر میں ایک پرانا براڈ کاسٹر یعنی ریڈیو کا آدمی ہوں اس لئے چھپے ہوئے پروگرام کی بجائے فرینکفورت پہنچ کر وہاں ٹھہرنے کی بجائے سیدھا ہوائی اڈے پر پہنچا ہوں اور پہلے جہاز سے برلن کی طرف اڑ جاتا ہوں۔ برلن کے نام میں ایک سنسنی خیزی ہے ' ایک کشش ہے ' ایک عبرت آمیز رومان اور غم کا رچاؤ ہے کیونکہ اور تاریخی باتوں کے علاوہ اس میں ایک بات یہ بھی ہے کہ اسی صدی میں یہاں سے دو عالمی جنگیں شروع ہوئیں۔ ایک قیصر جرمنی کی جنگ عظیم جس میں جرمنی ہارا اور دوسری ہٹلر کی جنگ عظیم اور جرمنی اس میں بھی ہارا۔ برلن پھر بھی اس طرح قائم ہے کہ ہمیشہ یہاں سے تیسری جنگ عظیم شروع ہونے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔

فرینکفورت سے برلن کوئی ڈھائی سو میل دور ہے اور راستہ کوئی ڈیڑھ ہوائی گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے یعنی عام چار پنکھوں کے جہاز سے کیونکہ ابھی شاید اس راستے پر جیٹ اڑانے کی اجازت نہیں ہے۔ میرا طیارہ پیر کانسٹی لیشن امریکی بھائیوں کی ملکیت تھا جسے امریکی بھائی ہی اڑا رہے تھے لیکن قانوناً وہ جرمن کمپنی کا طیارہ تھا۔ اسے بھائی تم آم کھاؤ گٹھلیاں گننے سے کیا فائدہ۔ آج کل قانون اور حقیقت میں بڑا فرق ہے بلکہ بزرگوں کے زمانے میں بھی ہوتا تھا اور شاید کئی نسلوں تک یہی سلسلہ چلے گا پس تم آنکھیں بند کر کے بیٹھے رہو یعنی اڑے جاؤ اور دیکھو کہ یہ برلن آ گیا۔ ہوائی اڈا تو خیر بہت شاندار ہے مگر یہ اونچی ہوتی ہوئی یادگار بھی قابل دید ہے۔ ۱۹۴۸ء کے ایئرلفٹ کی یادگار۔ ۱۹۴۸ء میں جب روسیوں نے زمینی رستے بند کر دیے تھے تو امریکیوں نے دن رات ہوائی باربرداری کی تھی اور

www.taemeernews.com

جب صبح نو ہوئی تو اپنے شاندار کارنامے کی یاد میں یہ ہوائی اڈہ تعمیر فرمادی۔ اس ہوائی اڈے کے سلسلے پتا نہیں کہاں کہاں سے ملے ہوتے ہیں۔ پولیس پاسپورٹ کی جانچ پرکھ خوب کرتی ہے کسٹم نرمی برتتا ہے کیونکہ ڈر محصول کا نہیں بلکہ "خطرناک آدمی کا زیادہ ہے"۔ اے کاش میں انھیں مشتبہ نظر آؤں" میں نے دل ہی دل میں آرزو کی۔ "مزا آجائے گا" مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھے کوئی بوگس سیاح سمجھے۔ نو سیاح یعنی نیا سیاح بھی بالکل نودولتیے کی طرح ہوتا ہے جس کی نہ صرف عزت نہیں کی جاتی بلکہ نوٹس بھی نہیں لیا جاتا اور وہ موقع بے موقع پیسے خرچ کر کر کے اپنی جان ہلکان کیے لیتا ہے۔ برلن کو سرمایہ دارانہ جمہوریت والے آئی لینڈ سٹی یعنی شہر جزیرہ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ مغربی برلن باقی مغربی جرمنی سے ملا ہوا نہیں ہے بلکہ اس کے گرد مشرقی جرمنی یعنی کمیونسٹ جرمنی پھیلا ہوا ہے جس کا مطلب اینٹی کمیونسٹ جھپتی بازوں کے بقول یہ ہے کہ اشتراکیت کے سمندر میں جمہوریت کا ایک جزیرہ ابھرا ہوا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

برلن کا نشان ریچھ ہے مگر کوئی خونخوار ہیبت ناک ریچھ نہیں بلکہ ایک پیارا سا گول مٹول سا ریچھ جسے دیکھ کر بچے ڈرنے کی بجائے ہنسنے لگیں (گو اُن کے بڑے برلن کا نام سن کر آج بھی خوفزدہ ہو جاتے ہیں) کسی نے کہا برلن کے معنی بھی ریچھ ہیں مگر تحقیق نہ ہو سکی، ایسے معاملوں میں تحقیق کرنی بھی نہیں چاہیے کیا پتا کیا معنی نکل آئیں۔ فرض کیجیے برلن کے معنی ہوں گلاب کا پھول اور اس کے ساتھ نشان شہر نظر آئے ریچھ تو کیا نسبت بنے گی۔ یہ کوئی ایشیائی نو آزاد ملک تو ہے نہیں جہاں ریچھ اور گلاب کے پھول کا جوڑا بھی چلتا ہے کیونکہ ایشیا کے نو آزاد ملکوں میں تو بھی کچھ چلتا ہے مگر یہ یورپ ہے آزاد اور ترقی یافتہ یورپ جہاں ریچھ کے ہات میں گلاب کا پھول دے دینا ایک نامناسب فعل سمجھا جاتا ہے اور اخبار والے آزادی اظہار کا کھلا استعمال کرتے ہیں ......!

چونکہ میں "مغرب" کا آدمی ہوں اس لیے مغربی برلن ہی میں ٹھیرا ہوں۔ ہوٹل سخت مہنگا ہے اس کا نام ہے برلن ہلٹن۔ ہلٹن امریکی ہوٹل والوں کا ایک عالمی سلسلہ ہے جو کوکا کولا کی طرح دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ رہا ہے پتا نہیں ہم سلسلہ ہلٹن سے کیوں محروم ہیں ہلٹن ہوٹل جہاں ہوتا ہے شاندار ہوتا ہے اور مہنگا ہوتا ہے اور انگریزی بولنے والوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اور کرایہ سات آٹھ ڈالر فی شب سو کمرے سے کم نہیں ہوتا یعنی فقط شب باشی کا کرایہ ہوتا ہے کھانا پینا سب الگ۔ اسے امریکن یا یورپین پلان کہتے ہیں۔ ایسے ہوٹلوں میں اپنا پرانا آقا انگریز اور اس کا انگلستان بہت یاد آتا ہے جس کے ہوٹلوں میں شب باشی کے ساتھ ساتھ صبح کی چائے اور ناشتہ ضرور ملتا ہے۔

برلن بٹ ہوا یعنی تقسیم شدہ شہر ہے، ایک حصہ ہے مغربی برلن اور دوسرا ہے مشرقی برلن۔ قانوناً پورا

www.taemeernews.com

شہر ابھی تک اتحادیوں کے قبضے میں ہے لیکن اتحادی خود بٹ گئے ہیں بلکہ کٹ پھٹ گئے ہیں اس لیے اب تقسیم کا یوں ہے کہ مشرقی حصے پر توروسیوں کا قبضہ ہے اور مغربی حصے پر مغربی اتحادیوں کا۔

سوال: بچو! اتحادی کون تھے؟

جواب: اتحادی ان لوگوں کا تخلص تھا جنھوں نے دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) میں جرمنی، اٹلی اور جاپان سے لڑنے کے لیے مل جل کر فوجیں تیار کی تھیں اور پھر جنگ جیت گئے تھے۔ انھوں نے اپنا تخلص خود اتحادی رکھا تھا۔

سوال: اُن کے نام بتاؤ؟

جواب: برطانیہ، فرانس، امریکہ، روس اور ان کے چھٹ بھیے۔

سوال: انھیں اب بھی اتحادی کیوں کہا جاتا ہے؟

جواب: اس لیے کہ وہ جنگ جیت گئے تھے۔

سوال: اب وہ متحد کیوں نہیں ہیں؟

جواب: انجمن اقوام متحدہ سے پوچھیے۔

مگر بچو کوئی اور پوچھے تو آخری جواب ہرگز مت دینا۔ بلکہ اپنے "سر" سے جواب پوچھ لینا یا جو "گائیڈ" میں لکھا ہوا ہو وہ دہرا دینا۔ کیونکہ یہ جواب دینے سے تم اشتراکی اور سرمایہ دار دونوں ملکوں میں فیل ہو جاؤ گے۔

اس شہر کی تقسیم باقاعدہ خطوط میں نہیں ہوئی بلکہ کٹی پھٹی ہے۔ گلی گلی، سڑک سڑک بٹی پڑی ہے۔ کونے کھدرے تک تقسیم شدہ ہیں۔ ایک گلی کا ایک ٹکڑا مغرب میں پڑتا ہے تو اسی ٹکڑے کا دوسرا سرا مشرق میں ہے کسی مکان کی دیوار مشرق میں اور دروازہ مغربی علاقے میں ہے بعض اوقات بلکہ اکثر اوقات سخت گھپلا ہو جاتا ہے مگر گھپلا تو بیسویں صدی کی عالمی سیاست میں ریڑھ کی ہڈی جیسی حیثیت رکھتا ہے گھپلا نہ ہو تو یار لوگ بڑی بڑی نوکریاں کیسے حاصل کریں۔ اور مسائل کے ایکسپرٹ کیسے کہلائیں۔ خیر بات برلن کی تقسیم پر ہو رہی تھی۔ ذکر گھپلے کا ہونے لگا۔ لیکن برلن اور گھپلا لازم و ملزوم ہیں۔ اس لیے کوئی ہرج نہیں — ہوا یہ تھا کہ جب برلن فتح ہوا تو ایک طرف سے یعنی مغرب سے امریکی برطانوی فرانسیسی افواج بڑھ رہی تھیں اور مشرق کی طرف سے روسی۔ جتنا جس کے قبضے میں آگیا وہی مشرق اور مغرب کہلایا۔ اب ان دونوں میں کوئی شے مشترک ہے تو وہ خدا ہے جو رب المشرقین والمغربین ہے مگر یہ لوگ نہ اسے جانتے ہیں نہ مانتے ہیں — کیا آپ اسے جانتے اور مانتے ہیں؟ ہاں معلوم ہوتا ہے کہ خدا کسی نہ کسی عنوان سے کسی نہ کسی نام سے جرمنوں کے تحت الشعور میں ضرور موجود

www.taemeernews.com

ہے کیونکہ انھوں نے اپنے مشہور اور پھیلے ہوئے میموریل چرچ کی تعمیر تو نہیں ہونے دی۔ مغربی حصے کا تقریباً پورا حصہ دوبارہ بن گیا ہے مگر اس عظیم گرجا کی مرمت نہیں کی گئی ـــ جرمن عذاب الٰہی کی یادگار ابھی مدتوں اسی صورت میں رکھنا چاہتے ہیں تاکہ اسے دیکھ دیکھ کر انھیں دوسری جنگ عظیم کی تباہی اور عذاب یاد آتا رہے۔

آج مغربی حصے میں کوئی سوا بیس لاکھ آدمی بستے ہیں اور مشرقی حصے میں تقریباً دس لاکھ حالانکہ جنگ سے پہلے پورے شہر کی آبادی پینتالیس لاکھ تھی اور چونکہ اس علاقے میں خاندانی منصوبہ بندی کی ضرورت نہیں اس لئے اگر جنگ نہ ہوتی تو اب برلن کی آبادی کم از کم ساٹھ پینسٹھ لاکھ ضرور ہوتی کچھ نہ ہوتا تو وہ پندرہ لاکھ آدمی کم نہ ہوئے ہوتے جن کی یادیں آج بھی ان کے خاندانوں کو پہروں رلاتی ہیں جنگ نہ ہوتی تو ۳۴۴ مربع میل پر پھیلا ہوا یہ خوبصورت اور شاندار شہر آج یوں کٹے پھٹے ڈیلٹاؤں کی طرح نظر نہ آتا جن کے دریا حرارت کے خوف سے کسی وقت بھی سوکھ سکتے ہیں۔ اس شہر کی تاریخ یورپ کے لحاظ سے خاصی قدیم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلی بار برلن کا نام ۱۲۳۰ عیسوی میں استعمال ہوا تھا جس کا مطلب یہ ہوا کہ بحیثیت ایک مقام کے برلن کوئی سوا سات سو برس پرانا ہے مگر یہ کوئی خاص بات نہیں کیونکہ اپنا لاہور تو اس سے بھی زیادہ پرانا ہے اور ملتان تو بہت ہی پرانا ہے پھر اس میں کیا خاص بات ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ یہ شہر کٹ کر اور بٹ کر بھی زندہ ہے اور صحت مند ہے سیکڑوں بلکہ ہزاروں خاندان دونوں حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ماں باپ ایک طرف تو بیٹا بیٹی دوسری طرف بلکہ بعض اوقات میاں بیوی بھی اپنے اپنے روزگار کی مجبوریوں کی وجہ سے مشرق و مغرب میں بٹ گئے ہیں، ہزاروں لوگ جو ایک طرف رہتے ہیں معاش کے چکر میں دوسری طرف جاتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق کوئی چالیس ہزار برلنی جو مشرقی حصے میں رہتے ہیں مغربی حصے میں ملازمت کرتے ہیں۔ اسی طرح کوئی آٹھ نو ہزار آدمی مغربی حصے کے شہری اور مشرقی حصے میں ملازم ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح دن بھر میں کوئی پچاس ہزار آدمی ایک طرف سے دوسری طرف جاتے اور واپس آتے ہیں۔ حالانکہ دونوں حصوں کی دنیا ایک دوسرے سے جدا ہے بلکہ الگ، نظام حکومت الگ۔ طرز زندگی الگ۔

دنیا کیا سے کیا ہونے لگی

اور سنیے مغربی برلن سے مشرقی یا ادھر سے ادھر براہ راست ٹیلیفون نہیں کر سکتے یعنی اس مکان سے سڑک کے پار رہنے والے سے براہ راست ٹیلیفون نہیں ہو سکتا بلکہ آپ کو کال چاہیے تو پہلے فرینکفورت یا فرینکفرٹ ٹرنک کال کیجیے وہ مشرقی جرمنی کے صدر مقام لیپزگ سے ملائیں گے اور لیپزگ سے مشرقی برلن واپس سلسلہ ملایا جائے گا یعنی کوئی دو سو گز دور پہنچنے کے لیے آواز کو ایک ہزار میل سے زیادہ سفر کرنا پڑتا ہے۔ وجہ! وجہ

www.taemeernews.com

بتانے کو زبانیں الگ الگ ہیں۔ مغرب کہے گا اشتراکیت کا ظلم۔ اشتراکی کہے گا۔ سرمایہ داری کی ناانصافیاں ہیں کہوں گا (پڑھے لکھے لوگ ہنسیں گے تب بھی کہوں گا) قہر خداوندی۔

اس تقسیم کے چکر میں کچھ مشترک مفادات کے مقام بھی آتے ہیں، جہاں نہ تقسیم ہو سکتی ہے نہ اختلاف۔ مثلاً او بان یعنی انڈر گراؤنڈ ریل مشترک ہے۔ ایک دن ظالم تحت الثریٰ کو بھی تقسیم کریں گے مگر ابھی تو یہ ہے کہ گو زیر زمین ریل کے اسٹیشن بالائے زمین حدود کے مطابق قانونی طور پر الگ الگ ہیں مگر وہاں ادھر سے ادھر آنے جانے میں ہر وقت پوچھ گچھ یا تفتیش نہیں ہوتی۔ بس کبھی کبھار چیکنگ ہو جاتی ہے لیکن عام طور پر لوگ بغیر دقت ایک سے دوسرے علاقے میں سفر کرتے ہیں۔

یہ سب کچھ عجیب ہے مگر اب تو اپنی آنکھیں عجائب کی عادی ہوتی جاتی ہیں۔ جب انسان تقسیم ہو گئے رنگ و نسل اور قومیتوں اور مذاہب میں فرق اور تقسیم ہے تو شہر کی تقسیم اور اس کے باوجود اس کی یگانگت پر تعجب کیوں ہو۔

اب برلن کے متعلق اتنا کچھ جان لینے کے بعد اس میں گھومنے کا مزا آئے گا۔ ویسے برلن کے بارے میں ابھی بہت سی دلچسپ باتیں باقی ہیں، مگر یہ باتیں چلتے چلاتے ہوں تو کیا برا ہے۔ یہ دیکھیے ٹورسٹ بس تیار ہے جو پورے شہر کی سیر کرا دے گی بلکہ مشرقی برلن بھی جائے گی اور مناسب یہ ہے کہ اسی بس میں بیٹھا جائے کیونکہ ہر وقت

چند کلیوں کے چٹکنے کی صدا آتی ہے

بس تو خیر بہت سے مقامات دکھا رہی ہے مگر سب سے پہلے میں آپ کو "کفرستان" میں ایک شمع ایمان دکھاتا ہوں۔ یہ ترکی مسجد ہے جو ۱۹۲۸ء تب بنی تھی جنگ کی بمباری میں محفوظ رہی اور اب حکومت پاکستان کی ملکیت ہے پتا نہیں وہ کون سی پاکستانی حکومت تھی جس نے یہ نیک کام کیا۔ بہر حال اس کے سربراہوں کی مغفرت میں اس کار نیک کا بھی دخل ہو گا میں نے اس کا نام جامع مسجد برلن رکھ دیا ہے مستقبل کے زائرین برلن سے درخواست ہے کہ اس میں جائیں تو اس فقیر کو بھی دعائے خیر سے یاد کریں کیونکہ یہ فقیر بس کنڈکٹر کی بدتمیزی اور عدم تعاون کے سبب اندر نہ جا سکا۔

اب اتنا وقت نہیں کہ آپ برلن کے مشہور عجائب خانوں کے اندر جائیں، یہ بہت سے ہیں اور ان میں جارج کو بیے میوزیم نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ آئیے برلن کا سب سے بڑا اور دنیا کا ایک ناقابل فراموش منظر دیکھیے یہ ہے ریشس تاغ جرمنوں کی پارلیمنٹ۔

اے آنکھوں والو دیکھو اور عبرت پکڑو۔

www.taemeernews.com

اور پھر زیادہ عبرت کے لیے شہر کے بیچوں بیچ یہ چلیے، یہ شکستہ عمارتیں دیکھیے، یہ بابل و نینوا نہیں۔ آثارِ قدیمہ نہیں بلکہ جدید یورپ کے ایک جدید شہر کا ایک منظر ہے، کبھی ان عمارتوں میں وہ جنرل اور وزرا رہتے تھے جن کے ایک اشارۂ ابرو پر لاکھوں جرمن فوجی کٹ جاتے تھے اور جن کی آوازوں کے ارتعاش سے ایشیا اور افریقہ اور امریکہ جیسے دور پار علاقوں میں دودھ پلانے والی ماؤں کے دودھ خشک ہو جاتے تھے۔

مگر آنکھوں والے نہ دیکھیں گے نہ عبرت پکڑیں گے، جس ظالم کو ظلم کی مہلت ملے گی وہ ظلم کرکے رہے گا۔

اور یہ دروازہ آپ دیکھتے ہیں۔ پانچ محرابوں یا دروازوں کا دروازہ برانڈن برگ گیٹ جس کے اوپر ایک پروں والا آدمی چار گھوڑوں کی رتھ میں سوار ہے۔ اس دروازے کی تاریخ الگ ہے مگر دلچسپ تازہ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ بیچ میں ایک بڑا دروازہ ہے اور دائیں بائیں دو دو چھوٹے چھوٹے یعنی کم چوڑے دروازے۔ عالی جناب معلی القاب قیصر جرمنی کی گاڑی بہت بڑی تھی وہ صرف بیچ کے دروازے میں سماتی تھی اس لیے وہ اس سے گزرتے تھے، باقی چھٹ بھیے آس پاس کے دروازوں سے۔ پھر روایت یہ ہوگئی کہ بیچ کا دروازہ شاہی گزرگاہ ہوگیا۔ اب یہ دروازہ مشرقی اور مغربی جرمنی کے درمیان ایک مشہور حدِ فاصل ہے۔ یہ سامنے جو موٹریں ہیں مغربی علاقے سے مشرق میں جا رہی ہیں جدھر سلطانیٔ مزدور کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔

(یہ اُس وقت کی تصویر ہے جب دیوارِ برلن کی تلوار نے شہر کو بالکل ہی قتل نہیں کیا تھا۔ اب تو میں دیکھتا ہوں کہ اس شاندار اور خوبصورت دروازے کے آگے ایک بدنما دیوار کھڑی کر دی گئی ہے اور برلنی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں اور شوہروں کے دل دو لخت ہو گئے ہیں۔)

سامنے مشرقی برلن ہے اور اس حقیر فقیر کو وہاں سے بھی بلاوا آیا ہے لیکن ابھی تھوڑی دیر مغربی برلن ہی دیکھیے، خاص طور پر اس کی عجیب و غریب ترقیات جو دوسری جنگِ عظیم کے ملبے پر بجلی کی تیزی اور مرمر کی صفائی کے ساتھ کی گئی ہیں اور اگر آپ رات کو بھی میرے ساتھ چلیں تو:

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا

یہ پندرہ منزلہ عمارت مغربی برلن کے محلہ روزنیک میں ہے اور اس کے آس پاس ایسی بہت سی عمارتیں بن چکی ہیں اور بن رہی ہیں جبکہ ۱۹۴۵ء میں یہاں صرف ملبے اور غلاظت کے ڈھیر نظر آتے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم میں ہوائی حملوں نے برلن کے پچاسی فیصد حصے کو تباہ کر دیا تھا، پچاسی فیصد حصہ۔ ایک سانس ایک نظر میں پچاسی فیصد تباہی کے معنی شاید محسوس ہی نہ ہوں گے مگر خیال کیجیے کہ دس بارہ برس کے اندر اندر وہ شہر دوبارہ اتنا خوبصورت و عالیشان کیوں ہوگیا۔ ہمارے ہاں تو!

www.taemeernews.com

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

(غیب سے کوئی آتا ہے اور کارنامے انجام دیتا ہے)

لیکن مغرب میں غیب کے معجزے چلتے پھرتے شہریوں کے ذریعے بھی سرانجام پاتے ہیں۔ ایک تباہ شدہ شہر ایک برباد معیشت ایک پٹی ہوئی قوم پھر اس طرح طاقتور اور سربلند ہو گئی کہ آج بڑی بڑی فاتح طاقتیں بھی اس سے خائف ہیں:

کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

ہاں ایک تھا مارشل پلان یعنی مارشل صاحب آف امریکہ کا امدادی منصوبہ جس کے تحت دو ارب ڈالر مغربی جرمنی کی تعمیرِ نو پر خرچ کیے گئے۔ مگر ایسی امداد تو ہم بھی برابر لیے جاتے ہیں اور ابھی تک ہمارے لالوکھیت کی جھگیاں اور لاہور کی مضافاتی جھونپڑیاں اور شہر شہر اور قریہ قریہ گندگی اور پریشان حالی کے بڑے بڑے نمونے موجود ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ روپیہ اور نئی مشینری امریکہ سے مہیا ہوئی لیکن ٹیکنیکل صلاحیت خود جرمنوں میں پہلے سے موجود تھی ان کے سائنسداں پہلے بھی دوسرے ملکوں کے ستاروں کو نشان راہ دکھاتے تھے اور پوری قوم کی قوم حیران کن حد تک محنتی تھی — اور ہے۔

مثلاً ڈاہلیم کے علاقے میں یہ فری یونیورسٹی یا آزاد جامعہ دیکھیے۔ شیشے کی لگتی ہے۔ پتا نہیں یہ پتھر ہے یا کنکریٹ یا پالش کی چمک ہے یا میری مشرقی آنکھوں کی دھندلاہٹ مغربی چکاچوند کے بوجھ سے یونہی دبی جاتی ہے مگر میں اس عمارت کے آگے گم سم کھڑا ہوں۔ جرمن جنگ میں دیو اور صلح میں جنات ہیں یعنی ان کی اصل خاصیت طاقت ہے۔ طاقت۔ ہمت۔ قوت جب اسلحہ سازی بند ہو جاتی ہے تو دانش گاہیں بنانے لگتے ہیں۔

لطیفہ: اس فری یونیورسٹی یا آزاد جامعہ میں کوئی بارہ تیرہ سو طالب علم پڑھتے ہیں جن میں سے تین ساڑھے تین سو مشرقی جرمنی اور مشرقی برلن کے ہیں۔ مغربی برلن میں تو عام اجازت ہے کہ جو لوگ اس علاقے میں کام کرتے ہیں وہ مشرقی برلن میں قیام کر سکتے ہیں لیکن آزاد جامعہ کے قوانین اس نقل و حرکت کے متحمل نہیں ہو سکتے بلکہ لازمی ہے کہ اس کے تمام طالب علم مغربی برلن ہی میں قیام فرمائیں۔ وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ صاحب یہ بیچارے طالب علم ادھر پڑھنے آئے اور اُدھر قیام کیا تو کمیونسٹ پولیس انھیں ہر وقت ستائے گی یا اغوا کرے گی۔ مطلب یہ ہے کہ اس طرح خود مغرب کے عقلمند حکام:

لاتے ہیں سرورِ اول دیتے ہیں شرابِ آخر

www.taemeernews.com

بہر حال سرور کبھی ملے شراب علم بہت ہے اور بہت سستی ہے۔

اب شونن برگ کا ٹاؤن ہال دیکھیے۔ باہر سے نہیں بلکہ اندر چلیے! اس میں ایک گھنٹہ ہے جس کا نام ہے آزادی کا گھنٹہ۔ اس وقت گھنٹے کی فارسی یاد نہیں ورنہ اضافت کے ساتھ آزادی کا لفظ اچھا چلتا ہے بہر حال اس وقت تو اردو کی گھنٹیاں ہی بجنے دیجیے جو دوسرے گھنٹے گھڑیالوں کی آوازوں سے پہلے ہی دبی دبی چیخوں جیسی صدائیں پیدا کرتی ہیں۔ ہاں تو یہ آزادی کا گھنٹہ دس ٹن وزنی ہے دس ٹن یعنی دو سو چالیس من (یا زیادہ) اور امریکہ کی طرف سے برلن کو تحفے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ گھنٹہ انگلستان کے مقام کرائے ڈن میں ڈھالا گیا۔ (کرائے ڈن لندن کے قریب ہے) اور نمائش کے لیے امریکہ لے جایا گیا جہاں اُسے ایک لبرٹی ٹرین میں دو مہینے تک گھمایا گیا۔ لبرٹی ٹرین کے معنی بھی وہی ہیں "آزادی کی ٹرین" یہ آزادی کی ٹرین چھبیس امریکی ریاستوں میں گھومی اور پھر اس گھنٹے کو یورپ واپس لا کر ۱۹۵۰ء میں برلن کے اس شونن برگ گرجا میں آویزاں کر دیا گیا۔

کہتے ہیں کہ جب ۲۴ر دسمبر انیس سو پچاس کو یہ گھنٹہ امریکی جرنیلوں کی موجودگی میں بجایا گیا تو ہزاروں برلنی جمع تھے اور سب پر ایک پشیمانی اور امید کا ملا جلا تاثر محیط تھا پشیمانی پچھلی جنگ کی۔ اُمید امن کی۔ یہ سُن کر مجھے رونا بھی آیا اور ہنسی بھی بقول دلّی والوں کے "بُوا ان کی ایک آنکھ ہنستی اور ایک روتی ہے" مگر یہ بات محاورے کی حد تک ہے میں محاورے کے مروجہ معانی سے گریز کر گیا کیونکہ میں رویا امریکیوں پر اور ہنسا جرمنوں پر۔ کوئی کیسے کیوں تو میں مسکرا کر رہ جاؤں گا اور نہ بولنے کے جواز میں جوش ملیح آبادی کا ایک مصرع پڑھ دوں گا

کہ سطحِ ذہنِ عالم سخت ناہموار ہے ساقی

اس گھنٹے پر انیسویں صدی کے امریکی صدر ابراہام لنکن کی ایک مشہور تقریر سے ایک فقرہ نقل کر دیا گیا ہے۔ یعنی گھنٹے پر پیتل کے حرفوں سے کھدوا گیا ہے کہ:

"یہ دنیا خدا کے سائے میں آزادی کا ایک نیا جنم لے گی"۔

یہ کتنا عمدہ کتنا دردمند کتنا ... شریفانہ فقرہ ہے لیکن کیا برلن میں اس کے استعمال کا حق صرف نازیوں کو پہنچتا ہے۔

اسے چھوڑیے۔ امریکی لائبریری ملاحظہ فرمائیے اس کا نام ہے امریکی یادگار لائبریری۔ جونہی آپ میرنگ ڈام سے مڑیں ایک آدھ مربع سامنے آئے گا جس کا نام ہے بلو فریلا ٹز اور اس کے دائیں ہاتھ کو ایک عظیم الشان بنک جیسا اور بھورے رنگ کی عمارت نظر آئے گی جس کی کھڑکیاں بہت فراخ ہیں۔ اس پر کوئی پچاس لاکھ جرمن مارک خرچ ہوئے اور کوئی دس لاکھ مارک تزئین و آرائش پر خرچ ہوئے (ایک مارک کوئی سوا روپے

www.taemeernews.com

کا ہوتا ہے) اور اس کا آغاز ۱۹۵۰ء میں کوئی ڈیڑھ لاکھ کتابوں سے ہوا۔

دس ٹن والے گھنٹے کی طرح یہ بھی برلنی جرمنوں کو امریکی عوام کا تحفہ ہے۔ وہ برلنی جرمن اور وہ امریکی عوام جو کئی برس تک ایک دوسرے کے خلاف ایک خونریز جنگ میں مبتلا رہے کیا یہ واقعی مخلصانہ تحفے ہیں یا یہ بھی شطرنج پر عمدہ اخلاقی اصولوں کے پیادے گھوڑے اور فیل چلائے جا رہے ہیں۔

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

مگر ایک بات ضرور ہے کہ امریکی چونکہ سابق یورپین ہیں اس لیے انھیں یورپ سے بہت محبت ہے بلکہ لاکھوں امریکی جرمن نسل سے ہیں اس لیے انھیں "اپنوں" کی شکست سے بھی رنج ہوا۔ اب تالیف قلب کے لیے طرح طرح کے جتن کرتے رہتے ہیں سو ہم ایشیا والے ٹک ٹک دیکھتے ہیں اور جناب وہ ہاتھ اٹھا کر جو پھینک دیں اسے پلکوں سے اٹھا لیتے ہیں۔

امریکی تحفوں میں ایک اور تحفہ حاضر ہے اس کا نام ہے کانگریس ہال۔ یہ سابق جرمن پارلیمنٹ ریشتاغ سے ذرا آگے بڑھ کر ہے اور برلن کی بالکل جدید عمارتوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے اس ہال کو امریکی مدبر بنجمن فرینکلن کے نام سے معنون کیا گیا ہے کیونکہ اس پر جو رقم خرچ ہوئی وہ امریکہ کی بنجمن فرینکلن سوسائٹی نے جمع کی تھی۔ وہ امریکی گھنٹہ اور وہ لائبریری اور یہ کانگریس ہال سب جمہوریت کے کھلونے ہیں جن سے دردمند امریکی بیٹھے ہوئے مگر طاقتور جرمنوں کو بہلاتے ہیں کہ میاں نسلی برتری کے چکر میں پڑ کر دنیا پر قبضہ کرنے کی بجائے عبادت کرو۔ کتابیں پڑھو۔ تقریریں سنو۔ اور۔ اور:

کر کلرکی کھا ڈبل روٹی خوشی سے پھول جا

بات یہ ہے کہ برلن میں قدیم جرمن کام بہت کم رہ گیا ہے۔ بہت کچھ جنگ کی نذر ہوا اور جو رہ گیا اُسے دوبارہ بنانے کی بجائے اس کی شکستہ حالت میں رکھ کر اس سے عبرت پکڑنے کا کام لیا جاتا ہے۔ بہرحال بچی کھچی بڑی یادگاروں میں سے ایک یادگار یہ ملاحظہ ہو۔ یہ محل شارلوٹن برگ کے وسطی احاطے میں ایک عظیم الشان بت ہے جسے گریٹ اسکیٹر یعنی معمار اعظم کا بت کہا جاتا ہے۔ معمار اعظم صاحب نے سترھویں صدی میں برلن کی تعمیر و تہذیب میں نمایاں حصہ لیا تھا اور ان کی یاد میں ایک فنکار آندریاس شولٹر نے ۱۷۰۰ء میں یہ شاندار کارنامہ انجام دیا۔

مغربی برلن میں گھومتے گھومتے ایک منظر بار بار سامنے آتا ہے۔ لوگوں کی خوش مذاقی۔ زندہ دلی اور فراغت۔ اور اس پر سخت حیرت ہوتی ہے۔ یہ شہر چاروں طرف سے ایک بالکل دوسری دنیا سے گھرا ہوا ہے

www.taemeernews.com

جس کا نام مشرقی جرمنی ہے جس کا رقبہ بیالیس ہزار مربع میل ہے اور جس کی آبادی تقریباً ڈیڑھ کروڑ ہے۔ اور جہاں لاکھوں کمیونسٹ افواج مورچے بنائے پڑی ہیں۔ اس ایک خطرناک اور "غیر" سمندر میں مغربی برلن کے شہری جس آزادی سے گھومتے پھرتے ہیں اور کاروبار کے ساتھ ساتھ تفریح کرتے ہیں انہی کا جگر ہے! اس صورتحال کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ لوگ خطروں میں رہتے رہتے نڈر ہو گئے ہیں اور ایک امن پسند دن کے بعد دوسرے امن پسند دن کی اُمید نہیں رکھتے اس لئے غم نہیں پالتے۔

اس علاقے کا نام ہے کُورفورسٹنڈام شہر کا ایک نہایت بارونق علاقہ ہے بہت سے مشہور ہوٹل دکانیں اور نائٹ کلب اسی مقام پر واقع ہیں لہذا جرمن طوائفیں بھی یہیں واقع ہوتی ہیں اور غیر ملکی تماشبین بھی یہیں واقع رہتے ہیں اور اس لیے میں بھی یہیں واقع ہو گیا ہوں بات یہ ہے کہ مغربی برلن میں گھومتے گھومتے رات ہو گئی ہے اور عام طور پر غیر ملکی لوگوں کو رات کے وقت مشرقی برلن میں جانے کا مشورہ نہیں دیا جاتا یعنی انھیں منع کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ میں اسی بازار میں گھومتا ہوں۔ نائٹ کلب بہت مہنگے ہیں پیرس اور لندن کا تجربہ یہاں کام آرہا ہے یعنی مفت "داخلہ" لکھا ہوا دیکھ کر بھی طبیعت ادھر نہیں آتی کیونکہ معلوم ہے کہ اندر ایک کوکا کولا بھی منگا لیا تو دس بارہ روپے کا چپت پڑ جائے گا۔ (جی ہاں ہم چپت کو مذکر بولتے ہیں) مگر کچھ نہ کچھ تاک جھانک بھی ضروری ہے سو وہ چلے جاتی ہے۔ یہاں چونکہ نہ کوئی گائیڈ ہے نہ پروگرام کی ہدایات اس لیے سب معاملہ یونہی چل رہا ہے "نہ کوئی منزل نہ کوئی جادہ نہ کچھ ارادہ۔"

"[illegible] موسیو رات کے بارہ بجے آپ یہاں اکیلے کیوں گھوم رہے ہیں" اس نہایت مرد معقول نے نہایت معقول انگریزی اور فرنچ لہجے میں فرمایا اور کھٹ سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میں ایک ٹورسٹ ہوں" میں نے ان کا ہاتھ ہٹانا چاہا جو نہیں ہٹا۔

"آہا تو کیا آپ یہ کتاب یقینی پسند کریں گے" انھوں نے جھٹ سے ایک البم میرے ہاتھ میں تھما دی اور میرے شانے والا ہاتھ اٹھا کر اس میں ایک ٹارچ پکڑا دی جو خاصی تیز اور سرخ روشنی پھینک رہی تھی۔

اس البم میں کوئی بیس خواتین کی ننگی تصویریں تھیں نہایت عمدہ اور مختلف الاقسام پوز دان کے نیچے ان کی عمریں اور قومیتیں اور ایک رات کی قیمتیں تین چار یورپی زبانوں میں ٹائپ کر دی گئی تھیں جن میں سے ایک انگریزی بھی تھی میں نے [illegible] کی تعریف شروع کی اور وہ اس تعریف پر تشکر و امتنان سے سر ہلاتے گئے۔

"[illegible] آپ مجھے [illegible] دیکھیے مجھے اپنے ہوٹل واپس پہنچنا ہے" میں نے ایک دم البم ختم کر کے عرض کیا۔

"[illegible] موسیو کیا آپ کو سیر و تفریح پسند نہیں۔ یا آپ مجھ پر اعتبار نہیں کرتے" انھیں غصہ آنے لگا تھا۔

www.taemeernews.com

میں چلنے لگا مگر انھوں نے پھر وہی پرانا ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک نسبتاً تنگ اور ویران سڑک پر کھڑا ہوں۔

"آپ نے میرا وقت ضائع کیا اور ان خوبصورت خواتین کی توہین کی۔ آپ کو اس کی قیمت دینی ہوگی۔"

میں قیمت دے دیتا مگر میرے پاس بڑی قیمت کے نوٹ ایک گڈے میں بند تھے۔ میں نے کوشش کی کہ جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر ہی اندر ٹٹولوں اور ایک نوٹ برآمد کروں مگر وہ صاحب کچھ اور سمجھے۔ انھوں نے فوراً میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اوہو تو آپ کے پاس ریوالور بھی ہے" یہ کہہ کر انھوں نے میرے شانے والے ہاتھ سے میرے منہ کی سیدھ میں ایک زوردار گھونسا چلا دیا جو میرے دائیں کلّے کی آخری داڑھ پر پڑا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں خون نگل رہا ہوں۔ میں کچھ سوچ بھی نہ سکا۔ شاید میرا احساس یہ تھا کہ میں کوئی مار دھاڑ والی فلم دیکھ رہا ہوں اتنے میں برابر والی گلی سے ایک مضبوط اور خوش شکل خاتون نمودار ہوئیں جوان کا دو سرا گھونسا ہوا میں لہراتے ہوئے دیکھ کر چیخنے لگیں۔ بات یہ تھی کہ البم والے صاحب مجھ سے بہت زیادہ لمبے اور تگڑے تھے۔

"مرڈر۔ مرڈر" ان کی چیخیں بلند ہونے لگیں اور وہ صاحب گھبرا گئے۔ میں نے جلدی سے بانفیاتے ہٹ منہ کے آگے کیا اور ... دونوں مٹھیاں ملا کر ایک جوابی گھونسا مارا جوان کی ناک پر لگا۔ وہ چکرا کر گر گئے اور گرتے ہی اٹھ کر بھاگے۔ قاعدے کے مطابق میں جیت گیا تھا مگر میں فوراً ہی دوسری طرف بھاگا شاید اس لیے کہ میرے منہ سے خون خاصی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ میں کوئی پچاس قدم ہی دوڑ کر تھک گیا اور پیچھے موڑ کر دیکھا تو وہ خاتون تیز تیز قدموں سے میری طرف آرہی تھیں۔

"میری محسنہ" میں نے دل میں کہا اور ان کا نہایت مخلصانہ استقبال کرنے پھر واپس مڑ گیا۔ انھوں نے قریب آتے ہی میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور تھر تھر کانپنے لگیں

"اوہ۔ آپ تو عرب ہیں"

"جی نہیں میں پاکستانی ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

"کوئی بات نہیں۔ لائیے میں ذرا خون تو پونچھ دوں" میں نے انھیں غور سے دیکھا تو مجھے خیال آیا کہ میں نے ماضی قریب ہی میں انھیں دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے۔

ایکدم میری نظر کے آگے وہ البم دوبارہ گھوم گئی۔ میں نے ایک لمحے کی تاخیر بھی نہ کی۔

"محترم خاتون میرا خیال ہے میں نے آپ کی تصویر ایک البم میں دیکھی ہے۔"

www.taemeernews.com

"اوہ۔ نو۔ تو کیا یہ 'وہ' تھا۔ مائی گاڈ" وہ گھبرا گئیں اور مڑ کر دیکھنے لگیں۔ مگر وہ بھاگ چکا تھا۔
"آیئے یہاں ٹھیرنا ٹھیک نہیں پولیس گشت کرتی ہے۔ آپ کہاں جائیں گے۔ کیا آپ میرے ساتھ چلیں گے۔ مگر نہیں۔ تو کیا میں آپ کے ساتھ چلوں۔ میں تھکی ہوئی تو ضرور ہوں مگر آپ کے ساتھ یہ واقعہ برا پیش آیا ہے۔" انھوں نے ہمدردی جتائی اور میں نے ان کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھ لیا کہ وہ جھوٹی نہیں تھی۔

"دیکھیے خاتون یہ کیسا دلچسپ اتفاق ہے کہ میں نے آپ کی وجہ سے مار کھائی اور آپ ہی کی وجہ سے بچ گیا۔ کیا میں آپ کو یہ دس مارک پیش کر سکتا ہوں۔ میں ایک غریب ٹورسٹ ہوں۔"

"نہیں نہیں" انھوں نے چلنے کے لئے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ "میں کبھی سو مارک سے کم نہیں لیتی لیکن مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے۔ اچھا تو جلد جلد چلیے مجھے اپنے گھر جانا ہے اور آپ کو......"

"میں۔ میں تو سیدھا اسپتال جاؤں گا۔"

"اوہ ــــ آیم سوری۔ مجھے بہت شرمندگی ہے کہ آپ کو اتنی تکلیف ہوئی۔ ایسے اتفاقات بڑے شہروں میں پیش آ ہی جاتے ہیں۔"

"جی ہاں" میں نے تعظیماً سر جھکایا۔ "شاعروں کی قسمت میں چند تصویر بتاں کے علاوہ اور رکھا بھی کیا ہے۔"

یہ چند سطریں اُن خاتون کی نذر ہیں جنھوں نے اپنا نام بھی نہیں بتایا۔ وہ پیشے کے لحاظ سے کچھ بھی ہوں مگر انھوں نے مجھ سے دس مارک بھی نہیں لیے اور ایک ٹیکسی ڈرائیور کو ایک اسپتال کا پتا دے کر مجھے ادھر روانہ کر دیا۔ جہاں ایک نازک اندام نرس اور ایک بد مزاج ڈاکٹر نے مفت میری اذیت رساں داڑھ پر دوا لگائی اور میری گزارش پر پولیس کو رپورٹ بھی نہیں کی۔ اور وہ داڑھ میں مغربی برلن کی نذر کرتا ہوں۔ کیونکہ وہاں تو وہ بچ گئی تھی مگر ہالینڈ پہنچ کر اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکی:

یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

www.taemeernews.com

ہٹلر سے گفتگو

"گُٹن مورگن"
"گُٹن مورگن"

یہ مشرقی برلن کی ایک صبح ہے اور میں خاص اجازت اور خاص اہتمام سے یہاں پہنچا ہوں. کیونکہ رہنما یا ترجمان کے بغیر مغرب میں تو کسی حد تک کام چل جاتا ہے مگر مشرق میں قدم قدم پر طرح طرح کی مشکلات پیش آتی ہیں اور یہی مشکل کچھ کم نہیں کہ آدمی گھوم لئے پھر لے مگر کچھ جاننے نہ پائے۔

"گُٹن مورگن"

اس کے معنی ہیں گڈ مارننگ۔ سلام صبح اور اس کا جواب بھی یہی ہے۔ میری رہنما انگریزی خوب جانتی ہیں مگر وہ اتنی پیاری ہیں کہ میں نے انگریزی کے بجائے انھیں جرمن زبان میں سلام کرنا مناسب سمجھا جس سے وہ بہت خوش ہوئیں۔ عام طور پر لوگ دوسرے سے اپنی زبان کا ایک لفظ بھی سن کر خوش ہو جاتے ہیں. سوائے اپنے پیارے وطن کے جہاں اب بھی اونچی سوسائٹی میں السلام علیکم کہنا جہالت اور مفلسی یا کم از کم گھٹیا پن کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

یہ خاتون چار جرمن مارک فی گھنٹہ پر میری معیت و رہنمائی کے لئے مقرر ہوئی ہیں۔ مغربی برلن اور مغربی جرمنی کے لیے یہ نرخ بہت کم ہے یوں سمجھئے چھ روپے گھنٹہ مگر مغربی جرمنی کے سکے کی قیمت مشرقی برلن میں بہت زیادہ ہے یہ لوگ مانتے نہیں لیکن عملاً دگنے کا فرق ہے۔ خیر ہوگا۔ یہ ان کے جھگڑے ہیں. ہم تو انٹرنیشنل آدمی ہیں اور اہلِ دل ہیں اور دل کے آگے روپیہ کیا مال ہے بس مشکل یہ ہے کہ آج کل دل بہت بڑا ہے اور روپیہ بہت کم۔ اس لیے ان اعداد و شمار کے چکر میں پھنس گئے ہیں. ورنہ ہمیں نے وہ دوہا بھی فرمایا تھا جس کا ایک مصرع یہ ہے:

موتی کوٹ کے مانگ بھروں چندن سے دھوؤں تیرے بال

بہرحال فی الوقت تو موتی کوٹنے کے بجائے اپنا سینہ کوٹنے اور چار مارک فی گھنٹہ کے حساب سے اس

www.taemeernews.com

نصیب فرنگ کی رہنمائی میں مشرقی برلن کا مزا لوٹیے (ہمارے فسانۂ عجائب والے مرزا رجب علی بیگ سرور کس آڑے وقت میں قافیے یاد دلاتے ہیں)

مشہور امریکی صحافی جان گنتھر نے مشرقی برلن میں داخل ہو کر کہا۔ یہ روس ہے۔ اور مغربی برلن میں یہ نہیں کہا کہ یہ امریکہ ہے میں ایک غیر مشہور پاکستانی ادیب ہوں لیکن اتفاق سے روس ہو آیا ہوں اس لیے میں گنتھر صاحب کی تائید نہیں کر سکتا۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ سوشلسٹ جرمنی ہے مشرقی برلن کے کونے کونے پر جرمن چھاپ ہے۔ تباہی' سخت جانی جفاکشی اور تنومندی کی چھاپ۔ مغربی برلن کے مقابلے میں اس کی سڑکیں بے رونق ہیں کیونکہ انواع و اقسام کی مغربی کاریں دوڑتی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ اس کی عمارتیں یکساں اور ہموار سی ہیں۔ گوناگوں اور خمدار نہیں۔ مگر ان کے مقابلے میں تاریک عمارتیں اور جھونپڑے بھی نہیں ہیں۔ اس کی دکانوں میں آرائش نہیں بلکہ ضروریات کا مال بھرا ہوا ہے کیونکہ بہت سے لوگوں کے لئے بہت سا سستا مال چاہیئے "چند لوگوں کے لیے سب کچھ اور بہت سے لوگوں کے لئے کچھ بھی نہیں" کا نظام یہاں نہیں چلتا۔ یہاں مارشل پلان والی امداد بھی نہیں آئی۔ امریکی تحفہ ہائے رنگ رنگ" بھی نہیں پہنچے۔ ایک مکمل طور پر تباہ شدہ ملک کو ایک مکمل طور پر تباہ شدہ قوم نے خود ہی دوبارہ بنایا ہے ــــ اور خوب بنایا ہے۔

براندن برگ دروازے کے دوسری طرف مشرقی برلن اور مشرقی جرمنی شروع ہو جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ مغربی رنگارنگی کے مقابلے میں سوشلسٹ یکسانیت فوراً اور شدید طور پر محسوس ہوتی ہے' سو وہ ہونی بھی چاہیئے آخر کو یہ سوشلسٹ علاقہ ہے۔ مگر پھر بھی یہ روس نہیں ہے یہ جرمنی ہے۔

سب سے پہلے اس صدی کا سب سے زیادہ دردناک تاریخی مقام دیکھیے۔ یہ رائخ چانسلری ہے ایک جرمن چانسلر یعنی وزیر اعظم یا حاکم ریاست کی قیام گاہ۔ جرمنی میں شاید الو نہیں ہوتے۔ ورنہ وہ یہاں بولتے دکھائی دیتے۔ یہ ریت اور ملبے کا ایک ٹکڑا ہے۔ جہاں بارش سے کیچڑ ہو جاتی ہے۔ یہ اس جرمن حاکم کی قیام گاہ ہے جس کا نام ہٹلر تھا۔

بچو اور بزرگو! تمھیں معلوم ہے کہ اب سے صرف بیس برس پہلے یہ جگہ پوری انسانیت کے لیے کتنا مہیب خطرہ بنی ہوئی تھی۔ اس جگہ جہاں میں چار پانچ روپے خرچ کر کے پہنچ گیا ہوں دنیا کی سب سے زیادہ مضبوط اور محفوظ رہائش گاہ تھی۔ ریت کے اس ملبے کے نیچے گرمی میں ایئر کنڈیشنڈ اور سردی میں گرم کمرے تھے۔ ان کے قالین اور صوفے ودیوان لاکھوں روپے کے تھے۔ وہ آدمی خود کروڑوں بلکہ اربوں روپے کا تھا جو ان میں رہتا تھا اس آدمی نے کروڑوں انسانوں کو ایسی جنگ میں مبتلا کر دیا تھا جس میں لاکھوں جوان ہلاک ہو گئے

www.taemeernews.com

اور آج اسی جگہ ایک دور افتادہ ایشیائی ملک کا ایک بالکل معمولی آدمی کس شان اور کس اطمینان سے کھڑا بھک بھک سگریٹ پیتا ہوا کس بقراطی سے حیات و ممات اور انسانوں اور قوموں کے عروج و زوال پر تبصرے کر رہا ہے۔

یکایک میں دیکھتا ہوں کہ ملبے کے نیچے سے ہٹلر صاحب نکلتے ہیں اور دایاں ہاتھ اٹھا کر زور سے سلام کرتے ہیں۔ وہ پوری وردی میں ہیں۔ ان کی مونچھیں مکھیوں کی طرح پھڑک رہی ہیں۔

"ہر حالی"

"ہر ہٹلر"

"گٹن مارگن"

"ڈنکے"

ڈنکے کے معنی ہیں شکریہ۔ میں نے جواباً "گٹن مارگن" کہنے کے بجائے بہت بے رُخی سے طنزیہ طور پر شکریہ کہا ہے۔

"اچھا تو آپ بھی مجھ سے خفا ہیں؟" وہ فصیح اُردو میں بولتے ہیں۔ (واہ بیٹا۔ جرمن سے اُردو بلواتے ہو)

میں کچھ جواب نہیں دیتا۔

"ہی ہی ہی" وہ ہنستے ہیں "بھئی یورپ والوں کی خفگی تو میں سمجھ سکتا ہوں اور یہودیوں کی نفرت بھی مانتا ہوں کیونکہ میں خود ان سے نفرت کرتا تھا مگر آپ کس خوشی میں مجھ سے اتنی نفرت کرتے ہیں؟"

"اس لیے کہ تم فاشسٹ اور ظالم ہو۔"

"کیا انگریزوں نے تم پر ظلم نہیں کیے؟"

خاموشی ___ پتا نہیں آپ کیا جواب دیتے۔

"اگر میری اور انگریزوں کی جنگ نہ ہوتی تو کیا تم لوگ اتنی جلدی آزاد ہو جاتے؟"

"ماضی کے بارے میں پیش گوئی کرنی بیکار بات ہے۔"

"دیکھو بھائی شاعر صاحب میں بیشک ظالم تھا مگر مجھے ظالم مشہور کرنے والے خود بھی فرشتے نہیں ہیں۔ تم نے مجھے اپنے آقاؤں کی آنکھ سے دیکھا ہے اور پھر غضب یہ ہوا کہ میں ہار گیا اور ظاہر ہے کہ جو ہار جائے اس کی تاریخ اس کا تمدن اس کے اچھے کام سب ہار جاتے ہیں۔ ان کی صورت مسخ کر دی جاتی ہے۔

"میں نازیت سے نفرت کرتا ہوں، سب مہذب دنیا کرتی ہے۔" میں جوش سے جواب دے کر منہ چھیلتا ہوں۔

"اوہو مہذب دنیا کی بات کرتے ہو۔ کون سی مہذب دنیا؟ آج کی آدمی مہذب دنیا سرمایہ دارانہ جمہوریت

www.taemeernews.com

سے نفرت کرتی ہے اور آدھی مہذب دنیا کمیونزم سے نفرت کرتی ہے اور آخر میں سب اس سے نفرت کریں گے جو ہار جائے گا مگر خیر تمہارا چڑیا سا دماغ اس تاریخی حقیقت کی تہوں تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔ تم تو یہ دیکھو کہ میں نے تمہارے سابق آقاؤں کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔"

"آئی ایم سوری ہٹلر صاحب میں مشرقی برلن دیکھنے آیا ہوں آپ کی بکواس سننے نہیں آیا۔" ذرا بکواس کا آزادانہ استعمال ملاحظہ ہو۔ کیا میں اس شخص کی زندگی میں ایسی بات کہہ سکتا تھا۔

مگر ہٹلر صاحب ذرا برا نہیں مانے "بڑا آدمی ذلت کا عادی ہو جائے تو بہت نیچے تک پہنچ جاتا ہے بلکہ کسی بات کا بھی عادی ہو جائے تو اسے حد تک پہنچا دیتا ہے۔

"وجہ یہ ہے پیارے ہر عالی" انھوں نے اطمینان سے کہا "تم پورے جرمنی میں گھوم لوگے تب بھی میرے لیے دو کلمات خیر کہنے والا کوئی نہیں ملے گا بلکہ نئی جرمن نسل خود مجھے ایک خونخوار درندے کے نام سے پکارتی ہے حالانکہ گر میں جیت گیا ہوتا تو آج میرے لاکھوں تنخواہ دار اور وظیفہ خوار اور مفت میں مرعوب صحافی اور ادیب اور مبصرین در محققین بیٹھے انگریزوں' امریکیوں اور روسیوں اور ان کے نظاموں میں کیڑے نکال رہے ہوتے۔ نہ کسی کو یہ پتا چلتا کہ میں نے کتنے لاکھ یہودیوں کو زندہ جلوا دیا نہ یہ کہ میری فوجوں نے کہاں کہاں کتنے مظالم کیے بلکہ الٹے وہ ہزاروں لرزہ خیز واقعات منظر عام پر آتے جو آج مٹھی بھر لوگوں کو بھی معلوم نہیں مگر پیارے تم ایشیائی ہو اور ایشیا پر وہی سفید فام اقوام قابض تھیں جن سے میری جنگ ہوئی تم تو میرے ساتھ انصاف کرو۔"

"کیا انصاف۔ یعنی میں نازیت کو حق بجانب قرار دے دوں۔"

"نہیں مائی ڈیر حق گو شاعر نازیت کو جائز قرار مت دو مگر یہ تو کہو کہ اس صدی میں اکیلا میں ہی ظالم و جابر نہیں گزرا۔"

"اچھا اس حد تک میں بھی مانتا ہوں کہ اس صدی میں اور بھی ظالم گزرے ہیں۔"

"اور یہ کہ اب بھی بہت سے افراد اور قومیں میری ہی طرح دوسروں پر ظلم میں مصروف ہیں۔"

"اچھا یہ بھی سہی۔"

"تو پھر ان کے نام بھی لو نا پیارے حق پرست — ان کے نام بھی لو ان کے مظالم پر بھی تحقیق کراؤ نا پیارے ایشیائی کبھی تو تم لوگ بھی آزادانہ غور و فکر کے جلوے دکھاؤ۔"

"نا بابا نا" میں نے دل میں کہا "میں ابھی ان کے نام نہیں لے سکتا کیونکہ ابھی مجھے ساری دنیا میں گھومنا ہے وہ بہت سے ملکوں کے پروانہ ہائے راہداری درکار ہیں۔" میں چپ رہا۔

www.taemeernews.com

" بولو نا بہادر حق پرست ایشائی ۔ مجھے سلطانی گواہ نہ بھی بناؤ تب بھی میں بہت سی عجیب و غریب شہادتیں مہیا کرنے پر تیار ہوں ۔"

" بیٹھیے جناب میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتا مگر میں پوری انسانیت کی طرف سے ایک وعدہ کر سکتا ہوں ۔"

" وہ کیا ۔"

" وہ یہ کہ انسانیت پر جملہ مظالم کی ایک سچی اور مکمل تاریخ کبھی نہ کبھی لکھی جائے گی ۔"

" چلو یہ بھی منظور ہے مگر کیا تم اندازہ کر سکتے ہو کہ مجھے کب تک انتظار کرنا ہوگا ۔"

" معلوم نہیں ۔" میں نے لاپروائی سے کہا " ہاں لکھی ضرور جائے گی کہ سے کم ڈیڑھ دو سو برس تو اور لگیں گے مگر تمھیں اس سے کیا فائدہ ہوگا کیونکہ تمھارا نام تو انسانی درندوں میں ہمیشہ جلی حرفوں سے آئے گا ۔ اس کا مجھے یقین ہے ۔"

" میرا فائدہ یہ ہے کہ میں اکیلا نہیں رہوں گا ۔ ایوا براؤن کے باوجود مجھے تاریخ کے اذیت دہ گوشوں میں تنہائی بہت ستاتی ہے ۔"

" یار ذرا ایوا براؤن کو تو بلواؤ ۔" میں سب کچھ بھول کر اپنی اصل سطح پر اُتر آیا ۔ شاید میری آنکھوں میں شیطنت چمکنے لگی ۔

" بھئی معاف کرنا وہ افریقہ کی تحریک آزادی ماؤ ماؤ کی تاریخ لکھنے میں بہت مصروف ہے ۔ سوری ۔"

لیجیے ہٹلر صاحب بھی صاف انسانی سطح پر آئے اور رقابت کے چکّر میں مبتلا ہو گئے ۔

" آوف ویڈرزین " (پھر ملیں گے) انھوں نے کہا اور غائب ہو گئے ۔

آوف ویڈرزین " میں کہتے کہتے رہ گیا ۔

بہرحال :

گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

(کبھی کبھی اس پرانے قصے کو بھی دہرا لیا کرو)

اب یہ اوپیرا ہاؤس دیکھیے یعنی رقص گاہ یا ناچ گھر ۔ یہ ۱۸۶۱ء میں بنا دو دفعہ جلا اور ۱۹۴۳ء میں دوسری جنگِ عظیم کے دوران بالکل ہی تباہ ہو گیا یعنی اس کا نام و نشان ہی نہیں رہا ۔ مگر جرمنوں کی وہی عقابی خاصیت کلچر کے میدان میں بھی بروئے کار آتی ہے ۔

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا

www.taemeernews.com

ہتھوں نے ۱۹۵۵ء تک اسی جگہ ویسا ہی ناچ گھر پھر بنا کر رکھ دیا۔

مورل آف دی اسٹوری: جرمن فنون لطیفہ کے بہت دلدادہ ہیں۔ اب ذرا اصلی مشرقی برلن دیکھیے سٹی ہال کے سامنے کانسی کے یہ دو بڑے بڑے مجسمے کس کے ہیں کسی بادشاہ کسی صدر کسی وزیراعظم کسی فاتح کے نہیں بلکہ ورکنگ کلاس یعنی مزدور پیشہ لوگوں کے ہیں جنھیں اپنے وطن میں عوام کہا جاتا ہے۔ عوام جو کام کرتے ہیں اور جنھیں آرام نہیں کرنے دیا جاتا۔ یہ مجسمے طاقت، محنت اور صحت کے مظہر ہیں۔ یہ مرد سخت کوش اور اولوالعزم معلوم ہوتا ہے اور یہ عورت اس کی کارکن ساتھی ہے۔ ایک مضبوط رفیق سفر، ایک مہربان ماں، ایک دلآویز بیوی، ایک پیاری بیٹی، ایک مثالی عورت۔

مگر اسے مغرب کمیونسٹ پروپگنڈا کہتا ہے!! پتا نہیں یہ مجسمے آج کے مشرقی برلن اور مشرقی جرمنی کے عوام کے صحیح نمائندے ہیں یا نہیں مگر عوامی قوتیں اسی طرح ظاہر ہوتی ہیں اور ظاہر ہوتی رہیں گی۔

کیا آپ نے یہ نہیں سنا کہ کمیونسٹ ملکوں میں مکانات کی سخت قلت ہے۔ آپ نے ضرور سنا ہوگا اور یہ بھی سنا ہوگا کہ یہ لوگ بڑی بیہودہ عمارتیں بناتے ہیں۔ سپاٹ، ایک جیسی اور یہ کہ یہ لوگ محلات نہیں بناتے جن میں ایک چھوٹے سے خاندان کے لیے بیس بیس کمرے اور پرائیویٹ ٹینس لان اور سوئمنگ پول ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات سچ ہے، مگر پہلی بات کی تردید شارع اسٹالین پر ان عمارات سے ہوجاتی ہے جو ٹاور بلڈنگیں کہلاتی ہیں۔ صفاً مضبوط اور چودہ منزلہ عمارات جو زیادہ لوگوں کے کام آتی ہے اور جن میں ایک ایک آدمی کے لئے الگ الگ سوئمنگ پول نہیں ہیں جو ہالی ووڈ میں نظر آتے ہیں۔

لطیفہ: پہلے اس سڑک کا نام شارع فرینکفورت تھا۔ فرینکفورت کا شہر مغربی جرمنی کے حصے میں آیا تو مشرق والوں نے اس کا نام بدل کر شارع اسٹالین رکھ دیا۔ خروشیف صاحب نے اقتدار سنبھالا تو یار لوگوں نے دوسرا نام بھی بدلنا چاہا مگر مشرقی برلن کے قدامت پسند کمیونسٹ اڑ گئے۔ مگر اب بھی پتا نہیں کس دن نام بدل جائے۔

خیر بقول شیکسپیر:

اے میاں کیا دھرا ہے ناموں میں

مگر کیوں نہیں دھرا ہے۔ بہت کچھ دھرا ہے۔ یہ دیکھیے اس وسیع قطعہ زمین کا نام تھا ٹریپٹو پارک۔ ٹریپٹو اس پورے علاقے کا نام تھا جو [illegible]ء میں بنایا گیا اور یہ باغ اور یہ پورا قطعہ اسی نام سے پکارا جاتا تھا مگر جب جرمن ہارے اور روسی جیتے تو اس کے عین وسط میں روسی شہیدوں کی ایک یادگار بنا دی گئی اور اس کا نام یادگار باغ رکھ دیا گیا۔ یادگار کسی کی جرمنوں کی نہیں سوویت افواج کی کیونکہ کہا جاتا ہے کہ یہاں سات ہزار روسی سپاہی دفن ہیں یہ کوئی نہیں بتاتا کہ جرمن سپاہی اور شہری کتنے دفن ہیں۔ بہرحال یہ باغ ملاحظہ کیجیے۔ باغ میں گاڑی نہیں جا سکتی اس لیے پیدل

www.taemeernews.com

چلنا پڑے گا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی ایک بڑا مجسمہ نظر آتا ہے جس کا نام ہے مادر روس۔ یہ خاتون بیٹھی ہوئی سب کی طرف ایک کرخت نظر ڈال رہی ہیں۔ ماں کا یہ تصور میرے لیے بہت اجنبی ہے شاید بات یہ ہے کہ روسی ماں کے لیے جرمن بچے زیادہ سے زیادہ سوتیلے بچوں کی طرح ہیں اور سنا ہے کہ ماں سوتیلی ماں ہوتے ہی ڈائن بن جاتی ہے۔

"نہیں جناب" میری رہنما جو کم وضاحت کرتی ہے اب ایک دم وضاحت کرتی ہیں "یہ ماں اپنے روسی بچوں کا سوگ منا رہی ہے جو یہاں قتل اور دفن ہوئے۔"

شاید یہ سچ ہے مگر یارو کوئی جرمن ماں بھی تو دکھی ہو جس کے شوہر کی غلطی نے اس کے بچوں کو قتل، دفن اور تباہ کرا دیا آخر وہ بھی تو ماں ہے۔

مفتوح قوم میں ماں باپ اور بچوں کا چکر نہیں چلتا۔ سب غلام ہوتے ہیں، سب ہارے ہوئے ہوتے ہیں۔ مجھے نئی دہلی اور لاہور میں انگریز ملکہ اور وائسرایان والا تبار کے بت یاد آ گئے۔

ویسے یہ یادگار باغ ایک نہایت عظیم الشان شے ہے۔ باغ کا تو نام ہی نام ہے کیونکہ بہرحال نرم اور سبز گھاس کے تختے دور تک دیئے گئے ہیں لیکن ان پر گہرے سنگ سرخ کی بڑی بڑی شاندار کمانیں، دیواریں اور کتبے تک جان ہیں ان پر جنگ روس و جرمنی کے مناظر، جلی تحریریں اور رزمیہ شعر کھدے ہوئے ہیں۔ یہ باغ کے دونوں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے سے آٹھ آٹھ مختصر قسم کے مقبرے ہیں۔ پورا مقبرہ ہے۔ عبرت، طاقت اور فتحمندی کے مرقعے۔ ایک مفتوح قوم کی زمین پر فاتح کا اعلان سربلندی۔

یہ الگ بات ہے کہ آجکل فاتحین کی زبان، رنگ الگ ہے مفہوم ایک ہی ہوتا ہے۔

مجھے اس باغ میں لینن گراڈ کا مقبرہ یاد آیا جہاں وہ پانچ لاکھ روسی شہری دفن ہیں جو اسی دوسری جنگ عظیم میں جرمن حملوں کا شکار ہو گئے تھے۔ وہاں میں رو دیا تھا۔ یہ باغ بھی اسی جنگ کی یادگار ہے۔ یہاں بھی روسی مجاہدین ہی دفن ہیں لیکن میرا تاثر لینن گراڈ جیسا نہیں کیونکہ بہرحال یہ جرمن زمین ہے۔ جرمن قوم کی زمین اور جرمن قوم ہار چکی ہے اور صلح کر چکی ہے اور بدل چکی ہے۔ اس کی تادیبی کارروائیاں پوری ہو چکی ہیں۔ اسے بہت سخت سزا مل چکی ہے یہاں تک کہ وہ تقسیم بھی ہو چکی ہے۔ اسے اتنا کھینچ کر رکھنا انسانی شرافت کو اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ آج کے جرمن تو یہ صورت حال قبول کرنے پر مجبور ہیں لیکن شاید کل کی نئی نسل اپنی زمین پر غیر ملکی یادگاریں پسند نہ کرے۔ نوسر خواہ مشرقی جرمنی کتنا ہی کمیونسٹ کیوں نہ ہو جائے، وہ جرمنی ہے۔ ایک علیحدہ قوم۔ ایک علیحدہ نسل ہے۔

یہ عمارت ہرمن شائنر ہے۔ یہ ایک زمانے میں جرمنی کا سب سے بڑا ڈیپارٹمنٹل اسٹور تھا جہاں ہر طرح کا مال ملتا تھا اور اب صرف ملبا ملتا ہے۔ جنگ ختم ہوتے اتنے برس ہو گئے مگر ملبا جوں کا توں پڑا ہے۔ عبرت کے لیے کس

www.taemeernews.com

کی عبرت کے لیے۔ خود جرمنوں کی عبرت کے لئے۔ اللہ اکبر۔ ایک تازیانۂ مسلسل ہے کہ لگے جاتا ہے۔ ایک مستقل عذاب ہے کہ نازل ہوئے جاتا ہے شہر بھر میں عمدہ عمدہ عمارتیں شروع ہوگئی ہیں مگر حاکموں نے نمونے کے طور پر جگہ جگہ آثارِ جنگ برقرار رکھے ہیں۔ اس قوم کی قوت برداشت کا کیا ٹھکانا جرمن قوم خواہ مغرب کی ہو خواہ مشرق کی ایک بہت بڑی قوم ہے جو ہر وقت اپنی ذلت کے زندہ مناظر دیکھتی ہے اور کام کیے جاتی ہے۔

مگر اب۔ اِش بن ہنگرش (میں بھوکا ہوں)

"بیتے۔ بیتے" مادام دلجوئی فرماتی ہیں۔ بیتے کا مطلب ہے پلیز (PLEASE) جی۔ اچھا۔ بفرمائیے۔ ہاں ہاں۔ ارے بھائی مطلب وطلب چھوڑو اور ادھر دیکھو جدھر مادام اشارہ کر رہی ہیں اور یہ ایک چھوٹا سا ریسٹوران معلوم ہوتا ہے۔

www.taemeernews.com

مشرقی برلن میں مشقِ تمنا

"اش بن مسلم (میں مسلمان ہوں)

"کائنے شوائن (مجھے سور مت دینا)

مشرقی برلن کے ایک چھوٹے سے سستے سے ریستوران میں میری رہنما مغربی برلنی خاتون میری فصیح و بلیغ جرمنی پر حیران ہیں۔

"بتے۔" BITE بتے (جی ہاں۔ پلیز) جرمن خادمہ بار بار اثبات میں سر ہلاتی ہے۔

"ڈنکے شوئن" (بہت شکریہ) میں بڑے اطمینان سے کہتا ہوں اور مزید ٹانگ اڑاتا ہوں "فیلن ڈنکے" (بہت زیادہ شکریہ)

"آپ تو اچھی خاصی جرمن جانتے ہیں۔"

"آہم یس۔ نو۔ ایسی تو خاص نہیں جانتا۔"

میں نے انداز تو ایسا اختیار کیا تھا کہ ہاں ناں کا پتا نہ چلے اور میری زبان دانی کا بھرم رہ جائے مگر مادام کچھ تاڑ گئیں۔

"وائی گیمت از آئے نن" یکبارگی جیسے انھوں نے سر پہ ہتھوڑا مار دیا۔

میں مسکرایا مگر یہ طے نہ کر سکا کہ اثبات میں سر ہلاؤں یا نفی میں۔ پتا نہیں ظالم نے کیا پوچھا کیا کہا ہو۔ میرا ہاتھ بے اختیار جیب میں چلا گیا جس میں انگلش جرمن کتاب سیاحت رکھی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کی شرمندگی کے بعد میں نے کتاب نکالی صفحے الٹے اور جواب نکال لیا۔

"سپر گٹ۔ ڈنکے۔ انڈ اے نن"

www.taemeernews.com

وہ ہنسنے لگیں۔ انھوں نے پوچھا تھا آپ کا مزاج کیسا ہے اور میں نے جواب دیا۔

اچھا ہوں بشکریہ ۔ اور آپ کا مزاج کیسا ہے۔

"اب آپ مجھے جرمن سکھا دیجیے" میں سنجیدہ ہوگیا" اس کی آوازیں ذرا کرخت ہیں مگر زبان بڑی وسیع اور پیچیدہ معلوم ہوتی ہے۔"

"جرمن بہت بڑی زبان ہے۔ عربی کی طرح ہے۔ انگریزی جیسی آسان سپاٹ اور بے جان نہیں بلکہ عربی کی طرح وسیع المفاہیم، وسیع القواعد، نازک، گمبھیر اور جاندار ہے' اب دیکھیے نا...." انھوں نے جلدی جلدی مجھے کئی رمز سکھائے۔ جرمن قواعد کے چھوٹے چھوٹے ضابطے بتائے۔ ظاہر ہے کہ اپنی زبان (پاکستانیوں کے سوا) سب انسانوں کی سب سے بڑی کمزوری ۔۔۔ سب سے بڑی قوت ۔۔۔ ہوتی ہے۔

کھانا آنے میں دیر لگ رہی تھی "مشرقی برلن کے ریستوران سست ہوتے ہیں" میں نے نوٹ بک نکال کر تبصرہ لکھا

"مادام یوں تو زبان آنے سے رہی میں تو چند عمدہ عمدہ فقرے یاد کرنا چاہتا ہوں مگر اس کتاب میں دو چار فقرے لکھے ہی نہیں گئے۔"

مثلاً ۔۔۔ شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔"

"آپ بہت خوبصورت ہیں۔"

وہ شرما گئیں ۔۔۔ ایک دم سرخ ہوگئیں۔ وہ خوش شکل ضرور تھیں مگر ایسی نہیں کہ خاص ان کے لیے یہ فقرہ کہا جائے ۔۔ لیکن ایسی عورت ابھی کہاں پیدا ہوئی جو اس فقرے کا مخاطب اپنے آپ کو نہ سمجھے۔

"ڈنکے" انھوں نے دبی زبان سے کہا ۔۔ ڈنکے یعنی شکریہ۔

میں چند ساعت خاموش بیٹھا رہا۔ خادمہ آئی اور کھانا میز پر چننے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ مادام کھانے تک بھی تکلف کر رہی ہیں۔ مجھے ان پر ترس آگیا۔

"مادام آپ نے ترجمہ نہیں کیا؟"

"کا ہے کا۔"

"ابھی جو فقرہ میں نے بولا تھا یعنی آپ بہت خوبصورت ہیں۔"

"اوہ ۔ آئی ایم سوری۔ وہ جھکرا کر سنبھلیں۔" میں جواب دینا بھول گئی تھی۔ ہاں اس کی جرمن کئی طریقے سے بنائی جا سکتی ہے۔ اگر آپ نے یہ فقرہ سیدھے سادے طور پر کہنا ہے تو ترجمہ اور ہوگا اور اگر اپنی محبوبہ سے کہنا ہے تو دوسری طرح ہوگا۔ جرمن زبان میں خاتون کو بڑے ادب سے خطاب کیا جاتا ہے۔ انگریزی کی طرح

www.taemeernews.com

نہیں کہ پتا ہی نہیں چلتا عورت سے خطاب ہے یا مرد سے یا چاند سے یا سمندر سے یا پھول سے۔

مجھے ان کے اینٹی انگریز جذبات بہت پسند آئے کیونکہ کسی کو میرے اینٹی انگریز جذبات پسند نہیں آتے۔

(اسی لیے میں ہم خیالوں کو تلاش کرتے کرتے جرمنی تک پہنچ گیا ہوں)۔

"اچھا تکلف والا ترجمہ سنائیے"

"زی زینٹ زیرشوئن :"

"اور وہ پٹاخے والا یعنی جو فرفر بے تکلفی سے بولا جائے۔"

"ڈولِبست زیرشوئن" اس میں ڈو تو ہے تم اور آپ کے مقام سے بہت نیچا ۔۔۔ یا بہت اونچا۔

"آئی لو یو" (مجھے تم سے محبت ہے)

"کیا فرمایا اب کے وہ بدک گئیں۔

"آئی ۔ لو ۔ یو" میں نے مرغی کی ٹانگ تقریباً نگل کر کہا۔ میں ذرا بھی نہیں ڈرا جھجکی میں تو طالب علم ہوں۔

"آئی سی" وہ کھنکاریں۔ اُن کے چہرے پر پھر سرخی کی ایک لہر آئی مگر اس کا رنگ گہرا نہ تھا۔ وہ فوراً ہی گزر گئی۔

"دیکھیے اس کے بھی کئی انداز اظہار ہیں لیکن مجھ سے میرے شوہر جو کہتے ہیں وہ بتا دیتی ہوں" انھوں نے گویا تنبیہ کی کہ وہ شوہر والی ہیں" وہ کہتے ہیں۔ اِش لِی بے ڈِش :"

"اجی یہ بتائیے میں اپنی بیوی کو کس طرح خطاب کروں" میں نے نہلے پر دہلا مارا "دیکھیے میں ہر ملک سے اسی کی زبان میں انھیں آئی لو یو کا ترجمہ لکھتا ہوں۔"

"ہاں ہاں ۔۔ ویری گڈ۔ یہ کتنی اچھی بات ہے" انھوں نے جواب الجواب خوشی سے برداشت کرلیا۔

"انھیں بھی آپ وہی فقرے لکھ سکتے ہیں یعنی اِش لِی بے ڈِش :"

"ڈنکے" میں نے گرمجوشی سے شکریہ ادا کیا اور فقرہ نوٹ بک پر لکھ لیا۔ وہ کسی قدر سرد مہری سے کھانا کھانے لگیں۔ پھر اچانک انھوں نے بڑی نرم آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

"آپ کو بھی کوئی اور زبان آتی ہے :"

"مجھے ہاتھوں کی زبان آتی ہے۔ ریکھا کی زبان' پامسٹری" مجھے استادانِ فنِ سیاحت کے لکھائے ہوئے سبق یاد آگئے۔

"اوہ نو ۔۔" ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "کیا واقعی؟"

میں نے انکسار سے سر ہلا یا۔ اور اب ان کی عقیدت دیکھ کر مجھے پورا پورا یقین ہوگیا کہ میں واقعی پامسٹری جانتا ہوں۔

www.taemeernews.com

"اچھا تو کھانا بعد میں کھائیے گا صرف ایک بات بتا دیجیے۔ دیکھیے میرا ہاتھ اور صرف ایک بات بتا دیجیے" اُن کا اشتیاق بے تحاشا بڑھنے لگا۔

میں نے ان کا سیدھا ہاتھ میز پر کھول کر رکھا۔ وہ لکیریں ایسی ہی تھیں جیسی سب لکیریں ہوتی ہیں۔ فرق ضرور ہوگا کیونکہ لکھا ہوا ہے کہ دنیا میں کسی آدمی کے ہاتھ کی لکیریں بالکل دوسرے جیسی نہیں ہوتیں انگوٹھے اور ہاتھ کی لکیریں لیکن فرق پڑھنے کے لیے آدمی کو کچھ نہ کچھ جاننا بھی چاہیے۔

میں نے متفکر چہرہ بنا لیا اور ہاتھ پڑھوانے کے نفع نقصان پر ایک چینی مفکر کی طرح تقریر شروع کر دی۔

"آپ تو صرف ایک بات بتا دیجیے۔ میرے بچے کتنے جئیں گے اور کتنے مریں گے" انھوں نے بڑی سنجیدگی اور زور سے کہا۔

"ہائے بے چاری" میں نے سوچا ضرور اس کے دو چار بچے پورے یا کچے گئے ہیں۔ ممتا کی ماری" میرا دل بھر آیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ انھیں خوش آئند باتیں بتاؤں گا۔ میں نے پھر ایک مقدمہ باندھا یعنی ابتدائی تقریر کر کے چند زریں اصول وضع کیے۔ ہاتھ کی مٹھی بنوا کر چھنگلی کے نیچے پڑی ہوئی لکیریں گنیں اور پھر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"بولیے۔ جلدی بولیے" وہ گھبرائی ہوئی نظر آئیں۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں محترمہ۔ دنیا میں دکھ سکھ سب کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ آپ خدا پر یقین رکھتی ہیں تو جان لیجیے کہ وہی دیتا ہے اور وہی واپس لیتا ہے۔ کم از کم ہم مسلمان تو اسی عقیدے کے سہارے اطمینان کی زندگی گزارتے ہیں۔" میں نے تبلیغ بھی شروع کر دی۔

"اچھا تو بتائیے نا۔"

"آپ جانے والوں کا غم بھول جائیے۔ باقی بچے زندہ رہیں گے اور کامیاب زندگی گزاریں گے۔" اے لیجیے سارا مسئلہ حل کر دیا میں نے۔

"کتنے بچے رہیں گے، یہ تو بتا دیجیے۔ جناب میں نے تو سنا ہے کہ ایشیائی پیدائشی پامسٹ ہوتے ہیں۔" اب میری ایشیائی غیرت جوش میں آگئی۔ پچھتا کر میں نے مٹھی بند کرائی۔ پھر اس کی لکیریں گنیں۔ وہ سات آٹھ تھیں کچھ تیلی تیلی کچھ چھوٹی چھوٹی، تین لکیریں بہت واضح اور نمایاں تھیں مگر استادان فن سیاحت نے سب باتیں کہاں بتائی تھیں، میں پچھتانے لگا اور بڑی مشکل سے حواس جمع کیے۔

"ان شاء اللہ آپ کے تین بچے تو بہت لمبی عمر پائیں گے۔" میں نے اب بھی احتیاط برتی۔

www.taemeernews.com

"وہ کب پیدا ہوں گے ہرعالی؟"

"جی ۔"

"میں پوچھتی ہوں وہ پیدا کب ہوں گے کیونکہ میرے ہاں تو بچہ ہوتا ہی نہیں ۔" وہ کھی کھی کرکے ہنسنے لگیں اور انھیں ہنستے دیکھ کر کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی ایک بڑی بی بھی ہنسنے لگیں حالانکہ ہم انگریزی میں باتیں کر رہے تھے۔

"آپ کی شادی کو کتنے دن ہوئے؟"

"انیس برس"

"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟"

"وہ کہتے ہیں کہ آپ کے ہاں بچہ نہیں ہو سکتا۔"

"ان شوہر سے"

"کسی بھی شوہر سے۔"

"وہ غلط کہتے ہیں۔"

"میرے شوہر کے کئی بچے پہلی بیوی سے ہیں اور میرا ان شوہر کو چھوڑنے کا یوں بھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"آپ کی مرضی! مگر لکیریں تو کچھ اور کہتی ہیں۔ آپ خود پڑھ لیجیے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ ...."

"نہیں ڈیر ہرعالی! اگر آپ اجازت دیں تو میں بتاؤں کہ یہ لکیریں کیا کہتی ہیں۔"

"فرمائیے۔"

"یہ کہتی ہیں کہ آجکل ہرعالی کو اپنا گھر بہت یاد آ رہا ہے۔"

www.taemeernews.com

برلن ایک عالمی چیلنج

میں مادام کی نسائیت، شرافت اور ذہانت کو کبھی نہیں بھولوں گا۔ وہ میرے محترم ترین دوستوں میں شامل ہو گئی ہیں۔

مگر کیا یہ خالص جرمن واقعہ ہے۔ نہیں۔ یہ ایک عام انسانی واقعہ ہے۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ برلن میں پیش آیا — ایسا واقعہ کہیں بھی پیش آ سکتا ہے۔ لندن، پیرس، قاہرہ کہیں بھی، مگر میرے ساتھ برلن ہی میں پیش آیا۔ پتہ نہیں یہ ادب ہے یا نہیں۔ مگر ایک چھوٹی سی صداقت ضرور ہے اور سنا ہے کہ صداقت کے لیے زمان و مکان کی قید نہیں ہوتی۔

لیکن اس مکالمے سے ایک فوری فائدہ یہ بھی ہوا کہ مادام سے مراسم دوستانہ اور بے تکلفانہ ہو گئے ہیں۔ وہ جرمن سیاست پر میرے تلخ سے تلخ، مشکل سے مشکل سوال پر جملہ معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔ اپنی رائے بھی دیتی ہیں جسے میں زیادہ وقیع نہیں سمجھتا لیکن وہ اپنے اکابر کی رائے بھی نقل کرتی ہیں اور آپ جانیں اکابر تو اکابر ہی ہوتے ہیں۔ اکابر جمع ہے کبیر کی یا شاید اکبر کی۔ دونوں کے معنی ہیں بڑا۔ اکابر یعنی بڑے لوگ — بڑی حیثیتوں والے لوگ۔

ان میں ایک حیثیت والے صاحب ولی برانٹ بھی ہیں جو مغربی برلن کے میئر یعنی منتخب حاکم ہیں۔ ان کا ایک قول سنیے اور یہ قول زریں بھی ہے کیونکہ عام طور پر اہل اقتدار اپنے دور اقتدار میں بڑے لوگ سمجھے جاتے ہیں اور ان کے اقوال کو عام طور بھی اور بطور خاص نوکر شاہی کے مجھ جیسے کل پرزے اقوال زریں ہی کہتے ہیں، فرماتے ہیں۔

برلن ایک چیلنج کی حیثیت اختیار کر گیا ہے — ایک چیلنج نہ صرف برلن کے شہریوں کے لیے بلکہ دنیا بھر

www.taemeernews.com

کے ان شہریوں کے لیے بھی جن کے لئے آزادی اور حق خود اختیاری خالی خولی الفاظ نہیں بلکہ بامعنی اور زندہ عقائد کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

یہ بات بالکل سچ ہے، برلن والوں کو یقیناً اس کا حق ہے کہ اپنے انتخاب کیے ہوئے نظام سیاست کو اختیار کریں اور اپنے رسل و رسائل اور معاشی روابط باقی دنیا سے قائم رکھ سکیں' انھیں اس کا بھی حق ہے کہ مشرقی جرمنی کے وسیع سمندر میں جزیرے کی حیثیت رکھتے ہوئے بھی مغربی جرمنی سے اپنا وفاق چاہیں بلکہ اپنے شہر کو مغربی جرمنی یا پورے متحدہ جرمنی کا صدر مقام کہیں (جیسا کہ وہ کہتے ہیں) اور مزا یہ ہے کہ ساری مغربی طاقتیں بھی اس ملک کی ساتھی ہیں بطور خاص امریکہ تو برلن کے معاملے میں تیسری عالمی جنگ کے لیے بھی تیار رہتا ہے اور یہ یقیناً حق پرستی اور انسانی شرافت کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔

مگر اے جرمن اور امریکن اور سب مغربی حاکمو! کشمیر کا مسئلہ تو اس سے بھی زیادہ واضح اور صاف اور دردناک ہے۔ مغربی برلن کی آبادی ۲۲ لاکھ ہے اور کشمیر کی آبادی ۵۰ لاکھ۔ مغربی برلن ایک سمندر میں ایک جزیرہ ہے مگر کشمیر کی تین چوتھائی سے زیادہ سرحد اور علاقے پاکستان سے وابستہ ہیں۔ اس کے ثقافتی، تہذیبی، لسانی اور مذہبی رشتے پاکستان سے اتنے قدیم ہیں جتنا قدیم خود ہمارا برصغیر ہے۔ وہاں اقوام متحدہ آزاد رائے شماری کی ضمانت بھی دے چکی ہے۔ وہاں کے عوام کا مطالبۂ آزادی روز بروز زور پکڑتا جا رہا ہے۔ مگر کوئی بڑی طاقت اس کے لئے تیسری عالمی جنگ تو کیا ایک غیر عالمی ڈانٹ ڈپٹ کے لیے بھی تیار نہ ہوگی۔ یہ کیا تضاد ہے۔ ایک انسانی اصول جو یورپ کے ایک چھوٹے سے شہر کے معاملے میں تیسری عالمی جنگ کرا سکتا ہے، ایشیا میں جنگ رکوا بھی نہیں سکتا۔ کیا انسانی حقوق کے معاملے میں رنگ و نسل اور جغرافیے کا دخل آج بھی ہے — کم از کم اقوام متحدہ کے منشور حقوق انسانی میں تو ان امتیازات کا کوئی ذکر نہیں۔

اے میاں واہی ہوئے ہو۔ یورپ یورپ ہے۔ ایشیا ایشیا ہے۔ سفید رنگ اور بھورے رنگ اور کالے رنگ کا فرق ابھی بہت دن چلے گا۔ شاید چلتا ہی رہے گا۔ اس کے علاوہ علامہ اقبال بھی فرما گئے ہیں کہ:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

مگر علامہ اقبال تو ایسی بہت سی باتیں فرما گئے ہیں۔ تم پڑھتے اور سمجھتے تو ہو نہیں اور گھر چھوڑ کر بار بار لندن نیویارک اور واشنگٹن دوڑے جاتے ہو۔

آدما دام ایک بار پورے برلن کا چکر دوبارہ لگائیں گھونٹ گھونٹ کر کے پینے کا مزا اٹھا لیا اب ایک دم

www.taemeernews.com

اسے پی لیا جائے۔ آخری جرعے کا مزا بے تحاشا پن میں زیادہ آتا ہے۔

برلن دنیا کے سیاسی نقشے پر ایک دردناک عجوبے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک تو بھائی صاحب بٹے ہوئے ہیں دوسرے قانوناً اب تک کئی طاقتوں کے زیر نگیں ہیں۔ مشرقی برلن تو مشرقی جرمنی میں مدغم ہو کر چھوٹ گیا یعنی کمیونسٹ ہو گیا اور ایک بڑے مسئلے کا ایک جزو بن گیا ہے۔ مغربی برلن اپنی بے مثال خوشحالی اور دلفریبی کے باوجود قانوناً "چار بڑوں" کی تحویل میں ہے۔ ۱۹۴۵ء میں جو اعلانِ فتح ہوا تھا اس کی رو سے اس پر روس، امریکہ، برطانیہ اور فرانس کا اقتدار ہے۔ ایک مقام ہے مرکزِ اقتدار اس کے آگے اب تک چاروں ملکوں کے جھنڈے لہراتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ روسیوں نے قانوناً اقتدار ترک کر دیا ہے اور اب یہاں اس عمارت کے آگے ان کے اقتدار کی نشانی صرف ان کا جھنڈا رہ گیا ہے۔ عملاً یہ بھی ہے کہ اس انقلاب کے باوجود یہاں خود مغربی برلن والوں کی حکومت ہے یعنی وہ اپنا میئر یا حاکم خود منتخب کرتے ہیں جو آجکل ولی برانٹ صاحب ہیں جن سے کبھی کبھار پورے جرمنی کے لیے مستقبل کے وزیر اعظم ہونے کی امید کی جاتی ہے وہ یقیناً ایک قابل آدمی ہیں قابل اور محنتی لیکن ان کا ایک پیشرو یعنی مغربی برلن کا پہلا میئر ارنسٹ رائٹر ان سے بھی زیادہ قابل اور محنتی اور دردمند آدمی تھا۔ وہ جرمنی کی شکست کے فوراً بعد برلن کا میئر بنا۔ ایک بڑے خاندان سے تھا اور عالم فاضل آدمی تھا۔ اس وقت چار بڑی طاقتیں بڑی طاقت سے اس ایک شہر پر حکومت کر رہی تھیں۔ اسے کیا کیا دشواریاں پیش آتی ہوں گی۔ اس کی کیا کیا توہین کی جاتی ہوگی۔ اس سے کیا کیا کام لیے جاتے ہوں گے اور اس نے کس کس جتن سے ان بدنصیب شہریوں کو ان کے حقوق دلوائے ہوں گے ــــ دیکھیے یہ اس کی قبر ہے۔ ایک سادہ دلکش اور پرسکون مقام۔ میں ارنسٹ رائٹر کو نہیں جانتا تھا نہ اس کے خاندان کے کسی آدمی کو جانتا ہوں نہ اس کے فیلوشپ پر ہوں نہ ہوں گا لیکن میں آپ سے التجا کروں گا کہ اس فراموش شدہ جرمن کی قبر پر میرے ساتھ چند ساعت خاموشی سے گزاریے۔ جو سیاح آئندہ برلن جائیں وہ نائٹ کلبوں میں وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ والڈفری ڈوف ضرور جائیں۔ جہاں ارنسٹ رائٹر دفن ہے اس کے نام سے ایک گول چوک بھی منسوب ہے جس کے قریب مدرستہ الفنون بنا ہوا ہے۔

اور برلن والوں کی اصل ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانے کے لیے یہ فرشتۂ نصرت بھی دیکھتے چلیے۔ یہ یادگار ۱۸۷۰ء کی جنگ پرشیا و فرانس میں جرمن فتح کی یادگار ہے۔ مطلب یہ کہ جرمن بھی فاتح ہوتے تھے! انھوں نے اس صدی میں دو بڑی جنگیں ضرور ہاریں مگر وہ جنگیں جیتے بھی ہیں۔ جب پرانے برلنی اس شہر میں اپنی شکست کی یادگاریں دیکھ کر اس طرف دیکھتے ہوں گے تو ان پر کیا گزرتی ہوگی۔

لیکن جرمن قوم صرف جنگجو ہی نہیں ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فطرت میں:

www.taemeernews.com

عجم کا حسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں
کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ شاعری، مصوری، تعمیر، موسیقی کا شوق انھیں جنگ کے برابر بلکہ اس سے زیادہ ہے۔ برلن کی تعمیرِنو میں یاروں نے اپنے عظیم شاعر شلر کو فراموش نہیں کیا بلکہ اس کے نام پر ایک تھیٹر بنایا جبکہ پورے لندن میں کوئی معقول مرکزِ فن شیکسپیئر کے نام سے منسوب نہیں ہے۔ شلر پرانا شاعر ہے اور بڑا شاعر ہے مگر ہم کو شاعری سے صرف مشاعرے کی حد تک دلچسپی ہے کوئی یادگار وغیرہ بنانا فضول بات ہے بلکہ اگر کوئی غریب شاعر اپنا کنبہ بے آسرا چھوڑ کر مرجائے تو اس کے کلام سے مشاعروں میں لطف لینے والے اپنی کوئی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے۔ کیوں محسوس کریں، سب کام حکومت کو کرنا چاہیے۔ آگے چلو میاں برلن دکھاؤ برلن۔ مادام کی کوئی بات بتاؤ کوئی سنسنی خیز چٹپٹی بات یا کسی قہوہ خانے میں لے کر چلو۔ یا کوئی غزل سناؤ کیونکہ:

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحیِ مئے ناب و سفینۂ غزل است

مگر اب میں بھی اکتا گیا ہوں، میں تو سیاسی باتیں کروں گا اور وہ اس لیے کہ برلن یقیناً تیسری عالمی جنگ کا ایک امکان اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے۔

براندن برگ دروازہ —— مصنف اور ترجمان
یہ تصویر اس وقت کی ہے جب دیوارِ برلن بن گئی تھی۔

www.taemeernews.com

برلن کو وداع

ذرا آپ یہ تصویر دیکھیے۔ اس بورڈ پر انگریزی، روسی، فرانسیسی اور جرمن زبان میں لکھا ہے "اب آپ امریکی علاقہ چھوڑ رہے ہیں۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ آگے روسی یا مشرقی برلن علاقہ ہے۔ یہی تحریر مشرقی برلن کے ان مقامات پر نظر آتی ہے جہاں سے مغربی علاقے شروع ہوتے ہیں۔

اصل میں یہ بورڈ پر تحریریں صرف برلن تک محدود نہیں بلکہ پورے ملک جرمنی پر نقش ہیں۔ یا آپ مغرب میں داخل ہو رہے ہیں یا مشرق میں۔ یہ حصہ "آزاد" ہے اور یہ حصہ "غیر آزاد"۔ دونوں حصوں کا دعویٰ ایک ہی ہے — یہ کہ آزاد حصہ وہ خود ہے اور دوسرا سرمایہ داری کا تابع ہے یا اشتراکیت کا۔

(بات یوں بڑھی تو اس کی لپیٹ میں پوری دنیا آ جائے گی)

رہا میری رائے کا معاملہ تو ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں۔

میں تو صرف تاریخ کی ستم ظریفیاں دیکھتا ہوں۔ ستم ظریفی نمبر ا یہ کہ ایک اتنا طاقتور اور پورے کا پورا ملک کٹ پھٹ گیا۔ ملحقہ علاقے یعنی جرمن زبان بولنے والوں کی متصل آبادیاں تو ویسے ہی نکل گئیں خود اصل جرمنی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ستم ظریفی نمبر ۲ یہ کہ مغربی جرمنی اور مشرقی جرمنی میں سے قانوناً کوئی ملک آج تک آزاد قوم رکھنے والی دنیا کا رکن نہیں کیونکہ دوسری جنگ عظیم کے فاتحین نے آج تک مفتوح قوم سے قانونی طور سے صلح نہیں کی ہے۔ آپ نے بار بار پڑھا ہو گا کہ خروشیف صاحب مشرقی جرمنی سے معاہدہ صلح کی دھمکی دیتے ہیں تو امریکی صدر اسے تیسری عالمی جنگ کا خطرہ کہتے ہیں۔

ستم ظریفی نمبر ۳ یہ کہ برلن کو مغربی برلن والے اور مغربی جرمنی والے آج بھی پورے یعنی متحدہ جرمنی کا صدر مقام کہتے ہیں اور بون کو عارضی صدر مقام کہتے ہیں۔ ان کو امید ہے کہ ایک دن جرمنی متحد ہو جائے گا اور برلن پھر اس کا صدر مقام بن جائے گا۔ یہ امید پچھلے سترہ برس سے چلی آ رہی ہے اور مشرق و مغرب کی سرد جنگ

www.taemeernews.com

میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے مگر کوئی یہ نہیں بتاتا کہ مشرقی اور مغربی جرمنی کا اتحاد کیسے ہوگا ۔۔ اور اندازاً کب ہوگا کیونکہ اس اتحاد کے معنی یہ ہوں گے کہ اشتراکیت اور سرمایہ داری میں صلح ہو گئی ۔

چوتھی یہ کہ مغربی اور مشرقی جرمنی میں سے کوئی بھی اقوام متحدہ کا رکن نہیں جبکہ دس دس لاکھ آبادی والے ملک اس کے پورے یعنی رائے دہندہ رکن ہیں ۔ وجہ یہ کہ ابھی باضابطہ معاہدات صلح نہیں ہوئے ۔!

یہ تم ظریفیاں برلن میں گھومتے پھرتے ہر وقت سامنے رہتی ہیں ان کا ملا جلا تاثر ایک عجیب ایسے کو جنم دیتا ہے ۔ وہ ایسا غمناک ہے کہ میری طربیہ بازی گری بھی اس کے مطالعے پر مجبور ہو گئی ہے ۔

" مگر مادام ایک سیاح کر بھی کیا سکتا ہے " میں ایک بیکار سی آہ بھر کر اپنی مشرقی جرمن رہنما خاتون سے عرض کرتا ہوں ۔

" یہ بات تو نہیں ہے ۔ اگر آپ غور کریں تو آج ہر ملک کا شہری پوری دنیا کا شہری ہے یعنی اگر آپ حساس ہوں تو ۔" مادام بڑے اعتماد سے تبلیغ کرتی ہیں ۔

میں دل ہی دل میں ہنسا ۔ بھئی واہ ! حساس ہونے کی خوب رہی ۔ ایک تو خود کمیونسٹ سوسائٹی کی ہیں جہاں ذاتی پسند ناپسند کو اجتماعیت کے سمندر میں ضم ہو جانا پڑتا ہے پھر بات کر رہی ہیں اس حقیر فقیر سے جسے یوں بھی حساس ہونے کا حق حاصل نہیں ہے کیونکہ اپنے ہاں تو حساس ہونے کا رائٹ یعنی بنیادی حق یا بڑے آدمی کو ہے یا بڑے کاروباری کو یا بڑے افسر کو یا بڑے ایڈیٹر کو یا بڑے ۔۔۔ لوجی یہ تو نہ ہوتے ہوتے بھی بہت سے لوگ ہو گئے ۔

بہر حال حساس ہونے کا حق مجھے کسی طرح حاصل نہیں ہے کیونکہ خالی خولی حق تو کوئی چیز ہوتا نہیں ۔ حق وہ ہوتا ہے جس کا اظہار کیا جا سکے جس کا تحفظ کیا جا سکے اور جس سے پیدا شدہ مطالبات کو سوسائٹی یا معاشرہ تسلیم کرے ۔

پھر مادام بات یہ بھی ہے کہ ایک پرنالے کا جھگڑا ہمارے ہاں بھی چل رہا ہے جس پر نہ آپ کے وزیر اعظم اُل برخت صاحب کچھ فرماتے ہیں نہ برلن کے حاکم ولی برانٹ صاحب کچھ فرماتے ہیں نہ مغربی جرمنی کے وزیر اعظم ایڈنائر صاحب کچھ فرماتے ہیں اور آپ جانتی ہی ہیں کہ وہ معاملہ پچاس لاکھ آدمیوں کشمیریوں ۔۔۔ کی آزادی کا معاملہ ہے ۔

آئیے چالو باتیں کریں ۔

مشرقی برلن اور مغربی برلن کی خواتین میں کوئی فرق نہیں ۔ اصل میں خواتین دنیا بھر میں ایک جیسی ہوتی ہیں ۔ خوش شکل ۔ تندرست ۔ کمزور ۔ خوبصورت اور بہت خوبصورت ۔ اللہ بخشے والدہ مرحوم کا ایک قول اپنے

www.taemeernews.com

برادرِ بزرگ سے سنا تھا اُسے پلّے میں باندھ لیا ہے۔ فرماتے تھے کوئی جوان صحت مند عورت ۔ بدصورت نہیں ہو سکتی۔ عورت بدصورت ہوتی ہی نہیں یا جوان ہوتی ہے یا ادھیڑ یا بڑھیا یا کمزور اور بیمار۔

پس اے عزیز اگر مشرقی برلن کی خواتین اشتراکیت کے سبب سرخی پاوڈر زیادہ نہیں لگاتیں یا ایک ہی وضع کے موٹے جھوٹے کپڑے پہنے نظر آتی ہیں تو انھیں مغربی برلن کی رنگ برنگی چڑیوں کے مقابلے میں حقیر نہ جان کہ بہر حال وہ خواتین ہیں۔ یہ طریقہ امریکی اہلِ نظر کا ہے کہ عورت کا حسن اس کے سامانِ آرائش کے پیمانوں سے ناپتے ہیں۔

ادیبوں سے ملاقات ہوئی مگر اس کا بیان بور ہو جائے گا (گویا اب تک کوئی بیان بور نہیں ہوا ہے)

مجھے زیادہ اشتیاق ہرٹ فیلڈ سے ملنے کا تھا جن سے روس میں صحبت رہی تھی ــــ معلوم ہوا کہ بڑے میاں واقعی مشرقی جرمنی کے نہایت ممتاز ادیب ہیں مگر حضرت مشرقی جرمنی کے دار الخلافے لیپ زیگ گئے ہوئے تھے۔ فون پر پیغام آیا کہ دو دن ٹھیر جاؤ تو آتا ہوں ایک کانفرنس ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر ہم ٹھیرے مغرب کے آدمی نیت کتنی ہی نیک کیوں نہ ہو یار لوگ مشتبہ ہی گردانتے ہیں:

اور کچھ یہ ہے کہ مصلحت یار بھی نہیں

مغربی برلن کی تیز روشنیاں اور فرینکفورٹ جلد پہنچنے کا احساس کھینچ کھانچ کر پھر مغربی برلن لے آیا۔

"گٹن ناخت" (شب بخیر)

"ڈنکے۔ گٹن ناخت ہیر عالی" (شکریہ۔ شب بخیر)

چلتے چلتے میں نے پھر نوٹ بک نکالی۔

"وہ کیا ترجمہ کیا تھا آپ نے مادام۔ تو بہت حسین ہے جان والے فقرے کا؟"

"آوف ویڈرزین" مادام ہاتھ ملا کر مسکرائیں اور رخصت ہو گئیں۔ مجھے شبہ ہوا جلدی جلدی کتاب کے ورق الٹے۔ آوف ویڈرزین کا ترجمہ تھا "گڈ بائی پھر ملیں گے۔ اوہ یہ فقرہ تو میں جانتا ہوں۔

"آوف ویڈرزین" میں نے از خود کہا اور برانڈن برگ دروازہ کو پار کر گیا جس کے اس طرف آزاد دنیا اپنی لذتوں اور عذابوں کے انبار لیے سب آزاد بندوں کا انتظار کرتی ہے۔

مغربی برلن کے لطیفے:

یہ شہر قانوناً ابھی آزاد نہیں یعنی چار طاقتوں کا مطیع ہے۔ پھر بھی آزاد ہے کہ اپنا حاکم خود انتخاب کرتا ہے۔ ولی برانٹ صاحب حال حاکم برلن کے متعلق سب جانتے ہیں کہ وہ قانوناً ایک ناجائز بچے ہیں مگر اس سے ان کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

www.taemeernews.com

بھی کمال ہے اپنے ہاں جائز ناجائز تو بڑی بات ہے، جاگیردار یا سرمایہ دار یا اس کا بیٹا ہوئے بغیر الیکشن کا خیال تک حرام ہے۔

مغربی برلن قانوناً مغربی جرمنی کی حکومت میں شامل نہیں مگر مغربی جرمنی کی پارلیمنٹ میں اس کے بائیس نمائندے جاتے ہیں جو بحث کرسکتے ہیں مگر ووٹ نہیں دے سکتے۔

کمیونسٹ پارٹی پر مغربی جرمنی میں پابندی ہے لیکن مغربی برلن میں پارٹی موجود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ۱۹۵۸ء کے انتخابات میں اسے دو فیصد ووٹ ملے تھے مگر وہ وہاں قانونی طور پر تسلیم کی جاتی ہے۔

برلن میں کئی ہوائی کمپنیوں کے جہاز آتے جاتے ہیں۔ پان امریکن کی پروازیں ہر روز پچاس سے زیادہ ہوتی ہیں مگر خود جرمنی کی اپنی کمپنی لفت ہنسا کا جہاز برلن میں نہیں آسکتا۔ نہ وہاں اس کا دفتر موجود ہے۔

روس اور پورے اشتراکی یورپ کے لیے برلن کی اہمیت یہ ہے کہ وہ اشتراکیت کے میدان میں ایک مغربی قلعہ ہے مضبوط اور مسلح۔ اس کی اقتصادی حالت مغربی ممالک کی طرح چمکدار ہے، وہاں برطانیہ امریکہ اور فرانس ایک خطرناک قومی محاذ بنا سکتے ہیں جس کا اثر پورے مشرقی یورپ تک پہنچتا ہے۔

مغرب کے لیے برلن کی اہمیت ایک پیچیدہ مسئلے کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ جرمنوں کا کہنا ہے کہ اگر برلن ہاتھ سے گیا تو سارا جرمنی گیا۔ برطانیہ، فرانس اور امریکہ اسے سرد جنگ کا ایک اہم ترین قلعہ سمجھتے ہیں۔ یہاں انھوں نے مغربی جمہوریت کا تجربہ کرکے خاص اشتراکی آنکھوں کے سامنے ایک نئی دنیا بنا رکھی ہے۔ اُن کے اندازے کے مطابق ہر سال کوئی دو لاکھ سے سوا دو لاکھ تک جرمن مشرقی جرمنی سے بھاگ کر اسی راستے سے مغربی جرمنی پہنچتے ہیں۔ وہ پہلے مشرقی برلن آتے ہیں اور پھر زیر زمین ریل کے ذریعے اور کبھی کبھار سیدھے براندن برگ دروازے سے نکل کر مغربی برلن میں داخل ہو جاتے ہیں، یہاں سے انھیں چھان بین کے بعد مغربی جرمنی میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر نوجوان ڈاکٹروں، دانشوروں، انجینیروں اور اہلکاروں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جب کوئی بڑی کھیپ آتی ہے تو تمام مغربی ایجنسیاں بڑے اہتمام سے ان کا پروپگنڈا کرتی ہیں کہ دیکھیے صاحب وہاں کیا کیا مظالم ہو رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اب تک کوئی اسّی لاکھ مہاجر مشرق سے آکر مغرب میں آباد ہوئے ہیں۔ مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود مغربی برلن سے یار لوگ بھاگ کر مشرق میں جا پہنچے ہیں۔ سارا معاملہ روٹی کا ہے۔ مانا کہ مغرب میں چمک دمک کے ساتھ ملتی ہے۔ مگر کبھی کبھار اُدھر بھی بادِ بہاری چلتی ہے تو شہد کی مکھیاں اُدھر کا رُخ بھی کرلیتی ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں ایک دم پچاس ہزار جرمن مغرب چھوڑ کر مشرق پہنچ گئے تھے۔ بہرحال ماہرین کہتے ہیں کہ ان میں زیادہ تر وہ تھے جو پہلے مشرق کے باسی تھے مگر

www.taemeernews.com

غربت جن کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

برلن کا شہاب بھی منہ کھولے ہوئے سوال کی طرح نظر آتا ہے "میرا کیا ہوگا" وہ پوچھتا ہے اور اس کا جواب صرف تاریخ کے پاس ہے اور سنا ہے کہ جو پچھلی تاریخ کی کتابیں پڑھتے رہتے ہیں وہی اگلی تاریخ کی کتابیں لکھ سکتے ہیں۔

لہٰذا اب میں پورے برلن سے اجازت چاہتا ہوں۔ مجھے یہ شہر ایک خوبصورت بیوہ یا بے شوہر دوشیزہ کی طرح نظر آیا جسے اس کے بزرگوں کے گناہوں کی پاداش میں برہنہ سر کر دیا گیا ہے۔ مغربی حصّے میں امریکی دوستی کے تحائف کی بھرمار ہے۔ مشرقی حصے میں یہ تکلف بھی نہیں بلکہ روسیوں نے سیدھی سیدھی اپنی یادگار فتح بنا رکھی ہے۔ اور ۸ مئی کو قومی چھٹی کا دن مقرر کر دیا ہے کیونکہ ۸ مئی ۱۹۴۵ء کو جرمنی نے ہتھیار ڈالے تھے۔

گُٹن ناخت مائی ڈیر پورے برلن پتا نہیں تم کبھی ایک ہو سکو گے یا نہیں۔ بہرحال میں نے تمھیں خوب دیکھا اور گو بہت پسند کیا مگر بہت رنج بھی کیا۔ مجھے اپنے سیدھے ہاتھ کی آخری داڑھ کا غم ضرور ہے مگر وہ ایک نہ ایک دن ضرور ٹوٹتی یعنی اگر میں یہاں نہ آتا تب بھی ٹوٹ جاتی۔ ایک اتنے بڑے اور زندہ شہر کا اتنا بڑا اور زندہ المیہ اور ایک چھوٹے سے آدمی کی چھوٹی سی داڑھ یہ کوئی مثلث نہیں بنتی۔

بہرحال چلتے چلتے ایک یادگار اور دیکھ لیجیے۔ یہ یادگار خواہ کسی نے بنائی ہو کسی نیت سے بنائی ہو نہ تو روسی "طاقت و جبروت" سے معنون ہے نہ امریکی "دوستی" سے بلکہ ایک سادہ، دلکش اور صحیح معنی میں عظیم یادگار ہے۔ اس کے اندر مسلسل ایک شعلہ روشن رہتا ہے۔ اُسے ہم غریب سہمے ہوئے ایشیائی اُمید کی کرن کہتے ہیں مگر طاقتور یورپین روشنی کا مینار کہتے ہیں۔ اگر آپ غور سے اس تصویر کو دیکھیں تو شعلہ نظر بھی آسکتا ہے (بشرطیکہ تصویر اچھی آسکے) اس سفید پتھر پر تین لفظ لکھے ہیں :

"امن"

"انصاف"

"آزادی"

مغربی برلن سے رخصت ہوتے وقت یہ شعلہ میرے غریب بے حقیقت دل میں پہنچ کر روشن تر ہو گیا ہے۔

www.taemeernews.com

نشان اور تصویریں

برلن سے فرینکفورت۔ فرینکفورت سے ڈارمشٹاڈ۔ اور، اور.....

ابھی میں کئی شہروں کی سیر کرا سکتا ہوں۔ فرینکفورت۔ جہاں بے مثال تعمیرِ نو کے مرقعے اور شیشے جیسی سڑکیں ہیں اور شارع قیصر جس پر سورج چھپتے ہی تیس تیس روپے والی قلو پطرائیں:

اہلِ دل کے لئے سرمایۂ جاں ہوتی ہیں

اور ڈارمشٹاڈ جس کے چھوٹے چھوٹے سے باغ اور پتلی پتلی سڑکیں پرستانوں کا بنا دیتی ہیں اور دریائے رائن پر نرم رو بجرے اور کشتیاں جن میں بیٹھ کر ہر عالی یعنی مسٹر عالی حیات و کائنات کے اسرار پر غور فرماتے ہیں۔

مگر ابھی یوں چلیے کہ یہ پورا جرمنی ہے۔ جرمنی کو آپ کتنا جانتے ہیں یا میں ہی کتنا جانتا ہوں۔ انگریز نے جاننے ہی کب دیا۔ خود جرمنی نے اپنا تعارف کب کرایا۔ اس برصغیر میں اُدھر سے توپوں، بموں اور جنگجو طیاروں کی آوازیں بھی آتی رہیں جنھیں انگریز پروپگنڈے نے اس طرح بھیانک بنا دیا کہ کوئی جرمن قوم اور جرمن ملک کو سمجھنے ہی نہیں پاتا۔

لہٰذا پہلے یعنی ایک دم پورا جرمنی دیکھیے۔ پورے جرمنی کا مطلب فی الوقت مغربی جرمنی ہے۔ وہ جرمنی جہاں ہم آزادانہ آتے جاتے ہیں۔ وہ جرمنی جہاں میں یونیسکو کے اہتمام میں گھوما پھرا ہوں۔

یہ چوبیس ریاستی نشانات ہیں۔ ویسے آج مغربی جرمنی گیارہ ریاستوں یا صوبوں پر مشتمل ہے۔ مگر چلیے نشانوں کے چوبیس ہونے میں کوئی ہرج نہیں۔ نشانات اصل میں اردو ترجمہ ہے (بہت خوب کیا نئی بات بتائی ہے) انگریزی لفظ ہے کوٹ آف آرمس۔ انگریزوں کا کوٹ آف آرمس تو ہمیں پشتینی عقیدت کی وجہ سے زبانی یاد ہے یعنی آنکھوں کے حافظے کے علاوہ زبان کی نوک پر بھی محفوظ ہے۔ قصہ یہ ہے کہ قدیم یورپ میں ہر حاکم خاندان کا نشان الگ ہوتا تھا۔ یورپ ہی نہیں ایشیا میں بھی چھوٹے چھوٹے حکمراں خاندان اپنا نشان

www.taemeernews.com

الگ رکھتے تھے۔ بادشاہوں کے نشان، وزیروں، امیروں، صوبے داروں کے نشان۔ مگر اب بھی سب جمہوریت کے بڑے نشان میں آمیز ہوتے جاتے ہیں اور اس صدی میں نہیں تو اگلی صدی میں وہ وقت آنے والا ہے جب پوری دنیا کا نشان ایک ہو جائے گا اور اگر اس وقت میری بات مانی گئی تو وہ نشان ہوگا امن و آشتی کا صلح کا محبت کا۔ میں نے اس کا خاکہ بھی بنایا ہے مگر ابھی چونکہ کاپی رائٹ ایکٹ کا نفاذ نہیں ہوا ہے اس لئے اُسے ظاہر نہیں کر سکتا کبھی کیا پتا کون ملک چُرا لے۔ خود اقوام متحدہ ہی اسے اختیار کرلے۔ کیونکہ اقوام متحدہ کی عادت ہے کہ اِدھر اُدھر سے آئیڈیاز یعنی خیالات لے کر ان کے مصنّفوں کو بھول جاتی ہے۔

خیر فی الحال تو پوری دنیا کے مستقبل کی بجائے مغربی جرمنی کا پس منظر دیکھیے! ان چوبیس نشانوں کی اپنی اپنی تاریخ ہے جس سے آپ کو دلچسپی نہیں ہوگی میں نے پڑھی تب بھی دلچسپی نہیں ہوئی مگر ان سب کو دیکھنے سے اس قوم کے بارے میں ایک خاص جلال و جبروت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔

یہ وسطی نشان وفاقی جمہوریہ کا ہے۔ ایک کالے رنگ کا عقاب۔ طاقتور تیار عقاب۔ کچھ علما کہتے ہیں کہ علامہ اقبال اپنا شاہین جرمنی ہی سے پکڑ کر لائے تھے مگر اسے انھوں نے مشرقی اور اسلامی فلسفے کی غذا کھلا کھلا کر اس سے بہت مختلف بنا دیا ہے۔ میں نے ابھی تک وہ شاہین تو دیکھا نہیں۔ ہاں علامہ کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال سے فردر نیاز مندی رکھتا ہوں جنھیں ان کے عقیدت مند پیار سے بچہ شاہین کہتے ہیں اور میں احتراماً مسٹر طائر اف لاہوت کہتا ہوں۔ وہ ایک خوشحال خوش مزاج قسم کے شاہین ہیں۔ پلٹتے جھپٹتے اور جھپٹ کر پھر پلٹتے بھی ہیں مگر عقابی آوازوں یعنی فوں فوں شوں شوں کی بجائے شعر بھی سناتے ہیں لطیفے بھی بیان کرتے ہیں۔ عالم فاضل ہیں اور شاہینی میں انسانیت کا امتزاج پیدا کر جاتے ہیں۔

ویسے جرمن عقاب بھی موزاخت کی موسیقی، شلر کی شاعری، گوئٹے کی دانائی اور ہیگل کانٹ اور شوپنہار کے فلسفے کی غذائیں کھایا ہوا ہے۔ خالی خولی جھپٹے باز عقاب نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب پنجہ مارتا ہے تو اس کی گرفت لوہے سے زیادہ سخت ہوتی ہے اور یہ بھی الگ بات ہے کہ جب یہ گرفتار ہوتا ہے تو اس پر بڑے شدائد گزرتے ہیں اور یہ بھی الگ بات ہے کہ وہ بڑا سخت جان ثابت ہوا ہے۔

ان چوبیس نشانوں میں آٹھ نشان عقابی ہیں اور پانچ شیروں کے، باقی بھی طاقتور جانوروں کی شکلیں ہیں۔ گھوڑا بیچارہ دو جگہ نظر آتا ہے شاید یہ علاقے ہمیشہ دوسرے علاقوں کے باجگزار رہے ہوں گے اور حکام بالا کی سواری اور باربرداری کے لیے ان علاقوں سے گھوڑے جاتے ہوں گے۔ بہرحال گھوڑا عام حالات میں چستی اطاعت اور آسائش کا نشان سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے یہ علاقے زیادہ صلح مند معلوم ہوتے ہیں۔ بارہ سنگھے اور ارٹن

www.taemeernews.com

گھوڑے بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ ان سب نشانوں کے ملاپ سے جرمن قوم کا ایک خاص ہیولا اُبھرتا ہے شیر، عقاب اور گھوڑے کا امتزاج! ایک طاقتور جنگی دارچست اور سخت جان قوم۔ ایک عظیم قوم جو بقول علامہ اقبال؎

اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری

بس مشکل یہ ہے کہ سوسوا سو برس سے جنگ زیادہ چل رہی ہے۔ پورے جرمنی کے سلسلے میں ایک چھوٹے سے شہر کی ایک چھوٹی سی گلی بھی دیکھیے۔ یہ سڑک نئی ہے اور چھوٹی چھوٹی پکی اینٹوں سے بنائی گئی ہے جن پر چلنے کا لطف الگ ہے جو چلنے سے آتا ہے اور جو کوئی ساتھ ہو تو دوبالا ہو جاتا ہے۔ مگر اس وقت تو آپ یہ مکان دیکھیے۔ اس کے اندر کوئی باغ کوئی احاطہ نہیں تو باسیوں نے کھڑکیوں کے سامنے پھول اور بیلیں سجا رکھی ہیں۔ یہاں تک کہ سڑک کے کنارے بھی لکڑی کا ایک لمبا گلدان جما رکھا ہے۔ مگر مجھے شبہ ہے کہ آپ یہ سب نہیں دیکھ رہے ہیں۔ بلکہ بائیں ہاتھ کے کونے پر ان چار لڑکیوں کو دیکھ رہے ہیں جن کی صحت اور تازگی کو بصیرت کی آنکھوں سے دیکھ کر مرزا غالب نے (کلکتے میں) یہ مصرع فرمایا تھا:

طاقت ربا وہ ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے

یہ امن وسکون والا جرمنی ہے۔ ٹھنڈے مزاج والا جرمنی۔ خوبصورت سیدھا سادا جرمنی!!!

اور اس تصویر میں مناظر فطرت والا جرمنی ہے جہاں آنکھ حیرانیوں کے سمندر میں بار بار ڈوبتی ہے۔

ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

معلوم بھی ہے یہ کہاں کی تصویر ہے؟ یہ بلیک فارسٹ کا ایک حصہ ہے۔ بلیک فارسٹ یعنی کالا جنگل جس کی داستانیں جرمن اور انگریزی ادب کے ہزار ہا صفحات پر بکھری پڑی ہیں مگر ان میں کرسٹان کیلر والا چٹخارہ نہیں ہے۔ اس لیئے آپ کو پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ ویسے میں بلیک فارسٹ پر اتھارٹی یعنی ماہر کی حیثیت رکھتا ہوں۔ مگر یہ بتلانے سے کیا فائدہ کیونکہ ابھی مجھے بہت سے مولاسے بالا پسند نہیں کرتے اور تنخواہ کا معاملہ وہیں کا وہیں ہے۔

اور یہ مصوّروں اور نقشوں اور سنگ تراشوں کا جرمنی ہے۔ یہ شمالی جرمنی کا ایک گرجا ہے۔ گاتھک اور رومن فنِ تعمیر کا میل اسی کی شان وشوکت، تقدس اور خوبصورتی، اس کی روشنیاں، اس کا پرسکون ماحول چیکے چیکے جرمن توپوں، بموں اور جنگی طیاروں کی آوازیں دبا دیتا ہے۔ کم از کم میں یہاں ان سب آوازوں کو بھول گیا ہوں۔ اگر آپ اسے دیکھ رہے ہیں تو غور سے دیکھیے ورنہ نہ دیکھیے۔

www.taemeernews.com

اور یہ کوہستان ہرز کا شہر گوسلر ہے۔ شہر کیا ہے قصبہ ہے۔ ساڑھے تین ہزار فٹ بلندی پر ایک پرسکون محنت کش قصبہ جو ہزار برس پرانا ہے۔ یہ اونچا سا گنبد شہنشاہ کی گرمائی قیامگاہ ہے اور اس کے پیچھے چھوٹے چھوٹے گنبد گلڈ ہاؤس کہلاتے ہیں۔ جی ہاں۔ گلڈ ہاؤس۔ گلڈ کے معنی ہیں پیشہ وروں کی انجمن۔ اور ہم بھی پاکستان میں کئی گلڈ ہاؤس بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں (گو اب تک صرف دو بنائے ہیں) مگر گلڈ کا مضمون دوسرا ہے اسی لیے تو میں گلڈ کا لفظ یاد آتے ہی ذرا ابل پڑا۔ آخر جذباتی آدمی ہوں اور نہ جانے برف کو دیکھ کر جذبات پگھلنے کیوں لگتے ہیں۔ بات الٹی سہی مگر ہے سچ۔

کیا کبھی برف دیکھ کر آپ کے جذبات بھی پگھلتے ہیں۔!!

اور یہ قدیم جرمن رسم و رواج کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ وقت نے مشرق و مغرب میں لڑکیوں کے سر سے دوپٹے اور مردوں کے سروں سے ٹوپیاں اتار لی ہیں مگر:

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

۱۴۷۵ء میں کوئی شاہی شادی ہوئی ہو گی جس کا نام ہے "لینڈ اشٹ کی شاہی شادی" اب ہر تین برس کے بعد اسے ایک ناٹک کی شکل میں دہرایا جاتا ہے۔ قدیم لباس، قدیم گاڑی، سب کچھ قدیم ہے اور چہرہ کتنا نیا ہے، کتنا تازہ، کتنا دلکش۔ سادگی و پرکاری۔

اور یہ ایک دم نیا جرمنی نظر آتا ہے۔ یہ تصویر کپڑے کے ایک کارخانے کی ہے۔ اُلٹے ہاتھ کو کلیں لگی ہوئی ہیں۔ مگر چلانے والے نظر نہیں آتے کیونکہ وہ ہیں ہی نہیں۔ یہ سب مشینیں خود کار ہیں یعنی آٹومیٹک۔ افسوس میں نے الٹا ترجمہ کیا مگر بدقسمتی سے آپ آٹومیٹک سے زیادہ آشنا ہیں اور خودکار سے کم اور بھٹکے ہوئے آدمی کو گھر واپس آنے میں تھوڑی دیر ضرور لگتی ہے اس لئے نرم نرم چلیے اور آہستہ آہستہ سمجھیے کہ آٹومیٹک کا اردو ترجمہ ہے خودکار آپ ہی آپ کام کرنے والا۔ یہ مشینیں ایک بار بٹن دبانے کے بعد خود چل پڑتی ہیں۔ اور مقررہ اوقات تک چلتی رہتی ہیں۔ ان کی صفائی بھی خود بخود ہوتی رہتی ہے مشینوں کی دنیا میں یہ کارخانہ معجزے سے کم نہیں۔ اور امریکی ترقیات کا جواب یا مقابلہ ہے۔ یہ کارخانہ اس قوم نے بنایا ہے جو دو بڑی جنگوں کی پٹی ہوئی ہے، اور جس پر طرح طرح کے اتحادی ذات طرح سے مسلط رہے ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ جرمن فیکٹریوں میں مزدور نہیں ہوتے۔ بہت ہوتے ہیں مگر یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ ساڑھے پانچ کروڑ آبادی کے باوجود جرمنی میں مزدوروں کی کمی محسوس کی جاتی ہے، اسی لیے مشرقی جرمنی

www.taemeernews.com

گئے "مہاجرین" نہ صرف کوئی اسی لاکھ کی تعداد میں یہاں کھپ چکے ہیں بلکہ روز چلے آتے ہیں. فقط کارکن عورتیں نوّے لاکھ کے قریب ہیں کیا سمجھے ساڑھے پانچ کروڑ کی آبادی میں ایک کروڑ کارکن خواتین یعنی مزدور یا ملازم خواتین۔ خدا انھیں سلامت رکھے. پرسوں خالہ جان اپنے صاحبزادے سے بڑی آزردہ تھیں۔

"اے وہ کمبخت بے غیرت آدمی۔ توبوا۔ بیوی سے بھی کالج میں نوکری کرواتا ہے۔ سچ ہے یہ چودھویں صدی ہے۔"

سو اس چودھویں صدی میں جرمن نوّے لاکھ عورتوں سے نوکری کراتے ہیں تاکہ باقی دنیا کو قرض دے سکیں. نقد۔ اناج مشینیں علم اور عزم۔

یا اللہ میں چودھویں صدی کا آدمی کدھر جاؤں' ایک طرف تو خود کار مشینوں کی جلوہ گری کے ساتھ ساتھ جرمن دوشیزاؤں کے گلاب جیسے رخسار دیکھتا ہوں۔ اُن کی یونیورسٹیاں' ان کے ثقافتی مراکز' ان کی شاعری' ان کی سائنس دیکھتا ہوں اور دوسری طرف خالہ جان کی باتیں سنتا ہوں۔ اور خالہ جان کو چھوڑیئے خود علامہ اقبال جیسا مفکر فرما گیا ہے کہ:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

مگر برخوردار یہاں انھوں نے مشینوں کی حکومت کہا ہے مشینوں کی ضرورت نہیں کہا۔ مشینوں کی ضرورت سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بھی نظر آرہا ہے جو شے ضروری ہو وہی آخر میں حاکمیت بھی اختیار کرلیتی ہے مگر اس مسئلے کا حل شاید امریکہ میں ملے گا۔ جہاں پہنچنے میں چند ہفتے باقی ہیں۔

www.taemeernews.com

کون مارٹن لوتھر

"آپ عرب ہیں یا جاپانی؟"

"پاکستانی"

"وٹ از پاکستان، ویر از دیٹ" (پاکستان کیا ہے — وہ کہاں ہے)

میں بون سے فرینکفورٹ جا رہا ہوں اور ریل میں بیٹھتے ہی دو ذہین جرمن بچے میرے پیچھے لگ گئے ہیں۔ انھوں نے سوال تو بہت سادہ کیا ہے مگر:

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

"اچھا اب آپ لوگ مجھے بتایئے" میں اپنا خاصا طویل جواب ختم کرکے پوچھتا ہوں۔ "آپ لوگ ہٹلر کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟"

"وہ ایک چانسلر تھا اور اس کے زمانے میں ایک بڑی جنگ ہوئی تھی اور اس کے ایک ساتھی پر اسرائیل میں مقدمہ چل رہا ہے ہم ٹیلیویژن پر اس کی کارروائی دیکھتے ہیں۔ اوہ وہ بہت برا آدمی لگتا ہے ہمیں۔ آپ جانتے ہیں اسے۔ اس کا نام آئخ مان ہے۔"

"آپ لوگ نسر کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟" میں چند نوجوانوں کی طرف مڑ جاتا ہوں۔

ہماری قوم پورے سولہ برس پہلے اس سوال کا جواب دے چکی ہے۔ معاف کرنا مسٹر ہمیں آج ایسے سوال بہت بےاز وقت معلوم ہوتے ہیں۔" جرمن نوجوان کسی قدر برا مان گئے۔ میں پھر بچوں میں لگ گیا۔ ریل دریائے رائن کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی۔ رائن۔ بابا رائن۔ پرانا مہربان خوبصورت رائن جس کے ایک طرف نیچی نیچی پہاڑیاں جیتی ہیں اور ان کی چوٹیوں پر پرانے نوابوں اور جاگیرداروں کے قلعے اس بات کی یاد دلاتے ہیں کہ کبھی جرمن

www.taemeernews.com

لوگ بھی ایسے تھے جیسے ہم آج یعنی عام لوگ رائن میں کشتیاں چلا کر پیٹ پالتے تھے اور نواب لوگ قلعوں کے جھروکوں میں بیٹھ کر جرمن شرابیں پیتے تھے۔

"بچو تمہارا سب سے بڑا آدمی کون تھا۔"

"اوہ ہم ابھی بتائیں گے مگر کیسا بڑا آدمی۔ موسیقار، شاعر، سیاست داں یا بادشاہ" ذرا نو نو برس کے بچوں کی ذہانت ملاحظہ کیجیے۔ اپنے ہاں تو کسی سے بھی یہ سوال کیجیے تو پھٹ سیٹھ امر دیا سیٹھ حاتم جی کا نام لیا جائے گا۔

"ارے بھئی بڑا آدمی یعنی سب سے بڑا آدمی۔ عمومی طور پر بڑا آدمی" میں بن کر کہتا ہوں۔

"وہ تھا مارٹن لوتھر" بچے یک زبان ہو کر کہتے ہیں۔

اب میں آپ سے کیا عرض کروں کہ مارٹن لوتھر نہ تو سیٹھ تھا نہ نواب نہ جاگیردار نہ پیشہ ور سیاستداں نہ حاکم جرمنی۔ پھر بھی ان لونڈوں کی عقل ماری گئی ہے بلکہ ان کے بزرگوں کی عقل ماری گئی ہے جو ان معصوم جانوں کو ایسے سبق پڑھاتے ہیں۔

"ارے بھئی مارٹن لوتھر تھا کون" مغربی پاکستان کے ایک جاگیردار صاحب پوچھتے ہیں جو اس وقت تو ٹرین میں میرے ساتھ نہیں ہیں مگر ان کا ہیولا ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے اور وہ ہمیشہ ایسے ہی سوال پوچھتا ہے ایک بار اس نے پوچھا کہ ارسطو بڑا کہ ڈویژنل کمشنر۔ تاج محل بڑا کہ چیف انجینئر پی، ڈبلیو، ڈی۔ پتا نہیں کہ ایسے سوال مجھ سے کیوں کیئے جاتے ہیں جبکہ میرا جواب ظاہر ہے' میں تو ڈویژنل کمشنر ہی کو بڑا کہوں گا۔ بلکہ ڈپٹی کمشنر کو بھی ارسطو سے بڑا جانوں گا کیونکہ ارسطو مجھے سوا دو روپے میں ہر کتاب گھر سے مل سکتا ہے اور بیچارہ مجھے کچھ کہتا بھی نہیں، نہ میری تنخواہ سامنے رکھتا ہے نہ میری سماجی حیثیت دیکھتا ہے نہ میری سیاسی اہمیت کو تولتا ہے نہ یہ دیکھتا ہے کہ میں کس کا بیٹا ہوں یا کس کا باپ ہوں۔ بلکہ سوا دو روپے میں جو بات پوچھوں اس کا جواب دے دیتا ہے نہیں دے سکتا تو چپ ہو جاتا ہے — اگر مجھ سے خفا ہو جائے تو کچھ بگاڑ بھی نہیں سکتا۔ سالا بڑا آدمی کیسے ہو سکتا ہے۔

ہاں جی یہ جرمنی کا مارٹن لوتھر کون تھا۔ بتاؤ نا یار۔ وہ کس سیاسی پارٹی کا کرتا دھرتا تھا۔ اس کے کتنے بینک تھے۔ اس کے پاس کتنی فوجیں تھیں، کتنی فارن ایکسچینج دوسروں کو دے سکتا تھا۔ وہ کم از کم انکم ٹیکس افسر تو ہوگا۔ آخر تم خود بھی انکم ٹیکس افسر رہ چکے ہو اور سنا ہے کہ اس زمانے میں بڑے زوروں پر تھے۔" جاگیردار صاحب کا ہیولا یا ان کا بھوت دریائے رائن کے کنارے تیز جانے والی ریل میں میرا پیچھا کیئے جاتا ہے۔

ہاں بھئی مارٹن لوتھر صاحب اب آجاؤ میدان میں کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ مجھ جیسا ایک نیم خواندہ آدمی

www.taemeernews.com

جرمنی میں تمہیں جانے بغیر آرام سے گھوم پھر سکے۔

"مارٹن لوتھر ایک مصلح تھا۔ آپ کی زبان میں یعنی انگریزی میں اسے ریفارمر کہتے ہیں" نوجوان نے بتایا۔ میں ان کے اس اعلان پر بہت خوش ہوا کہ ہماری زبان انگریزی ہے۔ میرا دل غرور و افتخار سے معمور ہوگیا۔ خدا کا شکر ہے کہ ان جرمنوں پر ہمارا رعب باقی ہے۔ ڈاکٹر عشرت حسین عثمانی صدر پاکستان اٹامک انرجی کمیشن اس وقت ساتھ ہوتے تو باغ باغ ہوجاتے اور میری طرف آنکھ مار کر کہتے لو میٹا اب بولو تمھاری انجمن ترقی اردو کیا کہتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے والدین ضرور اردو بولتے تھے مگر وہ خود اُسے بوگس زبان سمجھتے ہیں اور چونکہ وہ بڑے افسر ہیں اور میں چھوٹا آدمی اس لیے جس بات پر وہ خوش ہوں میں بھی خوش ہوتا ہوں۔

"ہوا یہ کہ سولھویں صدی عیسوی میں صلیبی جنگوں کے دوران پادری لوگوں نے ایک عام معافی نامے کی تحریک چلائی تھی، جو لوگ مسلمانوں سے لڑنے جاتے تھے ان کے تمام گناہ زمین پر پہنچتے ہی معاف کردیے جاتے تھے۔ خیر یہ تو کوئی بات بھی ہوئی مگر معاملہ آگے بڑھا اور طے ہوا کہ جو جنگ کے لیے پیسے دے وہ بھی معافی نامے کا حقدار ہو جائے گا۔ چلو یہاں تک بھی بات سمجھ میں آتی ہے مگر پھر یہ ہوا کہ صلیبی جنگیں بند ہوگئیں۔"

نوجوان جرمن بتائے جاتا ہے اور میں سنے جاتا ہوں۔ اس بھولے بادشاہ کو معلوم نہیں کہ آج کا ایشیا سولھویں صدی کے جرمنی سے بہت آگے بڑھ گیا ہے، وہاں صرف معافی ناموں کی مارکیٹ قائم ہوئی تھی یہاں تقصیر ناموں کی مارکیٹ بھی قائم ہے یعنی ہمارا کاروبار پیچیدہ اور زیادہ پھیلا ہوا ہے۔

"پادریوں کے ایک اسقف اعظم نے یہاں تک کیا کہ معافی ناموں کو بڑے بڑے گناہوں کی معافی کے لیے بھی فروخت کردیا۔ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ کچھ گناہ چھوٹے ہوتے ہیں اور کچھ بڑے یعنی ناقابل معافی گناہ ــــ"

میں پھر چپ بیٹھا ہوں۔ "یہ بیچا بالکل پرانے زمانے کی باتیں کر رہا ہے ایک اتنے ترقی یافتہ صنعتی ملک کا باشندہ ہے اور دقیانوسی مسائل سنا رہا ہے۔ ابے کاہے کا گناہ اور کہاں کی معافی، دنیا اُن گھپلوں سے بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ خیر دنیا تو بڑی جگہ ہے میں اپنے وطن کی بات کرسکتا ہوں جو اصطلاحاً پسماندہ کہلاتا ہے۔"

"جب یہ باتیں ہوئیں تو مارٹن لوتھر کھڑا ہوگیا۔ اس نے کلیسا کی ان خرابیوں کے خلاف پچانوے اعتراضات لکھے اور اُن کی خوب تشہیر کی۔ ہمارے شہر وٹن برگ میں ۱۵۱۷ء کی ایک صبح اس نے اپنے اعتراضات لکھ کر بڑے گرجا کے آگے لٹکا دیے اور وہاں سے اصلاح کی وہ عظیم تحریک چلی جس نے جرمن فکری نظام ہی نہیں بلکہ پورے یورپ کا فکری نظام بدل کر رکھ دیا۔"

لیجیے جناب ایک نہ دو پورے پچانوے اعتراضات۔ یہاں آج تک ایک ہی کتاب لکھنے کے چکر میں ہیں،

www.taemeernews.com

صرف عنوان مدتوں سے سوچ رکھا ہے اور وہ ہے :

صرف ایک اعتراض

" اچھا جناب کیا اس وقت چھاپے خانے کا وجود تھا."

" جی ہاں جناب۔ ہمیں فخر ہے کہ فن طباعت جرمنی کے ایک باشندے یوہان گوٹن برگ نے ایجاد کیا تھا. وہ ۱۴۵۰ء تھا. ساڑھے پانسو برس پہلے."

بس یہ آدمی یوہان گوٹن برگ ہی تاریخ کا سب سے بڑا مفسد قرار دیا جائے گا. کیوں بھئی چھاپے خانے کی ضرورت کیا تھی. حاکم لوگ آرام سے حکومت کرتے تھے علم وحکمت پر پیشہ ور دانشوروں اور کلیسا کا قبضہ تھا. لوگ پیدائشی طور پر چھوٹے اور پیدائشی طور پر بڑے ہوتے تھے جیسے اپنے پیارے ہمسائے ہندوستان کے براہمنی نظام میں اب تک ہے۔ برہمن کا بیٹا برہمن اور شودر کا بیٹا شودر۔ اس چھاپے خانے کے چکر نے ہر کہ ومہ کو اپنی بات دوسرے تک پہنچا دینے کا موقع فراہم کر دیا نتیجہ یہ ہے کہ آزادی اظہار جیسا بوگس فلسفہ اور بھی تقویت پکڑ گیا۔ اور مزید نتیجے میں آزاد افکار والے لوگ پیدا ہونے اور مارے جانے لگے۔ نہ ہوتا بانس نہ بجتی بانسری۔ اب مشکل یہ آپڑی ہے کہ چھاپہ خانہ اس دور کا جزو حیات ہو گیا ہے اور آزادیٔ اظہار کا اصول ہر طرف کچھ ایسا رائج ہے کہ اس پر پابندی بھی اسی کے نام سے لگانی پڑتی ہے ۔

مائی ڈیر بات مارٹن لوتھر کی تھی ۔

مگر مارٹن لوتھر آزادیٔ افکار وآزادیٔ اظہار ہی کا نام ہے. یوں اس کے کارنامے بہت ہیں اس کے خیالات پر بڑے جھگڑے ہوئے. گروہ بن گئے. عوام اس کے ساتھ ہو گئے اور اپنے دوسرے مطالبے بھی سامنے لانے لگے۔ پھر ایک تیس سالہ جنگ ہوئی اور بہت سے فکری اور سیاسی انقلابات آئے' یہ سب تفصیل کتابوں میں موجود ہے. اصل بات وہی ہے آزادیٔ افکار کی بات' آزادی اظہار کی بات' خواہ وہ جرمنی میں دریائے رائن کے کنارے ہو' خواہ دریائے دجلہ کے کنارے جہاں امام ابو حنیفہ کو منصور عباسی نے آزادیٔ اظہار کے صلے میں مسٹری بنا کر رکھا تھا۔ یونان میں جہاں خود یونانی عوام نے سقراط کو زہر کا جام پلا دیا' خواہ ایشیا میں جہاں ......

نہیں جی یہاں سب ٹھیک ہے' سب فرسٹ کلاس ہے. تم مارٹن لوتھر کی بات کرو' بس یہی مناسب بھی ہے اسی میں خیریت بھی ہے. بال بچوں والے ہو نا. دیکھیے نا بھائی صاحب ہم ایشیائی آپ کو اتنا برداشت کرتے ہیں آپ کی عزت کرتے ہیں اور آپ ہیں کہ سر پر چڑھے جاتے ہیں. ہاں وہ دریائے رائن کا کیا ذکر تھا.

دریائے رائن کا ذکر تو کوئی نہیں تھا' میں تو چھاپے خانے کی بات سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ایک سیمینار

www.taemeernews.com

یعنی مذاکرہ منعقد کیا جائے جس میں چھاپے خانوں کا معاملہ دوبارہ اٹھایا جائے۔

یعنی ؟

یعنی یہ موضوع رکھا جائے کہ چھاپے خانوں کی ضرورت کس حد تک باقی رہ گئی ہے یعنی بل۔ واؤچر کیش بک رجسٹر حاضری اور نصابی کتابوں کے علاوہ اور کیا چاہیئے بھئی سچ بات ہے' میں تو یہی کہوں گا کہ اتنے سارے چھاپے خانے بالکل بیکار ہیں۔

خبریں کیسے معلوم ہوں۔

ریڈیو سنو۔

علم کیسے حاصل ہو۔

نصابی کتابیں پڑھو۔

باقی علم کیسے حاصل ہو۔

اس کی کیا ضرورت ہے۔

یا اللہ ایسے خیالات جرمنی میں کیوں آرہے ہیں۔ دریائے رائن کے کنارے ریل تیزی سے جاری ہے۔ سیدھے ہاتھ کو دریا میں کشتیاں' بجرے اور خاصے بڑے بڑے جہاز خراماں خراماں جاتے ہیں۔ مگر آج نظر ان پر نہیں جاتی۔ اُلٹے ہاتھ کو پہاڑوں کی چوٹیوں پر پرانے نوابوں کے بڑے بڑے خوبصورت قلعے بنے ہوئے ہیں۔ مگر وہ بھی جاذب نظر نہیں' خود اسی ڈبے میں وہ وہ پریاں بیٹھی چہلیں کر رہی ہیں کہ:

زفرق تا بقدم خندہ ہائے زیر لبی

نہیں جانتی تم شاعر وا عر نہیں ہو شاعر تو غالب تھے کہ چکنی ڈلی پر پوری غزل لکھ گئے' چکنی ڈلی کی بساط ہی کیا ہے' ایک کالی کلوٹی ڈلی اور یہ البیلی چکنی بھی ہیں اور ڈلیاں بھی ہیں اور ڈالیاں بھی ہیں اور جن کی جوانیوں کے جھونکے انھیں طرح طرح سے لہراتے ہیں مگر تمھارے نفس دماغ سے کوئی سوتا نہیں پھوٹتا۔ بھلا کہاں جرمن جوانی اور کہاں چھاپے خانے۔ لاحول ولا قوۃ۔

www.taemeernews.com

بلبے سے یہ ملک اٹھا

اے لو یہ فرینکفورٹ آگیا۔ کیا زبردست اسٹیشن ہے۔ مگر پلیٹ فارم اونچے ہیں۔ ٹرین سے اترنا کودنے کے مترادف ہے۔ قلی ولی بھی ندارد۔ یہ تیس سیر کا بکس کون اٹھائے گا۔ اسٹیشن کا دروازہ خاصی دور لگتا ہے۔ خیر:

ایں ہم اندر عاشقی غسم ہائے بالائے دگر

آسان ترجمہ یہ ہوا کہ یورپ میں سفر کرنا ہو تو سامان خود ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ اور اس کی تشریح یہ ہوئی کہ بوجھ اٹھاؤ کیونکہ فرینکفورٹ جانا ہے۔

فرینکفورٹ کا بان ہوف یعنی ریلوے اسٹیشن اندر باہر دونوں طرف سے بھول بھلیاں ہے۔

اس وقت میں سخت بھوکا ہوں اور کوئی رہنما ساتھ نہیں اور ایک بھاری بکس خود اٹھانا ہے جس اٹھانا ہی پڑا پلیٹ فارم شیطان کی آنت بن گیا۔ راستے میں کئی کئی بار ہاتھ بدلا۔ جب باری باری دونوں ہاتھ جواب دے گئے تو بے غیرت بن کر کاندھے پر رکھ لیا۔ آس پاس گزرتے ہوئے جرمن شرفا دیکھ کر آنکھیں نیچی کر لیتے تھے لڑکے اشارے کرتے تھے اور لڑکیاں ہنس ہنس کر دوہری ہوئی جاتی تھیں۔ میر تقی میر نے برسات نامے میں کیا خوب فرمایا ہے:

میر جی اس طرح سے آتے ہیں
جیسے کنجر کہیں کو جاتے ہیں

دیکھا آپ نے جس معاشرے کا آدمی خود کام کرنے کو عیب سمجھتا ہے جب اسے بہ مجبوری بوجھ اٹھانا پڑ جائے تو وہ اسے خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت نہیں کرتا بلکہ دو سو برس پہلے کے جاگیردارانہ شعور پہ دکھتا ہے۔ اس شعر کا ترجمہ یورپ والوں کے سامنے کیا جائے تو وہ ایشیائی زوال کی پوری تاریخ سے بھرے بیٹھے ہیں گے۔

www.taemeernews.com

پلیٹ فارم ختم ہوا تو ایک پورا بازار۔ پورا شہر سامنے آگیا۔ یہ اسٹیشن کا اندرونی حصہ ہے۔ ایک آدھ سے انگریزی میں بات کرنی چاہی تو جواب میں خاموش مسکراہٹ ملی:

ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

مگر اللہ اپنے صابر و شاکر بندوں کے علاوہ بے صبرے اور ناشکرے بندوں کی بھی مدد کرتا ہے۔ اس کے بندے ہم جیسے گنہگار بھی تو ہیں۔

"آئی۔ ایم۔ سوری۔ کیا آپ ہر حالی پاکستانی ہیں؟" ایک نوجوان صاحبزادے گویا سامنے سے اُچک کر بولے اور یہاں:

صدا جو آئی تو اُمید کی ہوا آئی

یہ حضرت بالکل نکروٹ تھے۔ طالب علم ہیں۔ اور جز وقتی رہنمائی وغیرہ کا کام بھی کرتے ہیں۔ مجھے لینے بھیجے گئے مگر تفصیل نامعلوم۔ لہٰذا بڑے دروازے پر کھڑے ہو کر ایک ایک سے پوچھتے تھے بھئی معاف کرنا اس وقت مصرع ہو گیا ہے:

اک اک سے پوچھتے تھے کہ حضرت کدھر گئے

یہ صاحبزادے کوئی بائیس برس کے ہوں گے۔ جوان رعنا، سرخ سپید، رنگ نہایت مضبوط نئی جرمن نسل کے نمائندے۔ ان کا نام ایپلرار بارڈ تھا یا ار بارڈ ایپلر تھا۔ بہرحال میں انھیں ایپلر کہنے لگا۔ ار بارڈ ان کے وزیر خزانہ کا نام بھی ہے اور وہ نام دہرانے سے مجھے بار بار احساس کمتری ہوتا ہے۔

"ٹیکسی" میں نے زور سے آواز دی۔

"نائن نائن" (نہیں نہیں) انھوں نے دخل دیا۔ "ہم ٹرام سے چلیں گے۔ میں آپ کا بکس ڈرائیور کے پاس رکھ دوں گا۔ ٹرام صرف پندرہ فی نکلے گی ٹیکسی پانچ چھ مارک لے مرے گی!" انھوں نے جرمنی پر ایک مبسوط لیکچر بھی دیا جو مجھے یاد نہیں ہوا۔ پھر میں نے دیکھا کہ انھوں نے میرا بکس تقریباً ایک انگلی سے اٹھا کر کھٹ سے ٹرام میں رکھ دیا۔ ان کی مستعدی کا یہ عالم تھا کہ اگر میں منظور کرتا تو دوسری انگلی سے وہ مجھے بھی اٹھا کر ٹرام میں رکھ دیتے مگر ان کی ہمت دیکھ کر میں نے بھی ہمت دکھائی اور از خود ٹرام میں سوار ہو گیا۔

یہ فرینکفورت ہے۔

شاید آپ کو معلوم نہیں (مجھے بھی معلوم نہیں تھا) کہ دوسری جنگ عظیم میں فرینکفورت کا پچاسی فیصد حصہ بالکل تباہ ہو گیا تھا یعنی تقریباً پورا شہر بالکل ملبہ بن گیا تھا لیکن شہر سے گزرتے ہوئے اس بات پر یقین نہیں

www.taemeernews.com

آتا۔ یہ ایک نہایت مضبوط، مربوط اور مصفا شہر ہے جس کی سڑکیں شیشے کی اور عمارتیں چاندی کی معلوم ہوتی ہیں۔ آج سردی زیادہ ہے لیکن سورج پورا نکلا ہوا ہے جس کی روشنی میں شہر چاند ستاروں کی طرح چمکتا ہے۔

"فرینکفورت دوبارہ کس نے بنایا۔ امریکیوں نے یا انگریزوں نے" میں پوچھتا ہوں مگر ہر اسپلر ایکدم برا مان جاتے ہیں۔

"اجی کوئی اور کیوں بناتا۔ خود ہم نے بنایا ہے۔ ایک پوری نسل تعمیر نو کی نذر ہوئی ہے جناب، اور واقعہ یہ ہے کہ بڑی سختیاں اٹھانی پڑی ہیں۔"

ہیں ہیں سختی کا نام نہ لینا ہر اسپلر میری جان تو ویسے ہی نکل جائے گی۔ تعمیر نو جائے بھاڑ میں۔ تم نے سخت کوشی یا محنت کشی کا نام لیا تو میرے ملک بھر کے صحافی اور دانشور مل کر تمہارا مذاق اڑا دیں گے۔

"اجی جناب ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۲ء تک جرمنی میں کوئی صرف دانشور نہیں تھا۔ کوئی صرف صحافی نہیں تھا کوئی صرف افسر نہیں تھا۔ سب مزدور تھے معمار، مستری۔ کارکن، محنت کش۔ جرمن قوم مر رہی تھی۔ جرمن قوم کو زندہ ہونا تھا۔ ہماری لڑائی مکمل موت سے تھی اور یہ لڑائی ہم نے بہت سخت جانی سے لڑی ہے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ آٹھ آٹھ برس کی بچیاں تک اینٹیں ڈھوتی تھیں۔ ستر ستر برس کے بڈھے زمین کھودتے تھے۔ آپ یہ بات نہیں سمجھ سکتے ہر حالی کیونکہ خدا آپ کی قوم پر مہربان ہے۔ آپ پر ایسا وقت نہیں گزرا ہے۔"

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور خاموش ہو گیا۔ مجھے چپکے چپکے فسادات کا زمانہ یاد آیا اور ہجرت کا زمانہ جب پاکستان بنا تھا اور جب پوری قوم پر اسی سے ملتا جلتا وقت پڑا تھا اور مجھے مہاجر کیمپ یاد آئے اور وہاں کام کرنے والے رضا کار اور مجھے منٹو کا افسانہ "کھول دو" یاد آیا مگر میں نے ہر اسپلر سے کچھ نہیں کہا۔

"ہاں یہ سچ ہے کہ ہم پر ایسا وقت نہیں پڑا ہے۔" میں نے بات ٹال دی۔

لطیفہ: ایک انگریز جنرل جدید جرمنی دیکھ کر لندن گیا تو چرچل سے لڑ پڑا۔ اس نے کہا جناب دیکھئے جرمنوں نے جنگ ہار کر کیسی تعمیر نو کی ہے اور ہم لوگ ابھی تک اپنے دھنوائے سیاہ مکانوں کو صاف کرتے رہتے ہیں۔ کاش برطانیہ اور امریکہ میں ایک جنگ ہو جائے اور برطانیہ ہار جائے تاکہ اس کے بعد امریکی روپے اور برطانوی محنت کے امتزاج سے ایک نیا برطانیہ پیدا ہو۔"

بڈھا چرچل مسکرایا اور بولا "بات تو ٹھیک کہتے ہو میں یہ بھی مان لیتا ہوں کہ امریکہ اور برطانیہ میں جنگ ہو سکتی ہے اور یہ بھی مان لیتا ہوں کہ امریکی روپیہ اور برطانوی عقل و محنت پورے انگلستان کی کایا پلٹ سکتی ہے مگر مجھے ایک بات کے بارے میں شبہ ہے۔"

www.taemeernews.com

" وہ کیا " جنرل نے بے صبری سے پوچھا

" مجھے اس کا یقین نہیں کہ برطانیہ جنگ ہار جائے گا " بڈھے نے سگار کا دھواں چھوڑ دیا۔
میں پورا فرینکفورٹ گھومتا ہوں ٹیکسی میں، بس میں، ٹرام میں اور پیدل۔ میں کارخانے دیکھتا ہوں جہاں عورتیں مردوں کے دوش بدوش کام کر رہی ہیں۔ میں اسپتال دیکھتا ہوں جہاں مریض شاہوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔ میں اسکول دیکھتا ہوں جہاں بچے تازہ گلابوں کی مانند نمو پاتے ہیں۔ مزدوروں کی بستیاں جو ہمارے افسروں کے محلوں سے زیادہ صاف روشن اور آرام دہ ہیں۔ ایک لائبریری میں کتب فروشوں اور ناشروں کا اجتماع دیکھا کوئی سخت جھگڑے کا مسئلہ تھا مگر کسی نے کسی کو گالی نہیں دی۔ بحث ہوئی رائے شماری ہوئی اور فیصلہ ہو گیا۔ یا اللہ یہ جرمن قوم کو کیا ہو گیا ہے۔ بھئی میلر جی نہیں مانتا۔

" یار ایپلر صاحب ایک بات پوچھوں "

" شوق سے "

" بھئی مجھے کچھ نازی دیکھنے ہیں۔ آپ برا تو نہیں مانیں گے۔ "

" ہی ہی ہی " ایپلر صاحب ہنسنے لگے ــــ ان کے دانت میلے تھے۔ کم از کم میلے نظر آ رہے تھے ملگجے سے ایک دانت غائب بھی تھا۔ " ارے صاحب نازی بحیثیت نازی اب کہاں رہے شکست کے بعد پارٹی ختم ہو گئی۔ لیڈر مر گئے یا بھاگ گئے یا ان پر مقدمہ چل کر پھانسی ہو گئی۔ اب تو عام جرمن ہیں یہی نازی تھے یہی جمہوریت پسند ہیں۔ آپ یوں دیکھئے کہ آج جو لوگ پچاس ساٹھ برس کے ہیں کل ان کی ایک اچھی خاصی تعداد نازی رہی ہوگی۔ بہر حال نازی بھی جرمن ہی تھے نا مگر آج ان کی نازیت کہاں گئی۔ کچھ بھی نہیں رہا۔ یہ تو لیڈروں کی بات ہوئی ہے۔ "

ہر ایپلر نے اپنے چہرے کے تاثرات کو نارمل یعنی متوازن رکھا مگر میں صاف دیکھ سکتا تھا کہ انھیں نازیوں کے ذکر سے دکھ ہوا۔ انھوں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور جلدی جلدی یعنی لق لق پینے لگے۔ پھر انھوں نے موضوع بدل دیا۔

" ہم لوگ سگریٹ زیادہ پینے لگے ہیں۔ یہ بری بات ہے مگر ہے۔ اب دیکھیے صرف ۱۹۵۹ء کے بارہ مہینوں میں جرمنی یعنی ہمارے وفاقی جرمنی میں چھ ہزار پانسو تیس کروڑ سگریٹ پیے گئے۔ "

" کیا اس سے آپ لوگوں کی اعصابی تھکن ظاہر نہیں ہوتی۔ "

" ہوتی ہوگی مگر آدمی بھی تو پانچ کروڑ سے زیادہ ہیں۔ دیکھیے جناب میں اعداد و شمار کا ماہر ہوں۔ میں آپ کو

www.taemeernews.com

یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ ۱۹۵۵ء میں امریکیوں نے کتنے سگریٹ پیے؟"

کتنے پیے:

"امریکہ میں چوالیس ہزار ایک سو کروڑ سگریٹ پیے گئے مگر یاد رہے کہ امریکہ کی آبادی کوئی بیس کروڑ ہے بھئی ان کی کیا بات ہے وہ تو صرف ایک سال میں گھوڑ دوڑ پر ہی دو ہزار پانسو کروڑ ڈالر خرچ کر دیتے ہیں۔

اسے لیجئے ایک قوم ایسی بھی ہے جو دو ہزار پانسو کروڑ ڈالر صرف گھوڑ دوڑ پر خرچ کر دیتی ہے اور پھر اس کے اراکین مقننہ غیر ترقی یافتہ ممالک کو دو دو سو تین تین سو ملین ڈالر امداد اور قرض دینے پر سو سو شرطیں لگاتے ہیں مگر خیر وہ دوسری کہانی ہے۔

"آیئے ناشروں کی انجمن میں چلیں۔ فرینکفورٹ اشاعت کا گھر ہے پہلے لیپ زیگ تھا مگر وہ مشرقی جرمنی میں چلا گیا تو اب فرینکفورٹ نے اس کی جگہ لے لی ہے۔

صدر انجمن ناشرین بھی اعداد و شمار سے مسلح نکلے۔

"صرف ۱۹۵۵ء میں ۲۵۴۷ جرمن کتابوں کا دنیا کی دوسری کتابوں میں ترجمہ کیا گیا ہے" انھوں نے ترجموں میں میری خاص دلچسپی دیکھ کر بتایا۔ "ہاں آپ کے ہاں ترجموں کی شرح کیا ہے؟"

مجھے رائٹرز گلڈ کے بلند بانگ دعوے یاد آئے قدرت اللہ شہاب کی دل بڑھانے والی تقریریں، اپنے اداریے، رپورٹیں اور مضامین اور بحثیں۔ مگر کسی پاکستانی کتاب کا نام یاد نہ آیا جس کا کسی بھی بیرونی زبان میں ترجمہ ہوا ہو۔ میں نے صاف جھوٹ بولنے پر کمر باندھ لی۔

"ابھی ہمارے ہاں اس کی ابتدا ہے"۔ میں نے بڑے سنبھلے ہوئے انداز سے گفتگو کی "میرا خیال ہے ہماری تین ساڑھے تین سو کتابوں کے ترجمے ہوئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ یورپی مترجمین ہماری زبانیں یعنی اردو اور بنگلہ نہیں جانتے حالانکہ انھیں ابھرتے ہوئے ایشیا کی بڑی زبانوں کو جلد از جلد سیکھ لینا چاہیے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ عالمی سیاست میں ایشیا کتنا اہم مقام حاصل کرتا جا رہا ہے"۔ میں نے ترجمے کے موضوع کو طاق پر رکھ کر عالمی سیاست میں ایشیا کے نئے مقام پر گفتگو شروع کر دی۔ مجھے معلوم تھا کہ کوئی خلیق یورپین اس موضوع پر دل شکن بات نہیں کر سکتا۔

"جی ہاں۔ جی ہاں۔ کیوں نہیں۔ ویسے تین سو ترجمے سال کا اوسط خاصا اچھا ہے۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں گا اگر آپ مجھے ان ترجموں کی فہرست بھیج دیں"۔ وہ کمبخت پھر جالے کی گفتگو پر اتر آیا۔ "حیرت ہے کہ جرمن زبان میں آپ کے ڈاکٹر اقبال کے علاوہ اور کسی کا ترجمہ مشہور نہیں ہوا یا شاید باقی ترجمے جرمن میں کیے

www.taemeernews.com

ہی نہیں گئے" اس بیچارے نے ایک موٹا سا رجسٹر نکالا۔ اور اُلٹنے پلٹنے لگا۔ مجھے ڈر ہوا کہ اب پکڑا جاؤں گا۔ یہ پٹھا کہیں انگریز ناشرین کی فہرستیں نکال کر نہ بیٹھ جائے۔

"جی بات یہ ہے کہ۔ آہم۔ آہم" میں نے اُسے متوجہ کیا۔ "ہمارے زیادہ تر ترجمے فارسی اور عربی زبان میں ہو رہے ہیں۔ ہمارا مذہب ایک ہے۔ ثقافت بھی بڑی حد تک مشترک ہے اور ہم ایک ہی علاقے کے لوگ ہیں آپ جانتے ہیں کہ ان عناصر کا بڑا دخل ہوتا ہے علمی معاملات میں۔"

"آہ یہ بات ہے۔" اُسے اطمینان ہوا اور اس نے میری توقع کے مطابق رجسٹر چھوڑ دیا۔ "جی ہاں یہ بہت مناسب ہے کہ آپ پہلے اپنی قریبی دنیا سے اپنے آپ کو روشناس کرائیں۔ اس میں کیا شک ہے۔" اس نے اخلاقاً بار بار اثبات میں گردن ہلائی۔ "مگر یہ بھی ضروری ہے کہ آپ یورپی زبانوں میں ترجمے بھی کرائیں۔ آج دنیا تیزی سے سمٹ رہی ہے اور جرمن زبان تو بطور خاص تمام زبانوں کے خزانے اپنے اندر سمیٹ لینا چاہتی ہے۔" اس نے بین اللسانی ترجموں کی اہمیت پر ایک بلیغ گفتگو کی اور میں نے بھی جواباً خاصی بلیغ گفتگو کی۔ میں نے وہیں یہ بھی طے کر لیا کہ اگر کسی جرمن مترجم نے میرے دوہے جرمن میں ترجمہ کئے تو میں رائلٹی وائلٹی کا مطالبہ بالکل نہیں کروں گا۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ میرے دل میں جرمن قوم کے لئے خیر سگالی کے بہترین جذبات ہیں اور اس نے مجھے یقین دلایا کہ اُس کے دل میں میرے دوہوں کے لیے بہترین جذبات موجزن ہو چکے ہیں۔ "جب آپ کو آپ کے ملک نے دنیا بھر میں گھومنے کے لیے انتخاب کیا ہے تو یقیناً آپ اپنے ملک کی ایک مانی ہوئی شخصیت ہوں گے۔ "نہیں نہیں انکسار نہ کیجئے" اس نے نہایت عمدہ یورپین اخلاق کا مظاہرہ کیا جسے میں نے شرماتے ہوئے قبول کیا۔ ہائے بیچارہ شریف جرمن اسے کیا معلوم کہ میں کس گھپلے سے آیا ہوں۔ اُسے یہ بھی نہیں معلوم کہ مجھ سے پہلے ایک عزیز احمد صاحب بھی اسی فیلوشپ پر آ چکے ہیں جنھوں نے ۱۹۴۲ء میں ایک افسانہ لکھا تھا اور شاید ۱۹۴۸ء میں ایک ناکام فلم بنائی تھی۔ مگر یونیسکو کا یہی فیلوشپ لے اُلٹے تھے۔ یہ ناول نگار عزیز احمد نہیں ہیں۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ غیر ناول نگار عزیز احمد ہیں جو اس علمی فیلوشپ کے بعد فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کی معتمدی فرماتے ہیں۔ ان کو دیکھتے ہوئے مجھے کچھ زیادہ شرمندہ ہونے کی ضرورت بھی نہیں مگر پھر بھی شرم اور خفت ہے کہ پیچھا نہیں چھوڑتی۔ بہر حال وہ اچھے دوست ہیں اور میں اچھا آدمی ہوں اور

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

مناسب یہ ہے کہ میں آپ کے چند اشاعت گھر بھی دیکھ لوں۔" میں نے التجا کی۔

www.taemeernews.com

"ضرور مگر کون سے۔ بات یہ ہے کہ اس وقت مغربی جرمنی میں کوئی ڈھائی ہزار اشاعت گھر ہیں یعنی باقاعدہ اشاعت گھر۔ اکا دکا کتابیں چھاپنے والوں کی تعداد معلوم نہیں اور کالج اور یونیورسٹیاں اس تعداد میں شامل نہیں مگر ٹھہریئے اگر آپ اجازت دیں تو میں خود چند اشاعت گھروں کا انتخاب کروں گا۔"

یہ بھی ہوا۔ اشاعت گھر بھی دیکھے مگر آپ کو ان میں دلچسپی نہیں ہوگی جس ملک میں کتاب ہی سے دلچسپی نہیں ہے اسے اشاعت گھروں کے بارے میں کیا بتایا جائے۔ اس لئے آپ فرینکفورت کی صدر مارکیٹ چلیے جس کا نام ہے ہوپ واخا۔ انگریزی تلفظ میں اسے ہوپ ویگ کہا جائے گا۔ ویگ کے معنی ہیں شاہراہ، چوک۔ ہوپ کے معنی پتا نہیں جرمن میں کیا ہیں فی الحال تو اسے انگریزی کا لفظ جان کر کام چلایئے۔ گویا اس جگہ کا نام ہوا۔ اُمید کا چوک۔ فارسی میں میدان امید۔

ہوپ واخا میں بیک وقت جرمن تعمیر، صفائی اور اقتصادی آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ کئی سڑکیں چاروں طرف سے آکر ملتی ہیں ٹرام کا جنکشن ہے۔ پٹریوں پر کھلے کیفے ہیں جہاں سردی کے باوجود یار لوگ بیٹھے کولڈ کافی پی رہے ہیں۔ الٹے ہاتھ کو ایک عظیم الشان عمارت ہے اس پر لکھا ہے۔ کاف ہاؤف۔ کاف ہاؤف پورے جرمنی میں ڈیپارٹمنٹل اسٹور کا ایک سلسلہ ہے۔ ڈیپارٹمنٹل اسٹور جیسی پاکستان میں کوئی چیز نہیں اس لیے یوں سمجھیے کہ ایک کئی منزل کی بہت بڑی دکان ہوتی ہے جس میں سب کچھ مل جاتا ہے۔ ایک نیا شادی شدہ جوڑا اس میں دو تین گھنٹے خرید و فروخت کرنے میں گزار دے تو تمام سامان خانہ داری لے کر باہر نکل سکتا ہے۔ ہلدی، مرچ، بیلن، کڑھائی، چولھے سے لے کر لباس، سامان آرائش، فرنیچر، زیورات، یہاں تک کے اپنی پسند کی موٹر بھی۔

ہر کاؤنٹر کے آگے لڑکیاں ہیں خوش مزاج، تیز طرار لڑکیاں۔ میں نے صرف وہی کاؤنٹر انتخاب کیے جہاں نقد دل کا سودا بھی ہو سکتا تھا۔ خدا کی شان کہ غالب کے یہی پڑھتے پھرتے دور دیس جرمنی میں:

تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

مگر اہلِ کرم بڑے سخت دل نکلے۔ بالکل تماشائے کرم نہیں دکھایا بلکہ لوٹ کھسوٹ بل بنانے لگے اس بٹوے کے بیس مارک۔ اس خوشبو کے تیس مارک۔

ساتھ ریستوران بھی ہے۔ خریداری کرتے کرتے تھک جایئے تو مشروبات سے دل بہلایئے۔ سامنے ٹیلیویژن لگا ہوا ہے۔ اے بھائی ایپلر صاحب تمھارے ہاں بھی ٹیلی ویژن ہے۔

ایپلر صاحب پھر برا ماننے لگے۔ "اجی مشرق وسطیٰ تک میں ٹیلیویژن ہے تو جرمنی میں کیوں نہ ہوگا۔ ہمارے

www.taemeernews.com

ہاں اس وقت چالیس لاکھ سے زیادہ ٹیلی ویژن سیٹ ہیں اور سوا چھ سو کے قریب ٹیلیویژن اسٹوڈیو بھی واہ ٹیلی ویژن کے بغیر بھی کوئی ملک مہذب ہو سکتا ہے۔ مگر ہاں یہ یاد رکھیئے کہ اس کی فیس عوامی ضروریات کو دیکھتے ہوئے بہت سستی رکھی گئی ہے یعنی کل ۵ مارک یعنی کل ساڑھے پانچ پاکستانی روپے مہینہ ہے اور پروگراموں میں زیادہ تر تعلیمی پروگرام ہوتے ہیں"۔ انھوں نے پھر اعداد و شمار کا بم میرے سر پر دے مارا۔ "نہ جانے ہمارے ہاں ٹیلی ویژن کا کیا حشر ہوگا" میں سوچنے لگا "سب سے پہلے تو قاعدے کے مطابق اس کا ٹھیکہ کسی بڑے نفع خور کو دے دیا جائے گا پھر وہ سیٹوں کی قیمتیں بڑھا چڑھا کر مقرر کرے گا پھر اسے امریکہ کی مثال دے کر کمرشیل یعنی تجارتی بنا دیا جائے گا۔ تعلیم برائے نام رکھی جائے گی اور زیادہ تر وقت یہ سننا اور دیکھنا پڑے گا:

آجا مورے بالما تیرا انتظار ہے

اور پاکستانی کنواریاں بجائے دلچسپ اطلاعات عامہ حاصل کرنے کے بڑے سوز و گداز سے اس بالم کا انتظار کیا کریں گی جس کا وعدہ ٹیلی ویژن روز کیا کرے گا۔ خیر یہ بھی دوسری کہانی ہے۔

www.taemeernews.com

فرالین۔ عظیم لوگ اور بخشش

ایپلر صاحب تھکنے میں نہیں آتے۔ نہ گھومتے تھکتے ہیں نہ بولتے تھکتے ہیں۔ نگران کی اطلاع رسانی اور طراری میرے لئے بالکل بیکار ہے۔ وہ مجھے کوئی ایسا ایشیائی سمجھے ہوئے ہیں جو علم کی تلاش میں ملک ملک گھوم رہا ہے۔ اب میں ان کو اپنی اصلیت کیا بتاؤں (آپ تو جانتے ہی ہوں گے) میں فرینکفورٹ دیکھ دیکھ کر کباب ہو رہا ہوں۔ اس کی شیشے جیسی سڑکیں میری آنکھوں کو طراوت بخشنے کی بجائے میرا کلیجہ کاٹے لیتی ہیں۔ کیوں بھئی ہم ایسی سڑکیں کیوں نہیں بنا سکتے۔ ہم ایسے شہر کیوں نہیں بسا سکتے۔ ہم ایسی کتابیں کیوں نہیں چھاپ سکتے کیا جرمن خدا کی خاص مخلوق ہیں۔ ان کے قد بھی ہم جیسے ہیں۔ ان کی بھی دو آنکھیں ہیں۔ دو ہاتھ دو پاؤں اور ایک دماغ ہے اور یہ تو اتنے پٹ بھی چکے ہیں پھر کیا بات ہے کہ ہم میں ان جیسی کوئی بات نہیں۔

تحت الشعور سے کئی جواب ابھرتے ہیں مگر کئی جواب خوف و تہدید کے طوفان میں بہہ جاتے ہیں۔ ایک جواب جو باقی بچا ہے وہ حاضر ہے وہ یہ ہے کہ جرمن مسافر اپنا سامان خود اٹھاتے ہیں۔

یہ گوئٹے اسٹراس ہے اور یہ گوئٹے ہاؤس۔ یہ مکان گوئٹے سے منسوب ہے۔ اسے جرمن حکومت نے محفوظ کر رکھا ہے۔ باہر کا دروازہ معمولی سا ہے۔ اندر کا سامان آرائش کچھ جدید کچھ قدیم۔ ناشرین کا ایک دفتر بھی یہیں واقع ہے۔ جرمن قوم گوئٹے کے نام پر جان دیتی ہے کیوں دیتی ہے یہ اسی سے پوچھنا چاہیئے۔ ہم تو غالب کو انڈین پوئٹ یعنی بھارتی شاعر کہتے ہیں۔ لے دے کے ایک اقبال ہیں سو ان کی یاد بھی سال میں ایک دو بار لاہور میں منائی جاتی ہے اور کبھی کبھی کراچی میں بھی جہاں غیر ملکی سفراء کو انگریزی زبان میں ان کی عظمت سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ اللہ بس باقی ہوس۔

بات یہ ہے بھائی کہ پاکستانی قوم کے ذرائع محدود ہیں اور ہنگاموں کے مرکز بے شمار۔ اتنے سارے تو وزیر ہیں۔ اتنے سارے عمائد اور اتنے سارے افسر اب لوگ کس کس کی عزت کریں کس کس کی یاد منائیں

www.taemeernews.com

کس کس کے نام پر وظیفے جاری کریں۔ بس یہ جو کچھ بھی ہوتا ہے بہت ہے۔ جرمنوں کی مثال دینے سے کیا فائدہ۔ انھوں نے تو لاکھوں روپے ہر سال صرف گوئٹے پر کام کرنے والوں کے لئے مخصوص کر رکھے ہیں۔ وہ گوئٹے کو اپنی تہذیبی زندگی کی ایک جاری و ساری قوت سمجھتے ہیں۔ ہم کسی کو بھی نہیں سمجھتے نہ سمجھنا چاہتے ہیں۔ بیچارے علامہ اقبال نے اسی گوئٹے سے غالب کا موازنہ کیا تھا:

آہ تو اُجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

مگر وہ بڑے آدمی تھے جو کہنا چاہا کہہ گئے کسی نے ان کی زبان نہ پکڑی۔ آج تو کوئی غالب کا نام لے کر دیکھے اور کچھ نہیں تو سرکاری دربار میں اس کی ملکی وفاداریوں کا سوال اٹھا دیا جائے گا۔ یو پی یا دھر کے ہیں نا۔ ابھی اپنا سابق وطن نہیں بھولے۔ ایسا ہی غالب عزیز تھا تو اسے چھوڑ کر یہاں کیوں آئے بھائی۔ نہیں صاحب ان حضرت کو نئی پاکستانی قومیت کا احساس نہیں ہے۔

اچھا تو اقبال کی بات کیجیے۔ اقبال کی بات۔ اس سے تمھیں کیا تعلق۔ اقبال ہمارا آدمی ہے۔ ہم جس طرح مناسب سمجھتے ہیں وہی کرتے ہیں۔ دو اکیڈیمیاں بنا رکھی ہیں ہم نے' سال کے سال ان کے جلسے میں جایا کر دیکیا کہا اس کے کلام کے علمی پہلوؤں پر کام کرایا جائے۔ آپ کون یہ کہنے والے' ہم جانتے ہیں اس کے علمی پہلو کیا ہیں' بس آپ سے جو کہا جائے وہ کیجیے ورنہ دلّی جا کر غالب کی قبر سے سر پھوڑ لیجیے۔

اے بھائی ایلر صاحب خدا کے لیے مجھے گوئٹے کے گھر سے جلد باہر نکالو اور اب شام ہونے کو آئی ہے بنا ہے فرینکفورت کی قیصر اشٹراس پر جرمنی کی چیدہ چیدہ کسبیاں گھومتی ہیں جن کی آغوش میں' گوئٹے غالب اور اقبال کے فلسفے موم کی طرح پگھل جاتے ہیں۔ یار و مجھے معاف کرو......

یہ فرینکفورت کی کائے سر یا قیصر اشتراس ہے۔ اشتراس گلی کو کہتے ہیں جسے ہماری پیاری سرکاری زبان انگریزی میں اسٹریٹ کہتے ہیں۔

جب سورج ڈوب جاتا ہے تو جدید اور تازہ دم فرینکفورت کی روشنیاں تاروں سے آنکھیں لڑانے لگتی ہیں۔ چوک جیب داخا ہو یا کوئی اور چوک یا سڑک یا گلی' وہاں دن اور رات میں زیادہ فرق محسوس نہیں ہوتا مگر قیصر کی گلی نسبتہً تاریک ہے یا شاید تاریک محسوس ہوتی ہے کیونکہ یہاں شام ڈھلنے کے ساتھ رنگین و معطر سائے اُبھرنے لگتے ہیں۔

ایلر صاحب اس بات پر بہت خفا ہیں کہ میں انھیں یہاں بھی ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔ پہلے تو انھوں نے

www.taemeernews.com

ایک مہذب یورپین کی حیثیت سے میری شام کے بارے میں مشورہ دینے سے احتراز کرنے کا فلسفہ سمجھایا پھر ایک معروف آدمی کی شبانہ مجبوریاں بیان کیں پھر کھل گئے "ارے صاحب یہاں بیماری لگ جانے کا امکان ہے"۔

مگر میں بھرے پر چڑھا ہوا ہوں میں نے انھیں نہایت بے شرمی سے بتایا کہ میں چیخوف، موپساں، گورکی اور منٹو سے کسی طرح کم نہیں ہوں۔ میں ایک زبردست ادیب ہوں اور ہر طرح کی زندگی کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں"۔

وہ بے چارے ڈر سے گئے۔

"مگر یہ منٹو کون ہے"۔ انھوں نے پوچھا

"منٹو ہمارا ایک زبردست ادیب تھا جو طوائفوں اور جنسی مسائل پر لکھتا تھا"۔

"مگر ہم نے تو اس کا نام کہیں نہیں سُنا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم نے غالب کا نام سُنا ہے۔"

"نہیں"۔

"میر تقی میر کا نام۔"

"نہیں۔"

"سر سید احمد خاں کا نام۔"

"نہیں۔"

"تو پھر کس کا نام سُنا ہے"۔

"مسٹر گاندھی کا جو نیم برہنہ رہتے تھے اور نظام حیدرآباد کا جس کے جوتوں میں لعل جڑے ہوتے ہیں اور مسٹر جناح کا جنھوں نے پاکستان بنایا۔"

"شکر ہے آپ اتنے نام بھی جانتے ہیں۔"

"مگر منٹو کون ہے۔ یقیناً وہ کوئی ادیب ہے"۔ انھوں نے دلچسپی ظاہر کی۔

"منٹو ہمارا وہ ادیب ہے جس کے تقریباً ہر افسانے پر مقدمہ چلتا ہے"۔

"وہ کس زبان میں لکھتا ہے۔"

"اُردو میں۔"

"اردو کیا ہے۔ آپ کی زبان تو انگریزی ہے نا۔"

"یہ آپ سے کس نے کہا۔"

www.taemeernews.com

"اجی یہ تو مشہور بات ہے جب سے ہمارے ملک کے تعلقات آپ سے بڑھے ہیں اور کاروباری ادارے آپ کے ہاں قائم ہوئے ہیں ہماری یونیورسٹی میں بڑا شور و غل ہوا کہ ایشیائی زبانیں سیکھنی چاہئیں چنانچہ ہمارے ہاں کچھ انجینئر داخل کیے گئے کہ بھئی یہ پاکستان جانے والے ہیں۔ انھیں وہاں کی زبان سکھائی" وہ لوگ کوئی دس دس مہینے پڑھائے گئے اور پھر آپ کے ہاں بھیجے گئے۔ پھر باقاعدہ کلاسیں کھولی گئیں کہ اب تو آنا جانا شروع ہو ہی گیا ہے۔ مگر ہوا یہ کہ ان میں سے چند آدمی چھٹیوں پر آئے اور ہم سے ملے تو انھوں نے کہا ہمارا سب وقت ضائع گیا۔ پاکستان کے لیے کوئی ایشیائی زبان سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہاں سب کام کے لوگ انگریزی بولتے ہیں جو مزدور لوگ بولتے ہیں وہ سمجھ ضرور لیتے ہیں۔

"تو آپ کے ہاں ایشیائی زبانوں کی کلاسیں بند ہو گئیں"۔

"نہیں تو فارسی، عربی، چینی اور جاپانی وغیرہ پڑھائی جاتی ہیں"۔

میں کچھ کہنے کو تھا کہ ایک تقریباً بارہ فٹ کا سایہ ایک دم میرے سامنے نمودار ہوا اور اس نے زور سے میرے منہ پر طمانچہ مارا۔ میرا گال سرخ ہو گیا۔ دوسرے لمحے میں اس نے میرے کوٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر قلم نکال لیا اور اسے بجلی کی سی سرعت سے ... انگلیوں میں دبا کر توڑ دیا۔

"کیا بات ہے ہر حالی! آپ کیسے دیکھ رہے ... "میرے کانوں میں ایپلر صاحب کی آواز ایسے آئی جیسے کوئی بہت دور سے پکار رہا ہو۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ان کی طرف رخ کر کے مسکرایا۔

"کیا بات ہے" وہ میرے چہرے کا رنگ دیکھ کر گھبرا گئے۔

"کوئی بات نہیں۔ ایک دیو میرا پیچھا کر رہا ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں ہمارے ایشیا میں دیو، جن، بھوت بہت ہوتے ہیں۔"

"آئی سی" وہ سمجھے ہوں گے میرے دماغ کی چولیں ہل گئی ہیں" تو کیا اس وقت آپ نے کوئی بھوت دیکھا تھا"

"جی ہاں میں اُسے پہچان نہیں سکا۔ شاید وہ نوکر شاہی کا دیو تھا ورنہ عام بھوت تو میرا قلم توڑ نہیں سکتے۔ اس نے میرے ایک طمانچہ بھی مارا ہے"۔

"اچھا" وہ اور بھی گھبرانے لگے۔ "مگر میں نے تو کوئی آواز نہیں سنی"۔

"ایسے طمانچوں کی آواز دوسرے نہیں سن سکتے بلکہ ایشیا میں اگر کسی کو ایسی بات بتائی جائے تو کہنے والے کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور لاتعلق لوگ بھی سن کر خوش ہوتے ہیں کہ اچھا ہوا اس سالے کے طمانچہ پڑا بہت بنا کرتا تھا"۔

ایپلر صاحب خاموش ہو گئے۔ وہ کچھ نہیں سمجھے میں بھی خاموش ہو گیا۔ کیونکہ اس سے زیادہ میں بھی نہیں

www.taemeernews.com

سمجھا سکتا۔ اگر یہی بات سمجھانے بیٹھ جاؤں تو اور بہت سی باتیں سمجھانے کا موقع بھی ہاتھ سے جا تا رہے گا۔

اے میرے محترم قاری آپ بھی کچھ سمجھے یا اب بھی نہیں سمجھے۔

قاری صاحب کا جواب :

کلام میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

" وانٹ کمپنی " (ساتھی چاہیے) ایک دخترکے برجستے پاس سے گزری مگر ٹھہری نہیں۔

" یاہ (یس ہاں) " میں تقریباً چلا کر بولا۔ وہ ٹھٹھک گئی۔

سامنے والے ریستوران میں فرالین ایلز بیتھ سے ایک زبردست مکالمہ پیش آیا۔ مگر ایلر صاحب نے ترجمانی کے فرائض انجام دیے اور مجھے تمام وقت شبہ رہا کہ وہ اپنی طرف سے بہت کچھ گھٹاتے بڑھاتے رہے شاید انھیں یہ بات بہت بُری لگ رہی تھی کہ میں جرمنی کا ایک تاریک رُخ بھی دیکھ رہا ہوں۔

فرالین مس کو کہتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ یورپ میں مس کا کنواری ہونا ضروری نہیں۔ مگر جب تک شادی نہ ہو مس کہلاتی ہے طلاق ہو جائے تب بھی اپنے باپ کے خاندانی نام سے منسوب ہو کر مس امک یا مس ڈھمک کہلاتی ہے۔ جرمن میں مس کا مترادف ہے "فرالین" اور شادی شدہ یعنی میڈم یا مادام کو فراؤ کہتے ہیں۔

" فرالین ایلز بیتھ میں آپ کو کیا پیش کر سکتا ہوں۔"

" بچاس مارک۔"

" اچھا اگر میں بیس مارک دوں تو کیا آپ آدھے گھنٹے یہاں بیٹھ کر کافی پئیں گی اور میرے سوالات کا جواب دیں گی۔"

وہ ہنسیں بلکہ کھلکھلانے لگیں " بھئی میرا وقت تو اتنا ہی ضائع ہوگا۔ اصل تو وقت کی قیمت ہے۔" انھوں نے اپنی رنگی ہوئی آنکھیں مٹکائیں جن پر ایلر صاحب اپنے زہد کے باوجود دزدیدہ نظریں ڈال رہے تھے۔

" اچھا تو گٹن ناخت یعنی شب بخیر" میں نے بے غیرت بن کر کہا۔ ہائے ننگ اسلاف اب تو نقد دل پیش کرنے سے تو رہا سودے بازی پر اتر آیا ہے۔

مگر فرالین ایلز بیتھ اٹھی نہیں بیٹھی رہیں۔ ہم نے باہر کی طرف دیکھا تو رنگ و بو کا طوفان پوری طرح آگیا تھا، انھوں نے سوچا مارکیٹ مال سے بھر گئی ہے اب یہ بیٹھا دوسری دکان دیکھے گا۔ وہ بیس مارک پر تیار ہو گئیں انٹرویو بوگس ثابت ہوا۔ ان کی کہانی عالمی کہانی نکلی یعنی وہ جو ہر جگہ سنی جاتی ہے، بہت سے ٹکڑے

www.taemeernews.com

جو اگر یہ نتیجہ نکلا۔

"میں دن میں بھی کام کرتی ہوں، مگر میرا باپ مفلوج ہے اور ماں بہت بوڑھی اور ایک بہن برابر بیمار رہتی ہے، حکومت سے جو پنشن ملتی ہے اس میں پوری نہیں پڑتی۔ پڑ سکتی ہے مگر میرا باپ شراب بہت مانگتا ہے، جنگ کا مارا ہوا بھی اور مختل الحواس ہے۔ بہن سرکاری اسپتال کے علاج سے اچھی نہیں ہوتی اس لئے اُوپر سے دوائیوں کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ میں باقاعدہ پیشہ ور نہیں ہوں۔ پولیس سے بھی ڈر لگا رہتا ہے، ہفتے دو ہفتے میں نکل آتی ہوں۔ پینٹ پاؤڈر پر کافی خرچ ہو جاتا ہے۔"

کہانی ختم ہونے پر مجاہد جرمنی ایبلر صاحب نے انھیں جرمن زبان میں بُری طرح ڈانٹا جس کا جواب انھوں نے بھی گرم لہجے میں دیا۔ ممکن ہے انھوں نے زیادہ سخت الفاظ استعمال نہ کیے ہوں کیونکہ جرمن لہجہ اور جرمن الفاظ ہم انگریزی بولنے والوں کو کچھ کرخت ہی لگتے ہیں۔ ان کی گفتگو سے ماحول میں ناخوشگواری آگئی۔ میں نے جلدی سے تیس مارک گن کران کے سامنے رکھے جنھیں وہ بٹوے میں رکھ کر پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئیں۔

"نہیں جناب ان کے پاس اس آبرو باختگی کا کوئی جواز نہیں"۔ ایبلر صاحب نے فیصلہ صادر کیا "بات یہ ہے کہ انسان کے ساتھ شیطان لگا ہوا ہے۔ ہر حال بس اس بات کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔"

میں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ کاش فراٹین ایلزبیتھ روانی سے انگریزی بول سکتیں۔ کاش میں ہرایبلر کو کاٹ دیتا۔ اس شخص نے میرا انٹرویو اور انٹرویو کے علاوہ ساری شام تباہ کر دی۔

"ویسے یورپ میں اخلاقی اقدار اس صدی میں بہت تباہ ہوئی ہیں۔ ہرایبلر نے لکچر دیا" اور یہ دو بڑی جنگیں بڑی حد تک ان کی ذمہ دار ہیں۔ اب آپ یہ دیکھیے کہ پہلی جنگ عظیم سے اب تک صرف یورپ میں سات کروڑ انسان اپنے گھر بار چھوڑ کر ہجرت پر مجبور ہوئے، ذرا سوچیے اس کا اثر ان کے ذہنوں پر کیا ہوا ہوگا۔ سُنا ہے آپ کے ہاں بھی تو آزادی کے وقت بڑے پیمانے پر ہجرت ہوئی تھی۔ آپ خود کہاں کے ہیں؟"

میں نے بات ٹالی "ہاں ہجرت ہمارے ہاں بھی ہوئی تھی" میں نے سرسری سا جواب دینا چاہا "مگر اب سب ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے کا کیا مطلب یعنی سب آباد ہو گئے ہیں؟"

"بالکل سو فیصد بلکہ میں تو مجلس قانون ساز کے اراکین سے اس مسئلے پر اپیل کرنے والا ہوں مگر خیر چھوڑیے وہ ہمارا مقامی قضیہ ہے۔"

"نہیں نہیں مجھے ضرور بتائیے، بات یہ ہے کہ میں خود موجودہ مغربی جرمنی کا نہیں بلکہ مشرقی حصے کا

www.taemeernews.com

مہاجر ہوں۔"

"بھئی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں کچھ لوگ ابھی تک اپنے آپ کو آپ کی طرح مہاجر کہے چلے جاتے ہیں اور طرح طرح کے مطالبے کرتے ہیں میں یہ تجویز پیش کرنے والا ہوں کہ ایک قانون بنایا جائے جس کی رو سے جو اپنے آپ کو بھولے چوکے بھی مہاجر کہے یا لکھے اُسے سرسری سماعت کے بعد توپ دم کر دیا جائے۔"

"توپ دم یعنی توپ سے باندھ کر اڑا دیا جائے۔ توبہ توبہ یہ تو نہایت قدیم اور وحشیانہ سزا ہے۔"

"میاں یہ سالے اس سے کم کسی سزا پر نہیں مانیں گے۔ تم ہم لوگوں کو جانتے نہیں بھائی ایپلر صاحب۔ چلو تم اپنا قصہ سناؤ۔"

"آپ خود کیا ہیں۔ آپ مقامی ہیں یا مہاجر"۔

"پہلے میں جرمن تھا۔ مگر اب پاکستانی ہوں۔ خالص سو فیصد متعصب اصلی تے وڈا پاکستانی مگر 'وہ' مجھے اب بھی برابر کے حصے والا پاکستانی نہیں مانتے۔ بلکہ دو فیصد پاکستانی مانتے ہیں۔ چلو یہی بہت ہے، تم اپنی بات کرونا۔"

"مگر یہ 'وہ' کون ہیں" ایپلر بھوت کی طرح میرے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے۔ ذکر ہونا چاہیئے فرینکفورٹ کا اور وہ پٹھا میری اصلیت کی چھان بین میں لگ گیا ہے۔ مجھے اس پر غصہ آنے لگا ہے مگر جرمن پر غصہ کرنا پٹھان سے جھگڑا مول لینے کے مترادف ہے۔

"اے بھائی خان بابا۔ اب 'وہ' کی تعریف نہ پوچھ کیونکہ،

اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

"ہاں تو کیا کہہ رہے تھے تم سات کروڑ یورپینوں کو اپنے گھر چھوڑنے پڑے"۔

"جی ہاں" وہ مایوس ہو کر اپنی معلومات کے دریا بہانے لگے" ابھی اور تو اور آپ یہی جان کر حیرت کریں گے کہ ابھی تک سابق جرمن فوج کے کوئی بارہ لاکھ سپاہی لاپتا ہیں یعنی نہ تو ریکارڈ کے مطابق وہ مارے گئے نہ قیدیوں میں واپس ہوئے۔ جبکہ ہمیں یہ تک معلوم ہے کہ ہمارے کوئی ایک لاکھ دس ہزار جنگی قیدی محض قید ہی میں ختم ہو گئے۔ اب آپ اندازہ لگائیے کہ ان معلوم و نامعلوم لوگوں کے خاندان ان کے اقرباء و بال بچے اس کربناک کیفیت سے آزاد نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے ملک کی تعمیر و ترقی میں کس طرح دل و جان سے مصروف ہیں"۔

"جبھی تو ہم آپ جرمنوں کو جنات کہتے ہیں۔"

www.taemeernews.com

ہر ایپلر کے چہرے پر دیر کی پڑی ہوئی شکنیں غائب ہوگئیں۔ انھوں نے ایک کافی اپنے خرچ پر منگائی۔
میں نے میز پر تہ کیا ہوا اخبار نکالا۔ بارہ صفحے کا جہازی سائز تھا۔

" اوہ یہ اخبار تو بالکل معمولی ہے۔" ہر ایپلر میں نیا جرمن پھر بیدار ہوگیا۔ "آپ کو معلوم ہے ہم لوگ اخبار کے بہت شوقین ہیں کیا آپ بھی ہیں۔"

" نہیں جی اخباروں میں ہوتا ہی کیا ہے ویسے ہمارے ہاں بھی کل ملاکر دس بارہ لاکھ اخبار چھپ جاتے ہیں۔"

" دس بارہ لاکھ۔ دس کروڑ آدمیوں کے ملک میں دس بارہ لاکھ کی مجموعی اشاعت؟ اُفوہ یعنی آپ کے ہاں خواندگی کا اوسط بہت کم معلوم ہوتا ہے۔"

" جی ہاں۔ ہمیں انگریزوں نے پڑھنے ہی نہیں دیا۔" میں نے اطمینان سے سب الزام انگریز کے سر تھوپ دیا۔

" ارے آپ کو آزاد ہوئے دس برس سے زیادہ ہوگئے پھر بھی یہ حال ہے۔ سُنیئے جناب۔ صرف مغربی جرمنی اور برلن میں پندرہ سو روزنامے ہیں جن کی کل اشاعت پونے دو کروڑ ہے۔ ساڑھے پانسو رسالے ہیں اور ان میں سے زیادہ تو ہفتہ وار باتصویر رسالے ہیں جن کی اشاعت ساٹھ لاکھ کے قریب ہے۔ مزدوروں کی انجمنوں کے رسالے الگ ہیں۔ نوجوانوں کی انجمنیں الگ پرچے اور رسالے نکالتی ہیں۔" ایپلر صاحب نے نوٹ بک نکال کر تقریر شروع کی اور اصرار کیا کہ میں بھی نوٹ بک نکال کر ان کی خرافات لکھوں۔ جو میں نے لکھی۔ مجھے یاد آیا کہ روس میں چار سو روزانہ اخبارات ہیں مگر روس کی آبادی بیس کروڑ ہے۔ جرمنی کی ساڑھے پانچ کروڑ۔ مگر پھر مجھے یہ بھی یاد آیا کہ پاکستان کی آبادی بھی تو دس کروڑ ہے میں نے جھنجھلا کر نوٹ بک جیب میں ڈال لی۔ ہر ایپلر برا ہی مان رہے تھے کہ یک بیک جھومنے لگے۔ ان کے چہرے پر ایک لازوال خوشی کی چمک چھا گئی۔ ان کی آنکھوں میں شہد سا چھلکنے لگا۔ ریستوران والے نے ریڈیو کھول دیا تھا اور کوئی میٹھی میٹھی گت بج رہی تھی۔

" یہ کیا ہے" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

" خاموش۔ خاموش۔" ایپلر نے مجھے انگلی کے اشارے سے منع کیا۔

" اگر آپ چند لمحے خاموش رہیں تو میں بہت ممنون ہوں گا۔ اس وقت موزارٹ کا نغمہ بج رہا ہے" انھوں نے اخلاقاً سرگوشی کی۔

میں نے دیکھا کہ ریستوران کا ہنگامہ ایک دم معدوم ہوگیا ہے اور لوگوں نے کھانا پینا تک چھوڑ دیا

www.taemeernews.com

ہے۔ ریستوران کے باہر قیصر کی گلی میں تقریباً تمام کسبیاں تماشبین اور راہ رو دروازے کے آگے ہجوم بنا کر کھڑے ہو گئے ہیں معلوم ہوتا ہے گویا کوئی ایسا کلام غیبی آسمان سے اُتر رہا ہو جس کا لوگ مدت سے انتظار کر رہے تھے۔

یہ دیکھ کر میں نے بھی اپنے چہرے پر مدحیہ اور احترامیہ جذبات طاری کیے۔

"موزاخت" میں نے سوچا" او ہو یہ وہ ہے جسے انگریزی میں موزارٹ کہتے ہیں۔ اٹھارویں صدی عیسوی کا موسیقار جو مدتوں، فاقوں اور بیماریوں کا شکار رہا ہے، اس کی موسیقی چڑھتے دریاؤں کو روک دیتی ہے۔

پھر میں نے سوچا کہ جرمن قوم ایسی محنت کش ہونے کے ساتھ ساتھ موسیقی کی کتنی دلدادہ ہے یعنی موسیقی کا شوق زندہ قوموں کے کام میں حارج نہیں ہوتا۔

ابھی میں اس موضوع پر سوچنے والا ہی تھا کہ پھر وہی دیو سامنے آکھڑا ہوا اور اس بار پھر اُس نے میرے اسی گال پر زوردار طمانچہ مارا۔ اب کے وہ بولا بھی۔

" تم بیکار آدمی" وہ زور سے چیخا "موزاخت وزاخت جیسے ڈوم ڈھاڑیوں کے بارے میں ہی سوچتا ہے یا کوئی کام کی بات بھی کرتا ہے۔"

فرینکفورت کے بازار عاشقاں یعنی قیصر کی گلیوں میں ایک مست سا ریستوران اور موزاخت کی موسیقی اور میں یہ کیا مثلث بنی — شاید بن جاتی۔ لیکن اس کا تیسرا کونا نہیں، یہ حقیر فقیر بہت کمزور ہے۔

جب وہ ریکارڈ ختم ہو گیا اور بقول کسے خلقت چھٹ گئی تو ہر اپیلر نے گویا ایک ابدی نشے سے چونک کر اپنی موٹی آنکھیں کھولیں۔

" آپ کو بھی موزاخت بہت پسند ہے نا" وہ پورے یقین سے بولے۔

" بہت۔ مگر افسوس آپ نے روشن آرا بیگم کا گانا نہیں سنا" میں نے بھانجی ماری اور پھر خود محجوب ہو گیا ارے میاں کہاں تک وطن پرستی کا راگ الاپو گے۔ تم نے روشن آرا بیگم کے لئے آخر کیا ہی کیا ہے۔ سرکار نے ایک خطاب دے دیا اور آرٹس کونسلوں کے جنٹلمین اراکین کبھی کبھار بڑے بڑے شہروں میں ایک آدھ جلسہ کر دیا کرتے ہیں۔ جب ان کی آواز ختم ہو جائے گی اور وہ گانے سے معذور ہو جائیں گی تو اگر کچھ جمع جوڑ ہے تو بری بھلی گزر جائے گی نہیں تو ان کے لواحقین افسروں اور وزیروں کے آگے پیچھے وظیفوں کی اپیلیں کرتے پھریں گے۔ اُستاد بندو خاں کا قصہ یاد ہے کہ نہیں۔!!

ہر اپیلر مجھے اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر ذرا حیرت زدہ نہیں ہوئے۔ وہ سمجھے کہ یہ شاید

www.taemeernews.com

موزاخت کی موسیقی میں مگن نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔

دوسری صبح مجھے وہ ایک گرجا میں لے گئے جو بالکل خالی تھا اور بہ اصرار باخ کا ایک نغمہ سنوایا۔ میں ایک گناہ گار مگر راسخ العقیدہ مسلمان ہوں لیکن باخ کی موسیقی میرے وجدان کو نہ جانے کن کن ان جانی پہنائیوں میں لے گئی۔ گرجا گاتھک طرز کا نہ تھا جس کی بلند دیواریں منقش محرابیں اور طاق عیسائی عقیدت مندوں کے بقول انھیں باخ کی موسیقی کے سہارے خدا کے حضور میں پہنچ جانے کا احساس دلا دیتے ہیں۔ یہ گرجا تقریباً جدید تھا۔ مگر قدیم بھی ہوتا تو شاید میرے لئے کوئی فرق نہ پڑتا۔ کیونکہ میرا تہذیبی تحت الشعور اس روش بندگی سے آشنا نہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اسپلر صاحب کے بقول باخ کی اعلیٰ ترین موسیقی عبودیت سے عبارت ہے اور اس کا مزا عبادت خانے میں دوبالا ہو جاتا ہے۔

باخ نہ صرف جرمنی بلکہ پوری مغربی دنیا کے عظیم ترین موسیقاروں میں شمار ہوتا ہے۔ دو سو برس گزرنے کے باوجود آج بھی اس کی عظمت اور شان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کی زندگی بڑی سادہ تھی اور دوسرے فنکاروں سے خاصی مختلف بھی تھی۔ عیالدار آدمی تھا۔ عبادت گزار محنتی اور باضابطہ۔ کافی ہاؤس والے جتنا بھی مذاق اڑائیں۔ وہ اپنی روزمرہ زندگی میں ایک معمولی آدمی رہا۔ ڈھیر سارے بچے پیدا کیے اور انھیں پالا۔ ایک بیوی پر قناعت کی جب شادی کے بیس برس بعد وہ مرگئی تو دوسری کی۔

اور وہ تھا کیا نہ صرف عظیم موسیقار بلکہ آج یورپ اور امریکہ میں جس طرح موسیقی کے نشانات لکھے جاتے ہیں ان کا موجد بھی تھا۔ پہلا آدمی جس نے موسیقی کو سائنٹیفک طریقے سے لکھنا شروع کیا۔ مگر یہ بات ہم نہیں سمجھ سکتے کیونکہ ہمارے ہاں یہ علم سینہ بسینہ چلتا ہے شاہد احمد دہلوی کا دعویٰ ہے کہ مشرقی موسیقی بھی لکھی جا سکتی ہے مگر نہ وہ اس دعوے کو ثابت کرتے ہیں نہ کوئی ہندوستانی ماہر فن کوئی کتاب شائع کرتا ہے، خیر یہ بقول کسے دوسری کہانی ہے۔

باخ کا اختتام ملٹن کی طرح ہوا۔ آخر عمر میں رتوندا آگیا۔ بینائی بہت کمزور ہوگئی تو ایک انگریز ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ اس نے آپریشن کیا تو بینائی بالکل ہی جاتی رہی اور اس کے بعد وہ چند ہی مہینے میں اس صدمے سے مرگیا۔ دیکھا آپ نے۔ یہاں بھی انگریز نے جرمن کا پٹڑا کر دیا۔ مگر خیر یہ بھی دوسری کہانی ہے۔

www.taemeernews.com

شہرِ ترقی لسانِ المانیہ

یہ ڈارمشٹاڈ ہے۔ فرینکفورت سے اشٹوگاٹ جاتے وقت بیچ میں ایک چھوٹا سا شہر جرمن لوگ اسے قصبہ کہتے ہیں مگر اس کی سڑکیں بھی شیشے کی طرح ہیں۔ یا اللہ سارے جرمنی کی سڑکیں شیشے کی طرح کیوں لگتی ہیں۔ مضبوط، مصفا اور چمکدار۔ شاید میرے اندر کی کدورت اتنی زیادہ ہے کہ باہر شیشہ ہی شیشہ نظر آتا ہے۔ مگر سنا ہے کہ جرمن سڑکیں بنانے میں یوں بھی مشاق ہیں۔ میں ریل سے آیا ہوں مگر راستے میں بار بار ساتھ دوڑتی ہوئی آٹوبان سے واسطہ پڑا۔ آٹوبان یعنی شاہراہ کا مطلب جرنیلی سڑک قسم کی چیز نہ سمجھ لیجیے گا جس پر ایک لاری اُدھر سے آئے تو دوسری لاری اِدھر سے کچے راستے یا کھڈ کے ذریعے گزرے گی۔ جرمن آٹوبان پر چار چار بلکہ پانچ پانچ بڑی موٹریں ایک ساتھ دوڑ سکتی ہیں۔ عام طور پر آٹوبان یک طرفہ ہوتی ہے یعنی انگریزی کی ون وے سڑک۔ دو سڑکیں ساتھ ساتھ ہیں ایک پر آمد اور دوسری پر رفت۔ رفتار ساٹھ میل سے کم کر دو تو پیچھے والے غصے میں ہارن بجاتے ہیں۔ آٹوبان نے جرمن تجارت، صنعت اور نقل و حرکت کو حیرت انگیز طور پر آسان اور تیز رفتار بنا دیا تھا اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ کس کا تحفہ ہے۔ ہٹلر صاحب کا۔ اگر آپ کسی پرانے جرمن کے تحت الشعور کا عکس لے سکیں تو وہ ہٹلر کو جتنا بُرا بھلا بھی کہے یہ ضرور کہے گا کہ ہٹلر نے ہمیں آٹوبان دی اور اس کا قصہ یہ ہے کہ ہٹلر نے تقریباً پوری قوم کو آٹوبان بنانے پر لگا دیا تھا۔ چھٹیوں میں لاکھوں طالب علم اسے قومی فریضہ سمجھ کر ادا کرتے تھے۔ اعلیٰ افسران تک یہ کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے کہ ہم نے فلاں آٹوبان کی تعمیر میں اتنی چھٹیاں صرف کیں۔ بائیں اعلیٰ افسر اور سڑک بنائیں ادھر میاں تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے افسروں کے لئے ایسی بات کہتے بڑا افسر کا کام تو صرف حکومت کرنا ہے۔

خیر تو یہ ڈارمشٹاڈ ہے۔ میں یہاں ایک اکادمی دیکھنے آیا ہوں جس کا نام ہے "ڈوئش اکادمی فر اسپراخ

www.taemeernews.com

انٹر نیشنز یوں سمجھیے کہ سابق انجمن ترقی اُردو ہند ہے۔ کہیں انجمن ترقی اردو پاکستان نہ سمجھ لیجیے گا۔ کیونکہ میں اس کے معتمد کی حیثیت سے جانتا ہوں کہ وہ بیچاری انجمن کتنی ہے، اور ترقی اردو کتنی۔ بہرحال یہ داکشٹاڈ کی اکادمی جرمن زبان و ادب کی رکھوالی ہے۔ اس کے معتمد صاحب انگریزی بالکل نہیں جانتے اور ترجمان ساتھ نہیں اس لیے ہم دونوں نے چار مرتبہ چائے پی اور کوئی دو دو سو بار مسکرائے اور انھوں نے بڑے پیار اور احترام سے نیچے کی سیڑھیوں تک آکر مجھے رخصت کیا۔ مگر میں وہاں سے ہوٹل آنے کی بجائے برابر کے ایک باغ میں چلا گیا جہاں بالکل سنّاٹا تھا۔

کبھی ایک شہزادے فان ہومن ہوا کرتے تھے۔ یہ سارا علاقہ ان سے معنون ہے اور باغ بھی۔ ابھی سردی گئی نہیں لیکن بہار نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیے ہیں۔ کہیں کہیں کچھ غنچے زور لگا کر شاخوں پر نمودار ہو گئے ہیں اور سرد ہواؤں سے مقابلہ کیے جاتے ہیں۔ باغ میں پتھر کی سخت سخت بنچیں بچھی ہوئی ہیں۔ دو چار کتبے بھی لگے ہوئے ہیں جو مجھ سے پڑھے نہیں جاتے۔ سامنے ایک ٹیلے پر اکادمی کی عمارت ہے۔ میں نے ایک بنچ پر سگرٹ سلگایا اور اکادمی کو دیکھنے لگا۔ لمحے بھر میں برلن کی اعصابی حدت، فرینکفورت کی جدیدیت اور دوسری جنگ عظیم کا پس منظر۔ اس باغ کی تنہائی اور اکادمی کے نظارے میں تحلیل ہو گئے اور چاروں طرف سے شیریں اور نرم نرم آوازیں آنے لگیں۔

"ارے بھولے ایشیائی مسافر یہ خطہ یہ ملک صرف جنگ کرنا ہی نہیں جانتا۔ جنگ تو سبھی قومیں کرتی ہیں سبھی قوموں نے کی ہے۔ مگر کیا کسی جدید قوم نے ایسے لوگ پیدا کیے ہیں جیسے جرمنی میں پیدا ہوئے ہیں۔"

اور پھر ایک ایک کرکے کئی ہیولے اکادمی کے چھوٹے سے گنبد پر اُبھرنے لگے۔

"یہ دیکھو یہ لوتھر ہے، مارٹن لوتھر جس نے عوام کو مذہب کے بارے میں سوچنا سکھایا اور جس کے پیرو آج جرمنی، فرانس، سوئٹزرلینڈ اور ممالک اسکنڈے نیویا میں پائے جاتے ہیں۔"

"اور یہ شلر ہے۔ فریڈرخ فان شلر۔ جرمنی کا شیریں دہن شاعر، اس کی شاعری اس سے بہت زیادہ خوبصورت ہے۔ یہ ہمارے دکھوں اور دردوں کا ایک مستقل مداوا ہے۔"

"اور یہ ایمانوئیل کانٹ ہے۔ انگریزی میں کانٹ جو فلاسفۂ عالم میں ایک بلند مقام کا مالک ہے اور یہ ہے اس کا ہم عصر دوست اور اس سے الگ سوچنے والا اعظیم ہیگل۔ جارج فریڈرک ہیگل۔ اور یہ ہیگل جس کے بارے میں تو علامہ اقبال نے کہہ رکھا ہے:

www.taemeernews.com

ہیگل کا صدف گہر سے خالی
ہے اس کا طلسم سب خیالی

" ہاں مگر بڑوں پر اعتراض بڑوں ہی کو زیب دیتا ہے۔ اقبال نے پہلے ہیگل کو پڑھا پھر اعتراض کیا۔ اس سے ہیگل کی عظمت میں فرق نہیں پڑتا کیونکہ اقبال خود فلسفے کا طالب علم ہے اور خود بڑا آدمی ہے۔"

" اور یہ ہے آرتھر شوپنہار۔ جسے لوگ قنوطیت کا فلسفی کہتے ہیں۔ مگر تین چوتھائی دنیا اس سے استفادہ کرتی ہے۔"

" اور یہ ہیں وہ حضرت فریڈرش ولیم نطشے، سپرمین یعنی مافوق الفطرت انسان کا تصور دینے والے فلسفی جن کی کتاب 'بقول زرتشت' سے تم اردو والے خوب واقف ہو۔"

" ہاں مگر ان کے بارے میں بھی علامہ اقبال نے فرمادیا ہے کہ :

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

وہ بھی ٹھیک فرمایا ہے مگر اس طرح اس سے ان کی دلچسپی اور اس کی اہمیت میں کمی نہیں آتی۔ اقبال اور نطشے دونوں عظمت انسان کے منادی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ نطشے انسان میں الجھ کر رہ گیا ہے، اقبال انسان کے خالق خدا تک پہنچ گیا۔"

" اور یہ ہے کارل مارکس۔ اشتراکیت کا باوا آدم جس کے متعلق خود اقبال نے کہا ہے کہ :

نیست پیغمبر ولے دارد کتاب

میں دم بخود ان ہیولوں کو دیکھتا ہوں اور مجھے نہ قیصر یاد آتا ہے نہ ہٹلر۔ قیصر جرمنی، مصنف جنگ عظیم اول' اور ہٹلر جرمنی، مصنف جنگ عظیم دوم، ان عظیم مفکروں کے سامنے کہاں ٹک سکتے ہیں۔ قیصر کا وقت بیس پچیس برس۔ ہٹلر کا وقت دس پندرہ برس۔ بلبلوں کی طرح اٹھے اور ختم ہو گئے مگر لوتھر اور گوئٹے اور شلر اور کانٹ اور ہیگل اور شوپنہار اور مارکس اور نطشے آج بھی زندہ ہیں اور موزارٹ اور باخ آج بھی تھکے ہوئے ذہنوں کو سرمدی نغمے سنا کر آرام دیتے ہیں۔ اور روح کو الوہی بلندیوں تک پہنچا دیتے ہیں۔

ہاں یہ اصل جرمنی ہے۔ فلسفیوں، ادیبوں، شاعروں، موسیقاروں کا جرمنی۔ محنت کش عوام کا جرمنی۔ تازہ گلاب جیسی نئی نسل کا جرمنی جو جنگ سے نفرت اور امن سے محبت کرتا ہے۔

میں شہزادے کے باغ سے نہایت شاداں و فرحاں چلا۔ دوپہر کا وقت ہو گیا تھا۔ پندرہ نمبر میں ٹرام لے کر ہوٹل پہنچا۔ یہ ہوٹل اسٹیشن کے بالکل سامنے واقع ہے ایک بہت ہی سستا اور آرام دہ اقامت

www.taemeernews.com

گھر جہاں کھانا بھی مل جاتا ہے۔ اس وقت میں بہت خوش تھا۔ میں ڈامشٹاڈ کا بہت ممنون تھا جس کی پرسکون فضاؤں نے روزمرہ کی سیاست، مشینی گڑگڑاہٹ اور جنگ جو جرمنی کے مہیب تصورات سے دور لے جا کر جیسے ایک میٹھے اور ٹھنڈے چشمے میں غسل دے دیا ہو۔

"جرمنی اچھا جا رہا ہے" میں نے سوچا "یہاں کوئی آدمی واقعی بیکار نہیں۔ یہاں اعداد و شمار میں بیکار وہ لوگ کہلاتے ہیں جو ایک ملازمت چھوڑ کر دوسری حاصل کرنے والے ہوں اور اپنے آپ کو امیدوار رجسٹر کرائیں۔ مزدوروں کی تو الٹی کمی ہے ایک زمانے میں تو اتنی کمی تھی کہ یورپ کے دوسرے ممالک سے مزدور لائے گئے خاص طور پر اٹلی سے اور کوئی ایک کروڑ مشرقی جرمنی کے مہاجرین جو آئے وہ بھی کھپ گئے۔ تمدنی زندگی میں اس کے شاندار ماضی کی جھلکیاں نظر آنے لگی ہیں۔ اس کی عظیم اور قدیم یونیورسٹیوں میں دنیا بھر سے علم کے متلاشی اپنے ذوقِ تجسس کی تسکین کرتے ہیں۔ بنیادی تعلیم مفت اور جبری ہے۔ اعلیٰ تعلیم آسان اور سستی۔ ملک بھر میں ساڑھے دس ہزار سے زیادہ عوامی کتب خانے ہیں جن میں ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ کتابیں موجود ہیں اور مذہبی کتب خانے الگ ہیں، وہ بھی کوئی گیارہ ہزار کے قریب ہیں اور ان میں چونسٹھ لاکھ کتابیں ہیں گشتی کتب خانے الگ چلتے ہیں۔ کیا سمجھے آپ ایسے کتب خانے جو گشت کرتے ہیں۔ بڑی بڑی بسیں جن میں ہزاروں کتابیں بھری ہوئی ہوتی ہیں، یہ بسیں چھوٹے چھوٹے گاؤں تک پہنچتی ہیں، کتابوں کی نمائش کرتی ہیں۔ کتابیں پڑھنے کو بھی عاریتاً یا قیمتاً دیتی ہیں۔ اور جیسے بس سنتے چلیے۔ بارہ فیصد طالب علم سائنس اور اقتصادیات پڑھتے ہیں۔ سائنسی تحقیقات کے سرکاری مراکز تین ہزار سے زیادہ ہیں صنعتی اداروں کے اپنے مراکز الگ ہیں۔ مگر سائنس نے فنونِ لطیفہ کا ذوق کم نہیں کیا۔ ملک بھر میں کم سے کم ساٹھ اوپیرا کمپنیاں قائم ہیں جب کہ ایک اوپیرا کمپنی کے لیے سیکڑوں تربیت یافتہ سازندے موسیقار اور فن کار ضروری ہوتے ہیں۔ ہر سال ایک جشن بیتھوون پورے ہفتے منایا جاتا ہے۔ اس میں موزارٹ اور واگنر اور رچرڈ اسٹراس کے عقیدت مند اور معنوی شاگرد اپنے اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس جشن بیتھوون کو ایک طرح مذہبی تہوار کی اہمیت و حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

اور تھیٹر کی سنیے، دو سو سے زیادہ تھیٹر تو باقاعدہ ہیں یعنی سارے سال چلتے ہیں، باقی شوقیہ تھیٹروں کا کوئی حساب نہیں، انھیں حکومت سے باقاعدہ امداد ملتی ہے۔ ایلر صاحب نے ہمیں لکھوایا تھا کہ پندرہ کروڑ مارک سالانہ یعنی تین کروڑ ساٹھ لاکھ ڈالر سالانہ تو صرف مرکزی امداد ہے۔ کیونکہ فلموں نے جب سے تھیٹر پر ہلہ بولا ہے، تھیٹر کی اقتصادی حالت پتلی ہو گئی ہے۔ چونکہ جرمن قوم اسے اپنی ثقافتی زندگی کا ایک جزو لاینفک سمجھتی ہے اس لیے اپنے خزانے سے اس کے اخراجات میں حصہ بٹاتی ہے۔

www.taemeernews.com

فلموں کی بات آئی تو ایک بے ربط سا قصہ سُن لیجیے۔ جاپان جو دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کا حلیف تھا اور بڑا نام مشہور تھا صنعت فلم سازی میں اتنا آگے چلا گیا ہے کہ ایک سال میں اس نے ۴۳۳ فلم بنائے جب کہ امریکہ نے کل تین سو بنائے تھے۔ بائی دی وے ہندوستان امریکہ سے کم نہیں ہے کیونکہ اس نے اسی سال ۲۹۲ فلم بنا ڈالے تھے۔

توجناب یہ وہ جرمنی ہے جسے میں دیکھ رہا ہوں ہنستا کھیلتا، گاتا ناچتا۔ کام کرتا، لکھتا پڑھتا جرمنی۔ ہٹلر کا جرمنی ختم ہو گیا۔ مجرموں کو سزائیں مل چکیں، تاوان ادا ہو چکے اور اب وقت ہے کہ اسے اس کا ماضی قریب بھول کر سمجھا جائے۔

مگر — اسی شام کو ڈامشاڈ کے چھوٹے سے ہوٹل میں تین امریکی، برطانوی اور روسی" دوستوں" نے جو ہنگامہ برپا کیا اس نے میری تمام خوش خیالی پر پانی پھیر دیا۔

www.taemeernews.com

آخ مان۔ سامراج اور مار پیٹ

اُس رات ڈامشٹاڈ کے سستے ہوٹل میں ایک خاصی ہنگی لڑائی ہوئی۔

مجھے کھانے کی میز الگ ملی مگر چار قریبی میزوں پر چار ساتھی الگ الگ بیٹھے تھے۔ ایک جرمن نوجوان ایک امریکی انجینئر۔ ایک انگریز ٹورسٹ جسے اردو میں سیاح کہا جائے تو ڈاکٹر عثمانی آف جوہری توانائی کمیشن اور میاں افضل حسین آف انجمنِ اردو جہاد سُن کر حقارت سے مسکرائیں گے اور کہیں گے کہ ٹورسٹ کے مقابلے میں سیاح کیسا گھٹیا لفظ لگتا ہے۔ چوتھا ساتھی ایک روسی تھا جس کے اصلی پیشے کا پتا نہیں چل سکا۔ کھانا شروع ہوا تو مجھے اپنے وہی رٹے ہوئے جرمن فقرے دہرانے پڑے۔

"کا ئنے شوائن" (سور مت دینا)

"اِش بن مسلم" (میں مسلمان ہوں)

"بیتے واسر" (مہربانی سے پانی دینا)

امریکی اور انگریز نے مجھے بڑی حقارت سے دیکھا۔ انگریز کی غضبناک آنکھیں میری طرف اٹھتی تھیں اور شاید یہ کہتی تھیں کہ ابے انگریزی جانتا ہے تو جرمن کیوں بولتا ہے ہم جو بیٹھے ہیں۔ امریکی بیچارہ کھلنڈرا آدمی کہاں تک برا مانتا وہ بھی میری طرح جرمن میں چیزیں مانگنے لگا۔ روسی بہادر کے پاس ایک زبردست کتاب نکلی جس میں ہر موقع کا فقرہ جرمن میں لکھا ہوا تھا سو وہ بھی جرمن بولتے تھے۔

نتیجے میں ہوٹل والوں نے اس خاکسار کی خدمت سب سے زیادہ کی۔ ایک خاتون خادمہ تو اتنی مہربان ہوئیں کہ رعایتی نرخ کی پیشکش فرما دی۔ مگر شرفِ قبولیت کیسے وہ دوسری کہانی ہے۔

سامنے ٹیلیویژن پر پہلے کوئی خالص جرمن موسیقی کا پروگرام یعنی زندہ ناچ گانا ہوا اور پھر ایک دم

www.taemeernews.com

تمام کمرے پر ایک عجیب سکوت چھا گیا۔ ہم سب کھانا چھوڑ کر سامنے دیکھنے لگے۔
وہ آئخ مان کے مقدمے کی کارروائی تھی۔

اسرائیلی عدالت۔ آئخ مان۔ وکیل ترجمان۔ اخباری نمائندے۔ تماشائیوں کا ہجوم۔

میں نے دیکھا کہ جرمن نوجوان کے چہرے پر ایک رنگ آتا ہے اور ایک رنگ جاتا ہے۔ امریکی بے نیاز سا ہے۔ انگریز بڑے غور و انبساط سے متوجہ ہے اور روسی نہ کھانا چھوڑتا ہے نہ تماشا۔

یہ کارروائی کسی خصوصی انتظام کے تحت دکھائی جا رہی تھی کئی دن سے دکھائی جا رہی تھی۔ ایک جرمن کے خلاف مقدمہ خود جرمنی میں تماشائیوں پر زبردستی ٹھونسا جا رہا تھا۔

" تماشا ختم ہوا اور کافی آئی تو میں نے ذرا بلند آواز سے جرمن نوجوان کو متوجہ کیا تاکہ باقی سب بھی سنیں۔

" کیا آپ کو یہ سب کچھ پسند ہے۔"

وہ کھسیانا سا ہوا بیٹھا تھا " نہیں پسند ناپسند کی کوئی بات نہیں ہے۔ آئخ مان نازی تھا۔ نازیوں نے یہودیوں پر مظالم کیے انھیں اس کی سزا ملنی چاہیئے۔ سو وہ ملتی رہتی ہے مگر میں تو اس وقت آٹھ دس برس کا تھا میرا تو اس تمام قصے میں کوئی قصور نہیں۔ ہماری حکومت اسرائیلی حکومت کو تاوان بھی دیتی رہتی ہے۔ ہماری قوم ہار چکی ہے اور بٹ چکی ہے ہم ایک نئی جمہوری دنیا بنا رہے ہیں ہمیں نہیں آتا کہ بار بار ہمیں ہمارا اذیت ناک ماضی کیوں یاد دلایا جاتا ہے۔"

امریکی نے رواداری میں تائیدی طور پر گردن ہلائی مگر اصل میں وہ ایک سامنے والے جوڑے کو دیکھنے میں مصروف تھا جو ابھی آکر بیٹھا تھا۔ وہ خاتون نہایت نازک اندام تھی اور مرد سخت بے ہنگم۔ توندل پھیلا ور کرخت تھا۔

امریکی اٹھ کر میرے پاس آگیا

" ہے! لیٹ اس بی فرینڈز اینڈ ٹاک" (آؤ یار بات چیت کریں)

اس نے اپنا پیشہ تو بعد میں بتایا لیکن میں اسی وقت سمجھ گیا کہ یہ امریکی خالص امریکی ہے 'ڈپلومیٹ' یعنی سفارتی آدمی نہیں ہے کیونکہ عام طور پر امریکی سفارتی نمائندے آدھی دنیا کو اپنا محتاج اور آدھی دنیا کو اپنا دشمن سمجھ کر ناک اونچی کیے رہتے ہیں۔

مگر میں نے اس بے جوڑ جوڑے کے بارے میں بات کرنے کی بجائے آئخ مان کا قصہ چھیڑ دیا۔ اور پژمردہ جرمن نوجوان بھی قریب آبیٹھا۔ انگریز ہمارے قریب نہیں آیا بلکہ ہماری طرف سے منھ پھیر لیا۔ روسی نے بھی اپنی کرسی قریب کھینچ لی مگر امریکن کے برابر بیٹھنا گوارا نہ کیا۔

www.taemeernews.com

میری تقریر دلپذیر کے اقتباسات:

"چلو یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ اسرائیل کا جذبۂ انتقام ابھی تک بھڑک رہا ہے اور اس نے غیر قانونی طور پر ہی سہی لیکن ایک پرانے دشمن کو ارجنٹائن سے اغوا کر کے عدالت میں لا کھڑا کیا اور کسی ملک نے اس بین الاقوامی لاقانونیت پر کوئی زبردست احتجاج نہیں کیا مگر اس بات کو اتنی پبلسٹی دینے کا کیا مقصد ہے۔ امن و صلح کے نعروں میں نفرت کا اعادہ عالمی خوشگوار فضا کے لیے کس حد تک مفید ہے۔ یہ جرمن نوجوان صاف صاف کچھ نہ کہہ سکے مگر کیا یہ باتیں اسے اچھی لگیں گی۔ یہ کس فصل کے بیج بوئے جا رہے ہیں؟" اس سے پیشتر کہ کوئی بولے انگریز بہادر نے کرسی ہماری طرف موڑی اور زبان مبارک سے نہایت کرخت لہجے میں توجہ فرمائی۔

"آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟" انھوں نے پوچھا

"زمین کا یعنی کرہ ارض کا"

امریکی ہی ہی کر کے ہنسنے لگا۔ اس نے اپنی قمیص کی جیب سے ایل۔ ایم سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ بخش دیا پتا نہیں وہ قرض تھا یا امداد۔

"میں یہ سوچ رہا تھا کہ آپ سے سنجیدہ گفتگو کروں۔" انگریز بہادر نے پھر فرمایا

"فرمایئے"

"اس میں شک نہیں کہ اب ایک نیا جرمنی پیدا ہو رہا ہے لیکن کیا یہ ضروری نہیں کہ نئی نسلوں کو ان کے تاریک ماضی کے کرتوتوں سے آشنا کیا جائے۔ میرے خیال میں آئخ مان کے مقدمے کو تمام دنیا کے ٹیلی ویژن پر دکھانا چاہیے۔ ان کے بچے میں ہماؤ آ گیا ۔۔۔" اس لیے مجھے 'ٹرائل آف نورمبرگ' فلم پسند ہے اور گو امریکہ والے اسے بنانے میں بے وقوفی کر گئے ہیں مگر پھر بھی اچھی ہے۔"

"اچھا تو آپ سمجھے نہیں، پاکستانی یعنی سابق ہندوستانی ہوں" میں نے عرض کیا "اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے بیان کردہ اصول کی بنا پر میری بھی تھوڑی سی مدد کریں۔"

"شاید ضرور، آپ کا مسئلہ کیا ہے" وہ محتاط ہو کر بولے۔

میں چاہتا ہوں جیسے آپ نے کہا "میں ہندوستان پر انگریزوں کے مظالم کی دس بارہ فلمیں بناؤں۔ انیسویں صدی کی فتوحات کی داستانیں کیونکہ آپ کہیں گے کہ ابھی وہ تو انیسویں صدی تھی وغیرہ وغیرہ بلکہ بیسویں صدی کی باتیں۔ وہ منظر جب جنرل ڈائر نے امرتسر کے جلیانوالہ باغ کو چاروں طرف سے بند کرا کے وہاں نہتے لوگوں پر گولیاں چلائی تھیں یا جب میری قوم کو گلیوں میں پیٹ کے بل رینگنے پر مجبور کیا گیا تھا۔

جب ہندوستانی کو انگریز فرسٹ کلاس کے ڈبے سے لات مار کر نکال دیتا تھا اور وہ منظر جب کراچی کے خالق دینا ہال میں مولانا محمد علی پر بغاوت کا مقدمہ چلا تھا۔ بغاوت کا مقدمہ اس بات پر کہ ایک ملک کا شہری اپنا ملک واپس مانگتا ہے۔ اور ایک منظر مولانا حسرت موہانی کا جب وہ چارخانے کا نیکر پہنے ہوئے جیل کی بھاری بھاری چکیاں چلا رہے ہیں۔ میرے محترم کیا آپ ان مناظر کو فلمانے میں میری مالی ذہنی یا مشاورتی معاونت کر سکتے ہیں۔ کیونکہ میں آپ کی نئی نسلوں کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ انھیں آئندہ ایسے اخلاقی جرائم کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آئخ مان کا قصہ ایسا ہی نہیں ہے۔"

"ہوگا۔ مگر آپ کی تجویز سے کیا فائدہ۔ ہمارے آپ کے درمیان فاصلے بڑھ جائیں گے۔" انھوں نے سرسری طور پر جواب دے کر ایک موٹا سا پائپ سلگانا چاہا لیکن ایک چٹاخے کی آواز ہوئی اور وہ رک گئے۔ میں نے گردن موڑی تو دیکھا کہ روسی صاحب کھڑے ہوئے تالیاں بجا رہے ہیں

تقریر امریکی مندوب کی:

"میں نہیں جانتا کہ ہماری حکومت کا رویہ کیا ہے لیکن میں واقعی اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ پرانی نفرتیں تازہ کی جائیں۔ یہ امن اور آشتی کا زمانہ ہے ہمیں ایک دوسرے کی خوبیاں زیادہ اور عیب کم تلاش کرنے چاہئیں"

"مغربی جرمنی سرمایہ دارانہ روش پر جا رہا ہے، وہ اچھا نہیں۔ مشرقی جرمنی بہت اچھا جا رہا ہے۔ ہم نازیوں کو سزا دے چکے ہیں۔ آئخ مان کو بھی سزا ملنی چاہیے لیکن اسرائیل نفرت بڑھانے کا کام کر رہا ہے۔ ہمارا نظام دنیا کا سب سے اچھا نظام ہے، واد کا سب سے اچھی شراب اور اولانوا دنیا کی سب سے اچھی رقاصہ ہے۔ ہم ملوکیت کے خلاف ہیں۔ گڈ بائی" وہ چل دیے اور میں تالیاں بجاتے بجاتے سوچتا رہا کہ ایسی مربوط تقریر تو ہمارے مشہور مقررین بھی نہیں کر سکتے۔ روسی مندوب واہ واہ۔

"بہرحال جرمن کبھی بھی یورپ کے لئے ایک خطرہ بن سکتے ہیں۔ ہمیں ان کی پوری نگہداشت کی ضرورت ہے۔" انگریز بہادر نے درشتی سے فرمایا۔ جرمن نوجوان جو بڑے انہماک سے [illegible] سب کچھ سن رہا تھا تھوڑا سا بے چین ہوا۔

"میرا خیال ہے آپ کو کم از کم میرے [illegible] کی گفتگو کرنے کا حق نہیں ہے اور بہرحال میں اس نسل کا آدمی ہوں جو جنگ اور نفرت دونوں کے خلاف ہے۔"

"آپ لوگوں کا بھی کوئی اعتبار نہیں اور رہے یہ ایشیائی انھیں تو [illegible] آنکھیں دکھاتے ہیں۔" انگریز صاحب کو غصہ آنے لگا۔ [illegible]

www.taemeernews.com

جرمن نوجوان غصہ پی گیا، مگر میں آپے سے باہر ہو گیا۔

"مسٹر تمہیں یہیں اور ابھی معافی مانگنی پڑے گی۔"

"کس سے" وہ بھی غصے میں آ گئے۔ جرمن نوجوان ایک دم اٹھ کر چل دیا

"مجھ سے۔ مجھ ایشیائی سے۔ ابھی۔ فوراً۔ اور یہ سب لوگ گواہ ہیں کہ تم نے شراب پی رکھی ہے اور میں نے نہیں پی۔ بس اب میں گنتی گنتا ہوں۔ ایک دو.... ...." میں لڑنے مرنے کو تیار ہو گیا۔

ڈراپ سین

نتیجہ: (۱) چالیس مارک کا جرمانہ مجھ پر، چالیس کا انگریز بہادر پر، چالیس کا امریکی بھائی پر

(۲) دوستانہ پارٹی جس میں جرمن اور روسی مفت میں شامل کیے گئے۔ خرچ میں نے انگریز نے اور امریکی نے اٹھایا۔

(۳) نعرے: عالمی امن زندہ باد۔ ایشیا زندہ باد۔ جمہوریت زندہ باد۔ دنیا بھر کے عوام زندہ باد۔ (اس نعرے کی ترتیب میں بڑی بحث ہوئی تھی۔ روسی بھائی کچھ اور چاہتے تھے مگر پھر اسی گول میز کانفرنس میں اس نعرے پر اتفاق ہو گیا۔)

دیکھیے اب جرمنی سے رخصت ہوں۔ ڈامشٹاڈ سے میں ریل، موٹر اور جہاز کے ذریعے جلدی جلدی جرمنی کے تھوڑے بہت حصے میں اور گھوما ہوں۔ یہ ملک مجھے بہت پسند آیا ہے یہ لوگ محنت کش ہیں متواضع ہیں، فن پرست ہیں اور سائنس داں بھی۔ کاش یہ آئندہ کبھی نہ لڑیں۔ کاش آئندہ کوئی کسی سے نہ لڑے۔ کاش۔ کاش۔ کاش۔

یہ وادی دلیسر ہے۔ گہری سبز مہکتی ہوئی وادی۔ جہاں گاتی ہوئی ندیاں بہتی ہیں۔

اور یہ فرائی برگ کا شہر ہے۔ بلیک فارسٹ کا صدر مقام جہاں قدم قدم پر تاریخی داستانیں بکھری پڑی ہیں۔ قدیم جرمنی۔ مہذب جرمنی۔ خوبصورت جرمنی۔

اور یہ جرمنی کی وادی کاغان ہے۔ باویریا کا علاقہ، یہ کوہ الپس کی شاخ ہے اور اس سامنے والی جھیل کے کنارے جو شاندار محل ہے اسے کئی سو برس پہلے شاہ باویریا لڈوگ دوم نے بنایا تھا۔ نہ جانے اس محل کی تعمیر پر کتنا روپیہ خرچ ہوا ہوگا، مگر کیا یہ محل اس سامنے والی جھیل یا اُلٹے ہاتھ والی سفید چوٹی کا مقابلہ کر سکتا ہے جو قدرت کے کروڑوں کرشموں میں ایک معمولی سا کرشمہ ہے۔ یارو مجھے یہیں رہنے کی اجازت دے دو تو میں [illegible] گیت کا دوسرا ایڈیشن مرتب کروں۔

www.taemeernews.com

اور یہ کیا ہے۔ بندیستاگ یا بندیس ہاؤس۔ جرمن پارلیمنٹ جہاں اس ملک کا پہلا جمہوری تجربہ کیا جارہا ہے اور جس کی کامیابی پورے یورپ بلکہ پوری دنیا میں امن قائم کرنے کے لئے ایک اہم کردار ادا کرسکتی ہے کیونکہ اگر جرمنی جیسا ترقی پذیر ملک جمہوریت سے مکمل طور پر آشنا نہ ہوسکا تو ایک بار پھر امکان ہے کہ یہ کوہ آتش فشاں بن جائے۔

اب میں بون میں بندیس ہاؤس کے آگے کھڑے ہوکر اپنے جرمن رہنما سے ہاتھ ملاتا ہوں جو مجھے رخصت کرنے کولون تک جارہے ہیں۔

"اس ایوان کی حفاظت کیجیے گا" میں نے کہا" انگریز نے ہمارے براعظم میں پہلی دو جنگوں کے دوران آپ کی جو تصویر کھینچی ہے اسے صرف اس ایوان کے برش مٹا سکتے ہیں۔ یعنی جمہوریت کے رنگ و روغن۔"

"ہم یہ بات خوب جانتے ہیں ہر عالی۔" جرمن رہنما مسکرائے اور میں دل ہی دل میں پچھتایا۔ کیا پدی کیا پدی کا شوربا۔ آخر تمھارا تحت الشعور انگریزی کا تو بنایا ہوا ہے۔

بون سے کولون تک ہوائی اڈے تک وہی گھنٹے بھر کا راستہ ہوگا۔ مگر اب کے میں نے اسے برسوں میں طے کیا۔ قدیم جرمنی کی داستانیں۔ ماضی قریب کے جرمنی کی ہلاکت آفرینیاں۔ جدید جرمنی کی ترقی اور خوشحالی۔ اعداد و شمار کی جلدیں میرے سامنے کھلنے لگیں۔ اگلے پچھلے مناظر ایک ایک کرکے میرے سامنے چلنے لگے کمال ہے کہ آج بھی ہم لوگ انگلستان کے چپے چپے اور چپے چپے کی تاریخ سے واقف ہیں اور جرمنی جیسے بڑے اور خوبصورت اور ترقی یافتہ ملک کے متعلق کچھ نہ جاننے کے برابر جانتے ہیں۔

"آؤف ویڈرزین" (پھر ملیں گے) میں نے ہوائی اڈے پر اپنے رہنما سے کہا اور ایک راؤنڈ کاؤنٹ میں بیٹھ گیا جو مجھے روم لے جائے گا۔

www.taemeernews.com

اٹلی

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

شیطان کی آنت میں افسرِ اعلیٰ

"یہ وہ مرکز ہے جس کی طرف سب کھنچے آتے ہیں کسی کو یہاں کے علاوہ اور کہیں آرام نہیں ملتا۔ اور بھی کئی شہر ہیں جو ہمیں تھوڑی دیر کے لیے خوش کر سکتے ہیں مگر مکمل اطمینان صرف روم ہی بخشتا ہے۔ یہ سب اجنبیوں کے لیے دوسرا وطن بن جاتا ہے۔ رومن بننے کے لیے روم میں پیدا ہونا ضروری نہیں۔"

یہ نظم مشہور امریکی شاعر لانگ فیلو کی ہے۔ اور اس ناچیز کا ایڈیٹروں کی طرح اس سے متفق ہونا ضروری نہیں معلوم ہوتا ہے لانگ فیلو صاحب کبھی دلی نہیں گئے۔ نہ لاہور تشریف لائے بھئی وہ یہاں بھی اپنی ذہنیت کا چکر چلا دیا۔ ٹی ہاؤس، کافی ہاؤس اور جِم خانوں میں بیٹھ کر ایشیائی کمتری اور یورپی برتری پر بات کرنے والے انٹلکچوئل یعنی دانشور تمھیں کیا کہیں گے۔ شاید کچھ بھی نہ کہیں کیونکہ انھیں ٹائم، لائف، نیوز ویک اور مقامی طور پر ڈی مر پڑھنے سے فرصت کہاں جو دلی لاہور کی خرافات کے لیے وقت نکالیں۔

تو یہ روم ہے۔ رومۃ الکبریٰ جسے نہ صرف اطالوی بلکہ ساری مغربی دنیا اور مغربی دنیا سے متاثر دنیا ابدی شہر کہتی ہے، لازوال شہر۔ وہ شہر جو کبھی فنا نہیں ہوگا اور اس میں شک نہیں کہ یہ آٹھویں صدی قبل مسیح سے جو قائم ہوا ہے تو اب تک فنا نہیں ہوا۔ یوں اس کی صحیح عمر تاریخی تواریخ سے ثابت نہیں ہوتی مگر یار لوگوں نے کہانیوں اور آثار قدیمہ میں خوش اعتقادی کے اجزا ڈال کر ایک سلسلہ پیدا کر ہی لیا ہے اس کے مطابق روم ۲۱ را پریل سات سو چون قبل مسیح کو وجود میں آیا ہے۔

کولون سے چل کر روم کے ہوائی اڈے پر اترتے اترتے میں نے اس "شہر ابدی" کے متعلق اپنا حافظہ تازہ کر لیا ہے۔ جدید اطلاعات پڑھ لی ہیں۔ اور بقول کسے سمند شوق سیاحت یعنی سیاحت کے گھوڑے کے پہلوؤں میں ایڑیں مار رہا ہوں مگر بار بار ایک لوکل یعنی مقامی اور اردو نویس شاعر کا ایک شعر میری تیزی طبع کا بیڑا کیے دیتا ہے۔

www.taemeernews.com

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

ظاہر ہے کہ یہ علامہ اقبال ہیں جنھیں عوام تو خیر مانتے ہیں مگر خواص یعنی بنگلوں اور کوٹھیوں اور کلبوں کے بار روم میں بیٹھ کر ادب و فلسفہ پر بحث کرنے والے زیادہ سے زیادہ بدیشی سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ علامہ ایک بین الاقوامی ادیب نہیں ہیں اور انگریزی یا فرانسیسی یا اسپینی یا روسی یا چینی زبان کے ادیب نہیں اور اقوام متحدہ اور اس کی سکیورٹی یا حفاظتی کونسل کی کارروائیاں صرف ان ہی پانچ زبانوں میں ترجمہ کی جاتی ہیں۔ ٹی۔ایس ایلیٹ انگریزی کا شاعر ہے اور البرٹ کامیو فرانسیسی کا ادیب ہے اور پابلو نرودا اسپینی میں لکھتا ہے اور شولوخوف روسی ہیں اور ماؤزے تنگ چینی بولتے ہیں لہٰذا اردو فارسی عربی بنگالی زبانوں میں نہ سوچنے والے پیدا ہو سکتے ہیں نہ لکھنے والے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ آؤ پیارے کونیاک کا ایک جام پیو۔ ڈنر کے بعد یہ بہت ضروری ہے اور فیشن کے مطابق بھی ورنہ ہائی سوسائٹی سے نکال دیے جاؤ گے تنخواہ روزگار کاروبار سب میں ترقی کے بجائے زوال آجائے گا۔ اور یہ کونیاک ہے کبھی اسے برانڈی مت کہہ دینا کیونکہ برانڈی ہزار طرح کی ہوتی ہے اور کونیاک اس کی ایک اعلیٰ قسم ہے۔ اسے بڑے گول گلاس میں ہلا ہلا کر آہستہ آہستہ پیا جاتا ہے بس یاد رکھو کونیاک جلد نہ پینا اور مہذب لوگوں میں بیٹھ کر علامہ اقبال یا غالب والب کا تذکرہ نہ کرنا کہ اس قسم کی باتوں سے جہالت اور پھینچر پن کی بو آتی ہے اور امرا اور افسر ایسے آدمی کو کم از کم خبطی سمجھتے ہیں۔ اپنا امپریشن یعنی تاثر اچھا دیا کرو۔

ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

مگر مجھ پر اب بھی روم کا امپریشن یعنی تاثر "شہر ابدی" والا نہیں پڑتا۔ کیونکہ میں نے بابل و نینوا کے کھنڈر دیکھے ہیں۔ بابل جو روم سے بھی زیادہ قدیم ہے اور جہاں حمورابی جیسے دانشور حاکم اور بخت نصر جیسے طاقتور بادشاہ آئے اور چلے گئے اور عشتار دیوی کے نام سے منسوب بڑے بڑے معبد کھنڈروں میں تبدیل ہو گئے اور پھر وہ کھنڈر بھی خاک میں مل گئے۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں جب روم ایک چھوٹا سا گاؤں ہوگا۔ بابل کی دولت، طاقت اور تہذیب اس وقت کی معلوم دنیا پر سورج کی طرح چمکتی تھی۔

اور پھر میں خود موہنجوڈارو کے دیس سے آیا ہوں جس کی عمر پانچ ہزار برس سے زیادہ ثابت ہو چکی ہے۔ شاید وہ تین ہزار برس زندہ رہا ہو عظیم رہا ہو اور شاید اسے بھی اس وقت کی دنیا میں "شہر ابدی" کہا جاتا ہو تاریخ اور وقت کے چکر میں تین چار ہزار برس کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا۔ (لہٰذا کا استعمال ملاحظہ ہو) نہ ہو سکے

www.taemeernews.com

منشی نولکشور ورنہ یہ سفرنامہ بڑے شوق سے چھاپتے) لہٰذا میں اس شہر رومتہ الکبریٰ کو کھلی آنکھوں سے دیکھونگا مگر ہوائی اڈے پر آنکھیں کھلتے ہی کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

ہمارے جہاز کے برابر ہی پی آئی اے کا بوئنگ کھڑا تھا جسے دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا مشین امریکی ہے تو کیا ہوا نام تو پاکستانی ہے۔ چلاتے بھی پاکستانی ہیں اور اس کا صدر مقام بھی کراچی ہے۔

گندم اگر بہم نہ رسد بھس غنیمت است

(اگر گندم نہ مل سکے تو بھُس ہی غنیمت ہے۔)

میں نے سوچا ضرور وطن سے کوئی نہ کوئی جاننے والا اترا ہوگا۔ دل و دماغ میں آپ ہی آپ قومی ترانے کی جھنجھناہٹ پیدا ہوگئی اور میں اپنے ساتھ اُترنے والوں کی قطار چھوڑ کر سیدھا ان سیڑھیوں کی طرف بھاگا جو ہوائی اڈے کی طویل عمارت میں لے جاتی ہیں۔

روم کا ہوائی اڈا شیطان کی آنت ہے۔ اس میں عمارتیں الگ الگ نہیں بس ایک بہت چوڑا برآمدہ ہے جو چلے ہی چلے جاتا ہے۔ ایک طرف تمام ہوائی کمپنیوں کے چھوٹے چھوٹے سے کاؤنٹر، مشروبات اور تحائف کی چھوٹی چھوٹی دکانیں اور پاسپورٹ، کسٹم وغیرہ کے دفاتر ہیں اور دوسری طرف ہوائی اڈے کا کھُلا نظارہ یعنی سو سو فٹ اونچے نیلے نیلے شیشے لگے ہوئے ہیں جن سے ہوائی جہاز آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔

یہ ہوائی اڈا شاید دنیا کا خوبصورت ترین ہوائی اڈا ہے۔ اس عمارت یعنی برآمدے میں بھانت بھانت کے مسافر ایک ہی جگہ جمع رہتے ہیں جو لوگ ٹرانزٹ یعنی دوران پرواز روم کے ہوائی اڈے پر اُترتے ہیں انھیں خاص ہدایت ہوتی ہے کہ ازراہِ کرم پورے برآمدے کی سیر کرنے تشریف نہ لے جایئے گا ورنہ آپ کے مقرر کردہ دروازے تک واپس ہوتے ہوتے آپ کا جہاز اُڑ کر اگلی منزل تک پہنچ چکا ہوگا۔

بہر حال چونکہ فدوی کو روم پر ہی اُترنا تھا اس لیے اس پند سودمند کی پروا نہ کرتے ہوئے جذبۂ حب الوطنی سے سرشار دیوانہ وار پاکستانی چہروں کی تلاش کرنے لگا اور وہ نظر آ گئے۔

"وہ" پاکستان کی ایک عظیم سروس کے ایک خاصے سینئر افسر تھے جنھیں میں اچھی طرح جانتا تھا، اور وہ بھی مجھے پہچانتے تھے ان کے ساتھ وطن کے کچھ صنعت کار بھی کھڑے ہوئے تھے اور پی آئی اے کے کوئی افسر رابطہ مشروبات سے سب کی تواضع کر رہے تھے۔ سب وی آئی پی تھے نا۔

"سلام علیکم جناب" میں نہایت گرمجوشی سے ان کی طرف دوڑا۔

انھوں نے تقریباً خشونت آمیز انداز سے مجھے دیکھا۔ میرے گہرے بھورے رنگ کے کوٹ کو دیکھا جو خاصا

www.taemeernews.com

قیمتی تھا اور میں نے لندن میں بطور خاص پیسے بچا کر بنوایا تھا۔ پھر انھوں نے میری جناح کیپ پر نظر ڈالی جسے میں جان بوجھ کر بیرونی ممالک میں پہنتا ہوں تاکہ لوگ پوچھیں تو میں ذرا دون کی لوں۔

"وٹ آر یو ڈوئنگ ہیر" (تم یہاں کیا کر رہے ہو؟) انھوں نے بڑی سرد مہری سے اپنا قیمتی ہاتھ نہایت سُستی سے آگے بڑھایا جیسے میرا ہاتھ لگتے ہی ان کی سینیارٹی یا تنخواہ میں کوئی لرزہ خیز کمی ہو جائے گی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے وہی سمجھ رہے ہیں جہاں میں چودہ برس پہلے تھا اور سلام کا جواب وعلیکم السلام اس لیے نہیں دیا کہ آس پاس کے لوگ انھیں کوئی معمولی آدمی نہ سمجھ لیں۔ ایک دھچکے کے ساتھ قومی ترانہ رک گیا۔ میرے دل و دماغ سن سے ہو گئے میں اپنے آپ پر ملامت کرنے لگا۔

پھر میں لمحہ بھر میں ان کے آگے دوزانو ہو گیا یعنی اپنے گھٹنوں پر بیٹھ گیا۔ میں نے احتراماً اپنی ٹوپی اُتار لی۔ صنعت کار ساتھی ایک دم گھبرا کر پرے ہٹ گئے۔ افسر صاحب بھی کچھ گھبرا سے گئے۔ پی۔آئی۔اے کا افسر رابطہ سخت پریشان ہو گیا۔ آس پاس سے گزرنے والے مسافر دفعتاً رک گئے۔ ایک اطالوی لڑکی جس کے بال کوئی تین فٹ اونچے بندھے ہوئے تھے بھاگ کر قریب آگئی۔

"بس حضور کی جان و مال کو دعا دیتا ہوں امید ہے حضور میرا خیال رکھیں گے" میں نے نہایت لجاجت سے کہا۔ جیب سے رومال نکال کر آنکھوں پر رکھا جیسے آنسو پونچھ رہا ہوں اور دوسرے لمحے پیٹھ موڑ کر اس طول طویل بھول بھلیاں میں گُم ہو گیا کیوں کہ مجھے اپنی ہنسی فوراً ہی چھپانی تھی۔

پتا نہیں افسر صاحب نے کیا سوچا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ خوش ہوئے ہوں گے حالانکہ انھیں ایک غیر ملک میں میرا گھٹنوں کے بل بیٹھنا پسند نہ آیا ہوگا۔ مگر وہ یقیناً اسے میری جہالت اور کمتری پر محمول کر کے معاف کر چکے ہوں گے اور اصل میں میرے بیان کو گزارش احوال سمجھتے ہوں گے کیونکہ اس کے بعد وطن عزیز میں بار بار ان سے ملاقات ہوئی ہے اور ان کا رویہ خاصا سرپرستانہ اور ہمدردانہ رہا ہے۔

www.taemeernews.com

نکلنا خلد سے اور روم کا کھلنا

اب روم کے عجائب وغرائب اور مصائب شروع ہوئے۔

"باکالا کرساداری کیرے" کسٹم افسر صاحب نے فصیح و بلیغ اطالوی بولی۔ مطلب یہ تھا کہ کوئی ایسی شے ہے جس پر کسٹم لگے۔

"آئی ڈونٹ نو اٹالین" (میں اطالوی نہیں جانتا)

"فرانسے" (فرانسیسی جانتے ہو)

"نو"

وہ ہنسے اور ایک نرم و گرم خاتون کو زور سے آواز دی جو انگریزی جانتی تھیں۔ وہ خاتون بڑی خوش شکل تھیں مگر بدمزاج بھی خاصی ثابت ہوئیں۔ ساتھ ہی ساتھ بٹوے سے آئینہ نکال کر بال بھی درست کرتی جاتی تھیں یعنی معاف کرنا مجھے پھر اپنے لوکل آدمی کا شعر یاد آیا۔ جواب تو لوکل بھی نہیں بلکہ اُدھر کا ہے یعنی مرزا غالب:

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

میرے ساتھ دو خاصے بڑے بکس تھے جن میں اپنے کپڑے کتابیں اور سگریٹ سلیقے سے بند کر کے لایا تھا۔ خاتون کا اصرار تھا کہ سب الٹا پلٹا جائے گا۔ میں کہتا تھا کہ بابا میرے پاس کچھ نہیں ہے اور تمھیں تلاشی ہی لینی ہے تو ذرا آہستہ خرام۔ ہمارا جھگڑا دیکھ کر ایک تومند قسم کے کوئی بڑے افسر تشریف لائے۔ خاتون نے انھیں جلدی جلدی کچھ بتایا۔ ان کی گفتگو سے تندی ظاہر ہوتی تھی اور بندہ مقامی ادب کی پناہ گاہ میں پہنچا ہوا کھڑا تھا۔

www.taemeernews.com

کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے

"پاسپورٹ سینور" افسرِ اعلیٰ نے تدبر کا مظاہرہ کیا۔ سینور (سی نور مسٹر کو کہتے ہیں)

ہا۔ اے لا پاکستانی۔ ویل کوم (ویلکم کی بجائے انھوں نے ویل کوم بولا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی انگریز غیر ملکی الفاظ کا تلفظ انگریزی میں کریں تو دوسرے بھی کیوں نہ ایسا ہی کریں)

انسپکٹر صاحب نے نہایت گرمجوشی سے میرا ہاتھ دبایا۔ صرف سگریٹ کے پیکٹ گنے کیونکہ دوسو سے زیادہ سگریٹ لے جانے کی اجازت کسی ملک میں نہیں۔ پھر انھوں نے خود کھٹ سے میرے دونوں بکس بند کر دیے اور ان پر ایک موٹا سا کھریا کا نشان لگا دیا۔

"ویل کوم تو اطالیہ۔ ویل کوم تو روما۔ یو آر اَوَر فرینڈ سی نور" وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے دوسری طرف چلے گئے۔ خاتون تیسری طرف چلی گئیں اور میں اطالوی تیز مزاجی اور خوش اخلاقی کے بیک وقت مظاہرے سے پریشان کسی اور سمت میں چل دیا۔

باہر کے دروازے پر ایک کارڈ ملا۔ سی نور عالی کا انتظار وزیر خارجہ باہر دروازہ نمبر اتنے پر کر رہے ہیں۔ یا اللہ یہ کیا تماشا ہے۔ کہاں میں، کہاں وزیرِ خارجہ جن صاحبہ نے کارڈ ہاتھ میں دیا وہ بھی خاصی مرعوب اور پریشان تھیں۔ انگریزی بہت کم جانتی تھیں، وہ ہوائی اڈے کی کوئی کارکن تھیں جن کے پاس مسافروں کے لیے پیغام جمع کیے جاتے ہیں۔

بمشکل میں انھی کی رہنمائی میں متعینہ دروازے تک پہنچا تو ایک بیحد موٹی اور پستہ قد خاتون بھد بھد کرتی ہوئی دوڑ کر آئیں۔

"یو آر سینور عالی؟"

"یس مادام"

"آہا۔ ویل کوم تو روما۔ یہ میری بیٹی ہے جو وزارتِ خارجہ میں یونیسکو کے شعبے میں کام کرتی ہے۔ انگریزی سیکھ رہی ہے اور میں انگریزی جانتی ہوں۔ اس لیے یونھی اس کی مدد کے لیے آ گئی ہوں۔ سی نور یہ آپ کے استقبال کے لیے مامور کی گئی ہے۔"

اے اردو داں بھائیو! میں آپ کو کیا بتاؤں کہ اتنی انگریزی بھی ان محترم خاتون نے کس صفائی اور کمال سے بولی، یوں سمجھیے کہ اتنے فقروں کے ادا کرنے میں کوئی چار منٹ لگے۔ میں نے سوچا کہ جب ان فاضل انگریزداں بڑی بی کا یہ عالم ہے تو چھوٹی بی نہ جانے کیا بلا ہوں گی۔

www.taemeernews.com

چھوٹی بی بہت پیاری نکلیں۔ چھوٹی سی۔ کامنی سی۔ انھوں نے نہایت شرما کر ہاتھ ملایا اور فوراً کھینچ لیا۔
"ویلکوم تو روما" انھوں نے صرف ایک ہی فقرہ بولا۔
اب ایک گٹھے ہوئے قد کا نوجوان گویا کشتی لڑنے کے ارادے سے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس نے دھپ سے میرے شانے پر ہاتھ مارا اور دوسرے ہاتھ سے جھٹکا دے کر ہاتھ ملایا۔
"یہ سینیور فلاں بن فلاں ہیں جو میری بیٹی کے منگیتر ہیں۔" مادام اپنے ہونے والے داماد کا تعارف کراتے وقت باغ باغ ہوئی جا رہی تھیں۔ "ہم لوگ انھی کی کار میں آئے ہیں اور آپ کو اسی کار میں لے جائیں گے۔ کیونکہ بس میں بہت دیر لگتی ہے۔" اب وہ میرے کان کے قریب جھک گئیں اور انھوں نے کھسر پھسر کی "یہ لڑکا انگریزی بالکل نہیں جانتا۔ آپ کو چاہیے کہ اس کا شکریہ ادا کریں۔ شکریے کو اطالوی میں گرات سیا کہتے ہیں۔ دو تین بار اس لفظ کو ضرور دہرایئے۔"
"گرات سی آسی لو گرات سی آ" میں نے نہایت فرمانبرداری سے جما جما کر کہا اور دوبارہ ہاتھ ملایا۔
دولھا میاں کی فی اٹ یا فیٹ نمبر گیارہ سو میں سامان رکھ کر ہم چلے تو میں نے مادام سے سرگوشی کی۔ کیونکہ آگے تو رمیو جولیٹ بیٹھے تھے اور پیچھے میں اور مادام۔
"مجھے پرچہ ملا تو اس پر لکھا تھا کہ وزیر خارجہ انتظار کر رہے ہیں۔ یہ کیا معاملہ ہے؟"
"ہی ہی ہی" مادام ہنسنے لگیں اور ان کے ساتھ ساتھ ان کا سارا بدن ہل ہل کر کے ہنسنے لگا۔
"ترجمے کی غلطی ہو گی۔ اصل میں آپ وزارت خارجہ کے مہمان ہیں جبھی تو میری بیٹی آپ کو لینے آئی ہے۔ سی نور کیا آپ اپنے ملک کے کوئی بڑے آدمی ہیں؟"
مجھے چند منٹ اپنا گھٹنوں کے بل جھکنا یاد آیا۔ یہ میری اصلیت تھی مگر آخر میں بھی انسان ہوں۔
"جی نہیں۔ بڑا آدمی تو کیا ہوں بس ایک شہری ہوں جس کی لوگ عزت کرتے ہیں۔" میں نے گھما پھرا کر بات بنائی۔ کیونکہ وزارت خارجہ کی میزبانی کا مسئلہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
"آ وہ تو آر ویری — " وہ کچھ دیر رکیں "ویری مو دیست" انھوں نے لفظ تلاش کر لیا۔ ترجمہ یہ ہوا کہ آپ بہت انکسار سے کام لے رہے ہیں۔

اب ہم ایک سرنگ سے گزرنے لگے۔ یہ سرنگ دو تین میل لمبی ہے اور دن کی طرح روشن ہے۔ دونوں طرف تیز روشنیاں اور سڑک فراخ اور نہایت پختہ۔ یہ تو وے یعنی دو طرفہ راستہ ہے۔ دولھا میاں کوئی اسی میل کی رفتار سے گاڑی چلا رہے تھے بلکہ کہیں کہیں تو اگلی موٹروں کی سست رفتاری سے غصے میں آ کر ہارن بھی

www.taemeernews.com

بجاتے تھے۔ حالانکہ وہ بھی اسی رفتار سے جا رہی ہوں گی۔

"روما بہت عظیم اور خوبصورت ہے" مادام نے سمجھایا۔

"ضرور۔ ضرور"

"آپ کو شہر کے سب سے بڑے اور مہنگے ہوٹل میں ٹھہرایا جا رہا ہے۔ کیونکہ آپ وزارت خارجہ کے مہمان ہیں۔"

"گرات سی آ" میں نے کہا مگر پھر مخمصے میں پڑ گیا کہ بمبئی میں یونیسکو کا وظیفہ خوار وزارت خارجہ کا مہمان کیسے ہو سکتا ہوں پھر میں نے سوچا کہ اٹلی یہ ایک ترقی پسند ملک ہے یہ لوگ دنیا سے اپنے تعلقات بڑھا رہے ہیں یقیناً انھیں میری ادبی عظمتوں کا علم ہو گیا ہو گا آخر میں رائٹرز گلڈ کا مرکزی معتمد ہوں، شاعر ہوں، مقرر ہوں، ایک ہاؤسنگ سوسائٹی کا رکن منتظم ہوں۔ یقیناً وزارت خارجہ اپنی خیر سگالی کا مظاہرہ کرنا چاہتی ہے۔ میں نے اپنے سوٹ کی شکنیں درست کرنے کی کوشش کی مگر مادام نے جگہ بہت زیادہ گھیر لی تھی۔

روم شروع ہو گیا۔

ہم بڑی بڑی چوڑی سڑکوں اور پتلی پتلی گلیوں سے گزرنے لگے۔ کہیں جدید اونچی عمارات کہیں قدیم آثار۔ قدم قدم پر چوک نظر آتے تھے۔ چوک جنھیں انگریزی میں اسکوائر۔ اور اطالوی میں پیاتسا کہتے ہیں۔ پیاتسا جسے انگریزی تلفظ کے مارے ہوئے پیازا بولتے ہیں کیونکہ وہ PIZZA لکھا جاتا ہے۔

یہ ہوٹل ایمبسڈر رہے۔ بیچ شہر میں ایک شاندار عمارت بے حد مکلف اور آراستہ۔ باوردی مودب بیرے دوڑے۔ مادام نے جلدی سے اتر کر گھبرائی ہوئی آواز میں شور مچانا شروع کر دیا۔ ایک اسسٹنٹ منیجر قسم کے شخص کو پکڑ کر لائیں۔ "یہ وزیر خارجہ کے مہمان ہیں" انھوں نے انگریزی میں کہا۔ اور اسسٹنٹ منیجر نے تین چار بار ادب سے سر ہلایا۔

"گڈ بائی" مادام اور ان کی بیٹی اور داماد ایک ساتھ بولے "کل صبح گیارہ بجے آپ وزیر خارجہ سے ملیں گے۔"

"گڈ بائی۔ مادام سینوریتا۔ سینور گڈ بائی۔ گرات سی آ۔ گڈ بائی" میں نے تعظیماً جھک کر کہا اور اپنے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

کمرہ کیا تھا ملکہ قلوپطرہ کا بجرا تھا جس میں وہ مارک انطونی کا استقبال کرنے آئی تھی۔ میں اس کا تفصیلی ذکر کر کے زیادہ حاسد پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے لندن اور پیرس کے بڑے بڑے شاندار ہوٹلوں کے کمروں میں جھانکا ہے۔ خاص طور پر لندن کے کلارجز ہوٹل جہاں تمام ممالک کے سربراہ اور بادشاہ لوگ ٹھہرائے جاتے

www.taemeernews.com

ہیں مگر بقول مولانا حالی:

ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

"ہر سال روما میں ہوٹلوں کے پندرہ درجے مقرر کیے جاتے ہیں!" اسسٹنٹ منیجر صاحب کمرہ دکھاتے ہوئے فرما رہے تھے "یہ ہوٹل ہمیشہ سے اوّل درجے کا تسلیم کیا جاتا ہے اور آپ جیسے معزز مہمان اکثر یہیں ٹھہرتے ہیں" میں نے انھیں ایک جرمن سگریٹ پیش کیا جو انھوں نے نہایت خوشی سے سلگایا اور رخصت ہو گئے۔

دروازے کے اندر کی طرف ایک کارڈ پر اطالوی، فرانسیسی اور انگریزی میں کمرے کا کرایہ لکھا ہوا تھا جسے دیکھ کر میری جان نکل گئی مگر پھر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور دھم سے بستر پر گر گیا جس پر جھولے کا سا مزا آنے لگا۔

ابوالحسن کا دن

اے ناظرینِ باتمکین!

یہ دکھ کی کہانی ہے سُن لیجیے
پریشاں بیانی ہے سُن لیجیے

وہ رات میں نے روم کے عظیم الشان ہوٹل ایمبیسڈر میں اس طرح گزاری جیسے الف لیلہ کا ابوالحسن خلیفہ ہارون الرشید کا مہمان رہتا تھا۔ شام کو میں کہیں باہر نہیں گیا۔ ہوٹل کے دالانوں، ریستورانوں، بار، ناچ گھر اور غلام گردشوں میں گھومتا رہا۔ آخر میں وزیرِ خارجہ کا مہمان تھا۔ بیرے اور مختلف قسم کے منیجران میرے چشم و ابرو کی ایک جنبش پر جان نثار کیے دیتے تھے۔ میں نے رات کو کھانے سے پہلے ایسا گرم خوشبودار غسل کیا جو جرمنی میں نصیب نہیں ہوا تھا — نہ آج تک ہوا ہے — وہ کھانے کھائے جن کے تفصیلی ذکر سے دشمنوں کی تعداد میں اضافے کا امکان ہے۔ کھانے کے بعد جنوبی امریکہ کے ایک وزیر یا سفیر قسم کے مدبر کو مہنگی شمپین پلائی۔ اور سیاستِ عالم پر نہایت مدبرانہ گفتگو کی۔ میں ان سے اور وہ مجھ سے بہت متاثر ہوئے۔ رات کو کمرے میں بار بار مختلف روشنیاں بجھائیں اور جلائیں۔ ادھر یہ روشنی تیز ہے۔ دودھیا رنگ کا چھپا ہوا بلب اچھا رہے گا۔ بستر میں پروں کے تکیے تھے۔ نہیں نہیں ہمیں یہ پسند نہیں — روئی کے تکیے لاؤ۔

بہ مصر

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

www.taemeernews.com

تو اپنے بہترین کپڑے پہن کر ایک لمبی چوڑی ٹیکسی میں وزارت خارجہ کی طرف روانہ ہوا۔ روم میں زیادہ تر ٹیکسیاں چھوٹی ہیں فیٹ یا فوکس ویگن۔ بڑی گاڑی مشکل سے کرائے پر ملتی ہے مگر میں ہوٹل ایمبیسڈر کا مسافر اور وزارت خارجہ کا مہمان تھا۔

اٹلی کی وزارت خارجہ ایک عجوبہ ہے۔ ایک تاج محل ایک بھول بھلیاں۔ ایک بہت چوڑے کھلے ہوئے میدان کے گرد چوڑی پختہ سڑکیں دوڑتی ہوئی ایک عظیم الشان سنگیں عمارت کے آگے رک جاتی ہیں جس کے برآمدے مرمریں اور جس کا ماحول الف لیلوی ہے۔ پُراسرار خاموشی لمبی لمبی غلام گردشیں اور باوردی اہل کار (جنھیں یہاں چپراسی کہتے ہیں)

میں وزیر خارجہ کے ذاتی سکریٹری کے پاس لے جایا گیا۔ ایک انگریزی ترجمان بلائے گئے۔

"آپ کو وزیر خارجہ سے کیا کام ہے"

"میں ان کا مہمان ہوں۔ مجھے خاتون فلاں بن فلاں نے کل ہوائی اڈے پر مطلع کیا تھا۔ اور ہوٹل ایمبیسڈر میں ٹھہرایا تھا"۔ میں نے ان پر بے نیازی سے بوجھ ڈالا۔

"مگر وہ تو میلان تشریف لے گئے ہیں اور میرے پاس آپ کے متعلق نہ کوئی کاغذات ہیں نہ اطلاع"۔

"مگر خاتون بن فلاں بن فلاں جن کی شادی نہیں ہوئی اور جن کی والدہ اچھی انگریزی بولتی ہیں"۔

"انھیں ہم نہیں جانتے"

اب میں پریشان ہوا "اے کامنی بیگم تم کہاں ہو۔ اے بڑی بی تم کہاں ہو"۔ میرے دل کی آواز برآمدوں میں گونجنے لگی۔

نتیجہ غلط فہمی! جی نہیں۔ غلط بیانی۔ جی نہیں بلکہ کامنی بیگم کی والدہ بڑی بی کو کامنی بیگم نے یہ بتایا تھا کہ وزارت خارجہ کے شعبۂ یونیسکو نے میرے قیام کا انتظام کیا ہے اور مجھے ہوٹل پسند کرنے کے لیے دوسرے دن صبح ۱۱ بجے بلایا ہے۔ بڑی بی خوشی میں مجھے وزارت خارجہ کا مہمان بنا گئیں۔

"سوری سی نور"۔ سب متعلقہ افسران و افسرات نے معذرت کی۔

میں مسکرایا "کوئی بات نہیں، مگر اب مجھے دوسرا ہوٹل تلاش کرنا پڑے گا"۔

"سی سی نور" (یس سر) سب نے بہ یک آواز کہا۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہوٹل ایمبیسڈر میں اسّی ڈالر یعنی کوئی چار سو روپے کا بل ادا کر کے میں ایک پر فضا مقام پر پہنچا جسے پنشن ڈوکاک کہتے ہیں اور جو وبا کا پوری افریکا میں واقع ہے اور جہاں کا کرایہ میں کسی کو

www.taemeernews.com

نہیں بتاؤں گا کیونکہ بہر حال ہمارے ملک میں ایسی باتیں آدمی کی سماجی پوزیشن کو خطرے میں ڈال سکتی ہیں۔ ایمبسڈر سے چلتے وقت منیجر اور ہیڈ بیرا مجھے رخصت کرنے ٹیکسی تک آئے۔ منیجر نے پوچھا کہ آپ اتنی جلدی کیوں جارہے ہیں۔ ہم تو آج آپ کے لیے پاکستانی قسم کا کھانا پکوا رہے ہیں۔ مرچیں اور چٹنیاں۔

"بھئی معروف آدمیوں کی یہی مشکل ہے" میں نے کہا۔ "بات یہ ہے کہ میرے اپنے ملک کے وزیر خارجہ کل لندن پہنچ گئے ہیں اور مجھے ضروری مشوروں کے لیے ابھی بلایا ہے۔" یہ کہہ کر مجھے اطمینان سا ہو گیا کہ ان سب کو میری بات کا یقین آگیا ہے کیونکہ انھوں نے دو تین بار تعظیماً سر ہلائے اور منیجر نے خود آگے بڑھ کر ٹیکسی کا دروازہ کھول دیا۔

پنشن (PENSION) جیسی کوئی چیز انگلستان، امریکہ، روس بلکہ یورپ کے بہت سے ممالک میں نہیں ہوتی۔ اٹلی میں بے شمار ہوتی ہے۔ یہ ہوٹل ہے اور ہوٹل نہیں ہے۔ سرائے ہے اور سرائے بھی نہیں ہے۔ کرائے کا مکان ہے مگر وہ بات بھی نہیں۔ کچھ ایسا قصہ ہے کہ سرائے، ہوٹل اور کرائے کے مکان اور ریستوران کا مرکب ہے۔ میرا کمرہ ۲۸۰۰ لیرے کا تھا۔ ۱۰۰ لیرے ایک روپے کے برابر سمجھیے۔ ویسے لیرے کا گھپلا الگ ہے۔ فی الحال لیرے کو پیسہ سمجھیے اور یوں سمجھیے کہ یہ کمرہ ۲۸ روپے کا ہے۔ ناشتہ اور ایک وقت کا کھانا اس میں شامل ہے۔ چاہے لنچ کھائیے چاہے ڈنر۔ باتھ روم مشترک یعنی کئی کمروں میں مشترک۔ تولیے اپنے استعمال کیجیے۔ اسکالر اور وظیفہ خوار ہی زیادہ ٹھہرتے ہیں جن کو روپیہ تو زیادہ ملتا نہیں مگر پڑھے لکھے ہونے یا اپنے اپنے ملکوں میں چھوٹی موٹی افسری کی وجہ سے ان کی عادت کچھ "نفاست پسند" ہو جاتی ہے۔ اب یورپ میں بڑے ہوٹل کی حیثیت نہیں، گھٹیا جگہ ٹھہر کر اس کا پتا دینا بے عزتی کا باعث بن سکتا ہے، اس لیے خداوند تعالیٰ نے کم از کم رومتہ الکبریٰ میں سب کی شرم رکھنے کا سامان پنشن کی صورت میں عطا فرمایا ہے۔

"یہاں سب آپ ہی جیسے عالم فاضل دانشور رہتے ہیں۔ دکتور۔" سینوریتا نے مجھے اطمینان دلایا۔ میں نے یہاں بھی تردید نہیں کی کہ میں ڈاکٹر نہیں بلکہ ایک بوگس گریجویٹ ہوں۔

"وقت ملا تو میں ان سے مل کر خوش ہوں گا۔" میں نے دھونس کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا حالانکہ میں سخت بیتاب تھا کہ ڈاکٹر تو کجا کوئی آٹھویں جماعت کا طالب علم بھی مل جائے تو کم از کم زبان تو ہلاؤں جو نہ ملنے کے سبب سوکھی جاتی تھی۔

پھر میں روم میں سما گیا۔ روم کے ریلے میں بہہ گیا۔ روم عظیم روم۔ رومتہ الکبریٰ! اگر میں آج بھی پاکستان سے بعد جرنلسٹ کیا آتا تو بڑے سوز و گداز سے علامہ اقبال کا شعر گنگنایا کرتا:

www.taemeernews.com

سواد رومۃ الکبریٰ میں دلّی یاد آتی ہے
وہی عظمت وہی عبرت وہی شان دلآویزی

مگر وہ علامہ اقبال تھے بڑے آدمی تھے۔ بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں، بڑے لوگ وسیع القلب اور بھولے ہوتے ہیں کسی موڑ میں دلّی کے بارے میں کچھ کہہ گئے۔ ایسے موڑ ان پر کبھی کبھی آجاتے تھے۔ مثلاً پہلی بار یورپ جاتے ہوئے دلّی آئے اور خواجہ نظام الدین اولیا کے مزار پر جا کر ایک نظم پڑھ دی بھئی ان کی بات اور تھی تم کیا گھاس جو دلّی کا نام ستّرہ برس سے نہیں لیا تو اب بھی نہ لو ورنہ کسی نہ کسی بہانے تمہارا پتّا کر دیا جائے گا۔

تو میں کیا گنگناؤں۔ کچھ بھی نہ گنگناؤں تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ روم میں رومیوں کی طرح رہو آئیں بھرنے شکوے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

اچھا تو دلّی کی ایسی تیسی۔ اجی لاحول ولا قوۃ۔ معاف کیجیے گا سرکار کبھی کبھی باپ دادا کی ہڈیاں چٹخنے کی آواز آجاتی ہے جو دلّی میں گڑی ہوئی ہیں ورنہ:

یہ تاب یہ مجال یہ ہمت نہیں مجھے

آ روم کھل جا۔ سم سم کی طرح کھل جا۔ مجھ میں تیرے دروازے توڑنے کی طاقت نہیں، جو تو مجھے خود دے دے گا اپنی جھولی میں بھر لوں گا نہ تیرے پیچھے بھاگوں گا نہ تجھ سے کچھ مانگوں گا میں خود ایک نئے وطن کا آدمی ہوں مجھے پرانی باتیں بھاتی ضرور ہیں مگر میرا جی اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل میں اٹکا ہوا ہے جن کا دوسرا نام پاکستان ہے۔ میں اور میرے بچے یعنی میری نسل اور اگلی نسل اور اس سے اگلی نسل پاکستان۔ پاکستان۔ پاکستان۔

آؤ ادیب بھائیو اور بہنو سب سے پہلے تمہارے مطلب کی بات کروں یا شاید یہ خود میرے مطلب کی بات ہے۔ روم میں ہزار ہا نوادر و عجائب ہیں مگر میں سب سے پہلے اپنی برادری میں پہنچتا ہوں یعنی ادیبوں کی برادری میں۔

روم لیڈو ریلوے سے دیا اوستین سو کی طرف چلو تو ایک قبرستان آئے گا۔ اس کا نام ہے غیر کیتھولک لوگوں کا قبرستان۔ یہاں بڑے بڑے مصوّر، فنکار اور ادیب دفن ہیں۔ ان میں کیٹس دفن ہے اور شیلے کی قبر ہے۔ بیرسی بیشی شیلے جو تیس برس کا بھی نہیں ہوا اور تیرتے ہوئے سمندر کی لہروں کی نذر ہو گیا۔ روایت ہے کہ اس کی لاش جلائی گئی تو تمام بدن جل گیا مگر دل سلامت رہا۔ وہ یہاں دفن نہیں مگر اس کی قبر اور اس پر یہ کتبہ لگا ہوا ہے۔ میں شیلے کا عاشق ہوں، لاکھوں کروڑوں پڑھنے والے عاشق ہوں گے۔ مگر آج میں نے اپنے محبوب کی قبر بھی

www.taemeernews.com

دیکھ لی ہے۔ یہ بڑے اعزاز کی بات ہے۔

اب کہاں سے چلوں؟ روم کا ایک سرا تو ہے نہیں، جو کوئی ایک طرف سے چل کر دوسری طرف پہنچ سکے۔ اس لئے آیئے یونہی الل ٹپ چلیں جو نظر آئے دیکھیں جو سمجھ میں آئے سمجھیں۔ روم زندگی کی طرح ہے جیسی گزرے جب تک گزرے گزار دو۔ باقی اللہ مالک ہے۔

یہ شاید روم کا سب سے شاندار منظر ہے۔ پیاتسا سان پیترو سینٹ پیٹر کا چوک۔ اس کے سامنے وہ گنبد دیکھیئے۔ غور سے دیکھیئے اور وسطی عمارت کے دونوں طرف جو عمارتیں ہیں ان کا طرز تعمیر دیکھیئے ــــ کیا آپ کو طرز تعمیر میں دلچسپی ہے ــــ بہرحال کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا بھر میں سب سے خوبصورت چوک ہے۔ دنیا میں نے کہاں دیکھی جو اس دعوے کی تائید یا تردید کروں مگر یہاں کھڑے ہو کر انسانی عظمت کا ایک عجیب اور حسین احساس دل و دماغ پر محیط ہو جاتا ہے۔ یہ عمارت بھی اٹلی کے عظیم معمار برنانی کی بنائی ہوئی ہے۔ برنانی یا برنینی جو یورپ بھر میں فن تعمیر کا باوا آدم کہلاتا ہے۔ اس عمارت میں اٹھاسی ستون اور دو سو چوراسی سہارے ہیں۔ یار و کالم کا ترجمہ جلدی سے بتاؤ میں کہنا چاہتا ہوں کہ اس میں دو سو چوراسی کالم ہیں مگر ترجمہ نہیں ملتا۔ لہذا سہارے کا سہارا لیتا ہوں (اہل اصطلاحات معاف فرمائیں۔)

اگر آپ کا جی چاہا تو ایک دن اس عمارت کے اندر بھی سیر کرا دوں گا۔ کیونکہ وہاں بھی:

ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

اب جگر تھام کے بیٹھیے اور کلوسیم دیکھیے۔ کولوسی یم۔ یہ انگریزی تلفظ ہے۔ اطالوی تلفظ ہے کلوسیو۔ مگر خیر تلفظات سے کیا ہوتا ہے۔ بلکہ ناموں سے بھی کیا ہوتا ہے۔ واہ رے بھگت کبیر کیسے غلط موقع پر یاد آیا ہے۔

رنگی کو نارنگی کہیں۔ بنے دودھ کو کھویا

یہ کولوسی یم قدیم روما الکبری کی سب سے زیادہ مشہور اور بدنام عمارت ہے۔ آپ جو امریکی، اطالوی فرانسیسی فلموں میں قیصروں کے سامنے تلوار بازوں اور جانوروں کے تماشے ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں، اسی عمارت میں کھیلے جاتے تھے۔ یہیں پیشہ ور تلوار باز، سزا یافتہ مجرم اور غلام اور عیسائی مبلغین درندوں کے سامنے چھوڑ دیئے جاتے تھے یہیں عیسائی مذہب پرست آگ میں جلائے جاتے تھے اس سے پہلے بھی ایک عمارت تھی جہاں یہ سب تماشے ہوتے رہے مگر ان تماشوں، ان مظالم کی یادگار جو عمارت باقی رہ گئی ہے وہ یہی کولوسی یم ہے۔ یہ سن بہتر بعد مسیح سے سن اسی بعد از مسیح تک یعنی آٹھ برس میں بن کر تیار ہوئی جب اس کا افتتاح ہوا تو روما میں پورے سو دن کا جشن منایا گیا تھا۔ ایک رات میں وقت کی خوشامد کر کے اس جشن میں شریک ہو گیا مگر

www.taemeernews.com

اس کا حال بعد میں آئے گا فی الحال تو اسی پر صبر کیجیے کہ کیا زمانہ ہوگا جب ایک عمارت تعمیر ہونے کی خوشی تین سو پینسٹھ دنوں میں سے سو دن تک منائی جاتی رہی۔

کولوسی ام چار منزلہ ہے اور اڑتالیس میٹر اونچا ہے بھئی میٹر کے فیٹ آپ خود بنا لیجیے۔ میں نے یہی سنا ہے۔ دیکھا یہ ہے کہ بہت اونچا ہے۔ کہتے ہیں اس میں پچاس ہزار آدمی بیک وقت بیٹھ سکتے تھے۔ اس کی چوتھی منزل کا آدھا حصہ زلزلوں اور حملوں سے ٹوٹ چکا ہے۔ اس کے پتھر بہت دنوں تک چرائے جاتے رہے اور پوری عمارت روم کی بدحالی کے زمانے میں برے حالوں رہی۔ مگر پھر پاپائے اعظم بینی ڈکٹ چہاردہم نے اسے ایک مقدس عمارت قرار دے دیا تو اس کی حفاظت شروع ہوگئی۔ دیکھیے وقت کی خوبیاں کہ اسی عمارت میں ہزارہا عیسائی جلائے گئے اور اسی عمارت کو تحفظ بھی عیسائیوں کے پیشوائے اعظم کے فیض سے حاصل ہوا۔ کیا مصرع لگے گا یہاں۔ کوئی چالو مصرع ہی سہی!!

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

کولوسی ام کے چاروں طرف چوڑی چوڑی سڑکیں ہیں۔ رات کو چاروں طرف زیر زمین غاروں سے اس پر تیز روشنیاں ڈالی جاتی ہیں۔ بقول کسے یہ ٹورسٹ اٹریکشن ہے۔ ضرور ہے مگر میرے لیے یہ ایک روز کا تحفہ ہے کیونکہ اس کے بائیں ہاتھ کو جو راستہ جاتا ہے نادہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھ جاتا ہے اور میری گلی یعنی افریقہ والی گلی اسی پہاڑی پر واقع ہے۔

آج کل میں قیصروں، تلوار بازوں، درندوں اور عیسائی مبلغین کا ہمسایہ ہوں

www.taemeernews.com

دایاں بایاں۔ تعمیرات

"ایکسکیوزمی۔ دا کے پارتے سی دا ایمبسی پاکستان" (معاف کیجیے گا۔ پاکستانی سفارت خانے کون سا راستہ جاتا ہے۔)

"لنگوتے وے رے دِتے آرمی؟"

اب لنگوتے وے رے دتے آرمی کے معنی کیا بتاؤں۔ یہ ایک سڑک کا نام ہے۔ جب نام اتنا لمبا ہے تو معنی طویل تر ہوں گے مگر سننے چاہییے۔ لنگو کا مطلب بڑا۔ تے وے رے دریائے ٹائبر کا اصلی نام ہے تے وے رے جیسے خوبصورت لفظ کو انگریزوں نے جس طرح بگاڑ کر ٹائبر کر دیا ہے اس پر آکسفرڈ اور کیمبرج کے تعلیم یافتہ یا ان کے تلفظی شاگرد خوش ہوتے ہوں گے مگر میں نہیں ہو سکتا۔ مجھے تے وے رے اچھا لگتا ہے۔ یہ لفظ خود ایک پیارے میٹھے دریا کی طرح ہے اور کس آسانی سے ادا ہو جاتا ہے مگر انگریز بیچارہ بھی کیا کرے اس کی زبان میں ت کی آواز ہی نہیں ہے۔ پھر بھی وہ ہمارے دیس میں ایک مکمل ترین زبان کہلاتی ہے کیونکہ ہمیں فرانسیسی، عاوی، جرمنی، اسپینی، روسی کسی اور زبان کا کچھ علم ہی نہیں۔

ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

ہاں پورے معنی تو سنتے چلیے د تے کو کا کے کی سمجھیے جیسے انگریزی میں THE کے مقامات ہیں آرمی فوج ہوئی فرق یہ ہے کہ یہاں آرمی ARME لکھا جاتا ہے۔ انگریز بہادر یہ لفظ یہیں سے لے کر گئے ہیں اور اس سادہ سے لفظ کے معاملے میں بھی ٹانگ مار گئے ہیں اور ای کی جگہ وائی کے ساتھ یعنی ARMY لکھتے ہیں۔ خیر:

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں والے

www.taemeernews.com

قصہ یہ ہے کہ جس محلے میں ہے ہمارا گھر، وہاں کوئی سوداگر نہیں رہتا بلکہ اس کے سامنے کبھی فوجی بارکیں ہوتی تھیں اور اب شاید اطالوی وزارت دفاع ہے۔ دریا کے ایک طرف وہ عمارت ہے اور دوسری طرف ایک چھوٹا سا گھر جس میں سفارت پاکستان واقع ہے مگر میرے محلے یعنی افریقہ والی گلی سے بغیر ٹیکسی یہاں پہنچنا ایک کمال ہے اور ٹیکسی میں چلیے تو یہ لمبا چوڑا فاصلہ کیا مال ہے بس اتنا ہے کہ مال کا زوال ہے۔

لہٰذا کوسی اویا انگریزی میں کولوسی ام کے ادھر والی پہاڑی سے ٹرام لی جائے گی جس کے متعلق پچھلے سیاحوں نے تو کچھ نہیں بتایا مگر رہنمائے سیاحاں نے بڑی بڑی تفصیلات بہم پہنچائی ہیں۔ فرمایا ہے کہ پچیس پیسے یعنی پچیس پیسے میں پورا روم دیکھ لو۔ اے بھائی لنگوٹے دے رسے وستے آدمی کیسے پہنچوں۔ کتاب رہنمائے سیاحت کا چھوٹا سا صفحہ مسکرایا اور کہا جس ٹرام پر (E) ای اور سنسٹرا (SINISTRA) لکھا ہوا نظر آجائے اس میں بیٹھ جاؤ۔ ایک نہ ایک دن منزلِ مقصود تک جا پہنچو گے۔

سنسٹرا یعنی (SINISTER) قسم کی کوئی چیز۔ یا اللہ سنسٹر تو انگریزی میں شیطنت، بدمعاشی بدنیتی وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ پر صفحہ ہنستا ہے اور سنسٹر کے معنی بتاتا ہے۔ اس کے معنی ہیں بایاں ہاتھ، بائیں سمت ــــ ادھر بھی یہ بائیں بازو یعنی لفٹسٹ کا چکر SINISTER کہلاتا ہے۔

ڈر کے مارے میں اس ٹرام میں بیٹھتے وقت چاروں طرف دیکھتا ہوں۔ کیا پتا کسی طرح یہ بات "ان" تک پہنچ جائے ادھر بیٹا تم بائیں بازو کے ہوا اچھا یہ تو "گھر" چل کر بتانا کہ روم میں سنسٹرا بائیں طرف گھومنے والی ٹرام پر لکھا ہوا تھا جو سفارت پاکستان کی طرف جاتی تھی۔ اس وقت ذرا ٹھنڈے ٹھنڈے چلو ورنہ .....

ٹرام بائیں ہاتھ کو چلتی ہے۔ بایاں ہاتھ یعنی شہر روم کو بائیں ہاتھ سے دائرہ بناتی ہوئی طے کرتی ہے۔ بائیں ہاتھ اور دائیں ہاتھ میں کیا فرق ہے۔ دایاں ہاتھ زیادہ طاقتور ہے۔ کیا واقعی؟

مگر کچھ لوگوں کا بایاں ہاتھ بھی دائیں ہاتھ کی طرح کام کرتا ہے بلکہ ان کا دایاں ہاتھ ویسا نہیں ہوتا تو پھر بائیں سے برائی کیوں منسوب کی جاتی ہے۔ سیدھے ہاتھ اور اُلٹے ہاتھ۔ دائیں اور بائیں کے سیاسی محاوروں اور اصطلاحات نے کب اور کہاں جنم لیا اور کیوں لیا جبکہ خدا نے دونوں ہاتھ ایک جیسے اور اپنی اپنی جگہ مفید اور ضروری بنائے ہیں۔ مگر یار خدا نے تو گورے اور کالے بھی بنائے ہیں اور یورپین بھی اور افریقی بھی اور ایشیائی بھی پھر بھی گورے گورے ہیں اور کالے کالے۔ تم اپنے محبوب کو چاند اور سورج سے تشبیہ دیتے ہو کالے توے سے کیوں نہیں دیتے۔

ان سوالوں کا جواب اس حقہ نقیر نے ولیس ولیس گھوم کر تلاش تو نہیں کیا مگر ذہن نشین کر لیا ہے۔ وہ جوا

www.taemeernews.com

نیا نہیں۔ عجیب نہیں۔ حیران کن نہیں۔ وہ بہت پہلے پوری انسانیت کو مل چکا ہے۔ چودہ سو برس پہلے خود محمد رسول اللہ صلعم کی زبانی مل چکا ہے مگر اب بھی کروڑوں انسان نہ اُسے سمجھتے ہیں نہ مانتے ہیں نہ سمجھنے پر تیار ہوتے ہیں نہ کسی کو سمجھانے دیتے ہیں۔ بس اے بوگس دانشورا اے خالی خولی سیاح تو کس شمار قطار میں ہے جو یہ بتائے کہ انسان انسان میں کوئی فرق نہیں گورے کالے میں کوئی فرق نہیں دائیں بائیں میں کوئی فرق نہیں سب اللہ کی مخلوق ہیں سب اس کی رحمتوں نعمتوں اور عنایتوں کے حق دار ہیں۔ بیٹا پہلے اپنے ہی ملک میں صوبائیت اور قبائلیت کا مسئلہ تو حل کرو پھر اس عالمی سطح پر گفتگو کرنے کی تکلیف کرنا۔

بہت اچھا۔

چل ' مرے خامے بسم اللہ

ٹرام میں روم متحرک تصویروں کی قطار کی طرح نظر آتا ہے۔ نیا' پرانا' امیر غریب روم۔ شاندار سڑکیں اور چھوٹی چھوٹی گلیاں۔ بندرر روڈ اور رلا لوکھیت اور بوہری بازار۔ اعلیٰ درجے کے کپڑے پہنے ہوئے موٹے موٹے اطالوی سگار پیتے تیزی سے موٹریں چلاتے ہیں اور اطالوی ٹیڈی بوائے دھاری دار بنیان پہنے ہوئے راستہ چلتی لڑکیوں پر آوازے کستے ہیں۔ سیاہ اور سفید لباسوں میں پادری اور ننیں قطاریں باندھے جا رہے ہیں جن کے لیے جگہ جگہ ٹریفک رک جاتی ہے۔ میں نیرو اور سیزروں کے کھنڈر دیکھتا ہوا جا رہا ہوں۔ جدید اطالیہ کی جھلکیاں بیچ بیچ میں ماضی کے جھروکوں میں نئے سورجوں کی چکا چوند پیدا کر جاتی ہیں۔ ٹرام چلے جا رہی ہے۔ زندگی کی طرح میری طرح عظیم ٹائبر یا لنگوٹے وے رے کی طرح۔

سفارت خانے میں داخل ہو کر ایک عجیب سا احساس ہوا وطن کی خوشبوئیں آنے لگیں:

اے وطن اے جان من جانان من

اس وقت دہلوی صاحب سفیر تھے مگر وہ اپنی خدمت کا جائزہ دے رہے تھے اور وزارت خارجہ کے معتمد ہو کر جا رہے تھے۔ وہ خوش ہو کر ملنے آئے' انھوں نے عام سفیروں کی سی بے اعتنائی سے کام نہیں لیا بلکہ اپنی شدید مصروفیت کے باوجود اس بندۂ ناچیز کو چائے کی ایک پیالی پلائی۔ کچھ پتے دیئے' ہنسے بولے اور میری تنخواہ ملنے کے احکام فوری جاری کر دیئے۔

تھینک یو سر' میں نے بڑے خلوص کے بہجے میں کہا۔ مگر میں جان گیا کہ یہ حضرت دور تک نہیں جائیں گے وہ افسری کیا جو چھٹ بھیتوں کو منہ لگائے۔

میں سفارت خانہ بند ہوتے ہوتے پہنچا تھا' وہاں ایک بنگلا ادیب ابوالکلام شمس الدین سے بھی ملاقات

www.taemeernews.com

ہوگئی یہ حضرت ہمارے گلڈ کے بنیادی رکن تھے اور اب اٹلی میں آکر ایسے بسے ہیں کہ واپس جانے کا نام نہیں لیتے۔ گپ شپ میں خاصی دیر لگی واپسی میں وہ بڑے اخلاق سے اپنی کسی شدید مصروفیت کے بہانے اکیلے اپنی فیٹ نمبر گیارہ سو میں رخصت ہو گئے اور میں پھر اکیلا رہ گیا۔ اب شام ہوگئی تھی۔ میں بے سمت متعین کیے چلنے لگا۔

"پارلا اینگ لی زے" ایک بہت سُریلی آواز آئی۔ اس نے پوچھا تھا کہ کیا تم انگریزی جانتے ہو۔

" نون سو پارلارے اطالیانو " (میں اطالوی نہیں بول سکتا) میں نے رٹا رٹایا جواب دیا کیونکہ مجھے اس وقت خبر نہیں تھی کہ مجھ سے کیا پوچھا گیا ہے۔

"آہ سی نور" وہ انگریزی میں بولنے لگی" آپ تو بہت قابل آدمی ہیں" میں نے اپنا سینہ ترچھا کرلیا اور سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر بے نیازی دکھائی "نہیں بس میں ہر ملک کی تھوڑی تھوڑی زبان بول لیتا ہوں"۔

پیچھے سے کسی نے دھپ سے میرے شانے پر ہاتھ مارا اور مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ ایک سلیقن حسینہ تھی جو میرے سامنے والی دبلی پتلی حسینہ کے مقابلے میں آئفل ٹاور لگتی تھی۔ اونچی اور دبیز۔

وہ دونوں اطالوی میں لڑنے لگیں۔ پھر ایک پوری قطار ایک فوج نے ہمیں گھیر لیا اور صلح کرائی گئی لیکن میرا مسئلہ جوں کا توں ہی رہا کیونکہ:

مہرباں غمزہ کناں ماہ وشان روما
حیرتی ہیں کہ ہمیں کس کی وفا یاد رہی

آیئے آج پورے چار شعر ہی سُن لیجیے۔ مگر ان سے پہلے حضرت اکبر الہ آبادی کے شعر بھی ملاحظہ ہوں۔ یہ ان کا منظوم خط ان کے صاحبزادے کے نام تھا جنھیں وہ پیار سے عشرتی کہتے تھے۔ فرماتے ہیں:

عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا عہد وفا بھول گئے
موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت آئی
چمنِ ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے

اب نذر اکبر کے عنوان سے خاکسار کا کلام بلاغت نظام ملاحظہ ہو جو یورپ میں تصنیف ہوا:

ہم کو یورپ میں کراچی کی فضا یاد رہی
وہی گرمی وہی مرطوب ہوا یاد رہی
ایک ہنگامہ ہے لندن مگر اس میں بھی ہمیں

www.taemeernews.com

تیرے ہی دل کے دھڑکنے کی صدا یاد رہی
شام پیرس نے بہت رنگ دکھائے ہمکو
اور وہی سادگیٔ رنگِ حنا یاد رہی
مہرباں غمزہ کناں ماہ وشانِ روما
حیرتی ہیں کہ ہمیں کس کی وفا یاد رہی

کیا جاہلانہ بات ہے یورپ میں رہ کر ایسی بکواس کرنے والا آدمی پڑھے لکھوں میں کیسے اٹھ بیٹھ سکتا ہے۔ مثل مشہور ہے نا:

خرِ عیسیٰ اگر بہ مکہ رود
چوں بیاید ہنوز خر باشد

یعنی اگر حضرت عیسیٰ کا گدھا مکے جاکر بھی واپس آئے تب بھی گدھا ہی رہتا ہے۔

چنانچہ اب یہ فقیر ماہ وشانِ روما کے ہجوم سے بے خطر کلتا ہے اور بدھا لنگوٹے وسے رسے کے کنارے کنارے چل پڑتا ہے مگر سچ بات یہ ہے کہ آنکھیں نیچی نہیں ہونے پاتیں۔ واہ علامہ اقبال کیا عمدہ یاد آئے ہیں:

پھول ہیں یا کہ ہیں پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

اُن میں عصمت فروشی ممنوع ہے مگر وہ تو پیرس میں بھی ہے۔ ارے بھائی کسی کار ستے میں کھڑا ہونا اور کوئی دوست مل جائے تو اس کے ساتھ چلے جانا تو ممنوع نہیں۔ نہ اپنے ہوٹل میں اوقات مقررہ کے اندر اندر کسی سے ملاقات کرنا ممنوع ہے۔ اب یہ اتفاق ہے کہ نازنینوں کے ہجوم عام طور سے شام کو اسی مقام پر لگتے ہیں بلکہ آج ہی اطالوی عدالت عالیہ نے ایک باریک قانونی نکتے پر اپنا فیصلہ سنایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر موٹر ایک مقام پر کھڑی نہ ہو تو وہ گھر کی طرح تصور کی جائے گی۔ ہوا یہ کہ کسی منچلے پولیس والے نے ایک جوڑے کو کار میں پکڑ لیا اور ایک بیہودہ الزام لگایا اس کے پاس عینی گواہ بھی تھے۔ معاملہ بہت دن زیر غور رہا ماتحت عدالتوں سے عدالت عالیہ میں پہنچا۔ بڑی بڑی قانونی موشگافیاں ہوئیں اور پھر فیصلہ ہوا کہ ایک جوڑا ایک کار میں ہو اور وہ کار عام مقامات سے دور ہٹ کر کھڑی ہو تو وہ ان کا گھر ہے۔

اے آنکھوں والو دیکھو اور عبرت پکڑو

www.taemeernews.com

مگر یہ بات میں بار بار دہراتا ہوں اور خود عبرت نہیں پکڑتا۔ آخر میں اقبال کا معنوی شاگرد ہوں۔

گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا

اب وہ لوگ دل تھام کر بیٹھیں جنھوں نے انگریزی فلم تھری کوائنز ان اے فاؤنٹین دیکھی تھی اور جس میں اسی مصرع سے ایک بے مثال گانا شروع ہوتا تھا

تھری کوائنز ان لے فاؤنٹین۔ ایک فوارے میں تین سکے۔

وہ ایک اطالوی تہذیبی اور عشقیہ کہانی تھی لیکن یہ گانا اتنا مشہور ہوا کہ یار لوگوں نے اس فوارے کا نام بھی تھری کوائنز ان اے فاؤنٹین رکھ دیا جہاں اس کا ایک حصہ فلمایا گیا تھا۔ لہٰذا میں آپ کو فوراً اس فوارے اس چوک کی طرف لیے چلتا ہوں جو فلم میں اور تصویروں میں بہت رومانٹک اور شاندار نظر آتا ہے۔

اس کا نام ہے فونتے نادی ترے وی یعنی تین فوارے۔ ایک تنگ گلی میں داخل ہوتے ہی ایک بڑا سا چوک کھل جاتا ہے۔ سامنے یہ منظر ہے یعنی فوارے ہیں اور پیچھے ایک تنگ جگہ میں ایک گھٹیا اور چھوٹا سا ریستوران ہے یعنی جو کچھ جلوہ ہے سامنے ہی سامنے کا ہے۔

یہ فوارے ۱۷۳۵ء میں تعمیر ہوئے تھے۔ بنایا ایک بیچارے فنکار سالوی نے مگر اب تک مشہور یہی ہے کہ ان کا خاکہ بھی عظیم معمار برنینی نے بنا رکھا تھا۔ سچ ہے بڑائی کو بڑائی کھینچتی ہے۔ اردو کا ایک مشہور شعر آپ نے سنا ہوگا:

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

مگر اس کے مصنف کا نام آج تک کسی کو معلوم نہیں۔ کہتے ہیں کہ قدما کے زمانے میں کسی نوعمر شاعر نے کسی مشاعرے میں پڑھا تھا۔

اب دوسرا شعر سنیے جو آج تک سوائے حیدرآباد دکن کے شہریوں یا اس خاکسار جیسے دو چار شوقینوں کے کسی کو یاد نہیں آپ نے یقیناً نہ سنا ہوگا:

سلاطین سلف سب ہو گئے نذرِ اجل عثماں
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

یہ شعر سابق کلام الملوک ملوک الکلام والے حضرت نظام حیدرآباد کا ہے جن کے اور بہت سے ایسے ہی اشعار ملوک الکلام کہلاتے تھے۔

www.taemeernews.com

خدانخواستہ میرا مطلب یہ نہیں کہ برنینی کوئی بڑا معمار نہ تھا۔ وہ یقیناً تھا لیکن یہ بیچارہ ساوی ہی جو کچھ بنا گیا ہے۔ وہ اپنی نظیر آپ ہے پھر بھی خاکہ برنینی ہی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ آج اشعارِ آبدار کی بھرمار ہے تو اس فقیر یعنی راقم الحروف کا ایک دوہا بھی سنتے چلیے یہ اب بھی مگر توجہ کا مستحق ہے۔

چھوٹے بڑوں کے سنگم کا سب دیکھ لیا انجام
بات بڑھایا جمنا نے پر ہے گنگا کا نام

ہاں تو قصہ تھا فوارہ تری وی کا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جو اس کے پانی میں سکے پھینکے گا وہ دوسری بار ضرور روم آئے گا۔ سکہ کسی قیمت کا ہو مگر سکہ ہو نوٹ وو ٹ نہ ہو کہ نوٹ بہرحال کاغذ ہے جو پانی میں جلد گل جاتا ہے۔ اور یہ بات مشہور کرنے والے سیاحوں کے جانے کے بعد غوطہ لگا کر نوٹ صحیح سالم واپس نہیں نکال سکتے۔

چنانچہ میں نے بھی کئی سکے پھینکے۔ روم یورپ کے راستے میں ہے — بلکہ کئی ہوائی کمپنیاں تو یورپ اسی کے رستے لے جاتی ہیں اس لئے اصلی جاذبیت روم کی نہیں بلکہ پورے یورپ کی ہے۔ دس بارہ آنے میں یورپ کے دو چار چکر مہنگے نہیں پڑتے۔

ویسے یہ فوارہ ایک عجوبہ ضرور ہے۔ اس کا فن تعمیر سمجھنے میں تو وقت لگے گا مختصراً یہ دیکھیے کہ وسط میں دو بڑی سیپیاں ہیں جن پر نیپچون دیوتا کا نشان ہے۔ دائیں بائیں دو مجسمے صحت و زراعت کی نشانیاں بنے کھڑے ہیں۔ اس فوارے میں سے تقریباً آٹھ لاکھ کیوبک میٹر پانی روزانہ ابلتا ہے اور اس کی رفتار تیز اور بڑی مترنم ہے۔ باشاید وہ ترنم جسے میں نے محسوس کیا اس پورے چوک کی فضا میں ہے جسے پانی بہنے کی آواز حسنِ سماعت کے سہارے نغمہ بنا دیتی ہے۔

"جی ہاں یہ سب آپ کا حسنِ سماعت ہے۔"
"آداب عرض!"

اب فوارے کی بات چھڑ گئی ہے تو فوارہ فیوری بھی دیکھ ڈالیے جو پیاتسا نووونا میں واقع ہے پیاتسا نوونا یعنی چوک نوونا جو ستر ہویں صدی عیسوی کے روم کا ایک مثالی مقام ہے۔ یہاں کبھی سرکس ہوتا تھا جلسے تماشے اور جشن ہوتے تھے۔ انہی جشنوں کی یاد میں کئی سو برس بعد یعنی سترہویں صدی میں یہ چوک بنایا گیا اور تین فوارے لگائے گئے جن میں سب سے زیادہ خوبصورت وسطی فوارہ ہے جس کا نام ہے دریا کا فوارہ یا دریا جیسا فوارہ۔ اطالوی نام پھونتینے ورنیں دو آپ دونوں بور ہو جائیں گے (ممکن ہے آپ نہ ہوں) اور یہ جو تین تقریباً عریاں

www.taemeernews.com

مجسّمے نظر آتے ہیں چار دریاؤں کے نام سے منسوب ہیں یعنی ڈینیوب۔ نائلس (شاید مطلب ہے دریائے نیل) گینجز (گنگا کا اطالوی تلفظ معلوم ہوتا ہے) اور ریو دی لاپلاتا۔ پلاتا دریا کہاں ہے یہ میں انسائیکلوپیڈیا دیکھ کر بتا سکتا ہوں مگر سیر کا مزا کرکرا ہو جائے گا۔ اہلِ جستجو خود دیکھ لیں۔ فی الحال تو اس فوارے، اس چوک اور اس کی عقبی عمارتوں کے نظارے کیجیے مزا لیجیے کہ :

چندان جیسے مناظر بھی کہاں ملتے ہیں

ذرا یہ یاد رکھیے کہ جب یہ شاندار اور یادگار عمارتیں تعمیر ہوئی ہیں اس وقت روم اٹلی کا صدر مقام نہیں تھا اس وقت اٹلی ایک سیاسی وحدت ایک انتظامی اکائی نہیں تھا بلکہ کئی ایک [illegible] ایک شہر سلطنتوں میں بٹا ہوا تھا پھر بھی زندہ دل رومی روم بناتے رہتے جس کا ایک مطلب یہ نکلا کہ کچھ حالات پیدا ہوتے ہیں کچھ پیدا کیے جاتے ہیں۔ قدیم روما اکبری کی بات چھوڑیے کہ اس وقت رومیوں کے پاس دنیا کی عظیم تر سلطنت اور قوت تھی۔ یہ روم تو سترھویں صدی کا ہے۔ جب وہ نہ امپرطانہ لا تنور اگرات کے باسیوں کے دل بڑے تھے حوصلے بڑے تھے اور وہ بڑے کاموں میں ہاتھ ڈالنے والوں کا مذاق نہیں اڑاتے تھے۔

واللہ اعلم بالصواب

اسی سلسلے میں وتوریو ایمانوئیل یا وکٹر ایمانوئیل کی یادگار بھی ملاحظہ کیجیے۔ یہ میری بڑی قیمتی تصویر ہے اور اس کے رنگ پاکستانی چھپائی میں پوری طرح نہیں آئیں گے۔ مگر شاید اس منظر سے آپ کو رومی عزائم اور بزرگ خیالی کا اندازہ ہو جائے۔ یہ یادگار بھی قدیم قیصروں اور شہنشاہوں یا "روما اکبری" کے زمانے کی نہیں بلکہ انیسویں صدی کی ہے ۱۸۸۵ء میں شروع ہو کر دس برس میں ختم ہوئی۔ دائیں بازو کے دو فوارے دو سمندروں کی تشبیہات ہیں اوپر چھت طناز گھوڑوں کے مجسّمے ہیں بیچ میں شاہ ایمانوئیل گھوڑے پر سوار ہے۔ یہ پورا منظر جس کے آگے ایک وسیع چوک اور آٹھ دس شاہراہیں کھل جاتی ہیں، ایک ہیبت، عظمت اور دلفریبی کا مرقع ہے۔ اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ علامہ اقبال روم کا موازنہ دلّی سے کرتے ہوئے وطنیت سے مجبور ہو کر ڈنڈی مار گئے کیونکہ دلّی میں جامع مسجد کے علاوہ کوئی قدیم عمارت پورے تاریخی تصور کے باوجود اتنی پھیلی ہوئی اتنی شاندار اور قوی الجثہ نظر نہیں آتی۔ ہاں لال قلعے کی اور بات تھی مگر وہ بادشاہوں کا محل تھا، یہ صرف یادگار ہے۔

خواتین و حضرات! ابھی میں نے قدیم روم یعنی اصلی تے وڈے روما اکبری کا پیکر شروع نہیں کیا ہے جس کے عجائب و غرائب اور نوادر ماضی کے رومان انگیز اینڈ عبرت آمیز دھندلکوں میں محفوظ پڑے ہیں۔ پتا نہیں آپ ان کے منتظر ہیں یا نہیں بہرحال اس وقت ماضی قریب سے گزر کر یعنی ان فواروں اور یادگاروں کو چھوڑ کر آیئے

www.taemeernews.com

دم بالکل جدید روم کا ایک عجیب حسین و جمیل نظارہ ملاحظہ فرمایئے اور مصنف سطور ہذا کو دعائے خیر سے یاد کیجیے۔

اس مقام کا نام ہے پالاز و دلا سول تا جسے اپنی سرکاری زبان میں سویلی زیشن پیلس یعنی عوامی زبان میں ایوانِ تہذیب کہا جاتا ہے۔ سفید پتھر کی سات منزلہ عمارت جس کے دونوں طرف جہل ستون قسم کی دو لمبی لمبی عمارتیں ہیں اور صف باندھے ہوئے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہیں

اس باغ کے وسطی حوض میں جس طرح سامنے والی سفید عمارت کی دو منزلوں کا عکس پڑ رہا ہے اسے دیکھ کر کیا محسوس ہوتا ہے آپ کی بات میں نہیں جانتا! اپنے فوری احساس کا بیان کر سکتا ہوں اور وہ کچھ یوں ہے کہ وہ خدا کیسا عظیم اور حسین ہوگا جس نے ایسی ایسی عمارتوں کے خالق معمولی انسانوں کی شکل میں پیدا کیے ہیں۔

اور جو یہ دانشور لوگ میری ملائیت اور بے وقت کی مذہبیت سے پھر خفا ہو گئے۔

پراٹھے شرابیں بدن اور مناظر

"اگر آپ نے روٹی پراٹھا نہیں کھایا تو کچھ نہیں کھایا" قہقہ لگاتی ہوئی اطالوی سینوریناگدیچے مالک ہوٹل وڈکاک حال مختار کار ایں خاکسار نے فرمایا۔

میں دل ہی دل میں ہنسا۔ یہ ہمیں پراٹھا کھلائیں گی۔ ارے مائی اپنا تو کلچر ہی پراٹھا کلچر ہے (یہاں ہم سے مراد نیم متوسط درجے والوں کا طبقہ ہے جو باہر مونچھ پر گھی لگا کر نکلتے ہیں)

مگر اطالوی پراٹھا غضب کا نکلا۔ اس کا اصلی نام ہے پیتسا (پی ت سا) جو انگریزی میں PIZZA لکھا اور پی زا بولا جاتا ہے۔ میدہ گوندھ کر یہ چوڑی نان بنائی، پھر انڈا ملا، ٹماٹر، پیاز، پودینہ، ادرک، کالی مرچ، نمک، پسا ہوا گوشت (مرغی، بکرے یا سور کا حسب دلخواہ) چھڑکا اور تنور میں رکھ دیا۔ کچھ تنور بجلی کے ہوتے ہیں، باقی اصلی تے وڈے پاکستانی تنور ہوتے ہیں۔ جوانی کی طرح دہکتے ہوئے تنور جو آن کی آن میں مٹی کو کندن اور کندن کو مٹی بنا سکتے ہیں۔

اب اس آنچ میں تپ کر جو روٹی پراٹھا یا پیتسا نکلتا ہے اسے اسی وقت کھا لیجیے۔ زبان ذرا سی جلے گی مگر وہ مزا ہی کیا جس میں جلنا نہ پڑے۔ پیتسا محبت کی طرح ہے گرم گرم، مسالے دار محبت، ٹھنڈا ہوا اور سارا مزا کافور ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے آٹے میں لئی ملا کر کھا رہے ہیں۔ کیونکہ انڈے، گوشت، ٹماٹر سب ٹھنڈے ہو کر پرانے شادی شدہ جوڑوں کی سی ہمواری اور کیفیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ پیتسا کو بار بار گرم کیا جا سکتا ہے اور پرانے شادی شدہ جوڑوں کو بھی (پتا نہیں اس معاملے میں کتنے بھائی بہن مجھ سے متفق ہوں گے)

پیتسا اٹلی کی سب سے سستی اور بقول کسے تگڑی غذا ہے۔ ایک پراٹھا مشکل کھایا جاتا ہے۔ اپنے حبیب

www.taemeernews.com

کا پیٹ آدھے میں بھر جاتا ہے۔ اس لیے قیمتیں بھی ٹکڑوں کے حساب سے ہیں۔ ضروری نہیں کہ پورا پراٹھا مول لیا جائے پونا آدھا بلکہ پاؤ بھی ملتا ہے۔ امرا اسے اضافی ڈش کے طور پر کھاتے ہیں جیسے ہمارے امرا کے دسترخوان پر کئی کئی کھانے ہوتے ہیں اور پتا نہیں چلتا کہ

کیا چیز ہے بنیادی

اور یہ اسپاگیٹی ہے۔ ای س پا گے ٹی۔ جسے یہاں انگریزی داں اسپاگٹی وغیرہ کہتے ہیں۔ حالانکہ سویاں کہہ سکتے ہیں موٹی موٹی لمبی ہوتی ہیں کہ روم سے کراچی تک بحری تار کا سلسلہ قائم کرنے میں کام آئیں۔ چمچے کانٹے چھری تینوں کی مدد سے کھانا پڑتا ہے۔ ہلکے مکھن کے سالن میں سیر سیر بھر موٹی موٹی لمبی سویاں ایک بڑا سا پتیسا اور آس پاس نہایت اطمینان سے لپ لپ کھاتے ہوئے ماہرین چوکنی انکھیوں سے میری بے بسی کو دیکھتے جاتے ہیں۔

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

"آہ سی نورا آپ پانی نہ پئیں۔ اس کے ساتھ پانی کا مزا نہیں بلکہ یہ سرخ شراب پیجیے۔ ہلکی بے خوش ذائقہ ہے اور نشہ آور نہیں" سینورتا گرو نے ایک موٹی سی بوتل بلاتی ہیں جو درخت کی چھال میں بندھی ہوتی ہے۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو میں یہ سرخ شراب نہیں پیوں گا" پتا نہیں میں نے یہ جواب کیوں دیا۔ اپنے اسلامی نام کی وجہ سے عقیدے کی وجہ سے یا خوف خدا سے جو پردیس میں کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔

اچھا تو آپ یہ پیجیے"

وہ اٹھلائیں اور ایک چھوٹی سی شیشی نما بوتل اٹھا لائیں۔

"اس کا نام ہے چن زانو۔ یہ شراب نہیں ہے سوڈا ہے باہر والے اسے شراب سمجھتے ہیں مگر یہ اٹلی کا کوکا کولا ہے۔"

وہ شیشی بہت پتلی تھی اس پر CHINZANO لکھا تھا آیا۔ یہ تو ہمارے ہاں بڑے بڑے ہوٹلوں میں بڑی بڑی بوتلوں میں ملتی ہے اور ہمارے امرا اور "فاسرہ" اور تجارا سے سن زانو کہتے ہیں۔ میں ہچکچایا۔

برابر سے میرے سب سے افریقی ڈاکٹر سالی آف گی نا نے زور سے کہنی ماری۔

"یار تم بڑے قدامت پرست ہو یا تم ہم لوگوں پر دھونس جما رہے ہو۔"

میرا خیال ہے اس وقت میرے پڑھنے والے بھی کچھ ایسی ہی بات کہہ رہے ہوں گے کیونکہ مجھے بار بار نیچے بیٹھ میں کہنیاں سی چبھتی محسوس ہو رہی ہیں اس لیے میں کچھ نہیں کہتا نہ یہ کہتا ہوں کہ پی نہ یہ کہتا ہوں کہ

www.taemeernews.com

نہیں پا۔ مگر عملی طور پر آپ جان لیجیے کہ اس کا نام چن زا نو ہے۔ سِن زا نو نہیں۔ اطالوی میں سی (c) کی آواز چے ہے یعنی سِنما کو چِنما کہیں گے۔ انگریز بیچارے کو چے کی آواز نکالنے کے لیے c کے ساتھ H کا دم چھلا لگانا پڑا۔ ہائے غریب انگریز اپنی زبان بنانے کے لیے کیسے کیسے مصائب سے گزرا ہے جبھی تو ہم نے دوسرا اور سستا نسخہ اختیار کیا کہ اپنی زبان کی خامیاں دور کرنے کی بجائے غیر ملکی زبان سے کام چلاؤ۔ میاں باہر سے موٹریں، جہاز اور مشینری بھی تو منگاتے ہو ۔

اطالوی لنچ کھانے کے بعد قیلولہ ضرور کرتے ہیں۔ یورپ کے انتہائی شمال میں ہونے کی وجہ سے یہ ملک ژیولیا کے بقول "گرم" ہے۔ روے میدے کا کھانا کھا کر یوں بھی نیند آتی ہے۔ چنانچہ ایک بجے دوپہر سے چار بجے سہ پہر تک کاروبار تقریباً بند رہتا ہے۔ "لنچ ٹائم" چار بجے ختم ہوتا ہے تو یار لوگ دو گھنٹے اور کام کرتے ہیں مگر ان دو گھنٹوں میں بھی پندرہ منٹ چائے کے وقفے کے نام پر آدھ پون گھنٹہ گپ اور آرام فرماتے ہیں۔ چھ بجے اوقاتِ دفتر ختم ہوئے اور

پھر موجِ ہوا پیچاں اے میر نظر آئی

مگر میں ابھی اس موج کے پیچوں سے پوری طرح واقف نہیں ہوا۔ نائٹ کلب مہنگے اور ساتھی (یا ساتھن) مانگتے ہیں۔ اکیلا آدمی کب تک گھومے۔ کہاں کہاں گھومے اور سب سے بڑی دقت زبان یار جو ترکی ہے اس کا کیا علاج کرے۔ "دو دن میں اطالوی سیکھو" بار بار پڑھی بلکہ ہر وقت جیب میں رہتی ہے مگر کچھ خاص کام نہیں آتی چنانچہ میں نے اپنا پڑاؤ ایک پل پر لگایا ہے جو میری طرح تنہا بھی ہے اور ہنگامہ پرور بھی۔ تنہا یوں کہ اکیلا ہے ایک ہے اور بے جان ہے۔ ہنگامہ پرور یوں کہ اس کے آس پاس بہت سے ہنگامے ہوتے رہتے ہیں۔ یہ قدیم روما کا سب سے مشہور پل ہے۔ انگریزی میں اس جگہ کا نام وہی انگریزی قسم کا ہے یعنی "ٹائبر برج" مگر میں اسے کنار تے وِرے رے کہتا ہوں۔ تے وے رے۔ ٹائبر پرانا گرگ باراں دیدہ تے وے رے جس نے سیکڑوں قیصروں کے جلوس دیکھے ہیں۔ سیکڑوں جرنیلوں کو فتح کے جلوسوں میں گھوڑے کداتے ہوئے دیکھا ہے اور تاریخ کی طرح چپ چاپ مزے سے بہے جاتا ہے۔ جب عیسائیت نے زور پکڑا تو اس کا نام سینٹ انجلو کا پل رکھ دیا کیونکہ اس کے پیچھے سینٹ انجلو کے نام سے منسوب ایک عظیم الشان قلعہ بنا ہوا ہے۔ مگر اصل میں ایسے مقامات کے نام کوئی نہیں ہوتے جیسے دنیا کا کوئی ایک نام نہیں ہے۔ زندگی کا کوئی ایک نام نہیں ہے۔

میں تقریباً ہر روز یہاں آتا ہوں اور یہ جو اُلٹے ہاتھ کو دریا کے کنارے دیوار بنی ہوئی ہے اس پر دریا کی طرف پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ پیچھے درختوں کا سایہ ہے جو دھوپ کی شدت یعنی حال کے اثرات سے محفوظ

www.taemeernews.com

دکھتے ہیں۔ سامنے تے وے رے ہے جو ماضی کا بائیسکوپ دکھاتا ہے (یہاں جھلکیاں کچھ مزا نہیں دیتا بائسکوپ کی بات ہی اور ہے) اور مستقبل کے لیے کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔

تے وے رے کے کنارے میں ہی اکیلا نہیں ہوتا بلکہ لڑکے لڑکیوں کے ہجوم ہوتے ہیں۔ بوڑھے اور متوسط عمر کے لوگ کم نظر آتے ہیں۔ بوڑھے اپنا وقت گزار چکے ہیں۔ جوان لوگ روٹی کے چکر میں مبتلا ہیں۔ نئی نسل اس چکر میں نہیں پڑتی وہ اپنے وقت کے خون کا ایک ایک قطرہ چوس لینا چاہتی ہے۔

سمے گزرتا جائے رے بابا۔ سمے گزرتا جائے

درختوں کی چھاؤں میں اور دریا پر بہتی ہوئی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سخت رومانٹک مناظر دیکھتا ہوں اور مسکراتا ہوں مجھے ان نوجوان جوڑوں پر رشک کیوں نہیں آتا میری اخلاقی اقدار کو کیا ہو گیا ہے مجھے کبھی نہ کبھی ایک نہ ایک تقریر دلپذیر کرنی چاہیے جیسے پادری لوگ کرتے رہتے ہیں مگر میں چپ رہتا ہوں بعض اوقات یہ مناظر بقول اردو والوں کے "حیا سوز" ہو جاتے ہیں مگر میں پھر بھی ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ آہا اب میں اس کا راز پا گیا۔ جواب یہ ہے کہ میری شخصیت دریائے تے وے رے کی شخصیت میں مدغم ہو گئی ہے۔ دریائے تے وے رے جس کا اُردو نام ہے مرزا اسد اللہ خاں غالب۔

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

تو یار کیا آدمی تماشا ہی دیکھنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ اشتراکی دانشور اسے بے ہمتی شکست خوردگی، انفعالیت کہے گا۔ کافی ہاؤس والا خالص دانشور اسے تماشا بھی نہیں کہے گا بلکہ کچھ اور کہے گا یا کچھ کہے گا ہی نہیں۔ اور بہت مجبور کیا گیا تو دریائے تے وے رے اور مرزا غالب دونوں کو بیوقوف اور قدیم کہہ کر اپنی نظم سنانے لگے گا۔

تو آؤ حرکت میں آؤ۔ حرکت میں بزرگوں کے بقول یوں بھی برکت ہے اور حرکت بہرحال صرف تماشے سے زیادہ دلچسپ ہے۔

یہ دیکھو طاق قسطنطین ہے۔ آئی۔ ایم سوری سر اس کا نام آرچ ڈی کانسٹانٹن ہے میں جلدی میں رو دبول جاتا ہوں اس کا خیال نہ کیجیے گا۔ گھٹیا آدمی کچھ نظر آئے رہتا گھٹیا ہی ہے۔ اور سوچنے سمجھنے کا موقع نہ دیا جائے تو اپنی زبان اور محاورے بولنے لگتا ہے۔ اس لیے پھر مزید سوری۔ اپالوجی ــ بات آرچ ڈی کانسٹانٹن کی تھی۔ یہ میرے ہمسائے ہیں لینی کولوسی یم کے ساتھ ہی چاروں طرف آٹھ سڑکیں نکلتی ہیں۔ بیچ میں یہ دروازہ ایک ہوشیار بادشاہ کی طرح سب کی نگہداشت کرتا ہے۔ اس کی تعمیر تین سو سولہ عیسوی میں

www.taemeernews.com

ہوئی تھی یعنی سولہ سو برس پہلے۔ اور اسے رومن پارلیمان نے جسے انگریزی میں سینٹ اور اطالوی میں سنات کہتے ہیں ایک عظیم الشان فتح کے بعد شاہ قسطنطین کے نام سے معنون کر دیا تھا۔ وہ زمانہ خاصا بوگس زمانہ تھا جب بڑی بڑی عمارتوں یا کتابوں کے انتساب کے لیے یہ ضروری تھا کہ "ممدوح" پہلے کوئی کام کر دکھائے تب اُسے گھاس ڈالی جائے گی۔ اب بتایئے ممدوح کو کیسے دشوار گزار مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ فوج لے کر جائے دشمن سے لڑے قلعے فتح کرے ملک بدر برسوں رہے اور فتحیاب آئے۔ کیونکہ اگر کوئی رومی بھاگ کر آتا تھا تو عمر بھر کے لیے جلاوطن کر دیا جاتا تھا۔ یا "تخت یا تختہ" کا بیہودہ اصول زور شور سے نافذ ہوتا تھا۔ نا بھائی ہم کو یہ قدامت پسند نہیں۔ انتساب کے لیے اور باتیں دیکھنی چاہئیں۔ اور وہ باتیں آپ سب کو معلوم ہیں، اس لئے تفصیل میں نہ جایئے۔ فی الحال تو قدیم رومیوں کی بے وقوفی کی یہ زندہ یادگار یعنی طاق قسطنطین دیکھیے جو بڑی شاندار عمارت ہے۔ قدیم عمارات میں اس کی نگہداشت یعنی مرمت حفاظت اور حرمت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ ایک تو اس میں قیمتی اور نادر پتھر بہت سے لگے ہوئے ہیں۔ چند پتھر قدیم ترین قیصروں اور جرنیلوں کے محلوں اور مقبروں سے اکھاڑ کر لگائے گئے تھے کیونکہ وہ فتح جس کے بعد یہ عمارت تعمیر ہوئی پوری سلطنت روما کے لئے بہت امپورٹنٹ یعنی اہم تھی اور اسی لئے سب نے :

پتھر پہ رکھ دیئے تھے کلیجے نکال کے

دوسرے اس کا محل وقوع ہمیشہ سے مرکزی رہا ہے اور اب سوسوا سو برس سے جدید روم کے نقشے میں اُسے ایک زبردست مرکز سیاحان کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ رات کو اس کے گرد بچھی ہوئی تیز تیز زیر زمین روشنیاں اسے چاروں طرف سے بقعۂ نور بنائے رکھتی ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کو اس کے سنگ مرمر کی تراش پر ایک لیکچر دوں، اس کے مجسموں اس کی تحریروں اس پر کھدے ہوئے نقش و نگار کی تفصیل بتاؤں۔ مگر مولانا ابو صالح اصلاحی مدیر "مشرق" لاہور نے فرمایا ہے کہ اس طرح تم ایک کتابی اینڈ آثار قدیموی محقق معلوم ہوتے ہو۔ زندہ چلتے پھرتے ناچتے گاتے سیاح نہیں لگتے۔ لہٰذا میں ان کے زریں مشوروں پر عمل کرتا ہوا آپ کو طاق قسطنطین کے بالکل سامنے والی سڑک پر لے چلتا ہوں جہاں سرِشام ایک میلہ لگتا ہے جس کے بیان کی ذمہ داری مجھ پر نہیں بلکہ مولانا ابو صالح اصلاحی سابق مدیر "کوہستان" راولپنڈی و حال مدیر "مشرق" لاہور پر عائد ہوتی ہے۔

اے ناظرین با تمکین یہ شام کا سہانا وقت ہے، طاق قسطنطین روشن ہو چکی ہے، کولوسی یم بھی روشن ہو چکا ہے، سب سڑکیں روشن ہیں۔ مگر یہ سامنے والی سڑک جو آپ کو اس دروازے کے بیچ میں سے نظر آئے گی۔ دونوں کناروں پر صرف رو دامنگ حد تک روشن ہے۔ اس کے دائیں طرف بقول میر اثر دہلوی :

www.taemeernews.com

دیانتہ نے ترتیب اک خانہ باغ

اور کیفیت یہ ہے کہ

کڑے کو چھڑے سے بچاتی چلی
جوانی کی شوخی دکھاتی چلی

کوئی ساٹھ ستر نازنینان ہر رنگ' قطاریں کھڑی ہیں سگریٹ پیتی ہیں ۔۔۔ اور بھق بھق دھواں اڑاتی ہیں۔ سڑک کے اس کنارے جدھر وہ کھڑی ہیں عین سڑک کے اوپر ایک طول طویل باغ کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے جس کا دروازہ پتا نہیں کدھر ہے۔ مگر میری گنہگار آنکھیں یہ دیکھتی ہیں کہ اس پٹری کا زیر قدم ایک یہ دوازہ ایک دریچہ ایک طاق قسطنطین ہے۔ ان نازنینوں کے آگے غیر ملکی باوردی نیوی والے نوج والے ہوا باز آہستہ آہستہ گزرتے ہیں۔ ہر چار پانچ نازنینوں کے بعد ایک موٹی سی بڑھیا یا ایک تگڑا سا نوجوان بھی کھڑا ہوتا ہے جس سے "بات" کی جاتی ہے۔ بات بہت جلد ختم ہو جاتی ہے اور لمحہ بھر میں نازنین دیوار پھاند کر باغ میں چلی جاتی ہے اور نیوی والا بھائی بھی چلا جاتا ہے۔

یہ سب قانوناً ممنوع ہے مگر طاق قسطنطین سے صرف پندرہ گز کے فاصلے پر پیش آتا رہتا ہے۔ یہ وہ روم ہے جہاں تقریباً سب کیتھولک عیسائی ہیں جن کے ہاں گناہ کا تصور اتنا نازک ہے کہ وہ طلاق کو ناجائز اور دوسری شادی کو حرام سمجھتے ہیں۔ یہ وہ روم ہے جہاں طاق قسطنطین سے صرف چار پانچ میل کے فاصلے پر وے ٹی کن یعنی عیسائیوں کا مقدس شہر آباد ہے جو اصل میں شہر روم ہی کا ایک حصہ ہے مگر انتظامی طور پر پاپائے روم کے تحت ہے۔

تو میری گنہگار آنکھیں یہ سب دیکھ رہی ہیں اور یہ بھی دیکھ رہی ہیں کہ چھوٹی بڑی موٹریں بھی اس سڑک کے دائیں کنارے آ رکتی ہیں اور لمحہ بھر میں ایک یا دو یا تین نازنینیں ان میں داخل ہو جاتی ہیں اور موٹریں ہوا ہو جاتی ہیں۔ چلو یار چھوڑو:

ایک پہلو یہ بھی نکلا روم کی تصویر کا

اچھا پیارے تو اب:

دوسرے پہلو بھی دیکھو روم کی تصویر کے

۔۔ت جگہ کا نام ہے کیپٹول (کے پی ٹول) یہی نام آپ نے امریکی صدر مقام واشنگٹن کے سلسلے میں ۔۔۔سنا ہو گا۔ وہاں بھی کیپٹول نامی ایک گنبد والی عمارت ہے جہاں امریکی مقننہ یعنی سینٹ یعنی سنات

www.taemeernews.com

ہیشتی ہے بقول امریکیوں کے آج دنیا کا سب سے اہم مقام کیپٹول ہے۔ یہ لفظ بھی سات کی طرح اٹلی سے امریکہ لے جایا گیا ہے۔ بہرحال اس سے ہم کو کیا غرض کہ کون کہاں سے کیا لے گیا۔ اور پھر اسے کس طرح اپنایا۔ خود ہماری ہزارہا کتابیں لندن کے کتب خانوں میں مقید ہیں جن کے بل پر یورپ میں مستشرقین آج تک مشرقی علوم میں اپنی مہارت کی دھونس جماڑتے ہیں

آپ کو معلوم ہے یا شاید معلوم نہیں کہ روم سات پہاڑیوں پر بنا ہوا ہے اب وہ پہاڑیاں سڑکوں کے اتار چڑھاؤ میں بدل گئی ہیں اور کہیں کہیں محسوس ہو جاتا ہے کہ ہاں بھئی یہ کوئی الگ پہاڑی ہے۔ یہاں سے اس مقولے کی صداقت بھی معلوم ہوتی ہے کہ "روم ایک دن میں نہیں بنا"۔ یہ عمارت بھی ان سات میں سے ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ قدیم زمانے میں یہ سیاسی اور مذہبی مرکز کا درجہ رکھتی تھی۔ اب سیاحوں کی زیارت گاہ ہے۔ اس جگہ سے بڑی بڑی یادیں وابستہ ہیں۔ ایک رومی حاکم ٹائرس گراچس ۱۲۳ قبل مسیح میں اسی مقام پر قتل کیے گئے تھے اور — مگر پھر یہ تاریخ شروع ہو جائے گی۔ یہ سامنے مندر ہے۔ مندر یا عبادت گاہیں۔ ان کے زینے ملاحظہ کیجیے۔ ان پر نصب مجسمے ملاحظہ کیجیے۔ یہ سب اس وقت بنے ہیں جب رومتہ الکبریٰ کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ زوال پذیر قوم اپنے عروج کو نہ بھولی اور عروج حاصل کرنے میں ناکام ہوتے ہوتے اس کی یادگاریں قائم ہوتی گئیں کیپٹول قدیم رومتہ الکبریٰ کی نشانی نہیں بلکہ ان جمہوری روایات کی یادگار ہے جو قدیم رومنوں نے قائم کی تھیں۔

لطیفہ: سنہ پندرہ سو بیس میں اس کے حصار ٹوٹ گئے تھے اور مدتوں یہ بے ترتیب بے مرمت پڑی رہی۔ یہاں تک کہ مشہور مصور اور معمار مائیکل انجلو نے اس کی ترتیب نو اور تزئین کا منصوبہ بنایا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں بھی ایک فنکار ہی کام آیا۔ فنکار چوتھے درجے کا شہری یعنی وہ طبقہ جس کا ایک ادنیٰ فرد یہ حقیر فقیر پُر تقصیر بھی ہے۔

اب کہ خوبصورت اور تاریخی عمارات کا چکر چل پڑا ہے (کیونکہ مولانا ابو صالح اصلاحی کے خوف سے خوبصورت اور جدید خواتین روما کا ذکر ختم ہو گیا ہے) تو ذرا یہ مقام بھی ملاحظہ کر لیجیے جسے تری ٹی تاری مونتی کہتے ہیں۔ تری ٹی تی کو انگریزی میں ٹری نی ٹی کہیے تو فوراً سمجھ میں آ جائے گا کہ مطلب تین سے ہے اور بات بھی یہی ہے کیونکہ یہاں تین فوارے بھی ہیں اور اس مقام سے عیسائی روایات بھی منسوب ہیں۔ یہاں پہنچنے کے لئے پیالساوے ٹی شیا سے چلنا پڑتا ہے۔ یوں آپ کہیں سے چل کر کہیں پہنچ سکتے ہیں۔ مثلاً کراچی سے چل کر براہ نیویارک سان فرانسسکو، ہوائی، ٹوکیو، ہانگ کانگ، بنکاک، ڈھاکہ ہوتے ہوئے لاہور پہنچ سکتے ہیں۔

www.taemeernews.com

بہت سے لوگ اپنے مطالب کے اظہار میں ایسے ہی رستے اختیار کرتے بھی ہیں۔ مگر میں سیدھا انگھڑ آدمی سیدھا ہی چلتا ہوں پیا تسا دے فی شیا سے چل کر اس پہاڑی تک سیدھا پہنچ جاتا ہوں۔ ایک فوارے کے پاس اس طرف والی دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتا ہوں جدھر موٹر کار کھڑی ہوئی ہے اور سامنے سرخ اور زرد پھولوں کی نوجوانی اور سیڑھیوں کی قدامت پر غور کرنے لگتا ہوں۔ اسے بزرگ قدیم و جدید کا امتزاج کہتے ہوں گے پتا نہیں آج کل کے دانشور کیا کہتے ہیں میں صرف ایک حسین منظر کہہ سکتا ہوں۔

آج میں آپ پر خاصا مہربان ہوں یعنی اس مقام کی مکمل تاریخ بتانے سے گریز کرتا ہوں۔ اس کی سیڑھیوں کی تعداد بھی نہیں بتاتا۔ اس کی دائیں بائیں والی عمارتوں کی اہمیت بھی نہیں بتاتا کیوں کہ یہ داؤں میں کسی اگلے باب میں ماروں گا۔ اس وقت تو صرف اس چوک کو دیکھیے اور وہ لطف اٹھائیے جو میں نہیں اٹھا سکا کیونکہ جب دن میں اس طرف آیا ہوں میرے گھر سے ایک خط آیا جس میں یہ اطلاع تھی کہ میری والدہ پھر بیمار ہوگئیں۔

آج یورپ کے ایک دلچسپ سستے ہنگامہ پرور مگر میرے لئے تنہا شہر روم میں دور دراز بیمار ماں کی یاد اس طرح ستا رہی ہے جیسے کئی دن کا بھوکا بچہ دودھ کے لئے بلکتا ہے اور منہ سے کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ اس کی زبان اس کی ماں کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔

www.taemeernews.com

مُردہ شہر اور زندہ شہر

آپ روم سے اکتا گئے ہوں گے۔ میں نہیں اُکتایا بلکہ ابھی تو اصلی یعنی پرانا روم شروع ہی نہیں ہوا لیکن چلیے ذرا روم سے باہر بھی ہو آئیں کیونکہ اٹلی صرف روم ہی نہیں ہے حالانکہ یہ بھی درست ہے کم از کم ہمارے لیے اٹلی روم کے بغیر کچھ نہیں۔

اب آدمی روم سے پہلے کہاں جائے۔ وینس خوبصورت اور قدیم وینس جو پانی پر بنا ہوا ہے یعنی جس کے گرد پانی ہے جہاں سڑکیں نہیں ہیں بلکہ سڑکوں کی جگہ چھوٹی چھوٹی نہریں ہیں یا نیپلز وہ بندرگاہ جس کے بارے میں ملاح اور سیاح طرح طرح کی کہانیاں ساتھ لاتے ہیں (ملاح صاحبان اور سیاح صاحبان دونوں معاف فرمائیں کیونکہ یہ بات صرف قافیے کی نہیں بلکہ میں ان دونوں میں کوئی فرق نہیں سمجھتا) یا سسلی جسے گا سسلی جس کا عربی نام صقلیہ ہے۔ جزیرہ صقلیہ جہاں پہاڑوں کے بیچ میں قدرت نے نیلے نیلے چشمے بنا رکھے ہیں اور جو سیاحوں کی جنت کہلاتا ہے۔ شاید آپ میلان جانا پسند نہیں کریں گے کیونکہ وہ ایک صنعتی شہر ہے اور آپ کو صنعت و حرفت سے دلچسپی نہیں ہوتی چاہیے۔ صنعت و حرفت یا بہ الفاظ دیگر اقتصادیات سے دلچسپی برگس لوگوں کی عادت ہے۔ ہم ایشیائی وضعداروں کو اقتصادیات سے کیا تعلق یہ سب مادی اور دنیاوی باتیں ہیں اور ان پر غور و فکر محنت طلب ہے اور محنت اس گرم علاقے میں ناممکن ہے اور جو ہو بھی تب بھی اس میں کچھ مزا نہیں۔ چنانچہ میں آپ کو میلان نہیں لے جاؤں گا جو جدید ہے اور اٹلی کا تجارتی اور صنعتی مرکز ہے۔ یوں بھی وہ شمال میں واقع ہے اور اطالوی تاریخ اور حسن کے خزانے جنوب مغرب میں بکھرے ہوئے ہیں۔

یہ پومپی ای ہے جسے انگریزی واں پومپی آئی کہتے ہیں۔ پومپی آئی نیپلز کے ساتھ ہے بلکہ نیپلز میں ہے لیکن

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

www.taemeernews.com

یہ ایک عظیم اور خوشحال شہر تھا جو اُجڑ چکا ہے بجھ چکا ہے ختم ہو چکا ہے اور شاید ابھی زندہ ہے کئی سو برس ہوئے جب ایک رات اس شہر کی عیاشیاں، بدمعاشیاں، سازشیں اور ہوس پرستیاں عروج کو پہنچی ہوئی تھیں ایک قہر خداوندی نازل ہوا۔ ایک زلزلہ آیا اور پورا شہر زیرِ زمین چلا گیا پومپی آئی جسے دیکھنے یورپ ہی نہیں ایشیا تک کے زائرین جوق درجوق آتے تھے لمحے بھر میں ختم ہو گیا۔ اس کے مکان کھنڈر بن گئے اور مکین کھنڈر میں دفن ہو گئے۔

مجھے یہاں بابل کے کھنڈر یاد نہیں آئے۔ ان کی عظمت زیرِ زمین نہیں گئی تھی بلکہ ان کو آسمان کھا گیا تھا لیکن پومپی آئی کو زمین نے ہضم کر لیا اس طرح کہ آج تک ہزاروں ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی کوشش کے باوجود پورے شہر کو اُگلنے پر تیار نہیں ہے۔

بچو، دوستو، بزرگو، افسرو، حاکمو اللہ کی گرفت بہت سخت ہوتی ہے۔ یہ کھنڈر جو بائیں ہاتھ کو چلے گئے ہیں۔ نہ جانے کن کن امرائے عظام کے مسکن ہوں گے۔ ان میں ایرانی قالینوں پر ہندوستانی باندیاں رقص کرتی تھیں اور فرانسیسی طوائفیں مہمانوں کو شراب پلاتی تھیں۔ انھی محلوں میں ہائی پالیٹکس بھی ہوتی تھی، شہزادے وزرا، فوجی افسر ایک دوسرے کے موافق اور خلاف سازشیں کرتے تھے۔ پرمٹ بانٹتے تھے، عہدے تقسیم کرتے تھے، بادشاہوں کو بنانے اور بگاڑنے کے چکر میں مبتلا رہتے تھے۔

اور اب وہ سب کھنڈر ہیں، خاک ہیں، اور پتھر جن کا عام اور مشہور نام عبرت ہے اور جسے میں اس کی عمومیت کے باوجود بار بار دہراتا ہوں مگر سننے والے نہیں سنتے سمجھنے والے نہیں سمجھتے اور اگر سمجھتے ہیں تو خدا سے ڈرنے کے بجائے غصے میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ تو آپ نے بھی سنا ہے کہ غصے سے نزلہ پیدا ہوتا ہے اور نزلے کے بارے میں سب حکیم ڈاکٹر جانتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی پر گر کر رہتا ہے۔

چنانچہ پومپی آئی سے جلد باہر نکل جایئے مبادا آپ کو عبرت کی بجائے غصہ آ جائے جس سے نزلہ پیدا ہو کر کسی عضوِ ضعیف پر گر جائے۔ کچھ ہی مدت بعد نہ آپ رہیں گے نہ آپ کا غصہ نہ آپ کا نزلہ نہ عضوِ ضعیف بلکہ سب پومپی آئی بن جائیں گے۔۔۔ سب کھنڈر ہو کر رہ جائیں گے۔ سب کا نام بدل جائے گا اور سب کو ایک نام سے یاد کیا جائے گا اور وہ نام وہی پرانا نام ہے۔ پرانا سڑا ہوا نام۔ تاریخ۔

تو پھر کہاں چلا جائے۔ نیپلز سامنے ہے بلکہ نیپلز بغل میں ہے۔ وہاں بندرگاہ کے علاقے میں چل سکتے ہیں۔ جہاں سیاح اور ملاح وقت گزاری کے لیے:

اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

www.taemeernews.com

مگر یہ بات تو عالمی ہے، ہر جگہ ہر ملک میں ہے ہاں ہر ملک نہ پہر سہی۔ سو اب میں یہاں کی دواسازی کے مشاہدات کیا بیان کروں۔ آج کل کسی بات پر بھی عریانی کا الزام اتنا عام ہے کہ یہ فقیر بدنام ہونے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے مختصراً سن لیجیے کہ "یار نیپلز کی بھی کیا بات ہے۔"

بس مشین کی طرح ہے ادھر بٹن دبایا اور ادھر کارڈ باہر آیا۔ اب اس کارڈ پر کیا لکھا ہوا ہے یہ آپ کی قسمت ہے اور قسمت ہنستے ہنستے بدلتی رہتی ہے۔ یہاں کا ہفتہ قسمت جہازوں کی آمد و رفت سے بنتا بگڑتا ہے آخر مارکیٹ ہے نا مارکیٹ میں بھاؤ ڈیمانڈ اینڈ سپلائی کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔

ویسے میں آپ کو نیپلز یونیورسٹی لے جاتا جہاں پر وفیسر الیزندرو بوزانی اردو پڑھاتے ہیں۔ انھیں ہم انگریزی والے الگزنڈر بوسانی کہتے ہیں اور یہ حضرت بار بار پاکستان آتے رہتے ہیں اور بیکار اردو کی حمایت میں تقریریں بھی کرتے ہیں۔ ویسے انھیں حکومت پاکستان نے ستارۂ امتیاز بھی عطا کیا ہے لیکن حکومت نے تو مولوی عبدالحق مرحوم کو بھی ہلال قائد اعظم دیا تھا اور اس کے باوجود اردو وہیں کی وہیں رہی جہاں ان ہلالوں اور ستاروں سے پہلے تھی۔

(اس وقت ایکدم تھیٹریکل انداز میں نعرہ لگانے کو جی چاہتا ہے کہ اردو کا سورج خود چمکے گا، چمک کر رہے گا)

مجھے اچھی طرح معلوم ہو چکا ہے کہ آپ کو یونیورسٹیوں سے دلچسپی نہیں ہے اس لیے اگر میں آپ کو نیپلز یونیورسٹی لے چلا تو آپ ہاتھ چھڑا کر بھاگ جائیں گے جس ملک میں خود عوام اور تجار اور امرا اور جاگیرداروں نے ایک یونیورسٹی بھی نہ بنائی ہو اور سب کام حکومت پر چھوڑ رکھا ہو اس ملک والوں کو غیر ملکی یونیورسٹی دکھانے سے کیا فائدہ۔

تو بس اب نیپلز میں کیا رہ گیا۔ بندرگاہ کے مناظر سودہ کراچی جیسی بندرگاہ سے مختلف نہیں ہیں سوائے اس کے کہ وہاں عورتیں بھی کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں اور یہاں سب خشکا ہی خشکا ہے۔ رہے عجائب خانے، کتب خانے، نوادر، مجسمے تو آج میں بھی انتقاماً ان کی بات نہیں کروں گا۔ یہ جذبۂ انتقام اس احساس کی پیداوار ہے کہ اٹلی میں ہر شہر ہر قریے میں ان سب کی بہتات ہے اور میرے ملک میں جو کچھ ہے وہ بھی ملیامیٹ ہوئے جاتا ہے اس لیئے مجھے دوسروں کی اچھی چیزیں دیکھ کر بار بار غصہ آتا ہے۔

آؤ میاں من جاؤ کچھ دیکھو کچھ دکھاؤ نیپلز نہ سہی وینس سہی مگر وینس بجائے خود ایک الگ مضمون ہے ایک دنیا ہے ایک تجربہ ہے اس لیئے ابھی اس کا پردہ سمیں پر جھینپی سے انتظار کیجیے فی الحال فلارنس کا ایک تماشا دیکھیے جو روایتی انداز میں کھیلا جاتا ہے فلارنس اٹلی کے خوب صورت ترین مقامات میں شمار ہوتا ہے۔ یہ بھی پھولوں کی بہتات، حلاوت اور مناظر کے حسن نے شیلر جیسے سخت دلوں سے بار بار اس شہر کی تعریف کرائی تھی۔

www.taemeernews.com

میں تو بالکل ہی رفیق التعب آدمی ہوں ابھی چل پڑا تو صفحے کے صفحے بلکہ کتاب کی کتاب فلارنس کی تعریف میں بھر دوں گا مگر میں آپ سے بہت ڈرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو پھولوں اور مناظر سے بھی دلچسپی باقی نہیں رہی اس کی ایک وجہ میں جانتا ہوں اور کئی وجوہ آپ جانتے ہیں لیکن ابھی انھیں کھل کر ظاہر کر دینے کا وقت نہیں آیا۔ نہ جانے کس کا شاید ایک نسبتاً گمنام مگر بڑے شاعر کا شعر سنتے چلیے۔

کھل کر ترا افسانہ سُنا دوں تو ہو کیا رنگ
عالم بہ اشارات نہاں جھوم رہا ہے

اور اس کی تحریف یعنی ایجادِ بندہ بھی ملاحظہ فرمایئے، حضرت نہال سیوہاروی سے معذرت کے ساتھ:

کُھل کر کوئی افسانہ سنائے گا نہ ہرگز   بندہ بہ اشارات نہاں گھوم رہا ہے

یہ فٹ بال میچ کی تصویر ہے، میچ کو مقابلہ کہتا تو بچے اور پڑھے لکھے بات ہی نہ سمجھتے اس لیے مجبوری معاف: انجمن ترقی اردو کی بات مانوں تو کافی باذوقوں سے ربط ختم ہو جاتا ہے یعنی جن سے بات کرنی ہے وہ سمجھنے سے معذور نظر آتے ہیں اس لیے انجمن معاف فرمائے بندہ مقابلے کی جگہ میچ ہی استعمال کرے گا۔

یہ میچ پرانی وضع کے لباسوں میں کھیلا جا رہا ہے۔ بقول کسے تاریخی روایات کے احترام میں جہاں اور جشن منائے جاتے ہیں وہیں یہ بھی سہی۔ منظر بڑا شاندار ہے سمجھ میں بہت کم آتا ہے مگر دیکھنے اور سمجھنے میں ہمیشہ سے فرق رہا ہے اس لیے صرف اس تصویر کو دیکھیے اور عکاس یعنی فوٹوگرافر کو دعائے خیر سے یاد کیجیے (جو میں نہیں ہوں)

کیا چلتے چلاتے خواتین ایک دلچسپ لباس دیکھنا پسند کریں گی۔ اس تصویر میں ایک خاتون نیگرو تہذیب کا نمائندہ لباس پہنے کھڑی ہیں شکر ہے کہ یہ بہت خوبصورت نظر نہیں آتیں بلکہ خوبصورت ہیں ہی نہیں ورنہ خواتین اسے دیکھنے ہی سے انکار کر دیتیں۔ میرا مقصد صرف اس لباس پر توجہ دلانا ہے یعنی یہ کہنا ہے کہ اٹلی میں سبھی عورتیں صوفیا لارین نہیں ہوتیں بلکہ ایسی بھی ہوتی ہیں جیسی یہ خاتون ہیں۔ یہ لباس صرف تہواری یا تاریخی قسم کا لباس نہیں بلکہ اس علاقے کی اکثر خواتین اسے برابر پہنتی ہیں اور پھر بھی ان کے شوہر انھیں نہیں چھوڑتے نہ ان کے بھائی ان سے شرماتے ہیں نہ ان کے باپ بے عزتی محسوس کرتے ہیں۔ اس سے آپ پر یہ بھی ثابت ہو گا کہ اٹلی کے کچھ مشہور علاقے ہمارے مقابلے میں کتنے پسماندہ ہیں جہاں عورتیں نیم برہنہ اور چست لباس نہیں پہنتیں اور پھر بھی زندہ رہتی ہیں۔ اگر ہمارے شہروں میں یہ وبا آ جائے تو ہم ترقی یافتہ اقوام کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔

اچھا اس لباس کو چھوڑ کر ایک دم ایک عجیب و غریب منظر دیکھیے میں نے ایسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ مقام ہے مونتی جاتی نی یعنی کرہ جاتی نی۔ اس کے محل وقوع کی تفصیل میں نہ جایئے بلکہ ان سفیدے کے درختوں

www.taemeernews.com

کی ترتیب یا ترکیب دیکھیے (ترکیب اچھا رہتا مگر ترتیب ذرا قانونی لفظ ہے) کیا میں اس منظر کو بغیر تصویر دکھائے بیان کر سکتا ہوں۔ آہا دیکھیے تلسی داس نے کیا بات کہی تھی بھئی معاف کیجیے گا ادب کے معاملے میں ہندو مسلمان عیسائی کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور تلسی داس کو تو یوں بھی معافی ہے کہ وہ اسلام سے بہت پہلے کا آدمی ہے کہتا ہے:

"تیری تعریف کیسے کروں کیونکہ آنکھ کو زبان نہیں ملی اور زبان کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔"

بائی دی وے یہ مضمون بہت سے شعرائے یورپ و اُردو نے چرایا ہے ایک بار میں نے بھی چرایا تھا مگر میراجی مرحوم نے پکڑ لیا۔ چنانچہ انتقاماً اور ایمانا کم از کم اُردو دنیا پر ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ مضمون اصل میں تلسی داس کا ہے۔

ابھی ہم روم سے باہر ہی رہیں گے کیونکہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اٹلی کا نام صرف روم نہیں ہے۔

www.taemeernews.com

کچھ سیاست کچھ سیاحت

اٹلی نہایت مزے دار ملک ہے۔ چٹپٹا چٹخارے دار۔ رنگ برنگ۔ ہمارے اعتبار سے بہت امیر۔ یورپی اقدار کے مطابق غریب مگر اس وقت اصل قصہ امیری غریبی کا نہیں بلکہ چٹخارے کا ہے اور ہم مرچ کھانے والے ایشیائی غذائیت سے زیادہ چٹخارے پر جان دیتے ہیں۔

یہاں کی سیاست ہی دیکھیے۔ ایک طرح ہماری قبل از مارشل لا سیاست سے ملتی جلتی ہے۔ کوئی اکیلی پارٹی اس قابل نہیں کہ کسی معقول مدت کے لیے ایک مضبوط وزارت بنا سکے نتیجہ یہ ہے کہ کولیشن یعنی مخلوط وزارت بنتی ہے اور مخلوط حکومت کا مطلب تو آپ جانتے ہی ہیں کہ کیا ہوتا ہے اور اس سے بعض اوقات کیا کیا نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔

یہاں کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی کرسچین ڈیموکریٹ یا عیسائی جمہوریہ والی پارٹی کہلاتی ہے مگر وہ بھی کوئی سیدھی سادی یک خیال پارٹی نہیں۔ کہنے کو یہ ایک طرح کی چرچ پارٹی یعنی گرجا پارٹی ہے یعنی اس پر عیسائیت کے مرکز ویٹی کن کا اثر غالب ہے۔ لیکن اس گرجا پارٹی میں بھی دایاں بازو اور بایاں بازو موجود ہے اور جب بات دائیں بائیں کی ہو تو وہاں مرکز ضرور ہوتا ہے جسے انگریزی میں مڈل آف دی روڈ کہتے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی کہ ایک پارٹی میں اتنے سارے گچھے ہوں۔ مگر ہیں۔ ساری دنیا میں ہیں۔ بھارتی کانگریس پارٹی میں بھی ہیں۔ جدید سیاست کے تقاضے کچھ ایسے ہی ہیں۔ طرح طرح کے گروہ ایک مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں اور پھر بھی اپنی انفرادیت قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ شاید یہ تضاد خود آدمی کی ذات سے پیدا ہوتا ہے۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر

اٹلی کی پارلیمنٹ میں کل پانچ سو چھیانوے اراکین ہوتے ہیں۔ پتا نہیں چھ سو کیوں نہیں ہوتے یا ساڑھے

www.taemeernews.com

پانچ سو کیوں نہیں ہوتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حلقہ ہائے انتخاب کی پیچیدگیاں ہیں۔ سو یہ بھی سہی۔ ہاں تو پانچ سو چھیالیس میں گرجا پارٹی کے اراکین دو سو تہتر ہیں یعنی خالص اکثریت میں کوئی تیس کی کمی رہتی ہے۔ بس یہی کمی کیسے کیسے بقراط اصول پرستوں کو روز طرح طرح کے سیاسی سمجھوتوں پر مجبور کرتی رہتی ہے۔ دیکھیے وزارت سازی اور مفلسی کا کوئی براہ راست تعلق نہیں مگر نہ جانے اس وقت کیوں نظیر اکبر آبادی کے چند مصرعے یاد آگئے۔

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی

ابھی یہ نہ پوری نظم ہے دور تک جائے گی۔ اس سے بہتر مثال جوش ملیح آبادی کی ایک نظم میں ملتی ہے۔ نظم ہے "آدمی نامہ" آدمی کے بارے میں کہتے کہتے کہیں فرما گئے ہیں کہ مطلب کے لیے:

جو رو سُلانے پر بھی ہے مجبور آدمی

جب یہ نظم چھپی تو مجھ سمیت تمام شرفا نے ناک بھوں چڑھائی۔ چھی چھی چھی۔ آدمی کو ایسا ذلیل بھی کہا جاسکتا ہے۔ مگر مجھ سمیت سب شرفا یہ بھی جانتے ہیں کہ آدمی اس سے بھی زیادہ ذلیل ہوسکتا ہے۔ اصل میں ذلیل شریف کی تفریق خود ہماری پیدا کردہ ہے۔ آدمی تو آدمی ہوتا ہے نہ اچھا ہوتا ہے نہ بُرا جیسا جس کو بن چاہا پڑا ویسا ہی بن جاتا ہے۔ بنیں تو مٹ جاتا ہے، ہار جاتا ہے، معدوم ہوجاتا ہے یا پیغمبر ہوجاتا ہے۔

تو جناب طول کلامی معاف بُزرگوں سے سنا ہے کہ یہی قصہ سیاست کا بھی ہے۔ نہ سیاستداں اچھا ہوتا ہے نہ بُرا ہوتا ہے، وہ تو بس سیاست داں ہوتا ہے کسی کو حالات بنا دیتے ہیں کسی کو بگاڑ دیتے ہیں، ایسے بہت کم ہوتے ہیں جو حالات کو بناتے بگاڑتے ہیں۔ یہ حضرات تاریخ ساز شخصیتیں کہلاتے ہیں۔ اگر موقع ملا تو فقیر ایک دن اس تاریخ سازی کا احوال بھی گوش گزار کرے گا فی الحال تو سلطنت روما حال ملک اطالیہ کی سیاسی کیفیت سے باخبر ہوتے پر خوش یا ناخوش رہیے یا باخبر ہونے سے بھی انکار کر دیجیے کہ جو مزا بے خبری میں ہے وہ باخبری میں کہاں ہے۔

تو یہ جو اٹلی کی گرجا پارٹی ہے یہ سب سے بڑی پارٹی ہے اور اس کے دو سو تہتر اراکین پارلیمنٹ میں ہیں۔ مگر خود ان میں فریق ہیں اور ایک فریق بائیں بازو والوں کا ہے جن کی تعداد ایک سو کے لگ بھگ ہوگی۔ دیکھا آپ نے ایک مذہبی قسم کی پارٹی میں بھی بائیں بازو والے اتنی تعداد میں موجود ہیں اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ میں اپنے طور پر بھی اس کا تجزیہ کرسکتا ہوں۔ مگر میری بات کوئی مانے گا نہیں کیا بدی کیا بدی کا شور ہے۔ اس لیے بہتر ہو

www.taemeernews.com

سیاسی مبصر و صحافی و بقراط امریکہ جناب گنتھر کا تجزیہ سن لیجیے۔ کہتے ہیں اس تضاد کی وجہ یہ ہے کہ اٹلی اپنی بڑھتی ہوئی اقتصادی خوشحالی کے باوجود بنیادی طور پر ایک غریب ملک ہے اور سیاست دانوں کو اپنی کامیابی کے لیے کسی نہ کسی قسم کے عوامی مفاد کے لیے کام کرنا پڑتا ہے یا کم از کم نعرہ لگانا پڑتا ہے اور چونکہ عوامی مفاد کا قصہ غریبی، بیماری، بیروزگاری اور دیگر معاشرتی خرابیوں سے عبارت ہوتا ہے، اس لیے بیچارہ گرجا پارٹی سیاست دان بھی اپنے آپ کو کسی نہ کسی عنوان ان مسائل سے وابستہ رکھتا ہے تاکہ میدان اقتدار میں دوڑنے والے دوسرے گھوڑے یعنی کمیونسٹ، سوشلسٹ وغیرہ بازی نہ لے جائیں۔

واللہ اعلم بالصواب

اسی ضمن میں یہ بھی سن لیجیے کہ اٹلی میں دوسری بڑی پارٹی کمیونسٹ پارٹی ہے بلکہ دنیا بھر کی غیر کمیونسٹ دنیا میں اٹلی ہی ایسا ملک ہے جس کی دوسری سب سے بڑی پارٹی کمیونسٹ پارٹی ہے۔ یہ بھی ایک چٹخارے کی بات ہے کہ اٹلی کو دوسری جنگ عظیم کے بعد اتحادیوں نے فتح کیا اور اس پر عملاً انگریزوں اور امریکیوں کا قبضہ رہا یعنی جرمنی جیسی حالت پیش نہیں آئی مگر پھر بھی جب سے اٹلی کاملاً آزاد ہوا ہے۔ یہاں اشتراکی رجحانات زور پکڑتے جا رہے ہیں اور پارلیمنٹ میں ایک سو چالیس اراکین کمیونسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر آ گئے ہیں۔ باقی اور پارٹیاں بھی زوردار ہیں۔ مگر توازن قائم رکھنے کی حد تک۔ اپنی جگہ کچھ نہیں ہیں۔

لطیفہ: انیس سو ساٹھ میں پورے تریسٹھ دن ایسے گزرے جب اٹلی میں کوئی مرکزی وزارت نہیں تھی پارٹیاں اس طرح بکھر گئی تھیں کہ سمجھوتہ ہونے ہی نہیں پاتا تھا۔ شکر ہے کہ یہ فقیر وہاں انیس سو اکسٹھ میں پہنچا ہے ورنہ نہ جانے کیا حال دیکھتا! ایسی کیفیت تو کبھی وطن عزیز میں بھی پیش نہیں آئی تھی۔

لطیفہ: یہاں بہت سے سرکاری ملازمین بھی دائیں بازو یا بائیں بازو کے ہوتے ہیں۔ مجھے ایک بار ایک خاتون ترجمان ملیں۔ انھوں نے مجھے ادیب جان کر بڑی گرمجوشی سے پوچھا۔ پوچھا کیا یقین سے اشارہ کیا کہ میاں تم بھی بائیں بازو والے ہو نا۔ میں نے پہلے تو نہایت حیرت کا اظہار کیا پھر عرض کیا کہ میں تو مسلمان ہوں میری سیاست کچھ ہے تو اسلام ہے۔ اس پر وہ بہت خفا ہوئیں۔ ارے بھئی یوں تو ہم عیسائی ہیں مگر پھر بھی لفٹسٹ ہیں تم کیوں نہیں ہو سکتے۔ اچھا لفٹسٹ نہیں ہو سکتے تو دائیں بازو والے ہو جاؤ کچھ تو ہو جاؤ کچھ تو سوچو کچھ تو کرو۔ اس کے جواب میں فقیر نے غالب کا ایک شعر پڑھا اور بے ترجمہ کیے مسکرا دیا۔ آپ بھی سنتے چلیے لیکن ترجمہ نہ کرائیے گا ورنہ میں پھر مسکرا دوں گا۔

www.taemeernews.com

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

واضح رہے کہ یہ شعر اس وقت بھی بات ٹالنے کو پڑھا گیا تھا اور اس وقت بھی بات ٹالنے کے لیے لکھا گیا ہے ورنہ ——

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

جی میں آئی کہ ان خاتون کو اپنے مذہب پر ایک لیکچر دیا جائے مگر دوسرے مقررین یاد آگئے۔ خود وطن عزیز میں ابھی وہ زمانہ نہیں آیا کہ اسلام کی صحیح روح پر عمل کیا جاتا ہو تو ان بیرونی بائیں یا دائیں بازو والوں سے کیا سر پھوڑا جائے۔

دل کہتا ہے کہ وہ وقت ضرور آئے گا —— اور جلد آئے گا اور دل یہ بھی کہتا ہے کہ اللہ کا مذہب سمجھنے والے یعنی اللہ والے کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہیں جو نہ صرف ہمیں بلکہ پورے عالم کو ایک صحیح راستے پر ڈال دیں گے جو نہ دایاں ہوگا نہ بایاں بلکہ سیدھا ہوگا۔ سیدھا راستہ۔ صراط مستقیم۔

خیر اٹلی میں ایک بات قابل اطمینان ہے۔ یہاں فاشزم ختم ہو چکا ہے۔ دوسرے انسانوں کو کمتر سمجھنے اور دنیا بھر یا یورپ بھر پر چھا جانے کا جذبہ معدوم ہو چکا ہے۔ اٹلی کو مکمل جمہوریت بننے میں دیر لگ رہی ہے مگر فاشزم کی طرف واپس مڑ جانے کا کوئی واضح امکان نظر نہیں آتا۔ یوں ایک جدید فاشسٹ پارٹی کا وجود باقی ہے۔ مگر پارلیمنٹ میں صرف پانچ فیصد کی حد تک یعنی اس کے کل ارکین کی تعداد چوبیس تھی۔ قانون کے مطابق فاشزم جرم ہے یعنی ممنوع ہے اور اس لفظ کا استعمال بھی ممنوع ہے۔ اس لیے جدید فاشزم پر ایمان رکھنے والوں نے ایک غیر ممنوع نقاب اوڑھ کر اپنا نام اطالوی سماجی تحریک رکھ لیا ہے' چلیے اس کا اطالوی نام بھی سنتے چلیے۔ وہ ہے موومینتو سوشیل اطالیانو۔ مختصراً اسے MSI کہا اور لکھا جاتا ہے۔ یہ پارٹی اب تک مسولینی کے نام کی مالا جپتی ہے اور اطالویوں کو رومتہ الکبریٰ کے خواب دکھاتی ہے لیکن اب اطالوی فاتحین عالم ہونے کی بجائے خود اپنے ملک کی اقتصادی ترقی اور سماجی بہبود پر توجہ کرنا زیادہ بہتر خیال کرتے ہیں۔

ہے ہے یار تم کہاں سیاست کے چکر میں مبتلا ہو گئے۔ واللہ یہ ٹھولس ٹھالس ہے۔ یہ سفرنامہ ہے یا جدید تاریخ اطالیہ! ارے بھائی اپنی اصلیت پر آجاؤ جس کا کام اسی کو ساجے تم سیاح یا بقول خود ملاح آدمی۔ گھومو اور گھماؤ۔ کہاں ہیں وہ اٹلی کی خوبصورت پہاڑیاں وہ وادیاں وہ جنگل کی شہزادیاں جنھیں دیکھنے کو انکھیاں ترس گئی ہیں

www.taemeernews.com

تو اے صاحبانِ عالی شان اب اس سیاست کے خارزار سے ایک دم ایک رنگین منظر نامے میں داخل ہو جائیے اور دیکھیے کہ

صبح دم دروازۂ خاور کھلا

یہ لاطینا کا ایک منظر ہے۔ آپ نے لاطینی کا نام سُنا ہوگا۔ یہ قدیم اطالوی زبان کا نام ہے۔ لے ٹین (لاطین)۔ یہ لفظ پورے ایک دور، ایک تہذیب، ایک سیاسی اکائی پر محیط ہے جو بہت پہلے تھی اور بیچ میں غائب ہو گئی اور اب کیفیت یہ ہے کہ زبان تو سنسکرت کی طرح قدیم ہو کر رہ گئی ملک کی سیاسی وحدت دوسرے طور پر مرتب ہوئی ہے اور یہ لفظ ملک بدر ہو کر تو ایسا پھیلا ہے کہ آج تقریباً پورا جنوبی امریکہ لاطینی امریکہ کہلاتا ہے مگر خود اٹلی میں اس نام کا صرف ایک قصبہ رہ گیا ہے جس کی آبادی کوئی پچاس ہزار ہوگی۔

بہرحال آپ کو لفظ کی تاریخ سے کیا تعلق آپ تو یہ منظر ملاحظہ فرمائیے۔ صبح کا سہانا وقت ہے ایک ٹوٹی پھوٹی بس مجھے نیپلز سے روم لا رہی ہے کہ عین وسط راہ میں یعنی روم اور نیپلز کے درمیان یہ شہر یہ قصبہ آ پڑتا ہے۔ یہ جدید شہر خاصا جدید ہے، کہتے ہیں کہ ۱۹۳۲ء میں بنا ہے مگر بنیادیں بہت قدیم ہیں۔ قدیم رومنوں جتنی قدیم۔ اور موجیہ تاریخ وغیرہ کا قصہ شروع ہو جائے گا۔ یہ پنچھا قلم ایسا بگڑے دل ہے کہ ناظرین کی طبع نازک کا خیال کئے بغیر جدھر منہ اُٹھ جائے دوڑنے لگتا ہے۔ اسے بمشکل روک کر قابو میں لاتا ہوں اور آپ کو پھر اس منظر کی تعریف سے بہلاتا پھسلاتا ہوں جسے میں خود بھر بھر دیکھا کیا۔ یہ منظر ایک ساحلی سڑک کا ہے جو لاطینا کے کنارے گزرتی ہے۔ سمندر پر سورج اس طرح صاف اور شاندار چمکتا ہے جیسے بڑے افسر چھوٹے درجے کے ماتحتوں پر چھائے ہوئے رہتے ہیں۔ روشن، مضبوط اور پھیلا پھیلا سورج بڑا مضبوط اور شاندار افسر۔ سورج جو آگ ہے اور سمندر جو پانی ہے۔ افسر جو گرم ہے ماتحت جو سرد ہے۔ افسر سورج ماتحت سمندر پر چھا گیا ہے۔ اس کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی ہے اور ماتحت سمندر کی لہریں اچھل اچھل کر اس کے قدم چومنا چاہتی ہیں مگر رہ جاتی ہیں۔

بھئی آج غالب کا دن ہے۔ برابر حملہ کر رہے ہیں۔ دیکھیے پھر یاد آئے۔ کہتے تھے:

کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

مگر صاحب کیا جو سے بزرگ تھے۔ ناتجربہ کاری کا یہ عالم کہ خود کو آسمان سے بڑھ کر سمجھتے۔ آج ہوتے تو اپنی اصلیت معلوم ہو جاتی۔

کیا آپ کو اس تصویر میں سورج کی چمک اور سمندر کی لہروں کے ارتعاش نظر آ رہے ہیں۔ شاید نہیں مگر اس

www.taemeernews.com

میں قصور صرف چھپائی کا نہیں آپ کی آنکھوں کا بھی ہے۔

اب پھر دوبارہ بہت سا فاصلہ طے کرکے دی تربو نام کا شہر دیکھ ڈالیے یہ بھی چھوٹا سا مقام ہے۔ کوئی چالیس ہزار کی آبادی ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ یہاں بوڑھے بہت کم نظر آتے ہیں یہ نسبتاً پہاڑی علاقہ ہے اور بہت قدیم بھی ہے خیر قدیم تو سارا اٹلی ہے اور خوبصورت بھی مگر یہاں خوبصورتی کچھ نرالی وضع کی ہے۔ مرد وجیہہ اور طرحدار اور مضبوط ہیں۔ بوڑھے تقریباً معدوم معلوم ہوتا ہے لوگ بوڑھے ہوتے ہی نہیں۔ یا ہوتے ہیں تو چشتونیوں کی طرح جو بوڑھے معلوم نہیں ہوتے۔ اور رہ گئیں خواتین تو سبحان اللہ۔

زیب دیتا ہے انھیں جس قدر اچھا کہیے

مگر خواتین تو آپ دیکھتے ہی رہتے ہیں اور دیکھتے ہی رہیں گے۔ فی الحال تو یہ چوک دیکھیے جو ۱۶۲۱ء کی یادگار ہے اور جس کے وسط میں فواروں کا یہ منظر لاہور والے شالامار باغ کی یاد دلاتا ہے۔ یہ جگہ شالامار سے بہت چھوٹی ہے۔ ہونی بھی چاہیے کہاں مغلوں کی سطوت وجبروت کہاں تیرھویں صدی کے چھٹے پٹائے اطالوی مغلوں نے اپنے دور اقتدار میں جو کام کیا بڑے پیمانے پر کیا۔ بزرگوں کا خیال ہے کہ دولت اور اقتدار کے ساتھ ساتھ خیال کی پہنائیاں بھی وسیع تر ہو جاتی ہیں۔ بڑا آدمی بڑی باتیں سوچتا ہے۔ بڑی باتیں کرتا ہے۔ بڑی عمارتیں بناتا ہے۔ بڑی فتوحات کرتا ہے اور شکستیں بھی بڑی ہی کھاتا ہے۔ یہ فقیر چھوٹا آدمی ہے جب خود کچھ نہیں کرسکتا تو ایک بڑے آدمی کے سائے میں پناہ لے کر ہنکارنے لگتا ہے کہ میاں۔

واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

اس علاقے میں چٹانوں سے تراشی ہوئی یہ دو مہیب مورتیں بھی نظر آتی ہیں۔ دو عجیب الخلقت جانوروں کے مجسمے۔ سائنسدان کہتے ہیں کہ یہ دیو نما جانور کرۂ ارض پر زندگی کے اولین دور میں زمین کو روندتے پھرتے تھے۔ آج بھی دنیا کے ہر حصے میں ان کی ہڈیاں اور ڈھانچے تلاش کیے جاتے ہیں عجائب خانوں میں ان ڈھانچوں کو ایک سائنسی ترتیب سے رکھا جاتا ہے۔ ہاتھی اونٹ جیسے طویل القامت جانور ان کے آگے بونے لگتے ہیں جاپانیوں اور امریکنوں نے تو ان تہوار کی بنا پر بہت سی فلمیں بھی بنائی ہیں جن کی کہانی عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ جدید دنیا میں کوئی ایسا ہی جانور کسی سمندر کسی برف پوش گھاٹی سے نمودار ہو کر ہل چل مچا دیتا ہے۔ توپیں بم بجلی کے جھٹکے اس پر اثر نہیں کرتے مگر پھر وہ کسی نہ کسی خاص جسمانی کمزوری کی بنا پر کسی ہیرو یا ہیروئن کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ نہ جانے لوگ شیطانی اور طاغوتی طاقتوں کے سہارے تشبیہات اور استعارے کیوں تلاش کرتے ہیں۔ صاف صاف باتیں

www.taemeernews.com

کیوں نہیں کرتے۔ شاید آج تک دنیا اس قابل نہیں ہوئی کہ بات کہنے والے صاف صاف کہہ سکیں اور وہ اُسے صاف صاف سن سکے۔

مگر یہ مجسمے استعارے نہیں۔ یہ ٹھوس اور وسیع ۔ بعض مجسمے ہیں۔ ایک بڑا جانور ایک نسبتاً چھوٹے جانور پر حملہ کر رہا ہے۔ سنگ تراش نے بات آگے نہیں بڑھائی ہے۔ ہوتا تو اگلی چٹان پر چھوٹے جانور کی لاش یعنی لڑائی کا انجام بھی کھود دیتا۔ کیونکہ ہوا بھی یہی ہوگا۔ بڑا جانور بڑے آدمی کی طرح ہوتا ہے جو چھوٹے کو مار دیتا ہے، کھا جاتا ہے، اپنے اندر ہضم کر لیتا ہے۔

مگر بزرگو ایک اور بات پر غور فرماؤ۔ یہ بڑا خونخوار جانور ایک حقیقت تھا مگر فنا ہو گیا۔ آج مجلموں اور قیاسی کہانیوں کے سوا اس کا نشان پورے کرۂ ارض پر نہیں ملتا۔ یہ کیوں ہوا، کیسے ہوا، قدرت نے از خود ایسے ایسے مہیب ایسے ایسے عظیم الجثہ دیو پیدا کیے اور پھر خود ہی انھیں فنا کر دیا۔ اس کا راز کیا ہے۔ ایسا کیوں ہوا، ایسا کیوں ہوا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ جو صاحب اس سوال کا جواب پا جائیں، راقم الحروف کو مطلع فرمائیں۔

www.taemeernews.com

جوتا ۔ موچن ۔ سٹرک

جوتوں کا سیزروں یعنی قیصروں سے کیا تعلق ہے۔

یہ سوال اس لیے پیدا ہوا کہ آپ اور میں اٹلی کو آج تک قیصروں کا ملک جانتے ہیں۔ مگر آجکل وہاں قیصروں سے زیادہ اہم صنعت جوتے کی ہے۔ عجیب بات ہے مگر ہے کہ جس ملک کی فیکٹریوں میں کبھی بڑے بڑے طاقتور قیصر یعنی سیزر یعنی کلاڈیس کیلی گولا اور نیرو جیسے شہنشاہ ڈھلتے تھے آج وہاں دنیا بھر کے لیے جوتے بنائے جاتے ہیں۔ نوکدار لمبے لمبے چمکیلے جوتے جو میرے اور آپ کے بچے پہن کر بڑے فخر سے دوستوں کو دکھاتے ہیں اور اپنے خاندانوں کا سوشل اسٹیٹس یعنی سماجی رتبہ بڑھاتے ہیں۔

مگر گوئیندا (؟) یعنی کہتے ہیں کہ اٹلی میں جوتے کی صنعت چوتھے درجے پر ہے یعنی چوتھی اہمیت کی حامل ہے۔ بتانے والوں نے پہلے تین درجے نہیں بتائے کچھ اس میں ترجمے کا قصور ہوگا کچھ میری نافہمی یا خود بتانے والا سوچ رہا ہوگا کہ :

غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مرے حوصلوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

یہ شعر حسرت موہانی کا ہے مگر آپ یقین کیجیے کہ اسے ایک اطالوی بھی پڑھ سکتا ہے ایک جرمن بھی محسوس کر سکتا ہے اور شاید چچا امریکن بھی کیونکہ اس میں ایک عالمی بات کہی گئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ابھی ہمارے کافی ہاؤس والے انٹلکچوئل اور بڑے افسر یہ ماننے پر تیار نہیں کہ اس برصغیر میں کوئی اردو ؍ اردو کا شاعر بھی کوئی عالمی بات کہہ سکتا ہے ـــــ

تو بات جوتوں کی تھی۔ جوتوں کی بات کرنا ذرا غیر ادبی معاملہ ہے مگر اسے کیا کیا جائے کہ جس ملک میں آج

www.taemeernews.com

کل میں گھوم رہا ہوں وہاں جوتوں کی صنعت چوتھے درجے کی ہے۔ جوتے جو اُدھر سے اِدھر آتے ہیں بلکہ تمام دنیا میں جاتے ہیں جب آپ انھیں پہنتے ہیں تو ان کے بارے میں بات کرنے سے کیوں شرماتے ہیں۔

یہ تصویر جو آپ دیکھتے ہیں اس میں ساٹھ میزوں پر لڑکیاں جوتے سینے کی مشینیں سامنے لئے بیٹھی ہیں۔ جوتے بنانے والوں کو آپ لوگ موچی کہتے ہیں اور موچی کو ایک ذات کہتے ہیں اور ذاتوں کا ذکر آئے تو موچی کو کم ذات بھی سمجھتے ہیں لیکن ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر بتایئے کہ کیا ان نازنینان پری تمثال کو بھی کم ذات کہا جائے گا۔ یہ ساٹھ گل اندام لڑکیاں جو مشینوں پر جوتے سی رہی ہیں جب فیکٹری سے باہر نکلتی ہیں اور ہم آپ ارد گرد ہوتے ہیں تو کیا محسوس ہوتا ہے۔

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا ست

مگر یہ فارسی کا مصرع ہے اور فارسی متروک ہوتی جاتی ہے اس لئے خالص اُردو ملاحظہ فرمایئے۔ لاکھوں شعر ایک دم حملہ کر رہے ہیں۔ پتا نہیں یہ مصرع چپکے گا یا نہیں بہر حال حاضر ہے:

کس کس پہ رڈولے گا منوا ہر کوئی جھب دکھلائے

یہ جھب دکھلانے والیاں آپ کے بقول موچنیں ہیں موچی ذات۔ اماں یار ایک دم کس پستی میں گرے ہو، عاشق بھی ہوئے تو موچن پر۔

مگر اطالوی موچن کو ایشیائی حال پاکستانی ذات پات کی تفریق کا احساس نہیں۔ وہ مزدوری کو عیب نہیں جانتی صبح آتی ہے دن بھر محنت سے کام کرتی ہے یعنی جوتے سیتی ہے اور شام کو بال درست کرتی ہے، مسکراتی ہوئی چہکتی ہوئی دمکتی ہوئی اپنے شوہر یا عاشق کی دلجوئی کرنے روانہ ہو جاتی ہے۔ نہ اُسے کوئی غیر خاندانی نہ غیر کفو قرار دیتا ہے۔

اے نوجوانو اب اٹلی کے جوتے پہنتے وقت ان پری رویوں کا تصور باندھا کرنا۔ اور فقیر مصنف تحریر ہذا و فوٹوگرافر تصویر ہذا کو دعائے خیر سے یاد کرنا۔

کیا آپ ایک اور حیرتناک منظر دیکھنا پسند کریں گے۔ یہ منظر قدرتی نہیں بلکہ انسانی فن تعمیر کا کمال ہے۔ یہ جزیرہ سسلی میں ایک بل کھاتی لہراتی سڑک کا منظر ہے جو نعل کی صورت میں دور تک چلی گئی ہے۔ اطالوی تعمیر کے ایسے شوقین ہیں کہ سڑکوں تک کے معاملے میں جدت پسندی دکھا جاتے ہیں۔ پتا نہیں وہ ہماری میونسپل کمیٹیوں اور محکمہ تعمیرات سے سبق کیوں نہیں لیتے جو سرے سے سڑکوں کی ضرورت ہی تسلیم نہیں کرتے۔ فنکاری تو دور کی چیز ہے یہاں اصل سوال یہ ہے کہ سڑک کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کیا ہمارے قدما یعنی تین چار پشت پہلے کے بزرگ سیمنٹ کی سڑکوں کے بغیر زندہ نہیں رہتے تھے۔ اجی سب بکواس ہے یعنی اب سڑک وغیرہ کی اہمیت

www.taemeernews.com

پر بھی گفتگو ہونے لگی ہے اور یہ بھی مغرب کے مہلک اثرات ہیں جنھیں اپنے ملک سے جلد نیست نابود کر دینا چاہیئے ورنہ آج لوگ سڑکیں مانگتے ہیں کل اسپتال مانگیں گے پرسوں اسکول اور کالج اور یونیورسٹیاں مانگیں گے اور اترسوں نہ جانے اور کیا کچھ مانگ بیٹھیں !!

چلیے حضرت شاعر صاحب جوتوں اور سڑکوں سے آگے چلیے ورنہ ان کے ساتھ آپ بھی گھس جائیں گے۔ مگر آج قصہ یہ ہے کہ:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

میں زیادہ سے زیادہ جوتوں کا ذکر چھوڑ سکتا ہوں لیکن سڑکوں سے دست برداری پر تیار نہیں۔ سڑکیں مجھے دور دور لے جاتی ہیں۔ سڑکوں نے اشتراکی طریقوں کے بغیر اتنی ساری بکھری بکھری امریکی ریاستوں کو ایک عظیم ملک یعنی جدید امریکہ میں بدل دیا۔ سڑکیں شیر شاہ سوری کو پشاور سے کلکتے لے جاتی تھیں۔ سڑک۔ سڑکیں شاہراہ جو گھاٹیوں اور پہاڑیوں کے سینے چیرتی ہوئی انسانوں اور انسانوں کی ضروریات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہے۔ سڑک جو زمین ہے پختہ۔ مضبوط زمین اور جو آسمان اور آسمانی سواریوں یعنی ہوائی جہازوں اور اسپوتنکوں کی طرح بے اعتبار نہیں ہے۔

اس لیے سسلی ہی کی یہ سڑک اور دیکھیے۔ جزیرۂ سسلی بلکہ پورے اٹلی میں لڑکیوں اور مائیکل انجلو کی فنکاریوں کے بعد سب سے زیادہ جاذب نظر چیز سڑک ہے اور جب قدرتی مناظر انسانی کوششوں کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائیں تو دیوان خاص آف لال قلعہ دہلی کا شعر یاد آجاتا ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

کیوں بھائیو! تمھیں ان سڑکوں کو دیکھ کر کوئی خاص احساس ہوتا ہے یا نہیں۔ آج اطالوی قوم دنیا کی کوئی تیس مار خاں قوم بھی نہیں پھر بھی ایسے ایسے مشکل مقامات پر ایسے ایسے راستے نکال لیتی ہے یہ کیا چکر ہے یعنی یہ چکر کن چکروں سے پیدا ہوتا ہے۔ صرف روپے سے نہیں صرف انجینئرنگ کی مہارت سے نہیں بلکہ کسی جذبے کے تحت پیدا ہوتا ہے۔ وہ جذبہ جو اگر مجھ میں اور آپ میں پیدا بھی ہو تو اکثر اوقات کچھ بڑوں اور کچھ بڑوں کے ہاتھوں میں کھیلنے والی چھوٹی طاقتیں مل جل کر کچل دیتی ہیں مگر کبھی میرا اور آپ کا دن بھی آئے گا۔ وہ دن بھی آئے گا جب ہم ان سڑکوں سے بھی زیادہ خوبصورت اور مضبوط اور سیدھی اور پیچ دار سڑکیں

www.taemeernews.com

بنائیں گے۔ ایسی سڑکیں جن کی تصویریں اطالوی سیاح اپنے ملک میں شائع کرکے کہیں گے کہ دیکھو یہ ہے پاکستان جہاں لوگوں نے ایسی ایسی سڑکیں بنائی ہیں۔

دوستو اور بزرگو۔

مجھے میرے ملک میں ایک پوری سڑک نہیں تو کم ازکم ایک گز، ایک فٹ، ایک انچ کی ایک مضبوط پٹی بنانے دو تاکہ میری نسل اور اگلی نسل کے لیے چپہ بھر زمین ہی میرے عزم میری حب الوطنی میرے خلوص میری محنت کی یادگار رہ جائے۔ میں تمھارے عظیم گروپ سے تعلق نہیں رکھتا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے اپنے ملک میں ایک انچ زمین پر کام کرنے کا حق بھی حاصل نہیں' ایک انچ زمین جس کو میں ایک پختہ مثالی ٹکڑے میں تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔ اپنی آئندہ نسلوں کے لیے تمھاری آئندہ نسلوں کے لیے۔ پاکستان کے لیے۔ پاکستان جواب ہے جس کے لئے تم بھی پائندہ باد کا نعرہ لگاتے ہو۔ میرا پاکستان۔ تمھارا پاکستان۔ پاکستان جیسے ہزاروں سڑکوں کی ضرورت ہے' ایک ہی گروپ کے بنانے سے نہیں بنے گا' سب کے بنانے سے بنے گا اور سب میں ایک میری چھوٹی سی ذات بھی شامل ہے۔ پتا نہیں یہ آہ و فغاں "ان" تک پہنچے نہ پہنچے۔ اٹلی کی سڑکوں کو دیکھ دیکھ کر مجھ میں جو ایک جذبہ بیدار ہوا ہے وہ گھر پہنچتے پہنچتے مجروح نہ ہو جائے' ختم نہ ہو جائے اور میری اپنی بنائی ہوئی سڑک کا خواب شرمندۂ تعبیر ہی رہے۔ بہرحال سڑکیں بن کر رہیں گی۔ میں نہ بنا سکا تو کوئی اور بنائے گا۔ کوئی نہ کوئی تو بنائے گا۔ تاریخ کے پیچ و خم میں ان کی یا میری یا میرے یا اُن کے گروپ کی حیثیت ہی کیا ہے چلو جی تم اپنی بات ریکارڈ پر تو لے آئے کیونکہ:

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے

سڑک کی بات چل رہی ہے تو یہ ایک اور سڑک دیکھتے چلیے۔ یہ سڑک مٹی یا سیمنٹ کی سڑک نہیں بلکہ پانی کی ہے۔ پانی کی سڑک۔ نہر۔ آبی راستہ۔ خوابوں کے شہر وینس کے بڑے راستوں میں سے ایک ہے۔ اس پر موٹروں کے بجائے کشتیاں چلتی ہیں۔ اس کشتی کو گنڈولا کہتے ہیں۔ میں آپ کو ابھی وینس کی پوری سیر نہیں کرا سکتا کیونکہ وینس ایک شہر نہیں' ایک تاریخ' ایک تہذیب' ایک طربیہ' ایک حزنیہ ہے۔ ایک الگ کہانی۔ ایک الگ دنیا۔ اس لیے فی الحال سڑکوں ہی کے چکر میں مبتلا رہیے۔ اور وینس کی گرینڈ کنال یعنی بڑی نہر یعنی شاہراہ اعظم یعنی جرنیلی سڑک دیکھیے۔ ایسا تماشا دنیا بھر میں اور کہیں نہیں ہے۔ گدلا گدلا پانی چمکدار۔ گنڈولے رنگ رنگ کے مسافر اور مسافرات [illegible] جیسا [illegible] مسافرات کے پیچھے دوڑنے لگا جیسے آج کل ٹیڈی بوائے شریف اور "ایسی ویسی خواتین"

www.taemeernews.com

کے پیچھے اسکوٹر کی دوڑ لگا دیتے ہیں۔ آخر میں بھی تو اسی دور کا آدمی ہوں۔ میرا قلم بھی کبھی کبھی ٹیڈی ہو جائے تو افسوس کیجیے مگر حیرت نہ کیجیے کیونکہ سنا ہے جو آدمی اپنے عصر یعنی اپنے دور سے بالکل لاتعلق ہو جائے، اس کا دم گھٹ جاتا ہے۔ ویسے میں اپنے قلم کو ٹیڈی دیکھنا پسند نہیں کرتا جیسے آپ اپنے بچوں کو ٹیڈی دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ مگر وہ ٹیڈی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ قلم بھی اولاد کی طرح ہے جن کے والدین کے دلوں میں ہزاروں خواہشیں اور ارمان ہوتے ہیں مگر وہ کبھی سو فیصد پورے نہیں ہونے پاتے۔

چل چل رے قلم اب چل
تو سیدھا رستہ چھوڑ کر
کیوں کھائے ہے اینٹھ بل
چل چل

ایسا گیت فلمی طرز میں ابھارتا مگر کاغذ پر بوگس معلوم ہو رہا ہے۔ لہٰذا آپ یہ فٹ بال گراؤنڈ دیکھیے جو میلان میں واقع ہے اور جہاں ایک لاکھ تماشائی آرام سے بیٹھ کر تماشا دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کوئی دس بارہ ہزار کاروں کے لیے ایک کشادہ مقام بھی ہے۔ اس تصویر میں آپ کو دونوں نظر آئیں گے مگر پسند نہیں آئیں گے۔ کیونکہ آپ کرکٹیے ہیں یعنی کرکٹ والے۔ کرکٹ جو انگریز بادشاہوں کا کھیل تھا اور اب پاکستانی بادشاہوں کے طفیل پاکستانی عوام پر بھی لاد دیا گیا ہے۔ فٹ بال کھیل تو اچھا ہے مگر عیب یہ ہے کہ بڑے لوگوں کو اس میں سابق آقاؤں سے قرب و افتخار کا وہ جذبہ محسوس نہیں ہوتا جو کرکٹ میں ہوتا ہے۔ فٹ بال زیادہ سے زیادہ عوامی کھیل ہے سستا اور آسان مگر ابھی یہ طے نہیں ہوا کہ جو چیز عوامی ہو وہی قومی بھی ہو جیسے زبان کا معاملہ ہے کہ "عوام لوگ" اردو، بنگلا، سندھی، پنجابی اور پشتو بولتے ہیں مگر ان کی سرکاری زبان انگریزی ہے یعنی کیا مزے کی مثال ہاتھ آئی ہے۔ اگر وہ فٹ بال ہے اور انگریزی کرکٹ یا فٹ بال اردو ہے اور کرکٹ انگریزی ہے بس اسی معیار سے دونوں کھیلوں میں فرق مراتب بھی رکھا گیا ہے۔

مگر یہ سارے بیوقوف اطالوی کبھی انگریزوں کے غلام نہیں رہے۔ اس لیے فٹ بال اور ہاکی کھیلے جاتے ہیں کرکٹ کو منہ نہیں لگاتے بیٹھوں کو پتا ہی نہیں کہ کرکٹ کی نزاکتیں کیا کیا ہیں اور اس کے کھیلنے والے شاموں اور راتوں کو کیسی کیسی لطافتوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ برس دن میں ایک چوکا لگا دینے والا کس طرح راتوں رات قوم کا ہیرو بن جاتا ہے۔ اور جب "ٹیسٹ" میچ ہوتا ہے تو کس طرح ہمارے دفتروں میں پانچ پانچ روز تک کام بند ہو جاتے ہیں اور کیسی کیسی چھبیلی کنواریاں اور حسین بیاہیاں نئے نئے کپڑے سجا کر

www.taemeernews.com

اسٹیڈیم جاتی ہیں۔ کہاں اطالوی قوم کہاں انگریز قوم۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم انگریزوں کے غلام تھے اطالویوں کے غلام نہیں رہے۔ وہ جاتے جاتے ہمیں کرکٹ دے گیا۔ یہ فٹ بال جیسی حقیر چیز دے جاتے تو عمائدین کابینہ کے بچے عمر بھر اپنی محرومی پر سر پھوڑا کرتے۔

اگر کرکٹ کے شائقین برا مان رہے ہوں تو مجھے وینس کی اس آبی شاہراہ میں رواں دواں گنڈولوں کے بارے میں بات چیت کی اجازت دیجیے۔ مگر شاید ابھی ایسا ممکن نہیں ہے۔ زمانۂ سیاحت میں گنڈولے صرف معمولی باربرداری کا کام ہی نہیں کرتے بلکہ قدیم اڑن کھٹولوں کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں یعنی عاشقوں کو معشوقوں سے ملاتے اور معشوقوں کو عاشق تلاش کر کے دیتے ہیں۔ انھی میں ان جانے شہزادے بن دیکھی شہزادیوں کی تلاش میں نکلتے ہیں اور بن شہزادوں کی شہزادیاں مجبوری میں گنڈولے والوں یعنی موٹر ڈرائیوروں ہی سے جی بہلانے پر اکتفا کرتی ہیں۔

اے وائے آدمی

اے وائے آدمی

مگر ان داستانوں کے لیے جوش صاحب کا ایک مصرع ہے جو کچھ یوں ہے:

کہ سطحِ ذہنِ عالم سخت ناہموار ہے ساقی

www.taemeernews.com

ہم وطن بابر اور مصر کی آسٹریلوی دیوی

اب پھر روم کا ایک چکر لگ جائے کیونکہ ابھی تک صحیح معنوں میں روم نہ آپ نے دیکھا ہے نہ میں نے دیکھا ہے۔

یہ پیاتسا اسپانیا ہے یعنی اسپین کا چوک۔ یہاں میرے ساتھ مصور اور بت تراش بابر کھڑا ہے۔ بابر کو میں پہلے سے نہیں جانتا، ایک دن گھومتے گھومتے ایک ہم وطن قسم کی صورت نظر آئی اور میں اس کی طرف لپکا۔ وہ میری طرف نہیں لپکا مگر ٹھٹک ضرور گیا۔ انگلستان ہوتا تو مجھے لپکتے دیکھ کر فرار ہو جاتا مگر یہ بہرحال اٹلی ہے جنوبی یورپ۔ گرم جذباتی لوگوں کا ملک، عاشقوں، موسیقاروں، شاعروں، فنکاروں کا ملک۔ اس لیے بابر مجھے دیکھ کر بھاگا نہیں بلکہ صرف ٹھٹک کر رہ گیا اور پھر:

آ ملے ہیں سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک

بابر مصور ہے اور اس مضمون میں مزید تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ وہ بت تراش بھی بننا چاہتا ہے۔ بیوقوف لڑکا۔ "بت تراشی اپنے ملک میں نہیں چلے گی پتر" میں نے اسے پیار سے سمجھایا۔

"یہی میں بھی سوچتا ہوں پراہ جی" اس نے دھیمے سے کہا "مگر کیا کروں تخلیق کے سوتے ابلنے سے باز نہیں آتے" وہ روتے روتے رہ گیا مگر مجھے ہمدردی نہ ہوئی۔ میں بت تراشی کا قائل نہیں ہوں، مجھے کسی قسم کے بت پسند نہیں کسی قد کے بھی۔ کیا آپ میری بات سمجھ گئے۔

بابر گجرات کا تھا یا شاید راولپنڈی کا۔ میں نہ گجرات کا تھا نہ پنڈی کا مگر ہمیں یہ بات پاکستان سے باہر محسوس نہ ہوئی۔ ہم دونوں پاکستانیوں کی طرح ملے، پاکستانیوں کی طرح گھومے، ہنسے بولے اور پاکستانیوں کی طرح ہر بات محسوس کرتے رہے۔ کیا یہ روم کا اعجاز تھا یا پاکستان کا۔ اگر یہ اعجاز روم کا نہیں تھا تو پاکستان میں ہم پاکستانیوں

www.taemeernews.com

کی طرح کیوں نہیں رہتے۔ مجھ سے "وہ" میرا سابق وطن کیوں پوچھتے ہیں' میرا ضلع کیوں پوچھتے ہیں' میرا صوبہ کیوں پوچھتے ہیں۔ اگر میں کہیں اور پیدا ہو گیا تھا تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ کیا قصور ہے کیا قصور ہے۔

آ صعوبر بابر مجھے اپنے دامن میں چھپا لے میں یہ سطریں پاکستان میں بیٹھ کر لکھ رہا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ صرف مجھی پر نہیں بلکہ ایک دوسرے پر بھی سیکڑوں بڑے بڑے اور چھوٹے چھوٹے لوگ طرح طرح کے اعتراض کر رہے ہیں۔

یہ باہر کا آدمی ہے۔

یہ فلاں ضلع کا ہے۔

یہ دو فیصد کا حقدار ہے۔

یہ ایک فیصد کا حقدار بھی نہیں۔

یہ صفر فیصد کا بھی حقدار نہیں۔

آ صعوبر بابر پاکستانی حال رومی مجھے اپنے دامن میں چھپا لے۔ تو نے مجھ سے کوئی سوال نہ کیا۔ میری زبان سے دو بول نکلتے ہی گلے سے لپٹ گیا اور اپنے کام کاج چھوڑ کر دن رات مجھے روم میں لئے لئے پھرا۔ تو اصلی پاکستانی ہے تو بڑا پاکستانی ہے۔ پاکستان کو تجھ جیسے سپوتوں کی ضرورت ہے جنھیں اس کی اکائی پر اعتماد ہو۔ اکائی جسے آج کل قومی سالمیت کہا جاتا ہے نیشنل انٹیگریشن یعنی قومی یک جہتی جس کا پیشہ ورانہ طور پر نام لینے والے بہت سے ہیں اور ......

آ بابر مجھے اپنے سائے میں چھپا لے تو نے ایک کروڑ "اُدھر" والوں کو اپنے دامن میں پناہ دی تھی اپنا سکھ چھوڑ کر ان کا دکھ اپنا یا تھا۔ انھیں اپنے گھر اپنے محلے اپنے ضلع اپنے صوبے اپنے وسائل میں حصے دار بنایا تھا۔ آج ہر گھر ہر محلے ہر ضلعے ہر صوبے کو پھر تیری ضرورت ہے۔

بابر پیاتسا اسپانیا کے سامنے ہی ایک تنگ گلی کے ایک تنگ اور پیچیدہ مکان کے ایک تنگ کمرے میں رہتا ہے۔ اس کا کمرہ مصوروں کے کمروں کی طرح خاک دھول سے اٹا ہوا رنگوں سے لپا ہوا بے ترتیب بے سلیقہ ہے مجھے وہاں بیٹھے ہوئے وحشت ہوتی ہے مگر وہ میرے لیے ایک چتیا چار کباب اور قلا قندے کر آیا ہے۔ اطالوی قلاقند ان لوئی حسینہ کی طرح ہوتا ہے نرم سفید میٹھا اور ٹھنڈا۔

اور ایک دن اسی کے کمرے میں "وہ" بھی ملی۔ وہ آسٹریلیا کی مصورہ ہے (پتا نہیں مصور کے ساتھ صیغہ تانیث چلتا ہے یا نہیں) اور بابر سے کوئی چھ انچ زیادہ لمبی ہے مگر بجائے خود ایک تصویر ایک مجسمہ ہے ترشا ہوا بت۔ گاڑی جگ کی تصویر۔ بولے تو پھول جھڑیں چپ رہے تو ہلکی ہلکی خوشبو مہکتی رہے۔ نفاستی اور خوشبو۔ یہ

www.taemeernews.com

کیا مثال کیا استعارہ ہے۔ نہ میر نے باندھا نہ غالب نے۔ مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے آسٹریلیا کی کوئی گلاب رنگ دوشیزہ نہیں دیکھی تھی۔

تھوڑی دیر کو بابر باہر چلا گیا تھا میں نے پتیسا اور کباب اور قلاقند کی فرمائش کی تھی اور آسٹریلوی تصویر نے چین زانو کی کچھ دیر ہم خاموش بیٹھے رہے پھر وہ میری خاموشی سے اکتا گئی۔

"آپ اسے کب سے جانتے ہیں؟"

"کئی ہزار برس سے"

"کب سے؟"

"ہم دونوں موہنجوڈارو میں ایک ساتھ فٹ بال کھیلتے تھے۔ میں سنٹر فارورڈ تھا اور یہ فل بیک"

وہ ہنسی اور پھر اداس ہو گئی۔

"اس نے میرے متعلق آپ کو کیا بتایا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"کیا اس نے یہ نہیں بتایا کہ میں ایک مصری دیوی ہوں۔ گاڈس یعنی دیوی یعنی آسمانی مخلوق" اس بار اس کی پلکیں ایک ساعت کو بھی نہ جھپکیں۔

"یہ بات جاننے کے لیے مجھے اس کی تنہائی کی کیا ضرورت تھی" میں نے ڈر کر جواب دیا۔ مجھے اس کمرے سے خوف آنے لگا۔ جب روم اور مصر کے توہمات مل کر حملہ کریں تو میں چڑیا سی جان کب تک برداشت کر سکتا ہوں۔

"میں ایک مصری دیوی ہوں۔ میں آسٹریلیا میں پیدا کی گئی اور پھر روم بھیج دی گئی لیکن یہاں کے لوگ بے عقیدہ ہیں وہ مجھے نہیں جانتے۔ وہ مجھے نہیں مانتے صرف بابر مجھے پہچانتا ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے آخر کو وہ میرا ہم وطن ہے اور ہم پاکستانی مسلمان ہوتے ہوئے بھی انسانوں کو دیوی دیوتا بنانے کے شوقین ہوتے ہیں۔"

"اس سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"

"اوں ہوں" میں نے سوچا یہ دیوی کند ذہن بھی واقع ہوئی ہے۔ "میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہم خوبصورتی کو خدا کی دی ہوئی نعمت سمجھتے ہیں۔"

وہ مطمئن نہ ہوئی مگر میں اسے کیا بتاتا کہ ہم تو وقت پڑنے پر میونسپل کارپوریشن کے انسپکٹر کو بھی دیوتا ماننے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

www.taemeernews.com

"کیا آپ بھی مجھے دیوی مان سکتے ہیں۔"

"ضرور۔" مجھے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ "میں مان جو رہا ہوں۔ مجھے کھانا بھی کھانا ہے اور بابر سے میرے تعلقات بہت اچھے ہیں اور تمھارا قد لمبا اور رنگ گلابی ہے اور آنکھیں نیلی ہیں اور بال سنہرے ہیں اور زبان بہت میٹھی ہے اور مجھے تھوڑی دیر بعد روم کی سیر کرنے چلے جانا ہے۔ اس لیے اگر میں نے تمھیں دیوی نہ مانا تو میرا بھنہ اور میرا وقت اور میرا پروگرام سب کا سب خراب ہو جائے گا۔"

دیوی نے آنکھیں بند کرلیں اور میری طرف سے غافل ہوگئی۔

وہ خود فریب بھولی آزردہ حسین لڑکی پورے روم پر بھاری ہے۔ مگر چلیے اٹھیے کہ آپ کو روم دیکھنا ہے۔ ان باتوں کا روم سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ یہ باتیں کسی شہر میں بھی پیش آسکتی ہیں۔

روم کا پیاتسا اسپانیہ ـــــ مصنف اور مصور بابر

www.taemeernews.com

پچی زر۔ تاریخ اور ویٹی کن

یہ پیاتساکو ونا ہے ان پر غنہ کے ساتھ پڑھیے تو تلفظ کا مزا آئے گا ورنہ انگلش یعنی انگریزی خوراک کی طرح پھیکا سیٹھا لگے گا) یہاں میں آپ کو اس لیے لایا ہوں کہ یہ اصل میں ایک طرح روم کا مرکز ہے۔ فن تعمیر خود ملاحظہ کیجیے اور مجھے زحمتِ بیان سے معاف رکھیے۔ فی الحال تو یہ دیکھ لیجیے کہ اس اونچے سے ستون پر جو صاحب کھڑے ہیں وہ شہنشاہ مارکس اوری لی اس ہیں جنھوں نے جرمنوں کے مقابلے میں زبردست فتوحات حاصل کی تھیں۔ اس ستون میں بیس خم ہیں یعنی بیس پیچ۔ پتا نہیں ان کا ماخذ کیا ہے۔ کچھ نہ کچھ ہوگا۔ مگر اصولاً ایسے پیچ وخم کا ماخذ تلاش کرنا ہی نہیں چاہیے ورنہ بات کہیں سے کہیں پہنچ سکتی ہے۔

اس پیاتسا یعنی چوک کے دائیں طرف ایک حلوائی کی دکان ہے۔ حلوائی میں نے آپ کے چٹخارے کی خاطر استعمال کیا ہے۔ ورنہ اصل میں یہ ایک نہایت شاندار مٹھائی گھر ہے جہاں کا فرش ایک ذرّے کی کثافت بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ جہاں سروس یعنی خدمات کے لیے:

الٰہی کیسی کیسی صورتیں تو نے بنائی ہیں

لیکن یہ اور چند ایسے اور مقامات اتنے پیارے ہیں کہ آپ کو مفت میں ان کی تفصیل بتانی نہیں چاہیے۔ خود روم جائیے اور اپنی آنکھوں سے دیکھیے کہ یہ کنجوس مصنف کیا کیا چیزیں اپنے دامن میں چھپائے لیے جا رہا ہے۔

اب آپ تیار ہو جائیے کہ میں آپ کو قدیم روم کے آثار و نوادر کی طرف لے جانے والا ہوں۔ قدیم روم۔ اصلی روم۔ روما اکبری۔ قیصروں شہنشاہوں کا روم۔ سنات یعنی سینیٹ۔ رومن فورم۔ نیرو کا محل۔ سیزر کی تخت گاہ اور سب سے بڑھ کر مرکز عیسائیت۔ ویٹی کن جہاں کا چپا چپا اور ایک ایک چپے کا ہر قدم ایک فن پارہ، ایک تاریخ ایک تہذیب ہے۔ مگر اس سب شوق تاریخ و ذوق ایمان میں دو چار گھپلے پیدا ہونا لازمی ہیں جن سے

www.taemeernews.com

ایک گھپلا ان دو خواتین نے پیدا کر دیا ہے۔ یہ ماڈل خواتین ہیں ماڈل کا تصور ماڈرن ہے یعنی جدید اور قدیم کا جانشین ہے اس لیے اپنی نمائش کیے بغیر اپنا ووٹ بامنوائے بغیر قدیم کی طرف نہیں جانے دیتا۔ لہٰذا جدید یعنی ماڈرن ماڈل کو بھی خراج عقیدت ادا کرتے چلیے۔ ماڈل بھی ایک نہیں دو دو ہیں اور ان میں بھی آپ کی خوش بختی سے قدیم و جدید کا امتزاج ہے۔ اب آپ کی مرضی جس آستانے پر چاہیے عقیدت کے پھول چڑھائیے۔ بندے کی کیفیت تو فارسی کے اس شعر سے ظاہر ہے:

بالا ز کاخ و کو و پریشاں بہ کاخ و کو
کردم بہ چشم ماہ تماشائے ایں سرائے

آسان ترجمہ: میں نے اس دنیا کا تماشا چاند کی آنکھ سے کیا ہے جس کی چاندنی تو گلیوں اور گھروں میں پھیلی رہتی ہے مگر جو خود ان سے بلند اور الگ رہتا ہے۔

اب اگر آپ خراج عقیدت سے فارغ ہو گئے ہوں تو خالص قدیم روم کی طرف چلیے۔ یہ لیجیے میں آپ کے سر پر روم کا شاہی نشان چھتر بنا کر لگائے دیتا ہوں تاکہ ایک ٹھٹ میں ہزار مزے آئیں۔ یہ شہباز کا نشان ہے شاہی پرندہ۔ شاہین جو یہاں سے جرمنی گیا اور انگلستان گیا اور نہ جانے کہاں کہاں گیا اور آخر کار علامہ اقبال کے فلسفے کے جادو سے نیا روپ بدل کر ہمارے آپ کے ادب، معاشرے اور نصب العین میں شامل ہو گیا۔ اس شاہین کا نشان سانتی اپوستولی کے گرجا میں دیوار پر کھدا ہوا ہے میں نے بڑی مشکل سے سب کی نظریں بچا کر اکھاڑا ہے تاکہ اس وقت تک آپ کے سر پر سایہ فگن رہے جب تک آپ بڑے بڑے بادشاہوں، قیصروں اور جرنیلوں کے آثار کی زیارت سے فارغ نہ ہو جائیں۔

بھیا بڑوں کے دربار میں جانے کے لیے کوئی نہ کوئی بڑا سہارا ضروری ہوتا ہے ورنہ:

کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہو

تو یہ روم کی دنیا میں داخل ہوتے ہی آپ کو سب سے پہلے ایک نام یاد ہونا چاہیے۔ بلکہ اس کا صحیح تلفظ بھی معلوم ہونا چاہیے۔

وہ نام ہے [illegible] اور اس کا اصل تلفظ ہے۔ جیزرے۔ جی زر ہنسی آئی یا نہیں۔ شاید آپ کو ہنسی آئی ہو۔ مگر مجھے پہلے تلفظ کے بگڑ جانے پر رونا آتا تھا کیونکہ تلفظ روح کی طرح ہوتا ہے مسخ ہو جائے تو خواہ مسخ ہو کر اچھا لگے [illegible] لیکن اب نہیں اب سو مجھے تلفظ اور روح مسخ ہوتے پر رونا آتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کم بخت رونا بھی:

اب کسی بات پر نہیں آتا

www.taemeernews.com

ہاں تو اصل تلفظ تھا چی زر اور یہ بھی جان لیجیے کہ چی زر یا سیزر ایک نہیں تھا بلکہ قدیم روم میں بہت سارے سیزر گزرے ہیں۔ یہاں ہماری پبلک اور دنیا زیادہ تر ایک سیزر کو جانتی ہے یعنی قلوپطرہ والا سیزر جس پر شیکسپیئر صاحب نے ڈراما لکھا اور امریکی بھائیوں نے فلم بنائے ورنہ اور بھی سیزر گزرے ہیں مثلاً ایک سیزر کلاڈیس تھا جس نے انگلستان فتح کیا تھا اور جس کی بیوی مسالینا تھی جو دنیا کی چند حیرت انگیز عورتوں میں شمار ہوتی ہے لیکن ہوا یہ کہ انگریز بزرگ چونکہ کلاڈیس کے خلاف ہیں اس لیے اس کا ذکر کم اور مسالینا کا ذکر زیادہ کرتے ہیں۔ یوں میرا جی بھی یہی چاہتا ہے کہ مسالینا ہی کا ذکر زیادہ کروں مگر:

مے باقی و ماہتاب باقی

فی الحال ٹریلر کے طور پر اتنا جان لیجیے کہ مسالینا ایک سخت عیاش، بدمعاش، مکار اور فاحشہ عورت تھی اور اس نے ان فنون میں جو جو کمالات پیدا کیے، جو جو طریقے ایجاد کیے ان کی مثال دنیا میں آج تک نہیں ملتی۔ آخر میں بیچاری اپنے شوہر کی حمیت سے ماری گئی ورنہ روم کی مستقل ملکہ بن جاتی اور لوگ یہی مقولہ دہراتے کہ

NOTHING SUCCEEDS LIKE SUCCESS

یعنی کامیابی ہی کامیابی کا جواز ہے۔

خیر یہ تو آگے کی جھلکیاں ہیں۔ فی الحال تو بڑے سیزر کی شبیہہ ملاحظہ کیجیے۔ وہ سیزر جس نے سلطنت روما کی حدود دور دور تک پھیلا دی تھیں جو قلوپطرہ پر عاشق ہوا یا جس پر قلوپطرہ عاشق ہوئی اور جو روم میں بہت پاپولر یعنی مقبول ہو گیا تھا اور بہت طاقتور ہو گیا تھا اور جسے تین بار بادشاہ بن جانے کی آفر یعنی پیشکش ہوئی جسے اس نے تکلفاً یا خلوص سے رد کر دیا۔ مگر رومی سینٹ والے اس کی طاقت مقبولیت اور بادشاہت کے چکر سے ایسے خائف ہوئے کہ ایک دن اُسے سینٹ ہی میں قتل کر دیا۔

یہ سیزر ایک بڑا جرنیل تھا۔ طبقۂ شرفا کے ایک معمولی فرد کی حیثیت سے اتنی بلندی پر پہنچا۔ سالوں روم یعنی پوری سلطنت روما کا حاکم مطلق رہا۔ اس پر ہزارہا کتابیں لکھی گئیں۔ اس سے ہزارہا عظیم قول منسوب ہوتے تھے جن میں سے ایک قول یہ بھی ہے:

"میں آیا۔ میں نے دیکھا۔ میں نے فتح کر لیا۔"

مگر اس کی عظمت کے راز دنیا میں بہت کم لوگوں کو معلوم ہیں یعنی صرف انھی لوگوں کو معلوم ہیں جنھوں نے مشہور قدیم مورخ پلوٹارک کی کتاب "مشاہیر یونان و روما" پڑھی ہے۔ پلوٹارک کوئی دو ہزار برس پہلے کا مصنف ہے اور مستند نہ ہوتے ہوئے بھی مستند مانا جاتا ہے۔ اس لیے اس واقعے پر شبہ کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔

www.taemeernews.com

وہ بتاتا ہے کہ جب یہ سیزر عروج حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو اس وقت سلطنت روما کا سب سے زیادہ مقبول اور طاقتور سپہ سالار پومپی تھا جسے انگریز پومپی آئی کہتے ہیں۔ پومپی آئی بہادر، عقلمند اور نہایت خوبصورت اور عیاش تھا اور سیزر کی بیٹی بھی نہایت خوبصورت تھی مگر وہ بیاہی ہوئی تھی۔ ایک وقت آیا کہ سیزر روم میں اپنی طاقت مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ اور پومپی آئی اسپین فتح کرکے واپس آ رہا تھا جس کے معنی یہ ہوتے کہ وہ روم میں اور بھی طاقت حاصل کر لیتا۔ اور سیزر کا پتڑا ہو جاتا۔

پس اسے خواتین و حضرات اس عظیم سیزر نے جس کے بارے میں آپ نے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں اور اب فلمیں بھی دیکھ رہے ہیں، اس عظیم جرنیل نے اس "عظیم انسان" نے اپنی بیاہی بیٹی کو قانون روما کے خلاف اس کے شوہر سے زبردستی چھین کر پومپی آئی کے پاس بھجوا دیا تاکہ وہ دو چار مہینے اس کی توجہ کا مرکز بنی رہے اور پومپی آئی مرکز سلطنت تک پہنچنے ہی نہ پائے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ خاتون پاکدامن ہونے کے ساتھ ساتھ حاملہ بھی نکلی اور پومپی آئی کی محنت تو بے کار، وقت کا نقصان ہوا۔ خاتون مر گئی یا مار دی گئی لیکن پومپی آئی کو روم پہنچنے میں مطلوبہ تاخیر ہو گئی ــ اور یہ مشتے از خروارے ہے۔

دوسری طرف اسلامی تاریخ دیکھیے۔ اسلام کا لفظ آتے ہی بھڑک کر امویوں یا عباسیوں کے عہد کو یاد کرنے نہ بیٹھ جائیے بلکہ خالد بن ولید اور عمر بن عبدالعزیز کو بھی یاد کیجیے، حسن بصری کو یاد کیجیے۔ ابوحنیفہ کو یاد کیجیے۔

خیر تو یہ جولیس سیزر تھا جس کے اتنے غلغلے ہیں اور یہ کہانی میری نہیں۔ یالی وڈ کی نہیں بلکہ برادر بزرگ ہینڈارک مورخ قدیم یونان و روما کی ہے۔ پڑھنے والے عبرت پکڑیں یا نہ پکڑیں یہ ان کا کام ہے، اپنا کام تو سیر و سیاحت ہے جو نظر آتا ہے جو یاد آتا ہے لکھے جاتے ہیں۔

آئیے اس بڑائی اور چھوٹائی کی دنیا سے ایک مذہبی رومانوی عالم میں پہنچ جائیں جس کا نام وے ٹی کن ہے۔ وے ٹی کن جو کیتھولک عیسائی دنیا کا مذہبی اور کسی حد تک سیاسی مرکز بھی ہے اس کی تاریخ میں آپ کو ایک دم نہیں بتاؤں گا کیونکہ سیر و تفریح کے معاملے میں تاریخ بیچ بیچ میں آ جائے تو چل جاتی ہے ورنہ سیاحت نامہ تاریخ نامہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس زریں اصول کے پیش نظر سب سے پہلے تو میں آپ کو ان تصویروں پر للچاؤں گا جو میں نے وے ٹی کن کے سلسلے میں جمع کی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ اپنے رستے پر لے آؤں گا ــ کون سے رستے پر.....

وے ٹی کن شہر روم کا ایک حصہ ہے۔ الگ شہر ہے۔ یہاں عام اطالوی قانون لاگو نہیں۔ یہاں اطالوی حکومت کی حکومت نہیں چلتی بلکہ پاپائے اعظم کی حکومت قائم ہے۔ یہ چار دیواری دنیا بھر کے قوانین سے محفوظ یا بالاتر ہے۔ اس کی خود مختاری کو بڑے بڑے جابر بادشاہ، ڈکٹیٹر، جمہوری وزرائے اعظم بھی نہیں چھین سکے جنگ

عظیم بن اُمّی فتح کرنے والے بھی نہیں چھین سکے۔ یہ الگ بات ہے کہ صدیوں پہلے ویٹی کن کی حکومت پوری عیسائی دنیا پر قائم تھی اور اب صرف اثرات ہی اثرات رہ گئے ہیں۔

یہ ویٹی کن میں پیاتس سینٹ پیٹر یعنی سینٹ پیٹر کا چوک ہے، چوک کے وسط میں مینار اور مینار کے پیچھے اُن کا گرجا ہے۔ یہ چوک دنیا کے سات نہیں تو آٹھ دس عجائبات میں سے ایک ضرور ہے۔ اسے دیکھے بغیر اس دعوے کی تصدیق ہونا محال ہے جیسے تاج محل کو دیکھے بغیر اس کی تصدیق ممکن نہیں کہ وہ دنیا کے سات عجوبوں میں سب سے اعلیٰ اور خوبصورت عجوبہ ہے۔

چوک سینٹ پیٹر یا مقدس ولی پطرس کا چوک صرف عمارتی یا حسن ہی کے لحاظ سے عجوبہ نہیں بلکہ بجائے خود ایک عجیب و غریب تاریخ بھی ہے، سادہ کہانی تو یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے حواریوں میں ایک حواری پطرس بھی تھے جو ۶۴ء میں روم تبلیغ کرنے آئے اور سولی پر چڑھا دیے گئے۔ اور پھر ۳۲۴ء سے اس مقام کی تعمیر شروع ہوئی جو آج تک جاری ہے مگر بات اتنی سادہ نہیں۔ اس مقام پر ہزاروں اہلِ دولت اور ہزاروں عقیدتمندوں نے چھپے چھپے پر اپنی حیثیت کی یادگاریں قائم کر رکھی ہیں اور قائم کرتے جاتے ہیں۔ بادشاہوں اور دولتمندوں کا روپیہ، فنکاروں کی محنت اور خوش عقیدہ عوام کی محبت نے اسے دنیا کے نادر ترین نمونۂ نوادر میں شامل کر دیا ہے جن کی تفصیل کے لئے کئی کتابیں چاہئیں مگر:

میرا حصہ دُور کا جلوہ

میں جس دن وہاں پہنچا پورا چوک بھرا ہوا تھا۔ یہ اس بھرے ہوئے چوک کی تصویر بھی دیکھ لیجیے۔ یہ زیادہ تر عوام تھے معمولی کپڑے پہنے ہوئے مرد اور عورتیں جن میں امرا کم نظر آتے تھے۔ سیدھے ہاتھ کو ایک بالکنی پر ایک کھڑکی ہے، اس میں پاپائے اعظم چند لمحوں کے لئے نمودار ہوتے ہیں لوگ جھک جاتے ہیں وہ دعا پڑھتے ہیں سب کو ہاتھ سے برکت کا اشارہ کرتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں۔ پھر زیارتیں شروع ہوتی ہیں جن کی تفصیل الگ ہے اور جن میں سے بہت ساری باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں اور میرے غیر کیتھولک عیسائی پڑھنے والوں کی سمجھ میں بھی نہیں آئیں گی۔ اس لئے انھیں چھوڑ کر اس گرجا کے چند مقامات ملاحظہ کیجیے۔ یہ اندر کی اونچی محراب ہے کیسے تراش کر کن اقسام کے پتھروں شیشوں اور فن کی... سے مزین ہے کاش یہ تصویر خود بولے مگر تصویریں کب بولتی ہیں۔

اور یہ اس کا ایک وسطی ہال دیکھئے اور سب سے بڑھ کر یہ مرکزی مقام ملاحظہ کیجیے جہاں پطرس کے مجسمے اور ستون برسوں کی محنت کے بعد آویزاں کئے گئے تھے اور آج مرکزِ زیارت بنے ہوئے ہیں۔ اہلِ اسلام خفا نہ ہوں میں یہ تصویر صرف پاکستان کے ان عیسائی باشندوں کے لئے بطور تحفہ لایا ہوں جو ویٹی کن سے محبت کرتے ہیں

www.taemeernews.com

رراس کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اہل اسلام خفا ہوں گے بھی نہیں کیونکہ میرا مذہب یعنی ان کا مذہب نفرت نہیں بلکہ رواداری سکھاتا ہے۔ اس کے علاوہ جناب یہ تصویر میری بہت قیمتی تصویروں میں سے ایک ہے اسے غور سے دیکھیے۔ دائیں ہاتھ کی محراب کا کام ملاحظہ فرمائیے۔ بائیں ہاتھ کے نقش و نگار دیکھیے ادھر کی عبارت پڑھیے جو قدیم لاطینی زبان میں ہے۔ اس سے کم از کم لاطینی حروف شناسی کا تجربہ ہو جائے گا۔

اگر یہ سب کچھ پسند آئے تو فقیر کو دعائے خیر سے یاد کیجیے۔ نہ آئے تو معاف کر دیجیے۔ معاف کرنا کوئی ایسی بری بات بھی نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بہت سے لوگ آج کل معاف کرنے کو کمزوری یا مصلحت پسندی سمجھنے لگے ہیں۔ سو انھیں اللہ معاف کرے گا۔

www.taemeernews.com

لیمپ پوسٹ۔ نیرو۔ سینٹ پیٹر

اس تصویر میں وہ لڑکی نظر نہیں آئے گی۔ کیونکہ یہ تصویر اس نے خود کھینچی تھی۔

یہ اس پیانسا ہسپانیہ کی تصویر ہے جس کے سامنے مصوّر بابر رہتا ہے۔ پیانسا یعنی چوک سے اوپر سیڑھیاں جاتی ہیں اور ایک دوسرے محلے میں کھل جاتی ہیں لیکن اہلِ دل اہلِ درد اپنا زیادہ تر وقت انہی سیڑھیوں یا سیڑھیوں کی ساتھ والی دیواروں پر بیٹھ کر گزارتے ہیں۔

جب بابر نہیں ملتا تو میں سامنے والی سیڑھیوں کی طرف چلا آتا ہوں اور ایک پرانے عالمی یعنی یونیورسل دوست سے پہروں گپیں مارتا ہوں۔ وہ عالمی دوست یہ بائیں ہاتھ والا لیمپ ہے۔ لیمپ پوسٹ' اس معاملے میں روم یا اٹلی کی کوئی خصوصیت نہیں جو سفر نامے کے اس اٹلی والے حصے میں ذکر کیا جائے۔ مگر میں مجبور ہوں کیونکہ سچی بات یہی ہے کہ میں نے روشن اور ہنگامہ پرور اور خوبصورت اور "مرکزِ حسن ارزاں" روم میں اپنی زیادہ تر تنہائیاں اس لیمپ پوسٹ کے سہارے گزاری ہیں۔ یوں مجھے ایک اور بے جان بقراط سے بات چیت کا شرف بھی حاصل رہا ہے جس کا نام ابوالہول ہے اور جو اہرامِ مصر کے سامنے صدیوں سے سب کا تماشا دیکھ رہا ہے اور کچھ نہیں کہتا لیکن وہ پرانا آدمی ہے۔ بزرگ۔ لیا دیا۔ اپنے عہدے اور مرتبے کا خیال رکھتا ہے اور مجھ جیسے چھوٹے جیتوں کو زیادہ قریب نہیں آنے دیتا۔ لہٰذا میں نے بھی اس سے صرف نیازمندی ہی رکھی۔ آداب بسلامت جیسے مجبور چھوٹے خشک مزاج بزرگوں سے واسطہ رکھتے ہیں۔ ایک بار دو چار سوال کئے تو اس نے یہ مذاق اڑایا جس کا مجھے آج تک قلق ہے۔

یہ لیمپ پوسٹ جدید زمانے کی چیز ہے۔ اس سے تعلقات میں یارانے دوستانے کا بے تکلفی کا لطف آتا ہے۔ جو چاہو کہو جب تک چاہے اس کا وقت ضائع کرو بیچارہ بُرا نہیں مانتا مگر ظاہر نہیں کرتا۔ میں دو طرح پر اس

www.taemeernews.com

کے نیچے والے چبوترے پر بیٹھتا ہوں۔ زور سے آواز دینے پر سامنے والے ریستوران کا ایک ذرا سا لڑکا ٹھنڈی اور گاڑھی کافی کی پیالی دے جاتا ہے اور گھنٹے دو گھنٹے بعد بھری کی بھری پیالی واپس لے جاتا ہے۔ اس کی قیمت سو لیرے ہوتی ہے یعنی تقریباً سوا سو پیسے یعنی سوا روپیہ۔

دیکھو یا لیمپ پوسٹ! میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ اپنی کتاب میں کسی نہ کسی بہانے تمہارا ذکر ضرور کروں گا، سو میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اب اس پر اصرار نہ کرو کہ میں اپنی تمہاری گفتگو کی تفصیل سے بھی سب کو مطلع کروں۔ تم تو روغو پیا ۔۔ سا ہسپانیہ آف روم کی سیڑھیوں پر بیٹھے رہو گے لیکن میرا بیڑا ہو جائے گا۔ اس وقت یہی مناسب ہے کہ لوگ مجھے غبی کند ذہن اَن پڑھ یا زوال پسند یا جھوٹا یا فراڈ سمجھ لیں یہی غنیمت ہے پیارے۔ ابھی جیئے تو بہت عمر پڑی ہے لکھنے والے کے قلم کی سیاہی کبھی خشک نہیں ہوتی۔ لکھنے والا پینے والے کی طرح ہوتا ہے:

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

دیکھا تم نے ہمارے دادا میاں کے ہاتھ لرزنے لگے تھے قرضے بے شمار ہو گئے تھے۔ شراب نہ مل سکتی تھی نہ پی سکتے تھے۔ مگر واہ رے بڈھے:

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

کیا بات بن گئی؟ شاید نہیں بنی۔ چلو نہ بنے۔ ہر بات کہاں بنتی ہے۔ کہاں بن سکتی ہے۔ فی الحال تو تم اسی پر خوش ہو جاؤ کہ میں نے دنیا کو تمہاری تصویر دکھا دی تمہارا ذکر کر دیا اور یہ بتا دیا کہ روم میں میرے تم سے بڑے بڑے "مذاکرات" ہوتے ہیں۔ پاکستانی انٹلیکچوئل اس بات پر یقین بھی کر لیں گے کیونکہ ان کے زیادہ تر مذاکرات بھی تمہارے ہی بھائیوں سے ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن ایک دن میرے اور میرے عزیز دوست لیمپ پوسٹ کے درمیان "وہ" آ گئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ قدیم سے دوستوں میں سب سے بڑی بنائے افتراق یعنی جھگڑے کی وجہ زر، زن، زمین ہوتی ہے اور اب کرسی بھی ہونے لگی ہے۔ کرسی یعنی کسی نہ کسی قسم کی طاقت یا ذمے داری کی نشست گاہ۔ کنٹرولنگ سینٹر۔ مگر یہ ذرا جدید متولد ہے۔ حالانکہ اس کا اطلاق ازل سے آج تک ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے۔ پھر بھی نہ جانے بزرگوں نے اسے مثلث میں شامل کیوں نہیں کیا۔ شاید کاف آ جانے سے زے کا صوتی حسن خراب ہو جاتا یا شاید وہ کرسی کا سرچشمہ بھی زر کو سمجھتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بہر حال یہ قصہ ہے اس زن کا جو اس دن میرے اور میرے دوست لیمپ پوسٹ کے درمیان حائل ہو گئی

www.taemeernews.com

وہ آئی اور میرے برابر والے چبوترے پر بیٹھ گئی اور لمحے بھر میں میری توجہ لیمپ پوسٹ سے ہٹ کر دشمن بن گئی۔ میں نے لیمپ پوسٹ سے منہ موڑ لیا۔ ہفتوں کی دوستی خاک میں ملا دی۔ اس کی وفاداری متاثر ہوئی سب کچھ بھول بھال کر ایک ترقی پذیر عملی آدمی کی طرح اس زن کو دیکھنے لگا اور وہ بھی مجھے دیکھنے لگی اور یوں ہم دو دوست اس طرح جدا ہو گئے جیسے مجھ سے میرے کئی دوست میری ہی اپنی کرسیوں کے چکر میں جدا ہو گئے ہیں۔

مگر آپ کسی رومانٹک کہانی کی امید پر خوش نہ ہوں کیونکہ وہ زن بابر کی بلائی ہوئی ایک ترجمان نکلی جسے اس نے مجھے وے ٹی کن اور دوسرے مقامات دکھانے کے لیے بلایا تھا اور خود حسب عادت غائب ہو گیا تھا۔

اور یہ سب میں نے بعد میں جانا۔ اپنے ایک اتنے پیارے بے ضرر دوست کو چھوڑنے کے بعد جانا کہ میں نے اسے بے وجہ چھوڑا۔ بہت جلد چھوڑا اور جس امید پر چھوڑا وہ باطل ثابت ہوئی۔ پتا نہیں مجھے چھوڑنے والے دوستوں کو اب تک یہ احساس ہوا ہے یا نہیں کہ انھوں نے مجھے بے وجہ چھوڑ دیا۔ بہت جلد چھوڑ دیا اور جس مقصد کے لیے چھوڑ دیا وہ میری امید کی طرح باطل تھا۔ پتا نہیں آپ سب پڑھنے والوں کو چھوڑ دینے والے دوستوں کی کیا کیفیت ہے کیا وہ مجھ سے سبق لیں گے۔ میرے اعتراف سے میری بپتی کہانی سے۔

یہاں اعتراف کا لفظ یونہی نہیں آ گیا بلکہ یہ وے ٹی کن کا اثر ہے کیتھولک مذہب میں اعتراف ایک اہم عقیدہ اور عمل ہے۔ گناہگار پادری کے سامنے اپنے گناہ کا اعتراف کرتے ہیں اور گناہ معاف کرنا نہ کرنا خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن ان کا دل ضرور ہلکا ہو جاتا ہے۔ مجھ پر وے ٹی کن یعنی کیتھولک عیسائیت کے روحانی مرکز کا اتنا اثر ہے کہ میں نے کم از کم اپنے ایک گناہ کا اعتراف برسر عام کر لیا ہے۔

تو اس خاتون نے بابر کی واپسی پر ضروری شکایت کے بجائے خوش ہو کر یہ تصویر کھینچی اور مجھے وے ٹی کن دکھانے لے گئی۔ چونکہ اب مجھے ہالینڈ جانا ہے اور روم میں قیام بہت کم رہ گیا ہے اس لیے میں وے ٹی کن پوری طرح دیکھ لینا چاہتا ہوں۔ آپ اتنا کچھ تو نہیں دیکھ سکتے مگر جو چلتے پڑ جائے باندھ لیجیے کبھی نہ کبھی کام آئے گا۔

یہ دو تصویریں بڑی عبرت ناک ہیں۔ دیواروں پر اہل دل مصوروں اور فنکاروں نے بڑی دلسوزی اور محنت سے بنائی ہیں۔ ایک میں شہنشاہ نیرو سینٹ پیٹر یعنی پطرس کے قتل کا حکم دے رہا ہے اور دوسری تصویر میں اسی کے حکم سے سینٹ پال کو قتل کیا جا رہا ہے۔ نیرو کو آپ جانتے ہیں کہ جس نے روم کے عیسائی محلوں کو جلوا دیا اور شعلے بلند ہوئے تو خوشی سے مست ہو کر بانسری بجانے لگا۔ اردو میں نقشہ بانسری آیا ہے۔ حالانکہ سنا یہ ہے وہ گٹار بجاتا تھا اور اس وقت گٹار بجا رہا تھا۔ بہر حال خواہ اس نے بانسری بجائی یا گٹار بجایا بدنام خوب ہوا۔ آج تک اس کا نام نفرت و حقارت سے لیا جاتا ہے اور وہ عالمی ادب میں ظلم و تشدد کی ایک تشبیہ ایک مثال بن کر رہ

گیا ہے لیکن غضب دیکھیے کہ لوگ اس کے گٹار یا بانسری کو بھول گئے۔ دنیا بھر نے سمجھ لیا کہ نیرو ختم ہو گیا تو اس کے ساتھ اس کی بانسری بھی ختم ہو گئی حالانکہ میں اس بانسری اس گٹار کی آواز برابر سن رہا ہوں سبھی کانوں والے سن رہے ہیں اور نہ جانے کب تک سنتے رہیں گے۔ روم میں مظلوم عیسائیوں کے محلے سے شعلے نکل کر پوری دنیا میں پھیل چکے ہیں۔ مگر لاکھوں کروڑوں آنکھوں کو نظر نہیں آتے۔ آپ یقین کیجیے کہ مجھے وہ صاف نظر آرہے ہیں۔ میں بطور خاص اس مقام پر گیا جو نیرو کا محل کہلاتا ہے اور میں نے ایک بلندی سے چاروں طرف دیکھا اور میں پوری ذمے داری کے ساتھ گواہی دیتا ہوں کہ میں نے مشرق مغرب شمال جنوب یعنی دنیا کی چاروں سمتوں میں شعلے بھڑکتے دیکھے اور نیرو کی بانسری بھی سنی بلکہ گٹار بھی سنا۔ وہ شعلے وہ بانسری وہ گٹار مجھے روم میں زیادہ روشن نظر آئے یقین ہے بھی نظر آئے تھے اور پوری دنیا گھوم لینے کے باوجود کہیں معدوم نہ ہوئے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ شعلے آج بھی زندہ ہیں وہ بانسری آج بھی بج رہی ہے اس گٹار کی دلخراش آواز آج بھی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ نیرو مر گیا ختم ہو گیا مگر اس کی بانسری زندہ ہے اس کا گٹار زندہ ہے اس کے لگائے ہوئے شعلے بھڑکے جا رہے ہیں اور نہ جانے کب بجھیں گے۔

یاد رہے کہ نیرو کوئی دو ہزار برس پہلے کا آدمی ہے کہیں آپ یہ سمجھ لیں کہ جب میں روم میں تھا تو کوئی صاحب نیرو نام کے حکومت کر رہے تھے۔ میری اس وضاحت کا بُرا بھی نہ مانیے گا اس کی ضرورت اس لئے پڑی کہ آپ میری باتیں سمجھنے میں دیر بہت لگاتے ہیں یا سمجھنے کی زحمت ہی نہیں فرماتے۔ میری گزارش صرف اتنی ہے کہ میں نے ان شعلوں کو دنیا بھر میں بھڑکتے دیکھا ہے یعنی اتنی دنیا میں جو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہے۔ اگر سوشلسٹ بھائی بُرا نہ مانیں تو میں عرض کروں کہ یہ شعلے روس میں بھی بھڑک رہے ہیں اور سرمایہ دار یا "آزاد" بھائی بُرا نہ مانیں تو عرض کروں کہ یہ شعلے امریکہ میں بھی بھڑک رہے ہیں۔ یہ شعلے طاقت کے ہیں جن میں بے طاقت انسان یا سوچنے والی ہستیاں بس رہی ہیں کسی کا پتا چل جاتا ہے کسی کا پتا چلنے نہیں پاتا یا بہت دیر میں چلتا ہے۔ تاریخ ان مصوروں اور فنکاروں کی منتظر ہے جو ایک دیوار عالم پر سب جلنے والوں قتل ہونے والوں پھانسی پانے والوں کی تصویریں اسی طرح بنائیں گے جیسے ان عیسائی فنکاروں نے سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کی بنائی ہیں۔ ہاں ایک کھینچ تو ہوگی۔ وہ دیوار دنیا کتنی ہزار میل کی لاکھ میل ہی بنانی پڑے گی۔!! مگر خدا کی مدد سے انسان سب کچھ کر سکتا ہے تاریخ سب کچھ کر سکتی ہے۔ اگر فنکار بہت مصروف ہوئے تو مورخ پیدا ہو جائیں گے۔ مورخوں کی مانگ بھی اتنی زیادہ ہو جائے گی کیونکہ آج کل فنکار زیادہ تعداد میں پیدا ہو رہے ہیں اور مورخ بہت کم۔ فنکار ستمگاروں سے گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں اور اپنی گردن بچا لیتے ہیں اور مورخ بے چارہ قلم چلاتے ہی سر قلم کرانے کے

چکر میں آجاتا ہے۔ آل رائٹ میں دو ڈھائی سو برس اور انتظار کر سکتا ہوں بلکہ دو ڈھائی ہزار برس کا انتظار بھی کوئی ایسی مشکل بات نہیں ہے۔

اب دیکھیے کہ وہی سینٹ پیٹر جو اس طرح بے رحمی سے قتل کیے گئے کس طرح کروڑوں عیسائیوں کے دل و دماغ میں رچ گئے ہیں۔ ان کے نام سے منسوب گرجے اور چوک کی تصویریں آپ کو دکھا چکا ہوں جو دنیا کے عجائبات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اب ان کا ایک مجسمہ دیکھیے۔ یہ ہزاروں مجسموں میں سے ایک ہے لیکن ویٹی کن میں نصب ہونے کی وجہ سے زیادہ قابل ذکر ہے۔ پورا مجسمہ پیتل کا ہے اور ۴۲۵ء میں یعنی پورے پندرہ سو برس پہلے ایک مقدس راہب کے ہاتھوں یہاں نصب ہوا۔ امیر اہل عقیدت اس مجسمے کے قدموں میں زر و جواہر ڈالتے رہے ہیں۔ غریب لوگ اس کے پاؤں چومتے ہیں، تماشبین حیرت سے دیکھتے ہیں۔

یہ اس شخصیت کا مجسمہ ہے جسے عیسائی روایت کے مطابق ایک بادشاہ سلامت یعنی نیرو صاحب نے نہایت حقیر بے نوا اور کافر گردان کر شہر بھر میں قتل کرا دیا تھا۔

سینٹ پیٹر کے گرجا میں کئی ہزار تصاویر، نقش، مجسمے اور پاپاؤں کی یادگاریں ہیں۔ ان سب کا احاطہ ایک ضخیم کتاب میں بھی ممکن نہیں اور ان کا انتخاب بھی ممکن نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصاویر، مجسمے اور نقوش الگ ہیں۔ مگر بہر حال فدوی قدیم کلچر کی پیداوار ہے اس لئے از خود ان کی تصاویر شائع نہیں کر سکتا خواہ فن یا آرٹ کے تقاضے کچھ بھی ہوں۔ اس لئے جلدی سے وقت کی دیواریں پھاند کر ویٹی کن کے دو نادر فنی نمونے دیکھیے۔ یہ عظیم مصوری تراش اور خط کا ریفائیل اور اس کے شاگردوں کے کارنامے ہیں۔ ایک میں سورج اور چاند کی تخلیق دکھائی ہے۔ اس تصویر کو غور سے دیکھیے میری تحریر کی پروا نہ کیجیے۔ یہ تصویر گھنٹوں مطالعے کی مستحق ہے۔ دوسری تصویر جس میں روشنی تاریکی سے جدا ہو رہی ہے۔ ان تصاویر کے فلسفے سے قطع نظر ان کے فن پر نظر ڈالیے اور ... کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ ویٹی کن میں ایک طول طویل گیلری ہے جو ریفائیل سے منسوب ہے۔ اس کا نام ریفائیل کی بائبل ہے۔ اس میں کئی ثبت ہیں۔ آدم و حوا کی پوری کہانی بڑے بڑے پیغمبروں یعنی حضرت ابراہیمؑ حضرت یعقوبؑ حضرت یوسفؑ حضرت موسیٰؑ حضرت داؤدؑ حضرت سلیمانؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی تصویریں اور ... کہانیاں۔ طرح طرح کے فنی نوادرات میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ ان کی اشاعت بھی ہمارے قدیم روایت کے مطابق ... نہیں ورنہ ایسے ایسے پیغمبروں کی کھلی کھلی صاف صاف تصویریں اردو داں دنیا کے لیے بالکل نئی چیزیں ہوتیں۔ اس لئے فی الحال چاند اور سورج کی تخلیق اور نور و ظلمات ہی کی تصاویر پر اکتفا کیجیے۔ یوں فقیر کی جھولی میں بہت کچھ ہے مگر بہت سے آداب اس کی نمائش میں مانع ہیں۔ ابھی فقیر صرف ایک بار روم کے دیگر اہم مقامات کی اور سیر کرنے کا

www.taemeernews.com

اور پھر تنگیٔ وقت کے سبب بالینڈ روانہ ہو جائے گا۔ جہاں ہارلم کے رنگین باغوں، ایمسٹرڈم کی پن چکیوں اور ہیگ کی بین الاقوامی عدالت میں اس حقیقت نقیہ کا جیبنی سے انتظار ہو رہا ہے۔

ویٹی کن - مائیکل انجیلو کا شاہکار ـــــ "یوم انصاف"

www.taemeernews.com

ٹک دیکھ میاں اور آگے چل

یہ مشہور و معروف فورو رومانو ہے۔ فورو کو انگریزی میں فورم کہتے ہیں۔ اردو میں بہت کچھ کہہ سکتے ہیں۔ مگر اصطلاحی اختلافات کے ڈر سے کچھ نہیں کہتے یوں سمجھئے کہ ایک مقام ایک جگہ جہاں جمع ہوکر اظہار خیال کیا جائے۔ جہاں سے اظہار خیال کیا جائے۔ بہرحال یہ فورو یا فورم وہ جگہ تھی جہاں اولین رومی جمہوریت نے پرورش پائی تھی۔ "رومی تہذیب" کے ابتدائی زمانے میں اس کا بڑا زور تھا پورے روم پورے رومی مقبوضات کے سیاسی معاملات بحث مباحثے کے بعد یہیں طے ہوتے تھے بعد میں شہنشاہیت قائم ہوئی تو اس کا زور ٹوٹ گیا اور پھر اس کی عمارتیں بھی ڈھینے لگیں اور ان میں بھی آگ لگی۔ شاید:

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

لیکن یہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ رومی "جمہوریت" جمہوری مزاج سے مرکب نہیں تھی بلکہ ایک خاص طبقہ شرفا یا کہنا چاہیے کہ طبقہ امرا کی حکومت تھی جو دوسروں کے حقوق چھین لیتے تھے لیکن اپنے حقوق کسی کو نہیں دینا چاہتے تھے مثلاً وہ بادشاہت کے مخالف تھے لیکن صرف سلطنت روما کی حد تک یعنی اپنی حد تک کیونکہ وہ ساری غیر رومی دنیا پر قبضہ کرلینا، وہاں کی آبادیوں کو غلام بنا لینا اپنا حق سمجھتے تھے اور وہاں کے وسائل سے روم میں یہ فورو رومانو اور دوسرے محلات اور معبد اور اونچی اونچی عمارتیں بنانے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے تھے۔ جیسے اپنے انگریز بھائی ہیں یا تھے کہ انگلستان میں حزب مخالف کو سرکاری تحفظات دے رکھے تھے اور انگلستان سے باہر تمام ممالک محروسہ ملکہ معظمہ کا پٹہ کر رکھا تھا۔ اسی لئے تو انگلستان روم کا سیاسی شاگرد کہلاتا تھا اور اسی ذہنی غلامی در غلامی کے چکر میں ہم رومن لا یعنی اصولِ قانون روم کو اپنے قوانین کی اساس بنائے بیٹھے ہیں۔

www.taemeernews.com

میرے ساتھ تو ایک سفید رنگ کے صاحب کھڑے تھے، انھوں نے ان کھنڈروں کو دیکھ کر ایک آہ بھری اور برابر والی ایک سفید رنگ نک چڑھی بڑی بی کا ہاتھ دبا کر بولے۔ "ڈارلنگ یہ جگہ جمہوریت کی بنیاد تھی۔ دیکھو معلق، اعنان حکمرانوں کے زمانے سے جو تباہ ہوئی ہے تو آج تک نہیں ابھری"۔ یہ کہہ کر انھوں نے مجھے بھی دیکھا اور مجھے پڑھا لکھا جان کر آنکھوں ہی آنکھوں میں تائید چاہی۔ میں کافی ہاؤس یا جیمخانے کے پڑھے لکھے جمہوریت پسندوں میں کھڑا ہوا ہوتا تو اکیلے پن کی وجہ سے گھبرا کر ہاں کہہ دیتا۔ مگر میں نے آنکھیں صاف رکھیں، میں یوں ہی جما رہا، میں نے تائیدی طور پر سر بھی نہیں ہلایا بلکہ حقارت سے مسکرا دیا۔

"اسے نہ جانے کتنے بدیسی بے قصور غلاموں سے بنوایا گیا ہوگا"۔ میں نے الٹی بھابھی ماری "اچھا ہوا یہ سب ٹوٹ پھوٹ گیا"۔

سفید فام جمہوریت پسند نے یقیناً مجھے جانگلو سمجھا ہوگا۔ مگر میں اس رویے کا عادی ہو چکا ہوں۔ گھر باہر کالے صاحبوں نے وہ بھس بھر رکھا ہے کہ باہر والوں کا ڈر اٹھ جانا لازمی ہے۔ لہٰذا میں ڈھٹائی سے فور ورد، لو کو صرف عبرت پکڑنے کے لیے دیکھتا رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ اب مجھ سے تنگ آکر عبرت بھی کہیں دور بھاگنے لگی ہے۔ آہ عبرت۔ یا آہ میں۔

تعمیری اعتبار سے یہ دوسرا مقام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کا نام ہے آرکو ڈی سی تی می یوسے دے رو دھی معاف کیجیے گا یہ میرا رکھا ہوا نام نہیں ہے جیسے خود میرا نام میرا رکھا ہوا نہیں ہے۔ لیکن جب رکھ دیا گیا تو اسے برداشت کرنا سب کا ایک اخلاقی فرض ہے۔ اچھا چلیے اس کا تخلص بھی بتائے دیتا ہوں یعنی مقبول عام نام۔ عام طور پر اسے کولونا دی فوکا کہتے ہیں یعنی انگریزی میں فوکا کالم یعنی فوکا کا ستون۔ یہ اصل میں ایک تین رخ کا عظیم الشان ستون ہے۔ میں ہوتا تو اس کا فصیح نام سہ محرابی رکھتا لیکن اس پر فارسی کا اثر غالب ہونے کا الزام لگتا اور یہ الزام بھی لگتا کہ یہ بھائی صاحب زبان کو مشکل بنا کر اپنی اجارہ داری قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے شکر ہے کہ میں اس زمانے میں تھا ہی نہیں جب یہ عمارت بنی اور یہ نام رکھا گیا۔ ہوا یہ کہ ایک تھا بادشاہ سے وی اردو اور اس کے کئی بیٹے تھے۔ وہ بادشاہ ایک اچھا فاتح قسم کا بادشاہ تھا اس لیے اس کی موت کے بعد اسے یہ عمارت بنا کر اس سے اور اس کے بیٹوں سے معنون کر دی لیکن ذرا غور سے ملاحظہ کیجیے کہ بڑے ستون کے سامنے جو یہ چھوٹے چھوٹے آثار ہیں، یہ مشرق کی غلامی کی یادگار کے طور پر تعمیر کیے گئے تھے۔ مغرب جو بڑا اور حاکم تھا مشرق جو چھوٹا اور محکوم رہا ــ مغرب جس کے ایسے نفرت انگیز آثار بھی مشرقی سیاح کس عقیدت اور محبت سے دیکھتے ہیں آپ بھی دیکھیے اور قسم ہے کہ آپ بھی مجھ کو گنوار اور ان پڑھ کے لقب سے یاد کیجیے گا۔ کیونکہ آپ

صبح سے شام تک مغرب کی آقائی اور مشرق کی غلامی دیکھتے ہیں برداشت کرتے ہیں اور جان بوجھ کر یا بے جانے پسند کرتے ہیں آپ کو میرا زاویۂ نظر کیسے پسند آ سکتا ہے۔

اس تیسری عمارت پر مجھے کوئی سیاسی اعتراض نہیں یہ بڑی خوبصورت تعمیر ہے جسے قیصر قسطنطین نے بنوایا۔ کئی بار اس میں بھی آگ لگی کئی بار تباہ ہوئی مگر پھر مرمت کر دی گئی یہ چوتھی صدی کی یادگار ہے اور سینٹ جان سے منسوب ہے۔ یار یہ کیا بات ہے جہاں سینٹ یعنی مقدس لوگوں اور ولیوں وغیرہ کا ذکر آیا خواہ وہ عیسائی ہوں خواہ یہودی تمہاری انقلابیت پگھل کر بہہ جاتی ہے بالکل ریشہ خطمی ہو جاتے ہو یہ کاہے کا اثر ہے۔ مذہب کا ایشیائی مزاج کا یا صرف رواداری کا تقاضا ہے۔ اب اس سوال کا جواب کیا دیا جائے۔ پھر دادا حضرت کا سہارا لینا پڑے گا یعنی :

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اسے لیجیے چلتے چلاتے آپ کو روم میں اہرام بھی دکھا دوں یہ سینٹ پال کا دروازہ ہے اور بائیں ہاتھ کو چیس تی اس اہرام ہے مگر روم میں اہرام بھی بطور عمارت نہیں آیا بلکہ مخدوم کے طور پر۔ رومیوں نے مصر فتح کیا تو اُن کے عجائب وغرائب کی یاد آتی رہی۔ مصری کام ادرتی آتے جاتے۔ جب جب عقلمند حاکم محکوموں کو مار پیٹ کر مکا بنا دیتے ہیں تو ان کے آرام و آسائش کا خیال بھی رکھتے ہیں ان میں کسی نہ کسی قسم کے افتخار و وقار اور احترام کے گھپلے بھی پیدا کر دیتے ہیں جیسے انگریز بہادر خطابات دیا کرتا تھا۔ بائی دی وے اگر میرے بزرگ پڑھنے والے ننگ اسلاف نہ کہیں تو عرض کر دوں کہ میرے والد بھی نائٹ ہڈ سے سرفراز ہوئے تھے یعنی انھیں سر کا خطاب عطا ہوا تھا مگر یہ اصل میں جملۂ معترضہ ہے بات اہرام کی تھی اور یہ اہرام وہ سر کا خطاب ہے جو حاکم رومنوں نے محکوم مصریوں کو اپنے گھر میں ان کی عزت بڑھا کر دیا تھا۔ واہ بھئی حاکمو تمہاری ذہنیت ہمیشہ ایک سی رہی ہے۔ مگر واہ بھئی محکومو تمہاری ذہنیت بھی بدلنے نہیں پاتی۔ جہاں ادھر کا اشارہ ہوا۔ اور :

مجنوں کو برا کہتی ہے لیلا مرے آگے

اب روم روشن ہوتا جاتا ہے۔ اس لیے آیئے آپ کو ویا وے نی تو لے چلوں ویا وے نی تو یعنی شارع وے نی تو جو پیرس کی شانزالیزے اور کراچی کی الفنسٹن اسٹریٹ اور لاہور کی مال روڈ ہے اور تینوں سے زیادہ روشن اور گرم ہے۔ شانزالیزے تو خیر دنیا کی نمبر ون سڑک ہے مگر وہ نرم زیادہ ہے یہ ویا وے نی تو سب سے زیادہ گرم ہے۔ گرم مسالے دار، چٹ پٹی۔ جہاں بہ رلیستوران بہر دکان :

news.com

دامانِ باغبان وکفِ گلفروش ہے

یہاں میں راتوں کو اکیلا گھومتا ہوں کیونکہ روم میں رات کا ساقی دن کے ساقی سے بھی زیادہ مہنگا ملتا ہے اور:

چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

زبان سے ناواقفیت یعنی بے زبانی الگ تازیانہ ہے۔ حفیظ ہوشیارپوری کا یہ مشہور شعر کس قدر چھوٹا ثابت ہوا ہے آپ نے بھی سنا ہوگا ملکہ پکھراج نے گایا تھا،

بے زبانی زباں نہ ہو جائے

رازِ اُلفت عیاں نہ ہو جائے

لاحول ولا قوۃ۔ یہاں بے زبانی حد سے گزر چکی ہے۔ مگر زبان نہیں ہونے پاتی۔ رازِ الفت ہے کہ طوفانوں کی طرح اُمڈ تا ہے، بادلوں کی طرح گرجتا ہے، بجلی کی طرح چمکتا ہے، توپوں زلزلوں کی طرح گرجتا ہے مگر کسی پر عیاں نہیں ہوتا۔ سچ ہے جبھی تو شاعروں کو جھوٹا کہا گیا ہے۔ افسوس کہ میرے پاس دیاوے ٹی وی کی تصویر نہیں ورنہ

باغ معنی کی دکھاتا میں بہار

کیا خوب اب آپ کا قلم تصویر کا اس قدر محتاج ہو گیا ہے کہ باغِ معنی کے لیے بھی تصویر کی عینک چاہیے۔ اللہ رے زوال۔ (گویا کبھی عروج بھی تھا)

اچھا تا وان میں یہ تصویر ملاحظہ کیجیے۔ ساحلِ روم پر یہ لوٹیں یہ چھتریاں اور ـــ اور ـــ بھئی مرزا غالب پرانے آدمی تھے۔ روایت سے باغی ہوتے ہوئے بھی روایت پسند تھے فرمایا ہے کہ:

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں

شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

ہمارے ساتھ ہوتے تو ہم بڑے میاں پر ثابت کر دیتے کہ انھوں نے مضمون بالکل اُلٹا باندھا ہے۔ اصل میں بنات النعش گردوں روم کے ساحلوں پر دن ہی کو عریاں ہوتی ہیں۔ از راہ کرم غور سے یہ تصویر ملاحظہ کیجیے نقوش دھندے نظر آئیں تو تصور سے بھی کام لیجیے کیونکہ یوں صاف نظر آنے والی چیزیں بھی کوشش کیے بغیر سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں نے آپ کو کھینچ کھانچ کر اس ساحل اس نظارے تک پہنچا دیا ہے اب آگے آپ کی قسمت ہے۔

غور سے دیکھیے یہ مغرب ہے۔ یورپ۔ اٹلی۔ روم۔ مغرب، مغرب جو آج بھی ہمارا قبلہ بنا ہوا ہے، اے پاکیزہ خواتین والے باغیرت حضرات بولو تمہارا اور تمہارے بچوں کا قبلہ اسی ساحل پر واقع ہے یا کہیں اور۔

اگر اس ساحل پر واقع نہیں تو ادھر سے آنے والی ہوائیں طرح طرح کے نشوں میں کیوں مبتلا کیے دیتی ہیں؟

آئی ایم سوری میں پھر معذرت خواہ ہوں۔ اپنے ہی کلچر کا ایک مشہور شعر بار بار بھول جاتا ہوں کیا شعر تھا؟

ہاں یاد آگیا؛

عاقلا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

لہٰذا آپ اس ساحل کو دیکھیے اور خوش رہیے۔ میرا ساحل کہیں اور ہے میں اس کے خیال میں گم ہوں۔ آپ خوش اور میں مگن۔ جہاں تک ہو سکے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلتے ہیں۔ جب تک ساتھ رہا ساتھ رہیں گے، نہ رہا تو جدا ہو جائیں گے۔

ایسا ہمیشہ ہوا ہے اور بہتوں کے ساتھ ہوا ہے

اب ہالینڈ چلیے۔ ہارلم دیکھیے نیو یارک والا ہارلم نہیں بلکہ اصلی تے وڈا ہارلم جہاں:

سُنتے ہیں کہ بہاراں ہے

مگر روم سے رخصت ہونا آسان نہیں ابھی سیکڑوں سیزر شہنشاہ اراکین سینٹ اور اولیاء اللہ بُرا مان رہے ہوں گے کہ بھئی یہ کیا جانبداریت ہے؟ فلاں صاحب کے دربار میں گیا، فلاں کا کھنڈر دیکھا، فلاں کے مقبرے تک پہنچا اور ادھر نہیں آیا۔ اپنے کلچر میں بھی یہی تھا کہ مردوں یعنی گزرے ہوؤں کو ناخوش نہیں کرنا چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب اپنی بھی تہذیبی اقدار تیزی سے بدلتی جاتی ہیں اور انھی کے ساتھ ساتھ میں بھی تیزی سے بدلتا جاتا ہوں اور مردہ پرستی یا ماضی پرستی سے زیادہ حال اور مستقبل پر دھیان دینے لگا ہوں اور اس حال اور مستقبل کا مطلب قومی یا عالمی حال اور مستقبل ہی نہیں بلکہ ذاتی حال اور ذاتی مستقبل بھی ہے لیکن آدمی آسمان تو نہیں جو روز کیسے کیسے "رنگ بدلنے لگے۔ اس لیے مجھے رہ رہ کر ان بیچارے سیزروں اور آثار قدیمہ سے ندامت محسوس ہو رہی ہے جن کا حال آپ کو نہیں سنا سکا جن کی تصویریں آپ کو نہیں دکھا سکا۔ خاص طور پر اپنی برادری والوں سے بڑی شرمندگی ہے جن کے بڑے بڑے فن پارے اُردو دنیا میں پبلسٹی سے محروم پڑے ہیں۔ پچھلے سیاحوں نے بھی ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور میں بھی "طوالت باب روم" کے کامپلیکس میں مبتلا ہو کر انھیں نظر انداز کر رہا ہوں۔ مگر یارو اس میں میرا ہی نہیں بلکہ ان سب لوگوں کا قصور ہے جو روم سے بور ہونے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ کیونکہ یہ معاملہ شاعری کا نہیں جو شاعر بقول شاعر "خود اپنے لیے" لکھتا ہے بلکہ یہاں سوال سب پڑھنے والے بہن بھائیوں کا ہے جن کی پسند ناپسند اس خاکسار کے لیے ہر وقت نہیں تو اکثر

اوقات ہوا بنی رہتی ہے۔

پس اے روم۔ روشتہ ارکیرچی الوداع۔ یوور ویری گڈ ٹو می یعنی تو نے مجھ سے اچھا سلوک روا رکھا مگر اس کے صلے میں میں تجھے کچھ پیش نہیں کر سکتا ابھی میرے ہاں قاعدہ بھی نہیں کہ اچھے سلوک کا بدلہ اچھے سلوک سے دیا جائے اور خواہ میں کتنا ہی یورپ میں رہوں اصلیت تو وہی ایشیائی ہے اور میرا خطۂ ایشیا کی ہزاروں روایتیں اور عظمتیں مسلّم مگر یہ بات بھی پکی ہے کہ آج وہ نو آزاد سا اقہ ہے جہاں دور غلامی میں طرح طرح کی اکھاڑ پچھاڑ سے کئی پرانی قدریں ختم ہو گئیں کئی دبکی دبکائی بیٹھی ہیں اور انہی میں ایک قدر ایک تہذیبی قاعدہ جو اگر مرا نہیں تو روپوش ضرور ہو گیا ہے، یہ تھا کہ اچھے سلوک اچھے کام کا صلہ، کم از کم اچھے الفاظ اچھی یاد سے دیا جائے۔ سومائی ڈیر۔ روشتہ ارکیرچی فی الحال میں تیرے حسن سلوک کے جواب میں اطالوی زبان ہی کا ایک لفظ بول سکتا ہوں اور باقی آئندہ کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

"گراتسیا"

گراتسیا کے معنی ہیں تھینک یو۔ شکریہ۔ آہا ہا۔ اس وقت کیا کیا پرانے پٹے پٹائے مصرعے یاد آ رہے ہیں مثلاً:

برگ سبز است تحفۂ درویش

گر قبول افتد زہے عز و شرف

بلکہ اور آگے بڑھیے اور فلمی دنیا میں آ جائیے تو جذباتی لہجے میں لہک کر:

بچپن کی محبت کو

دل سے نہ جدا کرنا۔

مگر صاحب آپ لوگ کچھ زیادہ بد قسمت نہیں کہ اٹلی جیسے ملک کے بہترین مقامات و مناظر دیکھنے سے محروم ہوئے جا رہے ہیں جبکہ آپ کو اس فدوی المعروف بہ سیاحِ عالم کے ذریعے کیا کیا کچھ تقریباً مفت دیکھ لینے کی سہولت میسر ہے۔ اے تاریخ ادب یاد رکھنا کہ اس میں میرا قصور نہیں بلکہ صحافیانہ رسم و رواج کا قصور ہے جس کے مطابق "یار ایک ہی جگہ زیادہ ٹھہرنا نہیں چاہیے"۔

سوال: تم نے دریا کو کوزے میں بند کیوں نہیں کیا؟

جواب: کوئی میں کوزہ گر ہوں۔

سوال: مختصرات سے کام لیتے، چند صفحوں میں پورا ملک دکھا دیتے۔

جواب: بزبانِ دادا جان مرحوم و مغفور) ابے

سفینہ چاہیے اس بحرِ بے کراں کے لیے

لے لیجیے بائی دی وے ایک دم ایک طعنہ پھر کہیں سے نشتر کی طرح ابھرا ہے آپ بھی اس کا مزا اٹھائیے:

ان آنکھوں نے کیا کیا تماشا نہ دیکھا

حقیقت میں جو دیکھنا تھا نہ دیکھا

مثلاً آپ اس خوبصورت منظر ہی سے محروم رہے جاتے ہیں جو قصبہ ریمی نی میں ساحل اور اطرافِ ساحل کا ہے میں آپ پر رحم کھا کر ایک تصویر پیش کیے دیتا ہوں۔ دیکھیے اور یہ یاد کر کے جلیے کہ میں نے یہاں سمندر میں خوب کشتی چلائی ہے اور رات رات بھر ریت پر لیٹا سامنے والے ہوٹل کی روشنیوں کو دیکھتا رہا ہوں یوں تو ریمی نی یورپ کے مشہور ترین ساحلی مقامات میں شمار ہوتا ہے لیکن یہ قدامت میں بھی روم سے کم نہیں بلکہ مقامی محب الوطن مورخوں کی رائے میں تو یہ روم سے بھی قدیم ہے۔ خیر قدیم ہو یا نہ ہو خوبصورت ضرور ہے۔ بہت خوبصورت اور موسم تو

پانی بھی ہے شراب ہوا بھی شراب ہے

یہ الگ بات ہے کہ صرف اس مصرعے کا پورا مزہ لینے کے لیے دو تین دن میں تھرڈ کلاس بس اور ہوٹل کے باوجود دو ڈھائی سو روپے کا چپت پڑ جاتا ہے۔ بہ حال گزارش یہ کرنی تھی کہ اٹلی میں فلارنس اور وینس اور نیپلز ہی نہیں بلکہ

عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اور لیجیے مزید احسان سہی۔ آپ نے مقبرے دیکھے، بت دیکھے، تصویریں دیکھیں، کچھ کچھ "وہ" بھی دیکھیں۔ اب دو برتن بھی دیکھ لیجیے۔ یہ علاقہ ہے فین تسا۔ اطالویوں کے بقول یہ چھوٹی سی جگہ بڑی اہم ہے کیونکہ یہاں ایسے برتن بنتے ہیں جن کی تصویر پیشِ خدمت ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ ملتان یا ٹھٹھے کا کام اس سے بہتر نہیں بلکہ مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ ملتان اور ٹھٹھہ اٹلی میں بھی موجود ہیں۔ اصل میں ملتان اور ٹھٹھہ ساری دنیا میں موجود ہیں یعنی ساری دنیا کراچی یا لاہور یا لندن یا نیویارک یا روم یا ماسکو ہی کا نام نہیں مگر یہ بحث ذرا دوسری ہے، اسے بڑھانے سے شہر والے برا مان جاتے ہیں، شہر والے جن کا ادبی نام ہے انٹے لی جینٹ شیا۔

لہٰذا میں پھر ساحل کی طرف بھاگتا ہوں اور آپ کو ساحل سالیرنو کی ایک سرکش چٹان دکھاتا ہوں۔ چنانچہ آپ نے بہت سی دیکھی ہوں گی ایک یہ بھی سہی، لیکن چٹان دیکھ لینے سے کوئی خاص فائدہ نہیں جب تک فلسفۂ چٹانیت

کو نہ بہا جائے سودہ نہ آپ کے بس کا ہے نہ میرے بس کا ہے' علامہ اقبال مرحوم نے مجھ پر اور آپ پر بڑی محنت کی مگر نتیجہ میری اور آپ کی شکل میں نمودار ہو رہا ہے۔ خدا کرے آئندہ نتائج بہتر ہوں اس لیے چٹان کی طرف سے نظریں ہٹا کر ان چھوٹی چھوٹی کشتیوں کو دیکھیے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دامن میں اس کے سائے میں چھپی چھپائی بیٹھی ہیں۔ ہم آپ زیادہ سے زیادہ ان کشتیوں کی طرح ہیں جو جوار بھاٹا دیکھ کر تھوڑی دور سمندر میں جاتی ہیں اور پھر بھاگ آتی ہیں۔ اگر اس وقت توارد نہ ہو رہا ہو تو اس مصرع کا کریڈٹ مجھے دیجیے جو ابھی میرے ذہن میں آیا ہے اور اپنا معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ بھگت کبیر یا میرا بائی یا حال ہی کے کسی فلمی شاعر کا ہو۔ بہر حال اس وقت کاپی رائٹ کا سوال نہیں۔ سوال مصرع سے لطف اٹھانے کا ہے۔ مصرع ہے:

جیون آنکھ مچولی بابا جیون آنکھ مچولی

ابھی مجھے خیال آیا کہ اسے دنیا رنگ رنگیلی کی طرز میں گانا نہایت مناسب رہے گا۔

اچھا تو گڈ بائی ایوری باڈی اٹلی کا تماشا ختم۔ ہائے ابھی وینس باقی ہے۔ فلارنس باقی ہے نیپلز خاصا باقی ہے اور سسلی تو بالکل ہی نہیں آیا، مگر یار زندہ صحبت باقی۔ اب ہالینڈ کی ٹھہری ہے تو ہالینڈ ہی سہی۔

www.taemeernews.com

ہالینڈ

www.taemeernews.com

...نظر میں

دنیا خدا نے بنائی مگر ہالینڈ کو ولندیزیوں نے بنایا ہے۔

یہ کہاوت میری گھڑی ہوئی نہیں — کاش کہ ہوتی۔ خود ولندیزیوں کی گھڑی ہوئی نہیں، جس سے فقط حب الوطنی کی بو آتی بلکہ یہ ایک فرانسیسی ادیب کا قول ہے جو کبھی بھی ولندیزیوں کا تنخواہ دار "پی آر او" یعنی افسر تعلقاتِ عامہ نہیں رہا۔ افسر تعلقاتِ عامہ بھی ایک عجیب اصطلاح ہے اور اس کے معنی اس سے بھی زیادہ عجیب ہیں اور اس کی شان و شوکت تو ان دونوں سے بھی زیادہ عجیب ہوتی ہے۔ مگر خیر تعلقاتِ عامہ کے موضوع پر ایک لاجواب مضمون پھر کبھی لکھا جائے گا۔ اس وقت میں آپ کو اور محض آپ کی وجہ سے جملہ افسران تعلقاتِ عامہ (ہر قسم) کو معاف کیے دیتا ہوں۔

یہ پہلا فقرہ جو آپ نے اوپر پڑھا نہ کفر ہے اور نہ شرک ہے نہ ارتداد ہے۔ بلکہ ایک جغرافیائی سچائی ایک تاریخی حقیقت ہے۔

آپ نے ایسے بہت سے علاقوں اور جزیروں کا حال سنا ہو گا جو سمندر یا زمین میں دھنس گئے اور فنا ہو گئے۔ اور ان کا بھی جو سمندر کی سطح پر ابھر آئے لیکن ہالینڈ دنیا بھر میں واحد ملک ہے جو انسانوں نے خود لڑ کر سمندر سے چھینا یعنی پشتہ باندھ باندھ کر سمندر سے زمین نکالی۔ کیا سمجھے آپ؟ ذرا غور کیجیے کیونکہ میں بھی اس صورتحال کو بہت غور و خوض کے بعد سمجھا ہوں۔ قصہ یہ ہے کہ یورپ کا ایک شمال مشرقی کونا ہے اور اس کے آگے سمندر ہی سمندر ہے۔ دو ہزار سال قبل یہ صرف سمندر تھا اور کنارے پر رہنے والے آس پاس میں فرانس، جرمنی اور روس جیسی بڑی طاقتوں میں گھرے ہوئے تھے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دائیں بائیں پھیل نہیں سکتے تھے۔ مگر:

جان ہے تو جہان ہے پیارے

www. … news.com

نتیجہ یہ کہ انھوں نے سمندر سے زمین چھیننی شروع کی۔ ایک پشتہ باندھا اور بیچ میں سے پانی نکال کر پشتے کے پیچھے پھینک دیا۔ زمین خشک کی اور اس پر عمارتیں بنائیں اور آباد ہو گئے۔ پھر مزید پشتے بنائے اور مزید زمین نکالی اور طاقت پکڑی۔ اور بڑھے تو کئی ہزار میل دور جا کر انڈونیشیا پر قبضہ کر لیا اور وہاں پانچسو برس حکمران رہے۔ وہاں سے نکلے تو اپنے گھر پہنچ گئے۔ آبادی ایک کروڑ بارہ لاکھ اور رقبہ کل پندرہ ہزار مربع میل جس میں تین دریا صاحبان بھی موجود ہیں اور جھیلیں بھی ہیں نتیجے میں نزلہ پھر سمندر ہی پر گرا۔ اور اب تو بیسویں صدی کی انجنیئرنگ کا سہارا بھی ہے۔ سو بیچارہ سمندر برابر پیچھے ہٹ رہا ہے اور ولندیزی برابر آگے بڑھ رہے ہیں۔

مگر یہ سب باتیں میں آپ کو آہستہ آہستہ بتاؤں گا۔ فی الحال تو یہ سنیئے کہ ایمسٹرڈم کا ہوائی اڈّا بہت بڑا ہے اور کے۔ ایل۔ ایم کا صدر مقام بھی ہے۔ کے۔ ایل۔ ایم انگریزی حروف نہیں ہیں بلکہ تین ڈچ لفظوں کا مخفف ہے جن کا تلفظ مجھ سے ادا نہیں ہو سکتا اور آپ سے بھی ادا نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے اس کے ترجمے ہی پر اکتفا کیجیے۔ جو یہ کہتا ہے کہ کے۔ ایل۔ ایم شاہی ڈچ ہوائیہ کا نام ہے۔ شاہی کا قصہ بھی پھر آپ کو کبھی سناؤں گا۔ ہالینڈ میں قانونی طور پر ملوکیت ہے یعنی یہاں بادشاہی نظام رائج ہے یعنی یہاں سلطان کی سلطانی بھی ہے اور جمہور کی سلطانی بھی ہے فرق یہ ہے کہ یہاں سربراہِ ریاست بادشاہ نہیں ملکہ ہوتی ہے۔

ایمسٹرڈم روشنیوں کا شہر ہے اور نہروں کا بھی۔ روشنیاں اور نہریں یا نہریں اور روشنیاں۔ ادیب لوگ کو جو اچھا لگے۔ مجھے نہریں بھی اچھی لگیں اور روشنیاں بھی مگر روشنیاں تو ہر جگہ ہوتی ہیں۔ نہریں صرف اسی شہر میں ہیں۔ اصل میں یہ ایک نہر ہے جو بڑے اسٹیشن کے ایک سرے سے شروع ہو کر تقریباً پورے شہر کا چکر کاٹتی ہوئی ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاتی ہے۔ راستے میں جا بجا پل ہیں جو سڑکوں کو ایک دوسرے سے ملا دیتے ہیں۔ آپ لوگ نہر میں کشتیوں کے ذریعے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پورے شہر کا چکر کاٹ سکتے ہیں۔

خیر اس نہر کا تفصیلی حال میں آپ کو بعد میں سناؤں گا۔ فی الحال تو سرے سے چلیئے۔ مگر کونسا سرا۔ ہالینڈ ملک بہت چھوٹا ہے۔ اور اس کے معاملات بہت بڑے ہیں۔ مثلاً یہ دنیا کے چند عظیم ترین مصوروں کا ملک ہے۔ یہاں بین الاقوامی عدالتِ عالیہ ہے اور یہاں دنیا میں پھولوں کے سب سے بڑے باغ ہیں اور یہاں کچھ علاقوں کے لوگ اب تک لکڑی کے جوتے پہنتے ہیں اور یہاں اب بھی ہوائی چکیاں چلتی ہیں۔

یہ دیکھیے پھولوں کا ایک باغ۔ ان پھولوں کو بلب کہتے ہیں۔ ہالینڈ دنیا میں سب سے زیادہ بلب برآمد کرتا ہے۔ مگر برآمد و درآمد کی بات الگ ہے اصل بات پھول کی ہے بلکہ پھول کی نہیں ہزاروں لاکھوں پھولوں کی ہے۔ سرخ، زرد، پیلے پھول، تختے کے تختے، میدان کے میدان، میلوں لمبی قطاریں۔ اس منظر کی تصویر نہیں

www. taeme

لی جاسکتی۔ اگر فوٹوگرافر بھائی بُرا نہ مانیں تو یہاں تک کہوں گا کہ کسی بھی اچھے منظر کی تصویر نہیں لیجا سکتی۔ مگر پوری ابھی میں ایک لمبی بحث کرنے لگ جاتا۔ اس لیے ایک غیر منظر نما تصویر دکھا دیتا ہوں۔ یہ ایک طویل طویل بند ہے اور ایک سڑک۔ ایک محیرالعقول کارنامہ ہے سمندر پر انسان کی فتح۔ غور سے دیکھیے دونوں طرف سمندر ہے۔ اور بیچ میں ایک سڑک کس شان سے چلی جا رہی ہے۔

میرا قیام ابھی ایمسٹرڈم میں نہیں بلکہ ہیگ میں رہے گا۔ اس لیے میں آپ کو ایمسٹرڈم کے مزے نہیں اڑانے دوں گا جہاں بڑے بڑے کلب ہیں اور:

بہ خلوت می روند آں کار دیگر می کنند

بلکہ آپ کو میرے ساتھ ہیگ چلنا پڑے گا۔ ہیگ جو ہالینڈ کا خاموش سیدھا سادا صدر مقام ہے اور جس کی آبادی کل چھ لاکھ ہے اور جہاں شاہی خاندان کے لوگ یعنی شہزادیاں مزے سے سائیکلوں پر گھومتی ہیں یہی نہیں بلکہ یہاں ملکہ جولیانا اور ان کے شوہر بھی کبھی کبھی "واک" کرتے ہوئے دکھائی دے جاتے ہیں کیونکہ یہاں مخالف پارٹیاں ملکہ کی دشمن نہیں ہوتیں بلکہ سیاست کے کاروبار کو سربراہ ریاست سے الگ رکھتی ہیں ہیگ اصل میں سائیکلوں کا شہر ہے۔ ایمسٹرڈم میں تو کہیں کہیں اونچائی نیچائی بھی ہے مگر ہیگ بالکل ہموار ہے اس لیے غیر موٹر نشینوں کی اکثریت سائیکل استعمال کرتی ہے یہاں تک کہ موٹر نشین بھی کم فاصلے سائیکل ہی پر طے کرتے ہیں یہ سائیکل ہیگ کی قومی سواری ہے جب شہزادیاں سائیکلوں پر چلتی ہیں تو باقی سائیکل سوار انھیں احتراماً آگے جانے دیتے ہیں اور اس طرح ہم جیسے غریب غربا کو بھی پتا چل جاتا ہے کہ شہزادیاں آ رہی ہیں۔

میں رائن اسٹراٹ پر رائن ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔ اس کے ہجے آر۔ ای۔ جے۔ این ہیں۔ انگریزی داں کو یہاں جے غیر ضروری لگتا ہے جیسے جکارتا کو DJAKARTA لکھا جاتا تھا تو ہمیں ڈی غیر ضروری معلوم ہوتا تھا۔ مگر یہ ڈچ نظامِ ہجے ہے اس کا قصہ بھی آئندہ بتاؤں گا۔ میرا رائن ہوٹل بہت چھوٹا سا اور پیارا ہوٹل ہے۔ اصل میں یہ ایک گھر ہے جس میں اوپر چھ کمرے ہیں اور نیچے ایک ہال ہے۔ اسے ایک بڑے میاں اپنی دو بیٹیوں کی مدد سے چلاتے ہیں۔ ان دو بیٹیوں میں ایک کے بال اونچے اونچے باؤ بیرٹا ٹائپ کے اور سنہرے ہیں اور اس کا رنگ بھی سنہرا ہے مگر زیادہ کام وہی کرتی ہے۔ دوسری بیٹی عینک لگاتی ہے اور سادہ رو بھی ہے اور اس کی کمر بھی موٹی ہے اس لیے وہ زیادہ تر لکھائی پڑھائی کا کام کرتی ہے بل کاٹتی ہے اور کھاتے لکھتی ہے اور چھوٹی بہن سے لڑتی رہتی ہے کیونکہ وہ مسافروں میں بہت مقبول ہے اور شاید یہ ہے کہ ایک عورت کو دوسری عورت کی جائز مقبولیت بھی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اپوا کی آپائیں معاف فرمائیں۔ یہ بات ہالینڈ کی ہو رہی ہے۔

www.taemeernews.com

بوقلمونی اور زودتی ڈرزی

دی ہیگ ایک پُر فضا مگر اداس مقام ہے یا شاید اس لیے اداس نظر آتا ہے کہ یہاں ہنگامہ نہیں جھگڑا فساد نہیں سیاسی بے چینی پارٹی بازی کی شدت گھما گھمی نہیں، ہم ایشیائیوں کو جو:

ہنگامہ پروری میں پل کر جواں ہوئے ہیں

ایسا سکون ایک آنکھ نہیں بھاتا اور اداس نظر آتا ہے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ یورپ میں ڈنر شام کے چھ بجے کھا لیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہیگ میں بھی یہی معمول شروع ہوا مگر اس کے بعد عجیب عجیب واقعات پیش آئے۔

پہلی شام ڈنر کھا کر میں نے چند منٹ قیلولہ نما آرام کیا۔ پھر انگڑائیاں لیں کہ اب رات ہو اور کوئی "پروگرام" کیا جائے۔ میرے ہوٹل کے سامنے ٹرامیں آ کر رکتی ہیں، انھیں دیکھتا رہا۔ تھوڑی سی دیر میں ان کی تعداد میں کمی ہونے لگی۔ موٹریں بھی کم کم نظر آنے لگیں۔ رہگیر بھی اکا دکا رہ گئے۔ میں سمجھا آج کوئی خاص دن ہے، ہر ملکے ہر حصے کوئی بات ہوگی۔ ایک رسالہ سنبھالا ہالینڈ کے متعلق جو لاعلمی تھی اسے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں دور کیا اور پھر باہر جھانک کر دیکھا سڑک تقریباً سنسان پڑی تھی اور روشن تھی ادھر سورج بادلوں میں چھپا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور چاروں طرف ایک دُھندلی سی روشنی چھائی ہوئی تھی — گھبرا کر گھڑی دیکھی تو نو بج رہے تھے۔

"بے مس" میں گھبرا کر چیخا "تمھاری گھڑی میں کیا وقت ہے؟"

"کیوں" وہ عینک پوش ترش رو مس بُرا سا مانی "سامنے بڑا گھنٹہ دیکھ لو نا۔ نو بجے ہیں۔"

"اس وقت نو کیسے بج سکتے ہیں؟"

"ہمارے ہالینڈ میں نو بجنے کا وقت نو بجے ہی ہوتا ہے، تم اپنے ملک کا قاعدہ بتاؤ۔" وہ کھلکھلائی اور اس بار اس کے ساتھ اس کی رقیب خوبصورت بہن بھی مسکرائی جو عام طور پر اس کا بائیکاٹ کرتی ہے۔

www.taemeernews.com

"مگر یہ سورج کی روشنی اب تک کیوں باقی ہے روم میں تو اس وقت بالکل اندھیرا ہو جاتا تھا۔"

"بس یہاں ایسا ہی ہوتا ہے" اس بار دونوں بہنوں نے میری حالت زار پر رحم کھا کر سمجھایا۔ "ابھی تو سمر یعنی گرمی کا موسم پوری طرح نہیں آیا۔ جب گرمی شباب پر ہوتی ہے تو سورج گیارہ بارہ بجے رات تک روشن رہتا ہے ۔۔۔ یہی دودھیا سی روشنی یہی ہلکی ہلکی چھاؤں۔ آپ نے محسوس نہیں کیا آپ کے کمرے کی کھڑکیوں کے پردے اندر کی طرف سے گہرے رنگ کے ہیں تاکہ باہر کی روشنی چھن کر نہ آئے۔"

پھر تو مائی ڈیر ڈچ خواتین مجھے تم سے سخت ہمدردی پیدا ہو گئی۔ تم کو رات کے اسرار کبھی معلوم نہیں ہو سکتے۔ جب رات گھنیری ہوتی ہے تو اس کی دبیز تہوں سے کیا کیا نکات و رموز پھوٹتے ہیں۔ تمہاری یہ دودھیا رنگ کی ٹھنڈی ٹھنڈی راتیں ہمارے گرم اور گہرے اندھیاروں کا کیا مقابلہ کریں گی جبھی تو تمہارے ہاں کبھی پیغمبر پیدا نہیں ہوئے۔

اب مجھے ہالینڈ سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اور اس ملک کی دلچسپیاں ایک ایک کر کے اجاگر ہونے لگی ہیں۔ اس چھوٹے سے ملک کے دو نام ہیں، ہالینڈ اور نیدرلینڈ۔ ملکی لوگ اسے نیدرلینڈ کہنا اور لکھنا پسند کرتے ہیں۔ مگر غیر ملکی ہالینڈ ہی کہے چلے جاتے ہیں۔ اس کے دو صدر مقام ہیں ایمسٹرڈم اور دی ہیگ۔ دونوں سرکاری طور پر صدر مقام ہیں مگر ایمسٹرڈم میں حکومت کے دفاتر ہیں اور ہیگ میں ملکہ رہتی ہے اور مجالس قانون ساز کام کرتی ہیں۔ دی ہیگ کا اصلی نام ڈن ہاخ ہے۔ بڑی کرختگی سے ادا ہوتا ہے مگر ادا ہو جائے تو ڈچ بہت خوش ہوتے ہیں اور حیرت بھی کرتے ہیں کیونکہ جرمنوں کے علاوہ دوسرے یورپین ڈچ تلفظات ادا نہیں کر سکتے اور اپنا مذاق اڑواتے ہیں۔ یہ کمال صرف انگریز بادشاہ کو حاصل ہے کہ جو تلفظ اس سے ادا نہ ہو سکا اس نے نہ صرف بدل دیا بلکہ اُس کے ہجّے بھی بدل دیے۔ دہلی کو اس نے ڈیلہی کر دیا اور ڈن ہاخ کو دی ہیگ۔ دونوں قومیں بُرا مانتی ہیں مگر انگریز اپنا کام چلا لیتا ہے۔ کیا بات ہے انگریز بادشاہ کی۔

ہاں! ہالینڈ میں ملکائیں بھی دو ہیں۔ کم از کم آج کل تو یقیناً دو ملکائیں اس ایک ملک میں رہتی ہیں۔ ایک ہیں ملکہ ولہلمینا جو مادر ملکہ کہلاتی ہیں اور اپنی صاحبزادی ملکہ جولیانا کے حق میں کبھی کی دستبردار ہو چکی ہیں مگر ان کے اثر اور احترام میں کمی نہیں آئی۔ یہ ان کی تصویر دیکھیے کیا دبدبہ ہے۔ یہ وہی ملکہ ہیں جن کی ایک نہایت خوبصورت تصویر ہمارے بچپن میں پنواڑیوں سگرٹ فروشوں اور دیگر پبلک مقامات پر نظر آتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس تصویر میں ان کے گال انگاروں کی طرح روشن تھے اور میں ان پر ہزار جان سے عاشق تھا۔ میں انھیں دنیا کی حسین ترین خاتون مانتا تھا اور میں نے ایک بار اسکول کے ایک مباحثے میں "دنیا کی حسین ترین

www.taemeernews.com

خاتون اور میں کے موضوع پر ایک پر مغز تقریر میں انھی کا قصیدہ پڑھا تھا۔ مذکورہ تصویر ان کی جوانی کی ہوگی کیونکہ جب میں وہ تصویر دیکھتا تھا تو اس وقت یہ دورِ ضعیفی میں داخل ہو چکی ہوں گی اور ۱۹۴۸ء میں تخت و تاج سے دستبردار بھی ہوگئی ہیں۔ بہرحال مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں اپنے بچپن کی ممدوحہ سے صرف چند سو گز کے فاصلے پر بیٹھا ہوں۔ مجھے ان کے چہرے پر جھریاں نظر نہیں آتیں۔ ان کے ماتھے پر شکنیں محسوس نہیں ہوتیں۔ ان کے گال ڈھلکے ہوئے اور زردی مائل معلوم نہیں ہوتے بلکہ انار کی طرح سرخ آگ کی طرح گرم معلوم ہوتے ہیں۔ وہ میرے بچپن کی ممدوحہ میرے خوابوں کی شہزادی ہیں۔ میں انھیں پیار اور عقیدت سے سلام کرتا ہوں' ان کے زمانے میں ہالینڈ ایک سامراجی طاقت تھا اور انڈونیشیا کے دس کروڑ باسیوں پر ہر طرح کے ظلم و ستم روا رکھتا تھا اور مجھے سامراجیت سے نفرت ہے مگر ملکہ ولہلمینا کے معاملے میں میرا دل اتنا نرم ہے کہ میں ان کے بجائے ڈچ قوم کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہوں۔ ڈچ سامراج تو ساڑھے پانچ سو برس قائم رہا اور میری ممدوحہ ملکہ ابھی سو برس کی بھی نہیں ہیں۔ یہ بیچاری بے قصور ہیں۔" میں اپنے آپ سے کہتا ہوں۔ اسے عقیدت کے کرشمے کہتے ہیں۔

دوسری یا اصلی ملکہ جولیانا ہیں۔ وہ بس ایک اچھی ملکہ ہیں مجھے ان سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ خدا انھیں خوش رکھے۔ فقیروں کو بادشاہوں' ملکاؤں اور شہزادیوں سے کیا سروکار:

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

مگر مجھے ان کے شوہر سے نہایت گہری دلچسپی ہے' اس کی دو وجوہ ہیں' ایک تو عام وجہ یعنی میں ان مردوں کی نفسیات سمجھنی چاہتا ہوں جو ملکاؤں کے شوہر ہوتے ہیں مگر بادشاہ نہیں ہوتے یہی دلچسپی مجھے ملکہ ایلزبیتھ کے شوہر صاحب یعنی ڈیوک آف اڈنبرا سے ہے کہ وہ دن میں ایک خاتون کے تخت کے سامنے کھڑے ہو کر شام کو اس سے محبت کیسے کرتے ہوں گے ملکہ کو کیا کہتے ہوں گے۔ ملکہ انھیں کیا کہتی ہوں گی اور جب وہ بالکل تنہا یعنی ملکہ کے بغیر ہوتے ہوں گے تو اپنے طور پر اپنے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے یہی دلچسپی مجھے ملکہ وکٹوریا کے شوہر پرنس البرٹ سے ہے اور میں نے بار بار ان کی لائف یعنی سوانح عمری پڑھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ وکٹوریا ان کی بڑی عزت کرتی تھیں اور ان سے شدید محبت بھی کرتی تھیں وغیرہ وغیرہ۔ پھر بھی میری دلچسپی اس مسئلے سے کم نہیں ہوتی کہ ایک جیتا جاگتا' چلتا پھرتا مرد ایک خاتون کا شوہر ہوتے ہوئے بھی اس کے آگے "محض بیما" سر کیسے جھکا ہے۔ بہرحال اگر آپ کو بھی اس مضمون میں دلچسپی پیدا ہو تو اپنے طور پر سوچیے۔ فی الحال تو ملکہ جولیانا کے شوہر یعنی پرنس برن بارڈ پر توجہ فرمائیے ان سے دلچسپی کی ایک وجہ میں نے بتا دی وہ عمومی تھی یعنی ملکہ کا غیر بادشاہ

www.taemeernews.com

شوہر ہونا۔ دوسری وجہ ان کا اسم مبارک ہے۔ غور سے اور دل تھام کر پڑھیے۔ ان کا پورا نام ہے:

"شہزادہ برن ہارڈ لیوپولڈ فریڈرک ار ہارڈ جولیس کوئرٹ کارل گوڈ فریڈ پیٹر آف لیپے بیسٹر فیلڈ۔"

لیکن ڈچ، جرمن اور بطور خاص ہسپانوی دنیا میں یہ نام کوئی خاص لمبا نام نہیں ہے بلکہ؛

چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اگر موقع ملا اور آپ موڈ میں ہوئے یعنی میں موڈ میں ہوا تو کسی صحبت میں چند اور شاہی ناموں کا تذکرہ کروں گا۔ فقیر کی جھولی میں رنگ رنگ کا مال ہے۔

شہزادہ برن ہارڈ ایک نہایت مقبول شہزادے ہیں۔ وہ ملکہ سے دو برس چھوٹے ہیں۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ ایک محنتی اور خوش مزاج شہزادے کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ سیاست میں حصہ نہیں لیتے۔ رفاہ عامہ میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں بعض سرکاری فرائض جو ان کے ذمہ ہیں انھیں تندہی سے بجا لاتے ہیں۔ ڈچ لوگ اُن سے بہت مطمئن ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کا شاہی خاندان برطانیہ کے شاہی خاندان کی طرح چپقلش میں مبتلا نہیں رہتا۔

اتفاق دیکھیے کہ ہالینڈ کی اگلی حکمران ایک ملکہ ہی ہوں گی۔ کیونکہ ملکہ جولیانا اور پرنس برن ہارڈ کے ہاں پانچ شہزادیاں پیدا ہوئی ہیں شہزادہ نادارد ہے۔ مگر ڈچ لوگ اس بات پر ناخوش نہیں بلکہ بہت سے شہری تو خوش نظر آتے ہیں۔ بادشاہ خواہ کاٹھ کا بادشاہ ہو پھر مرد ہوتا ہے۔ اور ہمیشہ خطرہ رہتا ہے کہ اپنی سی چلائے گا۔ اور جمہوری نظام میں کوئی نہ کوئی گھپلا پیدا کرے گا۔ ملکہ طبعاً نرم اور ضابطہ پسند ہوتی ہے کیونکہ وہ ملکہ ہوتے ہوئے بھی گھر والی ہوتی ہے۔ اور گھر والی سیاست کے دھندوں میں نہیں پڑتی بلکہ آئین و ضوابط کے تحت حکومت کرتی ہے۔

اور سنیے ہیگ کے بھی دو نام ہیں۔ ہیگ تو انگریزی کا تلفظ ہوا اسے ناموں میں شمار نہیں کیا جائے گا۔ اس کا ایک نام ہے ڈن ہاخ اور دوسرا نام ہے گریون ہاخ پرانے ڈچ اسی دوسرے نام کو فصیح مانتے ہیں۔

مزید سنیے۔ ہالینڈ کا جو سکہ ہے اس کے بھی دو نام ہیں، اسے گلڈن بھی کہتے ہیں اور فلورین بھی۔ مگر یہاں فقیر انگریزی کا سہارا لیتے ہوئے اسے گلڈر کہتا ہے کیونکہ انگریزوں نے گلڈن کا نون اڑا کر اپنی آسانی کے لئے آر لگا دیا ہے۔

ڈچ شاہی خاندان ہاؤس آف اورینج یعنی سنگترے کا خاندان کہلاتا ہے۔ یہ نسبت نہایت خوبصورت ہے کم از کم شاعرانہ تو ہے۔ انگریز رؤسا اور بادشاہوں کے خاندان تو ایسی بُری بُری آوازوں سے مرکب ہوتے ہیں کہ

سماعت وزبان دونوں پر بار پڑتا تھا۔ انگلستان ٹرینڈ افسران معاف فرمائیں، بات ان کے حسن سماعت کی نہیں اپنی پھینچر نزاکت احساس کی ہے ۔۔۔ یہاں سنگترے نے کیسی شیرینی حلاوت اور رنگ آمیزی پیدا کر دی ہے۔ اس بیسویں صدی میں اگر شاہی خاندان ہو تو کم از کم ایسا ہو کہ نام بھی اچھا پیارا سا ہے ملکائیں بھی خوش شکل خوش سیرت نیک کردار ومحنتی ہیں شہزادہ سرکاری کام کرتا ہے شہزادیاں سائیکلیں چلاتی ہیں اور پورا شاہی خاندان عوام سے گھلا ملا رہتا ہے۔ آپ یقین کیجیے کہ میں نے بہت سے انگریزوں کو انگلستان میں شاہی کو غیر ضروری کہتے ہوئے پایا مگر سیکڑوں ولندیزیوں سے بار بار سوال کرنے پر بھی کسی کو شاہی کی مخالفت کرتے نہیں سنا۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ڈچ شاہی خاندان مالی طور پر زیادہ مہنگا نہیں اور سماجی طور پر پریشان کن بھی نہیں۔

ڈچ لوگ سخت محنتی ہیں۔ جرمنوں سے بھی زیادہ جرمن قوم بڑی ہے، آٹھ کروڑ کی آبادی ہے، ان کے کام بڑے بڑے ہیں۔ ڈچ قوم کل ایک کروڑ دس لاکھ ہے، لیکن یورپ کے اہم ترین معاملات میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ کومن مارکیٹ میں شامل ہے جس میں ابھی تک انگریز بہادر کو ان کے کروفر کے باوجود داخلہ نہیں مل سکا۔ NATO میں بھی شامل ہے حالانکہ ناٹو کے بارے میں:

بے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

بہرحال ناٹو ایک بڑا جنگی ادارہ ضرور ہے اور اس میں ڈچ لوگ زوروں سے جمے ہوئے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا مسئلہ زمین کا ہے۔ آبادی ایک کروڑ دس لاکھ اور رقبہ کل ساڑھے بارہ ہزار مربع میل یعنی ایک مربع میل میں کوئی نو سو افراد بستے ہیں جو یورپ بھر میں سب سے زیادہ گنجان آبادی کی شرح اوسط ہے بلکہ اپنے مشرقی پاکستان کی شرح اوسط کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ اس ساڑھے بارہ ہزار مربع میل میں بھی آدھی زمین سطح سمندر سے نیچے واقع ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مستقلاً سمندر کو دھکیلنا پڑتا ہے۔ سمندر اپنی پوری طاقت سے اس زمین پر حملے کرتا رہتا ہے اور ولندیزی مسلسل پشتے بنا بنا کر اور پانی باہر پھینک پھینک کر زندگی کی جدوجہد قائم رکھتے ہیں۔ ہم ہر سال سیلابوں اور طوفانوں کی زد میں آنے والے پاکستانیوں کے لیے ہالینڈ میں بہت سے سبق موجود ہیں۔ مگر ہم ہر سال سیلاب فنڈ جمع کرنے کو غنیمت جانتے ہیں اور اس فنڈ کے لیے بھی زندہ ناچ گانے یعنی کلچرل شو اور فینسی ڈریس شو کے بغیر کام نہیں چلتا مگر خیر یہ بقول کسے تلخ و ترش باتیں ہیں، اور "یاران سے کوئی فائدہ تو حاصل ہوتا نہیں اور بڑے لوگ تمہارے دشمن ہو جاتے ہیں"۔

لہٰذا میں بڑے لوگوں کی دشمنی سے ڈرتے ہوئے پھر بے ضرر اچھی اچھی باتوں پر اتر آتا ہوں اور ڈچ لوگوں کا پسندیدہ ذکر شروع کر دیتا ہوں جیسا کہ بے ضرر خوش مزاج وقت پرست کالم نویسوں کا قاعدہ ہے۔

www.taemeernews.com

یہاں ایک نمکین، ترش مزاج اور زبردست جھیل ہے "زوئی ڈرزی"۔ ڈچ لوگوں نے اسے فتح کرنے کا ایک زبردست منصوبہ بنایا ہے۔ ان کا منصوبہ یہ ہے کہ اسے پانی سے خالی کر دیا جائے اور پھر اسے آباد کر دیا جائے۔ یہ منصوبہ اب سے کوئی ساٹھ برس پہلے سوچا گیا تھا اور کسی وقت بھی کسی نے اسے دیوانے کی بڑ قرار نہیں دیا بلکہ پوری قوم کی اجتماعی فکر اس پر مرتکز ہو گئی۔ جوع الارض یا زمین کی بھوک تمام طاقتور قوموں میں موجود رہی ہے اور آج بھی تمام بڑی بڑی قومیں اپنی سرحدیں بڑھانے کے چکر میں لگی رہتی ہیں تاکہ مزید زمین مزید وسائل میسر ہوں۔ یہی جوع الارض دوسرے بھیس بدل کر انھیں "مقبوضات" اور "ممالک محروسہ" کے چکر میں ڈالتی رہی ہے۔ اسی کی خاطر انھوں نے اپنے وطن سے ہزاروں میل دور جا جا کر جنگیں لڑی ہیں، آزاد قوموں کو غلام بنائے رکھا ہے اور تاریخ میں اپنے لیے بدترین ادب کا سامان پیدا کیا ہے۔ ڈچ لوگ بھی صدیوں مقبوضاتی چکر میں مبتلا رہے اور کروڑوں لوگوں کو اس میں مبتلا رکھا لیکن اس صدی میں مقبوضاتی گھپلے چل نہیں سکتے۔ یہ بات وہ اوروں سے ذرا پہلے جان گئے اور گھر واپس آ کر اپنے وال ... لیے پر اکتفا کی اور جب ایک قوم ہزاروں میل دور صدیوں حکمرانی کر سکتی ہے تو اپنے گھر میں کیا کچھ غضب نہیں ڈھا سکتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس ہیبت ناک دیو اس جھیل کا رقبہ روز بروز سکڑتا ہو رہا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کا شور زدہ پانی سمندر کی طرف پھینکا جا رہا ہے۔ پھر وہ خشک کر دیا جاتا ہے۔ اس پر ہل چلا کر آباد کر دیا جاتا ہے اور بستیاں بسا دی جاتی ہیں۔

"ہم اس صدی کے آخر تک پوری جھیل بھر چکے ہوں گے"۔ ڈچ بڑے اطمینان اور ولولے سے کہتے ہیں اور میں حیرت سے سنتا ہوں قوموں کی فکر میں چالیس پچاس برس کی کیا کچھ حیثیت ہے۔ میں نے پورے ملک میں اس منصوبے کا مذاق اڑاتے نہیں سنا۔ میں نے ایمسٹرڈم میں بڑے بڑے کافی ہاؤسوں، دانشوروں اور بقراطوں سے اس منصوبے کے بارے میں سوالات کیے کسی نے بھی اس سے بیزاری اور عدم دلچسپی کا اظہار نہیں کیا، نہ اس منصوبے سے دلچسپی کی وجہ سے کسی شاعر کسی افسانہ نگار کسی مصور کے تخلیقی سوتے خشک ہوتے نظر آئے۔ اور یہ وہ ہالینڈ ہے جہاں فن مصوری میں دنیا کے بڑے بڑے اساتذہ پیدا ہوئے ہیں۔ اور آج بھی فرانس اور اٹلی کے استادوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ ہالینڈ جس کے موسم اور مزاج میں رومان رچا ہوا ہے جس کے کھیتوں سے رنگ پھوٹتے ہیں اور جس کی ہوا چکیاں اور ان کے آگے میلوں لمبے پھولوں کے تختے بصارت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں، اس ہالینڈ کے دانشوروں میں کوئی زوئی ڈرزی کے منصوبے سے بیزار نظر نہیں آتا۔ حالانکہ بہت سے لوگ میرے ملک کی طرح یہاں بھی حکومت وقت کے خلاف ہیں۔ اس کی بہت سی پالیسیوں پر اعتراض کرتے ہیں، اسے کھل کر برا کہتے ہیں مگر اس جھیل کے معاملے میں سب ایک ہیں۔ اپنی خوشحالی کے منصوبوں کے معاملے میں سب یک آواز ہیں۔

یارو کچھ تو بتاؤ کیا منصوبہ بندی کی بات کرنا غیر دانشورانہ بات ہے۔ کیا یہ کوئی ذلت کا مقام ہے کہ

www.taemeernews.com

سے انسانی سربلندی کی تحقیر ہوتی ہے۔ اگر نہیں ہوتی تو کبھی کبھار کافی ہاؤسوں، ٹی ہاؤسوں، مجالس اور کلبوں میں اپنے دیہات کے بندوں، پلوں، نہروں، کھیتوں، کھلیانوں کی بات بھی کر لیا کرو۔

ادھر بعض دانشور لوگ بھڑک اُٹھے "یہ سرکاری پروپگنڈا ہے"۔ آوازیں آنے لگتی ہیں اور میں دبک کر کافی ہاؤس سے بھاگ اٹھتا ہوں اور ہارلم کے گلابی باغوں میں جا پہنچتا ہوں جہاں ہر قدم پر:

صراحیٔ مئے ناب و سفینۂ غزل است

www.taemeernews.com

پھول۔ وان گاگ اور علامہ اقبال

پھول عورت کی طرح ہوتا ہے یعنی جیسے کسی ایک ملک کی عورت دوسرے ملک کی عورت سے بنیادی طور پر مختلف نہیں ہوتی ایسے ہی ایک مقام کا پھول دوسرے مقام کے پھول سے مختلف نہیں ہوتا۔ اس لیے بارلم کے پھولوں میں کوئی ایسی بات نہیں جو ایران یا انگلستان یا فرانس یا ہندوستان کے پھولوں میں نہ ہو' مگر بارلم اور دوسرے مقامات میں یہ فرق ہے کہ دوسرے مقامات میں پھول بھی ہوتے ہیں اور یہاں صرف پھول ہی پھول ہوتے ہیں۔ عورت یا عورتیں ہی عورتیں۔ اللہ اکبر — کیا فرق ہے۔

بارلم ایمسٹرڈم اور ہیگ کے درمیان ریل کی پٹری کے بالکل کنارے ہے۔ یوں سڑک بھی جاتی ہے مگر چونکہ میں روز ہیگ سے ایمسٹرڈم جاتا ہوں اور یہ موسم بہار کا ہے' اس لیے روز دو بار کم از کم پانچ چھ منٹ کے لیے ایک عجیب و غریب منظر آنکھوں کے آگے سے گزرتا ہے۔ ایسا منظر جو بارلم سے پہلے اور بارلم کے بعد کبھی میری آنکھوں نے نہیں دیکھا۔ میلوں لمبے رنگ برنگے پھولوں کے تختے ریل کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہیں۔ رنگ اُبلتے ہیں۔ پھٹتے ٹوٹتے ہیں۔ ہوائیں آئینہ ہو جاتی ہیں۔ سورج کی تیز کرنوں پر سوار ہو کر میری آنکھوں' میری روح میں در آتے ہیں۔ میرے دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں اور ریل کی بد آواز گڑگڑاہٹ' نرم' سبک' شیریں نغموں میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ جیسے رقص کرتے ہوئے معدوم ہوتے ہیں۔ جیسے باضابطہ طبلے پر تھاپ پڑ رہی ہو۔ جیسے عربی فارسی تقطیع کے ارکان کئی قطاروں میں مارچ کر رہے ہوں فعل فعولن فعل فعولن۔ مفاعیلن مفاعلین۔ مفاعیلن۔ جیسی انگریزی دانوں معاف کرنا ملا کی دوڑ مسجد تک۔ اردو کا شاعر افاعیل تفاعیل کے دائرے سے باہر کیسے نکل سکتا ہے۔ ہائے دیکھیے اس موقع پر ایک اپنا شعر یاد آیا ہے۔ آنا تو نہیں چاہیے تھا مگر آ گیا اور آپ کی خدمت میں پیش اس لیے کیا جا رہا ہے کہ خادم کو روز ایسا موقع کہاں ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو اور توجہ کے ساتھ ملاحظہ ہو:

www.taemeernews.com

حیرت انگیز رنگوں میں لپٹی ہوئی مضطرب تشنگی
آج تک اپنی لے میں نہیں ڈھل سکی نیند آنے لگی

اس کی شان نزول بھی ہالینڈ سے متعلق ہے بلکہ خاص ہارلمے سے متعلق ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نے یورپ نہیں دیکھا تھا اور صرف ایک فلم دیکھی تھی جو ہالینڈ کے عظیم مصور ون گاگ (اصلی تلفظ فن خاخ) کی زندگی پر بنائی گئی تھی۔ وہ تمام عمر خاکوں اور رنگوں سے سر پھوڑتا رہا لیکن عمر کے آخری لمحے تک اپنی بیقرار روح کے لیے کسی تصویر کسی خاکے سے سکون حاصل نہ کر سکا یہاں تک کہ ایک دن تصویر بناتے بناتے اپنی واردات قلب کی تاب نہ لا کر خودکشی کر لی۔

فن خاخ یا انگریزی والوں کی زبان میں ون گاگ بہت بڑا مصور تھا۔ زندگی میں نہ مانا گیا۔ زندگی کے بعد سب نے اس کی پرستش کی۔ ناقدری کے معاملے میں پرانا یورپ آج کے ایشیا سے زیادہ مختلف نہیں تھا مگر الگ بات ہے قدر اور ناقدری کی ایسی تیسی سوال تو اس آدمی کی اپنی ذات اپنی روح اپنے پیچ و تاب اپنے اضطراب کا ہوتا ہے۔ جسے سوچنے کی عادت ہو سچائیوں کی تلاش ہو اور زندگی کی پیاس ہو اس پر کیا کیا دیکھ کر کیا کچھ گزرتی ہے، وہ دوسرے کیسے جان سکتے ہیں۔ بھ شاکا ایک پٹا پٹایا مصرع آج بھی بہت بڑی سچائی ہے:

گھائل کی گت گھائل جانے اور نہ جانے کوئے

ون گاگ نے خاصی عمر ہالینڈ کے باہر بھی گزاری مگر ہالینڈ ہی میں اس علاقے میں بھی گزاری ہے جو ہارلم کا شہر باغات کہلاتا ہے۔ ان ہواچکیوں کے آگے ان پھولوں کے ہجوم میں تپتے ہوئے سورج کی روشنیوں میں ہر تختۂ سبزہ پھول جس طرح چمکتے تھے وہ ان کی تاثراتی تصویریں بنایا کرتا تھا اور اپنی ہر کوشش سے نامطمئن ہوتا تھا، ہر اس کوشش سے جو آج عالمی شاہکاروں میں شامل ہے اسے اپنے رنگوں پر غصہ آتا تھا۔ وہ اپنے برش پر جھنجھلاتا تھا، وہ بیٹھے ہاتھ چبا لیتا تھا۔ وہ اپنی آنکھیں پھوڑنے کے درپے ہو جاتا تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ روشنیاں اور تاریکیاں اور دھندلاہٹیں اس کے قبضے سے بھاگی جاتی ہیں۔ سچائیاں اس سے کترا کترا کر نکلے جاتی ہیں — وہ حقیقت کو چھو نہیں پاتا، وہ سچائی کو دیکھ نہیں سکتا، دکھا نہیں سکتا۔

اے مہ جبین معزز قارئین کیا آپ میری بکواس سے بور نہیں ہوئے۔ ایک تو یہ ویسے بھی بکواس ہے اور پھر آپ مغز سے پرتوں کا کوئی موقع ہی نہیں ہے مگر میں بھی اپنی وضع سے مجبور ہوں بہرحال آئیے علامہ اقبال کے دو چار شعر سنتے چلیے۔ ان کا منظر شاید کشمیر تھا لیکن اس معاملے میں ہالینڈ اور کشمیر میں کوئی خاص فرق نہیں ہے:

www.taemeernews.com

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن
پھول ہیں وادی میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

مگر آخر بڑے میاں تھے نا فلسفی، اچھی خاصی منظر نظم کہتے کہتے فلسفہ ہانکنے لگے:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

بھئی واہ یہ کیا بات ہوئی 'علامہ صاحب خطا معاف۔ آپ بزرگ آدمی ہیں اس لئے کچھ عرض نہیں کرسکتے ورنہ کوئی برابر کا ہوتا تو پوچھتے کہ بھئی ایک منظر نامے میں ایسی باتوں کی تک کیا ہے آپ پھولوں ڈالوں کا سیدھا سیدھا بیان کیجئے' یہ پریوں کی تشبیہ بہت اچھی تھی' اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے والے مصرعے میں بھی بڑا ترنم ہے لیکن ایسی پیاری پیاری بے ضرر باتیں کئے جائیے' ایکدم رخ بدل کر سراغ زندگی وغیرہ کا قصہ کیوں شروع کر دیا۔ کوئی کیوں اپنے من میں ڈوبے۔ کیونکہ من میں ڈوبنے کے عمل میں اور دوسرے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ مثلاً اپنے آپ کو دیکھنا پڑتا ہے۔ اپنا معائنہ کرنا پڑتا ہے۔ اب بتائیے آدمی ہریالیاں' پریاں' پھولوں کی قطاریں دیکھتے دیکھتے اپنے آپ کو دیکھنے لگے تو ایک دم کیسا اذیت ناک منظر شروع ہو جائے گا من کے پردے پر طرح طرح کی عجیب تصویریں آنے لگیں گی۔ اسے دیکھئے اچھا خاصا گل پرست مناظر قدرت کا عاشق ایک بلیک مارکیٹئے کے روپ میں سامنے آگیا جو ذخیرہ اندوزی کر رہا ہے' خلقِ خدا کو بھوکا مار رہا ہے' مال کے دام بڑھائے جاتا ہے' حکام کو رشوت دے رہا ہے' طرح طرح کی بدمعاشیوں پر کمر باندھے ہوئے ہے اور من میں زیادہ ڈوبا تو دوسرے کردہ اور ناکردہ جرائم کی فلم چلنے لگی۔ ہم بظاہر اچھے خاصے مرد معقول دوسروں کی ماؤں' بہنوں پر بری نظریں ڈال رہے ہیں' ہم صوبائی سطح کی سازشیں کرتے ہوئے قومی یکجہتی پر وعظ فرما رہے ہیں۔ حضور علامہ صاحب یہ مصرع آپ منظر نامے میں سوٹ نہیں کرتا۔ اچھا ہوا کہ آپ پاکستان بننے سے پہلے انتقال فرما گئے۔ ورنہ آپ کے بہت سے مصرعے آپ کے خواب آپ کی تصنیف آپ کے اپنے محبوب و موعود ملک یعنی اس مملکت خداداد کے منظر نامے میں فٹ نہ ہوتے خود آپ فٹ نہ ہوتے بلکہ آپ کے کئی مصرعوں کئی نظموں کئی کتابوں پر کئی قسم کے اعتراضات "لاگو" ہو چکے ہوتے مثلاً وہ جو نظم آپ نے فرمائی تھی:

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

www.taemeernews.com

وہ بس یوں چل گئی کہ وہ زمانہ انگریزی حکومت کا تھا، ہندوستان غلام تھا، اور لوگ ہر بات کی ذمے داری بدیسی حکومت کے سر تھوپ دیتے تھے اور آپ کی نظم پڑھ پڑھ کر خوش ہوتے تھے، پھر آپ انتقال کر گئے اور آپ کی نظم یادگار کے طور پر رہ گئی بلکہ آپ کے دیگر فلسفیانہ اور حکیمانہ خیالات میں گھل مل کر بے ضرر سی ہو گئی۔ ذرا آپ آج تو یہ نظم لکھ کر اور پڑھ کر دکھایئے فوراً آپ کا بیڑا کر دیا جاتا۔ یہ بھی یہ آدمی کاخ امرا یعنی امرا کے محلوں کے در و دیوار گروانا چاہتا ہے یعنی فری انٹرپرائز کے خلاف ہے، نہیں یہ باغی ہے یعنی انارکسٹ ہے، ادھیاں لینا ذرا ان کی خبر، بہت قومی شاعری کرنے چلے ہیں۔ آپ کی ایک نظم دو چار سرمایہ داروں کے زمانے کے آگے کیا چلتی۔ کس کی چلی ہے۔

بس شکر ہے کہ علامہ اقبال مرحوم و مغفور آج ہمارے درمیان نہیں ہیں اور شکر ہے کہ میں بھی بارلم میں پھولوں دروں کے منظر نامے ہی میں مبتلا ہوں اور زیادہ سے زیادہ من کی دنیا میں جھانکنے کے کھیلوں پر گفتگو کر پایا ہوں، اس سے زیادہ کا مجھ میں دم بھی نہیں ہے۔ میں ون گاگ نہیں جو ان پھولوں میں ان ہوا چکیوں، ان مرجھائے ہوئے یا ان کھلتے ہوئے چہروں میں سچائی تلاش کرتے کرتے اپنا کان کاٹ لوں (جیسا کہ اس نے کیا تھا) یا اپنے گولی ماروں۔ چلو بھائی ان رنگوں ان شعشوں ان چمکتی دمکتی کرنوں سے بھاگو۔ یہ آدمی کی جان کھا لیتی ہیں۔ ہالینڈ میں بارلم ہی نہیں اور بہت کچھ موجود ہے جیسے دنیا میں امریکی بقراطوں کے بقول صرف امیری غریبی کا مسئلہ ہی نہیں بلکہ آرٹ، شاعری حسن و عشق کے مسائل بھی ہیں جن پر پسماندہ اقوام کو زیادہ توجہ کرنی چاہیے۔ اور امیری غریبی کا مسئلہ امریکی ماہرین اقتصادیات پر چھوڑ دینا چاہیے۔

مگر ـــ چلنے سے پہلے ون گاگ کی ایک کہانی سنتے چلیے۔ یہاں اس کہانی کی بھی کوئی تک نہیں لیکن چونکہ یہ ذکر ہالینڈ کا ہے اور ون گاگ ڈچ تھا اور ایک بڑا مصور تھا اور میں ایک چھوٹا ادیب ہوں اور آپ ایک بڑے خوش تحریر صاحبِ ذوق پڑھنے والے ہیں اور عاشقانہ مضامین ضرور پسند کرتے ہوں گے، اس لیے یہ کہانی سننے میں کوئی ہرج بھی نہیں۔ کہانی یہ ہے کہ ون گاگ ایک لڑکی سے عشق کرتا تھا جو اس سے معمولی دلچسپی رکھتی تھی لیکن اس لڑکی کے والدین ون گاگ سے سخت نفرت کرتے تھے ـــ کھاتے پیتے لوگ تھے اور ون گاگ بھوکا مصور تھا اور بے ڈھنگا سا تھا اور اس کی زندگی بھی بے ترتیبی سے بڑھی رہتی تھی اور اسے مصوری سے کوئی آمدنی وغیرہ نہیں ہوتی تھی۔ [illegible] انھوں نے اس [illegible] کا ملنا جلنا بند کر دیا۔ ون گاگ بہت پریشان ہوا۔ صبر کیا ضبط کیا ہجر و فراق [illegible] تب [illegible] ایک شام کوچۂ یار میں پہنچا، در یار پہ دستک دی اور دروازہ کھلتے ہی ایک دم [illegible] لڑکی [illegible] اور اس کے ابا [illegible] صاحب [illegible] لیے دروازے کے سامنے میز پر ایک موم بتی جل رہی تھی،

www.taemeernews.com

ون گاگ نے جھٹ آگے بڑھ کر موم بتی کے شعلے پر اپنی ہتھیلی رکھ دی۔

"جب تک میں یہ برداشت کر سکوں مجھے اسے آخری بار دیکھنے کی اجازت دیجیے، میں پھر کبھی نہیں آؤں گا" اس نے ایک دم ایک عزم کے ساتھ درخواست کی۔ باپ اور بھائی حرکت تک نہ کر سکے اور وہ سامنے آگئی۔ اس کی ہتھیلی پہلے سیاہ ہوگئی پھر گوشت جلنے لگا پھر چربی ٹپکنے لگی پھر ہڈیاں جلنے لگیں اور وہ دیکھتا رہا اور وہ اسے دیکھتی رہی پھر وہ چیخ مار کر بیہوش ہوگئی اور اس کے باپ اور بھائی نے ون گاگ کو دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ معلوم نہیں موم بتی کے شعلے کو کیا ہوا۔ کچھ ادب قسم کے راوی کہتے ہیں کہ وہ شعلہ آج تک جل رہا ہے۔ وہ ہتھیلی آج تک پگھل رہی ہے۔ اس صنعتی زمانے کے آدمی ایسی باتیں سمجھتے نہیں، اس لیے انھیں سننے سے کیا فائدہ۔ آپ کچھ سمجھے ہوں تو آپ کا کام۔

یہ ون گاگ کی دو تصویریں ہیں۔ یہ رنگین ہیں۔ اس چھپائی میں ان کے رنگ نہیں آئیں گے لیکن ان کے نقوش شاید اجاگر ہو جائیں۔ اگر آپ محنت کر سکیں تو غور کیجیے اور دیکھیے یہ تصویر ایک غریب کسان کی ہے اس کا ہیٹ ٹیڑھا ہے۔ حالانکہ سیدھا ہو سکتا ہے مگر ٹیڑھا ہے کیونکہ [illegible] اس کی شخصیت میں کجی نظر آتی تھی کجی، جھول، ڈھیلا پن، افلاس یہ آدمی آپ کو ویسا نظر آئے گا جیسے وہ مصور کو نظر آتا تھا۔ اس کی بے ترتیب مونچھیں اس کا ٹیڑھا ہیٹ، اس کا فاقہ زدہ چہرہ کیا یہ سب ون گاگ کی اپنی آنکھ کا قصور ہے یا شاید اس عصر اس زمانے اس نظام کا قصور ہے جس میں اس آدمی نے جنم لیا۔ بہرحال یہاں سے بات آگے بڑھی تو بقراطیت کی حدود شروع ہو جائیں گی اس لیے باقی کام آپ پر چھوڑا۔

اور یہ دوسری تصویر ایک ڈاکیے کی ہے۔ ڈاکیا جیسے ون گاگ کو نظر آتا تھا شروع سے آخر تک ڈاکیا، اینچ اینچ ڈاکیا، اس کے بھی رنگ آپ کو نظر نہیں آئیں گے مگر شاید کوئی کام کی بات پتے پڑ جائے۔ نہ پڑے تو ون گاگ کو قصور معاف کر دیجیے گا، جو سزا دینی ہو مجھے دیجیے گا، میں خوشی سے بھگت لوں گا۔

گڈ بائی ڈیر ون گاگ تمھارے لیے اور دنیا کا اتنا وقت ضائع کرنا بھی بہت۔ جتنا تم نے موٹی موٹی [illegible] کی تصویر بنائی نہ صرف آنکھ چشم گذرا نار جیسے خوبرو [illegible] کی تم زندگی کے جھمیلوں میں الجھے [illegible] کے آدمی دن بھر جیتے ہیں مرے تو رات کو گل و بلبل کے گیت گائیں گے۔ کوئی بھوک کی بات کرے تو [illegible] قرار دیں گے اس لیے تم ہمارے ہاں زیادہ نہیں بیٹھ سکے۔ یہ بھی اس خاکسار کی جرأت یا بے غیرتی ہے [illegible] ایسے [illegible] اور [illegible] مزاج قارئین یعنی اہل اردو پر مسلط کر دیا بس گڈ بائی [illegible] نہایت زبردست اشاعت گھر میں جاتا ہے جسے صرف ادیب چلاتے ہیں اور اس سے [illegible] یہ اشاعت گھر دنیا بھر میں اپنی قسم کا پہلا اور واحد اشاعت گھر ہے۔ ایمسٹرڈم کی ایک تنگ سی گلی میں [illegible]

www.taemeernews.com

ہے جس کے آگے ڈچ زبان میں ایک لمبا سا کتبہ تحریر ہے۔ اس کتبے کا انگریزی ترجمہ ہے BUSY BEE
معروف مکھی ۔

www.taemeernews.com

ان تھک مکھی اور لوبر ہاوزن

"یہ "مصروف مکھی" ڈچ ادیبوں کا اپنا اشاعت گھر ہے۔"

یہ کہانی شاعر اور ادیب لوگ غور سے پڑھیں — یعنی اگر وہ اخبار و خبار جیسی "چھوٹی چیز" پڑھتے ہوں تو۔ اور وہ لوگ بھی جو شاعروں اور ادیبوں کی عزت کرتے ہیں — یا نہیں کرتے۔

ہالینڈ کے ادیب و شاعر پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کی طرح ہیں۔ ان کے بھی دو پاؤں، دو ہاتھ، دو کان، دو آنکھیں، ایک ناک ہے۔ وہ بھی "خوددار" جذباتی اور حساس ہیں۔ سگریٹ اور کافی بھی زیادہ پیتے ہیں اور پہروں ادب اور فن پر گفتگو کرتے ہیں۔ وہ غریب بھی ہیں اور محبت بھی کرتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ محبت کی جائے تو اس میں ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ سب علاتی جو ہماری جان کے ساتھ لگے ہوئے ہیں ڈچ ادیبوں کی جان کے ساتھ بھی لگے ہوئے ہیں مگر —

دوسری جنگ عظیم میں جرمنوں نے ہالینڈ کو ایک ہی ہلے میں لے لیا۔ جرمن تو فرانس جیسے ملک کو آن کی آن میں ہڑپ کر گئے تھے، ہالینڈ بیچارہ چڑیا سا ملک، چھوٹا سا رقبہ، نہ ادھر ادھر پہاڑ، نہ کوئی فصیل، کشور بند وستاں۔ ڈچ فوجوں نے ہار کر ہتھیار ڈال دیئے۔ ملکہ نے سویڈن اور پھر انگلستان میں پناہ لی۔ فاتحین نے حسب معمول مفتوحین پر مظالم شروع کر دیئے، وغیرہ وغیرہ۔ سارا ہالینڈ جیسے بے دست و پا ہو کر رہ گیا مگر ابھی توپوں، ٹینکوں اور جنگی طیاروں کے شور نے ایک نئے ادارے کو جنم دیا اور اس ادارے کا نام تھا BUSY BEE یا مصروف مکھی — اور جب یہ کہانی خود کہانی کا مصنف — مجھے سنا رہا تھا تو کمرہ خاصا گرم لگا اور جو کافی میں پی رہا تھا وہ بھی خاصی گرم تھی اور جو ڈچ سگار میں پی رہا تھا۔ اُس کی جلن بھی میرے ٹمپریچر کو اونچا رکھنے کے لئے کافی تھی مگر میں بالکل سرد ہو جاتا تھا۔ سرد خاموش متحیر کیونکہ یہ داستان کو کوئی جرنیل آزمودہ کار سپاہی نہیں تھا بلکہ

www.taemeernews.com

صرف ایک ڈچ ادیب تھا جس کا نام ہے لوبر باوزن۔

لوبر باوزن بڈھا آدمی نہیں ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں وہ پچیس تیس برس کا تھا۔ اب پچاس کا ہوگا۔ ابھی جوان لگتا ہے۔ کاٹھی معمولی ہے۔ آنکھوں پر عینک ہے مگر اس کا چہرہ صاف اور آنکھیں روشن ہیں۔ وہ ڈچ ادیب "معروف مکھی" کا بانی اور آجکل مینیجنگ ڈائریکٹر ہے۔

ہالینڈ پر قبضہ ہوتے ہی ڈچ ادیبوں کی ایک جماعت انڈر گراؤنڈ چلی گئی یعنی روپوش ہوگئی۔ لوبر باوزن سائنس کا طالب علم اور ایک نیا سائنسداں تھا۔ شوقیہ افسانے بھی لکھتا تھا۔ مگر اس نے روپوش ہوکر ایمسٹرڈم ہی میں ایک دستی چھاپہ خانہ قائم کیا۔ ساتھی ادیب جمع کیے اور جرمنوں کے خلاف قلمی جہاد شروع کر دیا۔ (کاش کاتب صاحب قلمی جہاد کو فلمی جہاد نہ لکھ جائیں ورنہ یاروں کو تو پتا نہیں چلے گا میری بہت خرابی ہوگی۔ کیونکہ ادیب لوگ اگر یہ تحریر پڑھ رہے ہوں گے تو پہلے ہی بہت نفرت اور غصے کا شکار ہو چکے ہوں گے)

لوبر باوزن اور اس کے ساتھیوں نے اتنے چھوٹے سے ملک میں اتنی بڑی فوج اتنی بڑی طاقت کے خلاف چار برس قلمی محاذ قائم کیے رکھا۔ پہلے ان کی کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتیں اور سائیکلواسٹائل ہوکر بکتی تھیں۔ پھر ٹائپ والا چھاپہ خانہ بھی لگ گیا۔ تین بار یہ چھاپہ خانہ پکڑا گیا۔ بارہ ادیب گرفتار ہوئے، سات کو پھانسی ہوئی چار کو برسرِ عام اذیتیں دے کر ہلاک کیا گیا۔ مگر ان خونخوار آزمائشوں کے ہجوم میں وہ چھوٹی سی مکھی برابر مصروف رہی۔ اس کا نام تو تھا "روپوش اشاعت گھر" مگر محبِ وطن ولندیزیوں نے اُسے معروف مکھی کے نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ پہلے یہ لقب خفیہ طور پر استعمال ہوا پھر وہ اسی نام سے مشہور ہوگیا۔ یہاں تک کہ جب ہالینڈ دوبارہ آزاد ہوا تو یہ اشاعت گھر اسی نام سے قائم ہوا اور آج پورے یورپ میں اسی نام سے جانا جاتا ہے۔ اس اشاعت گھر نے غیر ملکی قبضے کے زمانے میں آزادی کے گیت، افسانے، ناول، کارٹون، خاکے گھر گھر پہنچائے۔ اس کے لیے کارکنوں کو کیا کچھ کرنا پڑا ہوگا۔ یہ مجھ "دانشور" کی سمجھ میں بھی نہیں آسکتا......

جب لوبر باوزن یہ کہانی سنا رہے تھے تو میں سراپا عقیدت بنا ہوا تھا مگر انھوں نے ذرا بھی دون کی نہیں لی۔ وہ کچھ ایسے سپاٹ طریقے سے بولے جا رہے تھے جیسے ٹائپ رائٹر چلتا ہے حالانکہ یہ آدمی رائٹر ہے۔ یہ وہ لوبر باوزن ہے جس کی تحریروں میں آج بھی شعلے بھرے ہوئے ہیں جو آج بھی ایک نہایت حساس اور گہری نظر اور پیاری زبان رکھنے والا ادیب کہا جاتا ہے لہٰذا اس لیے نہیں کہا جاتا کہ اس نے صرف جرمنوں سے قلمی لڑائی لڑی تھی بلکہ اس لیے کہ اس لڑائی کے دوران میں واقعی اس کی صلاحیتیں اُجاگر ہوئیں۔ اس نے اپنے آپ کو پالیا۔ وہ سائنسداں نہیں بلکہ ادیب بننے کے لیے پیدا ہوا تھا اور آج کئی ایسی کتابوں کا مصنف ہے جو ادبی طور پر بھی اعلیٰ پائے کی تصانیف

www.taemeernews.com

مانگی گئی ہیں۔

یار دیکھو کئی کتابوں کا مصنف قوم کا ہیرو ایک کھاتا پیتا آدمی ایک بڑے اشاعت گھر کا ڈائرکٹر کیوں ایسی سپاٹ باتیں کر رہا ہے نہ اس کی انا میرے ٹھوکر مارتی ہے نہ وہ لاف کام کرتا ہے۔

"یہ سالا ادیب ہی نہیں ہے" پاکستانی کافی ہاؤس چیختا ہے۔

"کہیں ادیب انڈر گراؤنڈ جا کر لڑتے ہیں کہیں ادیب دستی چھاپے خانے چلاتے ہیں کہیں ادیب قتل ہوتے ہیں. کیا ادیب اس لیے ہیں کہ قومی دوری چکر میں جیل جائیں کوڑے کھائیں اور پھانسی کے تختے پر چڑھ جائیں"

میں لوبر باوزن پر شبہ کرنے لگتا ہوں۔ واقعی کہیں یہ سالا ولندیزی فراڈ نہ ہو۔ ادیبوں کو جنگ وجدل سے کیا واسطہ بھئی ہمارے ہاں بھی تو انگریز آئے تھے اور تو اور نواب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب نے بحضور حکام سرکار انگلشیہ کی شان میں قصائد لکھے اور پنشن واگزار کرائی۔ اس کے بعد "خان صاحب" بسیار دوستان مہربان کا نیا خطاب بھی پایا اور پھر۔ اور پھر۔۔

لوبر باوزن تمہاری کہانی میرے لئے بڑی اذیت ناک ہوتی جاتی ہے۔ میری آنکھیں تمہارے بند آرام دہ کمرے کی محدودات پھاند کر اپنے برصغیر کی تاریخ پہ لگی ہوئی ہیں۔

لوبر باوزن تمہاری کہانی میرے لئے بڑی اذیت ناک ہے اب میری آنکھیں خود اپنے ملک پر لگی ہوئی ہیں۔

لوبر باوزن تم بڑے چھوٹے آدمی ہو تم مہمان نواز نہیں ہو تم کمینے ہو۔ تم مجھے بالواسطہ طریقے سے ذلیل کر رہے ہو۔ مجھے اپنے پورے وجود سے شرم آ رہی ہے۔

"پھر جنگ ختم ہونے کے بعد ہمارے اسی ادیبوں نے ایک کنونشن بلایا اور اس چھوٹے سے اشاعت گھر کو پھیلانے کا منصوبہ بنایا ہم نے اپنے اپنے وسائل اپنے اپنے مسودات جمع کیے اور ایک کمپنی بنائی کیونکہ ہمیں قوم کی ذہنی تعمیر نو کرنی تھی۔ ہم بار کر یپٹ کر تھک گئے تھے ہم آزردہ اور آشفتہ تھے بطور خاص ادیبوں کی مالی حالت بڑی خراب تھی۔ بہرحال ہماری کوششوں کا یہ معمولی سا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ یہ عمارت ہماری اپنی ہے لیکن اگلے سال تک ہم ایک نئی عمارت بنا لیں گے۔ ہمارے چھاپے خانے پھیلتے جاتے ہیں۔ ہماری مطبوعات اچھا نفع دیتی ہیں اس کا آدھا حصہ ہم آپس میں بانٹ لیتے ہیں اور آدھا کاروبار کی ترقی میں لگاتے ہیں۔ اب ہمارے غیر ملکی ترجمے ہمیں کافی پیسے دینے لگے ہیں" — وہ کہتے رہے اور ایک طرح شرماتے رہے وہ اپنے ناخن کریدتے جاتے تھے۔

نہیں یار لوبر باوزن تو قطعی ادیب نہیں ہے۔ یہ تو سیری طرح کا فراڈ ہے۔ اور بے ایمان بھی ہوگا ہم نے

www.taemeernews.com

جب گلڈ اشاعت گھر قائم کیا اور حکومت سے قرض مانگا تو اس کا اعلان قدرت اللہ شہاب نے حسب عادت قرض ملنے سے بہت پہلے کر دیا۔ آن کی آن میں خبر اڑ گئی کہ حکومت کا ایک لاکھ قرض گلڈ کے خازن عبدالعزیز خالد کھا گئے ہیں بات اس نوعیت کی بھی ہوتی ہوگی۔ مگر چونکہ خازن عبدالعزیز خالد تھے اس لیے انہیں سوسائٹی کے جلسۂ عام منعقدہ لاہور میں کھلا سوال کیا گیا۔

"وہ اشاعت گھر والا ایک لاکھ کہاں گیا ذرا اس کا حساب دیجیے۔" سوال کرنے والے نے تلوار نکال لی۔ "خالد صاحب جواب دیں۔"

"وہ روپیہ ابھی خزانے سے وصول نہیں ہوا" میں نے جواب دیا اور واپسی پر عبدالعزیز خالد نے اپنے اعزازی عہدے سے استعفا دے دیا۔ وہ درویش آدمی ہے۔ کارکن بنا تھا مگر پہلے ہی حملے میں بھاگ گیا۔

تو خواتین و حضرات یہ لوبر باوزن دلندیزی عرف ڈچ ادیب کیسے ادیب ہو سکتا ہے۔

میرا محبوب ادیب تو وہ ہے جو اول تو ملکی یا بین الاقوامی مسائل حاضرہ سے کوئی تعلق ہی نہ رکھے۔ رکھے تو حریفانہ رکھے یعنی ہر بات کو بُرا کہے اور اس کے بارے میں عملاً کچھ نہ کرے۔ دو سطریں بھی نہ لکھے۔ ایک نظم بھی نہ کہے — اور محبوب ترین وہ ہے جو:

رات کے وقت سے پیے
ساتھ حبیب کو لیے

مشاعروں میں جائے اور غزلیں پڑھے اور اسٹیج پر قے کرے اور ہو سکے تو وہیں پیشاب بھی کر دے۔ اور پھر کارکن لوگ اسے بیہوشی کے عالم میں وہاں سے اٹھا کر باہر پھینک دیں۔ یا کوئی رحمدل "مداح" اسے موٹر میں گھر پہنچا دے اور اگر وہ بیہوش نہ ہو اور مشاعرہ "کامیاب" پڑھ جائے تو پھر:

پھر کسی شہناز لالہ رُخ کے کاشانے میں چل

مگر وہاں مشکل یہ ہے کہ شہناز لالہ رُخ ہو یا زرد رُخ نقدی کے بغیر رُخ ہی نہیں کرتی:

زر می طلبد سخن درین است

نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمام معاشرے کو گالیاں دیتا ہے اور حکومت کو گالیاں دیتا ہے اور حزب اختلاف کو گالیاں دیتا ہے اور گھر پہنچ کر بیوی کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے ایک نہ آنے والی صبح کے انتظار میں سو جاتا ہے' وہ صبح جس کا طلوع وہ چاہتا ضرور ہے مگر اس کے لیے کچھ کرنا نہیں چاہتا — یا کچھ کر نہیں سکتا۔ اور جو کوئی حسرت موہانی' کوئی مولانا محمد علی' کوئی ظفر علی خاں کچھ کر گزرے تو اسے بے وقوف غیر حقیقت پسند صرف آئیڈیلسٹ صرف مقرر

www.taemeernews.com

مشاعرہ اور مولانا چندو کا خطاب ملتا ہے۔

"مجھے یقین ہے کہ آپ کے ہاں بھی ادیبوں نے قومی مسائل پر کام کیا ہوگا۔" وہ شاید اخلاقاً یا مخلصانہ امید کے ساتھ بولے۔

"بہت" میں نے تڑسے جواب دیا۔ لیکن میری نظریں خلا میں ان کتابوں، ان نظموں، ان مضامین، ان خاکوں کو تلاش کرنے لگیں جو پاکستان میں ابھی تک نہیں لکھے گئے۔ نزاعی مسائل کی بات چھوڑیئے کشمیر کا مسئلہ تو نزاعی نہیں ہے۔ اس پر صرف دو چیزیں "پاکستانی ادب میں پیدا ہوئیں، ایک "کشمیر اداس ہے" اور دوسری ایک نظم جس کا وہ مصرع تھے:

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

باقی یوں بہت کچھ ہوا مگر "بڑے" ادیبوں نے کیا لکھا اُس کا مجھ فقیر کو آج تک پتا نہیں چلا۔ فیشن ایبل لوگ بُرا مانیں گے میں خود کہتے کہتے چھوٹا منہ بڑی بات کے کامپلیکس میں مبتلا ہوں اور خطائے بزرگاں گرفتن خطاست کا مقولہ بھی یاد ہے مگر کیا یہ سچ نہیں کہ جوش صاحب دنیا کے ہر مسئلے پر لکھتے ہیں اور کشمیر پر کچھ نہیں لکھتے۔ فیض صاحب نے افریقہ پر نظم لکھ دی مگر کشمیر کے معاملے میں ان "بڑوں" کے تخلیقی سوتے کیوں خشک ہو جاتے ہیں۔ کشمیر جو سیاسی مسئلہ نہیں بلکہ خالص انسانی مسئلہ ہے۔ اپنے گھر کا مسئلہ ہے، اپنے ہم ناموں، ہم ذاتوں، ہم مذہبوں، ہم مزاجوں ــــ محاورے میں اپنے بھائیوں ــــ کا مسئلہ ہے۔ کشمیر کے معاملے میں جب یہ بڑے بڑے لوگ کچھ نہیں لکھتے تو چھٹ بھیے کیا لکھیں گے۔ مگر "چھٹ بھیے" لکھتے ہی رہتے ہیں۔

یہاں ایک پڑھا لکھا بین الاقوامی سیاست کا ماہر دانشور میرا کان کھینچتا ہے اور کہتا ہے تم سیٹو میں ہو تم سنٹو میں ہو اس لیئے یہ مسئلہ الجھا ہوا ہے۔ ہم بین الاقوامی منظر سیاست کو سامنے رکھتے ہیں۔ ہم چھوٹی باتیں نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ میں پڑھا لکھا دانشور نہیں ہوں میں دب جاتا ہوں گھبرا جاتا ہوں۔ مجھے فصیح انگریزی بھی بولنی نہیں آتی اور میں کوئی کام کی بات سوچوں بھی تو ادا نہیں کر سکتا اس لیئے میں چپ ہو جاتا ہوں مگر ــــ کیا یہ لوگ کوئی بھی چھوٹی بات نہیں کرتے۔ کوئی بات بھی۔

پس یہ لوبر بادزن چھوٹا آدمی ہے۔ وہ سب لوگ غیر ادیب ہیں جو قومی مسائل پر اپنے ملک کے موقف کی تائید کریں خواہ مفاد عامہ میں اس کی کتنی ہی ضرورت ہو۔ اصل چیز بڑی شاعری ہے، غزل، نظم، عاشقانہ اور فلسفیانہ خیالات کے اشعار۔ زوردار لفظ۔ خوبصورت تشبیہیں۔ الجھے اسٹائل۔ بالینڈ کی ایسی تیسی کشمیر کی ایسی تیسی۔ آیئے جناب غزل سنیئے۔ اس کے مصنف جناب جمیل الدین عالی ہیں، یہ ہے شاعری۔ قوم ووم کی شاعری کیا ہوتی ہے اور اگر ہوتی ہے تو ہر حکومت وقت کو بُرا کہنے میں چلتی ہے۔ خواہ کوئی حکومت وقت ہو۔ بے اطمینانی کے شعر پڑھو مضمون لکھو

www.taemeernews.com

عوام کی خراب حالت کا ذکر کرو' وہ شاعری چل جائے گی کیونکہ ہر زمانے میں عوام ہر حکومت سے ناخوش ہوتے ہیں' اس کا انتخاب خود بھی کریں تب بھی ناخوش ہوتے ہیں اس لیے یہاں تک تو قومی شاعری جائز ہے۔ آدمی کا بھرم رہتا ہے مگر کشمیر و کشمیر یا مسلم مہاجرین پر ہندو مظالم کا تذکرہ پھیکی سیٹھی بے وقار سی بات ہے' نہ کہنے میں مزا نہ سنانے میں مزا نہ دکان چلے گی نہ لوگوں کی ہمدردیاں ساتھ ہوں گی پس مائی ڈیر مسٹر لوبر باوزن تم یہ سن رکھو (گو میں کھل کر نہیں کہتا لیکن دل ہی دل میں جواب دیتا ہوں) کہ ہمارے ہاں بھی ملکی مسائل پر بڑا زبردست ادب پیدا ہوا ہے اور ہوتا رہتا ہے اور جب ہمارے ملک پر انگریزوں نے قبضہ کیا تھا تو ہم نے اپنی صنف قصیدہ میں بیشمار اضافے کیے تھے۔ جب ملک آزاد ہوا تو "چھٹ بھیوں" نے آزادی کے گیت ضرور گائے مگر چونکہ بڑے ادیبوں نے اسے مکمل آزادی نہیں سمجھا تھا اس لیے انھوں نے اس نامکمل آزادی پر ذرا سی خوشی کا اظہار بھی مناسب نہ سمجھا' آگے کیا ہوگا۔ اس کا علم اللہ کو ہے۔

یہ لوبر باوزن کے اشاعت گھر سے سخت کبیدہ خاطر واپس چلا ہوں۔ لندن میں بین الاقوامی انجمن ناشرین کے صدر سر اسٹینلے اَن وِن نے مجھ سے کہا تھا کہ غیر کمیونسٹ دنیا میں کوئی اشاعتی ادارہ ادیبوں کی ملکیت نہیں ہے۔ ادیب یہ کام کر ہی نہیں سکتے' ہاں ہالینڈ میں BUSY BEE نے اس دعوے کو باطل کر دیا ہے۔ تم وہاں ضرور جانا۔

چنانچہ میں وہاں گیا اور منغض و متعجب و متاسف آیا (سخت اُردو معاف' غصے میں اسٹائل کہاں باقی رہتا ہے) لیکن میرے دل میں ایک کھٹک' ایک اُمید ایک ہلکی سی روشنی ضرور پیدا ہوئی۔ لوبر باوزن اُردو نہیں جانتا مگر میں نے چلتے وقت اس کی آنکھوں میں علامہ اقبال کا ایک مصرع پڑھا۔ کاش میرے دوست یا میرے مخالفین یا میرے دوستوں یا مخالفین کے جانشین اس مصرع کو سمجھ لیں۔ وہ مصرع وہی پرانا رٹا رٹایا مگر سچا بڑا عظیم مصرع تھا:

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

www.taemeernews.com

مجبورِ عدالتِ عالیہ

اس دن ڈن ہاخ یعنی دی ہیگ میں میرا دن بڑے تاریخی اور فلسفیانہ کرب و اضطراب میں گزرا۔ کاش اس مضمون کو پڑھ کر آپ کا دن بھی اسی طرح گزرے۔ کاش آپ بھی سوچیں خواہ میری طرح نہ سوچیں بلکہ صرف سوچیں کیونکہ سوچ خود ایک کرب ایک اضطراب —— ایک عذاب ہے۔

وہ دن میں نے بین الاقوامی عدالت عالیہ میں گزارا، وہ عدالت عالیہ جو دنیا کی سب سے زیادہ مہنگی سب سے معزز اور سب سے "بڑی" عدالت انصاف سمجھی جاتی ہے۔ اس رنگا رنگ دنیا میں خدا کے بعد سب سے بڑا درجہ شاید عدالت کو حاصل ہے، اس لیے مختلف مسائل میں مبتلا انسانوں کو عدالت سے بڑی امیدیں لگی رہتی ہیں۔

یہ بین الاقوامی عدالت عالیہ کی عمارت ہے لیکن بدقسمتی سے ابھی میری نظر اس عمارت پر نہیں جمی بلکہ میں سامنے والے دروازے سے نکلنے والی ایک نہایت جاذب نظر "ٹورسٹ" خاتون کو دیکھ رہا ہوں جن کی تصویر میں آپ کو نہیں دکھاؤں گا۔ آخر ایسی بھی کیا مضمون نویسی کہ آدمی اپنی ہر خوشی میں دوسروں کو شریک کرنے لگے۔ یوں بھی آپ عورت اور انصاف کے رشتے کو ایک دم نہیں سمجھ سکتے۔ آپ صرف اتنا جان سکتے ہیں کہ عورت خدا نے بنائی ہے اور آج تک چل رہی ہے یعنی ہر جگہ عورت کا وجود باقی ہے اور انصاف بھی خدا نے بنایا تھا مگر وہ عورت سے کمزور نکلا کہیں ڈھیلا ڈھالا چل رہا ہے کہیں چلا ہی نہیں کہیں چل کر رہ جاتا ہے کہیں چلنے ہی نہیں پاتا۔ اس لیے جی چاہتا ہے کہ اس وقت انصاف کے مسئلے کو چھوڑ کر ایک مشہور شعر کا صرف پہلا مصرع دہرایا جائے کیونکہ دوسرے مصرع سے فساد خلق کے علاوہ فساد خانہ پیدا ہو جانے کا احتمال ہے۔ وہ پہلا مصرع آپ نے بار بار سنا ہوگا، سنا نہیں ہوگا تو اس سے ملتے جلتے جذبات نے آپ پر حملہ ضرور کیا ہوگا جیسے اب سنتے ہی چیخیے:

الٰہی کیسی کیسی صورتیں تو نے بنائی ہیں

www.taemeernews.com

اب اس صورت حال میں آدمی ہیگ کی بین الاقوامی عدالت عالیہ دیکھے جو انسانوں کی ایک پیچیدہ سی کوشش کا ایک مبہم سا نتیجہ ہے یا ایک واضح درخشاں قدیم اور جدید اور تازہ حقیقت دیکھے۔

لیکن جب یہ درخشاں اور جدید اور تازہ حقیقت اپنی عدالتوں میں نظر آتی ہے تو زندگی کی تاریکیاں تمام روشن پہلوؤں پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ یہی شوخ کرن شوخ مثال بگیہ جو زنان نفقے یا طلاق کے لیے عدالتوں میں بار بار حاضری دیتی ہے۔ کیونکہ سیاں کوتوال بنے بغیر اسے سٹرا سٹرا کر مارنے کا ارادہ کر چکے ہیں۔ یا ستیاں کی با اثر والدہ صاحبہ یا بہن صاحبہ اُسے خود بیاہ کر لانے کے باوجود اس کا بیڑا غرق کرنے پر اس لیے تلی ہوئی ہیں کہ اس کے ہاں لڑکا پیدا نہیں ہوتا بلکہ لڑکیاں پیدا ہوئے جاتی ہیں۔ یا وہ اٹھارہ آدمیوں کے کنبے کے لیے تین وقت کا کھانا اکیلی نہیں پکا سکتی یا اس کے غریب باپ بھائی یا اور رشتے دار عید بقرعید پر سیاں یا ستیاں والوں کو مناسب تحفے تحائف نہیں دیتے یا وہ اگر اچھے گھر کی ہے تو سسرال والوں کے لیے قرض حسنہ اور ملازمتوں کا انتظام نہیں کرا سکتی۔

اے شوخ کرن شوخ مثال بگیہ جو میری آنکھوں سے دور ہو جا اس وقت تو مجھے ایک دم اپنے ملک کے پس منظر میں ایک خوفناک دردناک اذیت دہ سائے کی طرح نظر آ رہی ہے میں تیرے لیے کچھ نہیں کر سکتا تو خود ہی انصاف کا دروازہ کھٹکھٹائے جا میں تو تجھ سے فرار ہونا چاہتا ہوں اور اس فرار کا آسان ترین راستہ یہ سامنے والا دروازہ ہے جو مجھے بین الاقوامی عدالت عالیہ کے وسطی کمرے میں لے جاتا ہے۔

تو یہ بین الاقوامی عدالت عالیہ ہے۔ کیا آراستہ اور شاندار اور باوقار کمرہ ہے۔ یہ چھت والے فانوس ہی کئی لاکھ روپے کے ہوں گے سنا ہے جج صاحبان کی تنخواہ دس دس ہزار روپے ماہوار سے کم نہیں جس پر انکم ٹیکس بھی نہیں لگتا۔ مکان بے کرایہ کے یعنی مفت ملتے ہیں۔ چھٹیاں بھی لمبی لمبی ہوتی ہیں۔ جج صاحبان اپنے اپنے ملک کے نمائندے نہیں ہوتے بلکہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی سفارش پر جنرل اسمبلی انتخاب کرتی ہے۔

اس عدالت میں احترام کے مارے میرا دم گھٹا جاتا ہے۔ کیا سنجیدہ ماحول ہے۔ کیا باوقار صورتیں ہیں۔ جج ملک ملک کے [illegible] قانون دان ہیں۔ انہیں میں ہمارے ملک کے ایک سپوت سر ظفر اللہ خاں بھی بیٹھے ہیں۔ سر ظفر اللہ خاں جن کی شہرت [illegible] پاکستانیوں کے لیے تو محتاج تعارف نہیں مگر آجکل کے نوجوانوں نے بمشکل ان کا نام سنا ہو گا۔ ان [illegible] کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ سر ظفر اللہ خاں ہمارے ایک مشہور ماہر قانون ہیں۔ غیر منقسم ہندوستان [illegible] اعلیٰ ترین مرکزی عدالت میں جج تھے۔ پھر پاکستان کے وزیر خارجہ تھے۔ پھر اس کورٹ کے جج پھر [illegible] پاکستان کے نمائندے پھر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے صدر پھر اسی عدالت کے جج۔

www.taemeernews.com

(بچ کیا سمجھے۔ پاکستان میں صرف ٹیڈی بوائے اور ٹیڈی گرلز ہی نہیں بلکہ سر ظفر اللہ خاں بھی ہوتے ہیں)
مگر خواتین و حضرات آپ کو اس رعب داب کے باوجود یہ جان کر خوشی نہیں ہوگی کہ یہ عدالت ایک طرح دنیا کی سب سے کم اختیار یعنی مجبور عدالت ہے۔ یہ اتنی بڑی اور شاندار اور مہنگی اور بہترین ماہرین پر مشتمل عدالت چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ ایک پاکستانی مجسٹریٹ درجہ سوم کے اختیارات اس عدالت سے بدرجہا زیادہ ہیں۔ کیونکہ وہ عدالت با اختیار ہے اور یہ عدالت بے اختیار۔

قصہ یہ ہے کہ اس عدالت میں افراد تو جا ہی نہیں سکتے۔ مثلاً میں آپ کے خلاف یا آپ میرے خلاف دعویٰ نہیں کر سکتے۔ خیر اپنی میری بات چھوڑیے ملکوں کی بات کیجیے کیونکہ یہ عدالت بین الملکی یا بین الریاستی تنفیے طے کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ ملکوں کا قصہ یہ ہے کہ جب تک دونوں فریق عدالت کے فیصلے قبول کرنے پر رضامند نہ ہوں عدالت مقدمہ سن ہی نہیں سکتی۔ مثلاً فرض کیجیے کہ امریکہ نے شمالی ویٹ نام کے ایک دھپ مار دیا۔ اور شمالی ویٹ نام نے عدالت میں شکایت کی تو جب تک امریکہ مقدمے میں فریق بننے کے لیے از خود تیار نہ ہو مقدمہ عدالت میں رجسٹر نہیں ہو سکتا۔ مگر خیر یہ مثال تو جھگڑے فساد والے یعنی فوجداری کے مقدمات کی ہے۔ دیوانی کا معاملہ لیجیے دیوانی میں بھی یہی شرط ہے کہ ایک ملک دوسرے ملک پر اس ملک یعنی مدعا علیہ کی مرضی کے بغیر دعویٰ دائر نہیں کر سکتا۔ مثلاً اسرائیل مصر کے جہاز لوٹ لے یا مال کھا جائے تو مصر اس وقت تک اس عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹا سکتا جب تک اسرائیل مدعا علیہ بننے پر تیار نہ ہو۔

نتیجہ یہ کہ پاکستان کشمیر کا کیس بین الاقوامی عدالت عالیہ میں نہیں لے جا سکتا کیونکہ ہندوستان فریق بننے پر تیار ہی نہیں ہوتا۔ پھر یہ عدالت کیا ہے اور کیا کرتی ہے۔

قصہ یہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد مرحوم لیگ آف نیشنز یعنی مجلس اقوام بنی تو ایک اسی قسم کی بین الاقوامی عدالت عالیہ بھی بنائی گئی۔ سفید قومیں ظاہری ضابطوں اور قاعدوں پر مرتی ہیں نا اس لیے جب انھوں نے مجلس اقوام کا چکر چلایا تو اس کی کئی شاخیں قائم کیں جن میں وہ ایک مرحوم عدالت بھی تھی ویسے اس مرحوم عدالت کا نام اس عدالت کے نام سے زیادہ بڑا تھا یعنی اس کا نام تو ہے بین الاقوامی عدالت انصاف اور اس کا نام تھا "مستقل بین الاقوامی عدالت انصاف" مگر وہ مجلس اقوام کے ٹوٹتے ہی ٹوٹ گئی کیونکہ بقول علامہ اقبال:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

شکر ہے کہ اس عدالت کے ساتھ "مستقل" کا لفظ نہیں رکھا گیا۔ شاید نام رکھنے والے مذہبی قسم کے [illegible]

www.taemeernews.com

لوگ تھے بستقل خدا کی ذات کے علاوہ کچھ نہیں، کچھ نہیں، کچھ نہیں۔
(یہاں میرا خطاب پاکستانی افسران و حکام با اختیار سے ہرگز نہیں ہے، ہرگز نہیں ہے، ہرگز نہیں ہے)
خیر تو پھر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحدہ بنی اور اقوام متحدہ بنی تو پھر یہ عدالت انصاف بھی بنی اور چونکہ اقوام متحدہ اب تک قائم ہے اس لیے یہ عدالت بھی اس وقت تک قائم ہے۔
یا اللہ اس غریب ادیب یتیم کی دعا ہے کہ اقوام متحدہ ہمیشہ قائم رہے۔ اس کے قواعد و ضوابط ضرور حقیقت پسند آ بنا دیے جائیں۔ مگر وہ ٹوٹنے نہ پائے کیونکہ بہر حال:

گندم اگر بہم نہ رسد بھُس غنیمت است

یعنی اگر وہ بڑی جنگیں نہ روک سکے تو جب تک ممکن ہو چھوٹی جنگیں ہی روکتی رہے۔ بڑا انصاف نہ کر سکے تو چھوٹا انصاف ہی کرتی رہے۔ کچھ نہ کچھ کام ہوتا رہے۔ یونسکو چلتی رہے۔ عدالت انصاف چلتی رہے۔ خوراکی ادارہ چلتا رہے۔ بھیا صلح میں بڑی صفائی ہے، باقی جو کچھ ہے وہ برائی ہی برائی ہے۔
اچھا اب یہ جو عدالت ہے اس میں پندرہ جج ہوتے ہیں جن کی نامزدگی ایک بڑے طویل اور صبر آزما چکر سے گزرتی ہے اور پھر سلامتی کونسل اس پر سوچ بچار کرتی ہے۔ اور پھر پوری جنرل اسمبلی یعنی تمام ملکوں کی اسمبلی مگر اس میں ایک گھپلا ملاحظہ کیجیے۔ سلامتی کونسل ایک طرح جنرل اسمبلی کا تحتی یعنی ماتحت ادارہ ہے اور اس کے کل گیارہ رکن ہوتے ہیں لیکن ان میں پانچ سفید اقوام یعنی امریکہ۔ روس۔ برطانیہ۔ فرانس اور انگلستان کو ہر معاملے میں ویٹو یعنی حق استرداد ملا ہوا ہے مطلب یہ کہ کسی بھی معاملے میں اگر باقی دس کے دس رکن متفق ہوں تب بھی صرف ایک ملک حق استرداد استعمال کرکے پورے مسئلے کا بٹا کر سکتا ہے۔ جیسے روس نے مسئلہ کشمیر کا کیا تھا یعنی پوری سلامتی کونسل پاکستان کے ساتھ تھی اور روس ہندوستان کے ساتھ تھا، اس لیے اس نے ویٹو استعمال کرکے ایک نہایت اہم قرار داد کو منظور نہ ہونے دیا۔ یہی صورت اس عدالت میں ججوں کی نامزدگی کے باب میں بھی پیش آسکتی ہے اور جنرل اسمبلی تک پہنچتے پہنچتے معاملہ الجھ سکتا ہے۔ یہ نہیں ججوں کے معاملے میں حق استرداد کتنی بار استعمال ہوا ہے۔ مگر اس کا باقی رہنا ہی بنیادی انصاف کے خلاف ہے۔ بہر حال بقول کسے:

رموز قوم سیاہان سفید را داند

یعنی کالی قوموں کا راز گورے ہی جانتے ہیں اور چونکہ میں ذاتی طور پر کالا نہ ہوتے ہوئے بھی گوری قوم کی فہرست میں نہیں تا اس لیے مجھے اس مصرع کی صداقت مان لینی چاہیے۔
اب دو ...تی اور مدعا علیہ کا قصہ تو آپ سمجھ گئے یعنی مدعا علیہ کی مرضی کے بغیر مدعی بالکل سست ہی رہتا ہے،

www.taemeernews.com

گواہوں کی چُستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مطلب یہ ہوا کہ آئے دن کے بڑے بڑے جھگڑے اس عدالت تک جاتے ہی نہیں جو انصاف کی نوبت آئے۔ بڑے اور طاقتور ملک خاص طور پر اس عدالت میں جاتے ہوئے ڈرتے ہیں کیونکہ عدالت بہرحال عدالت ہے۔ سلامتی کونسل نہیں جہاں اقتدار اور مصلحت کا کھیل چلتا ہے۔ عدالت تو انصاف کرے گی خواہ امریکہ ناخوش ہو خواہ روس۔ اس لیے بڑوں کے بڑے قضیے عدالت میں پہنچتے ہی نہیں پاتے۔

اب عدالت کو کام بھی کرنا ہے۔ اس لیے اقوامِ متحدہ والوں نے اسے مشاورتی حیثیت بھی دے رکھی ہے یعنی کوئی ملک اس سے کسی بین الاقوامی قانون کی کسی پیچیدگی پر مشورہ یا رہنمائی طلب کر سکتا ہے۔ سو یہ کام بہت ہوتا رہتا ہے کچھ ہنگامی کام بھی ہوتا ہے مثلاً جب ایران میں تیل کی صنعت قومیائی گئی تو برطانیہ نے اپنی کمپنی کی طرف سے ایران پر دعویٰ کر دیا۔ وہ کیس خوب چلا خوب قانونی موشگافیاں ہوئیں اور عدالت نے چند نکات پر برطانیہ کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ میں نے سنا ہے کہ ۱۹۶۳ء تک اس عدالت نے کوئی ۳۵ مقدمات طے کیے ہیں لیکن ان میں نہ تو کوریا کا مقدمہ ہے نہ فارموسا کا نہ کیوبا کا نہ کشمیر کا نہ ویٹ نام کا نہ لاؤس کا نہ انگولا کا نہ اسرائیل کا ——— نہ ہائیڈروجن بم کا.....

مگر میں نے یہ بھی سنا ہے کہ مدت سے ایک اور عدالت کہیں بیٹھی کام کر رہی ہے جو عالمی عوام کی عدالت کہلاتی ہے اور جلد یا دیر میں یہ سب مقدمے طے کرے گی کیونکہ اس نے ایسے ایسے بہت سے مقدمے طے کیے ہیں اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اس عالمی عوامی عدالت کے اوپر ایک اور عدالت بھی ہے جو عالمی عوامی عدالت کے فیصلوں پر فیصلہ دیتی ہے اور اس عدالت کے نام کئی ہیں جن میں سے ایک نام ہے تاریخ۔

اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اس بڑی عدالت یعنی تاریخ سے اوپر بھی ایک عدالت ہے جو سب سے زیادہ با اختیار ہے جو از خود معاملات اور قضیوں کا نوٹس لیتی ہے اور جو اپنے فیصلے کو بزور منوا بھی لیتی ہے اور جو تاریخ کے فیصلوں کی اپیلیں سُن کر ان کا فیصلہ بھی کرتی ہے اور یہ کہ اس عدالت کا صرف ایک نام ہے اور ہر زبان میں اس کا ترجمہ موجود ہے۔ اور گو کچھ زبانوں سے وہ ترجمہ نکال دیا گیا ہے اور کہیں کہیں موجود رہ گیا ہے لیکن اس سے اس عدالت کے وجود اور اختیار میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

اور اس عدالت کا نام ہے خُدا۔

کیا آپ اسے سخن سازی، اشتہار بازی، جذباتیت، جہالت یا جھوٹ کہیں گے۔ اگر میں یہ کہوں کہ مجھے ہالینڈ کے شہر ہیگ کی بین الاقوامی عدالت میں خُدا بڑی شدت کے ساتھ یاد آیا۔ خدا جسے میں اب تک نہیں جانتا اب تک نہیں پہچانتا لیکن جسے مجھے بار بار ماننا پڑتا ہے۔

www.taemeernews.com

ہیوما اور روشن آرا بیگم

جب آپ روشن آرا بیگم، نزاکت علی سلامت علی کو سنتے ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں نا۔

آپ اثبات میں سر ہلائیں گے یعنی آپ ہاں کہیں گے۔ موسیقی سے دلچسپی یوں بھی ایک خاصہ ہے۔ اور آج کل تو افسر لوگ بھی فائن آرٹس یعنی فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کے لیے آرٹس کونسلیں وغیرہ بنا رہے ہیں۔

تو روشن آرا بیگم گھنٹوں اپنے کمال کا مظاہرہ کرتی ہیں اور نزاکت علی سلامت علی بھی اور استاد امراؤ بندو خاں بھی اور دیگر "اساتذہ کرام" بھی اور افسر لوگ ڈنر جیکٹ پہنے اور آپ اور میں عام کپڑے پہنے سر دھنتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں اور جب رات گہری ہو جاتی ہے تو اپنے ذوق اور فنکاروں کے شوق پر ناز کرتے ہوئے اپنے گھر چلے جاتے اور سو جاتے ہیں۔

اور فنکار بھی اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں مگر وہ سوتے نہیں۔ شاید روشن آرا بیگم سو جاتی ہوں گی کیونکہ خدا نے انھیں نسبتاً آسودہ حال رکھا ہے لیکن بہت سے فنکار آرام سے نہیں سو پاتے۔ ان کی یہ بے خوابی فنی الجنون یا عشق کی بے پناہ گرمیوں کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ وہ عام طور پر پیٹ کا چکر ہوتا ہے۔ ان کے بڑے بڑے کنبے ہیں، اہل عیال ہیں، اہل عیال کے علاوہ دوسرے ضرورتمند عزیز اقربا ہیں۔ ہماری آپ کی طرح فنکار بھی عام انسانوں کی سی ضروریات رکھتے ہیں۔ ذرا سوچیے کہ آرٹس کونسلیں اور ڈنر جیکٹ والے افسران اور ان کی قیمتی لباس میں ملبوس "فن پسند بیگمات" اور دیگر دلدادگانِ موسیقی یعنی ہم آپ سب ان فنکاروں کو کیا پیش کرتے ہیں (ابھی ریڈیو پاکستان کا نام بیچ میں نہ لائیے کیونکہ میں مدت تک عملی طور پر بیک لسٹ رہنے کے بعد کہیں جا کر دوبارہ "کھلا" ہوں۔ پہلے ہوا یہ تھا کہ ایک مشاعرہ پڑھنے کی وجہ سے خدا خوش رکھے بخاری صاحب خفا ہو گئے تھے۔ اب پتا نہیں نئے حاکم صاحب کس بات پر خفا ہو جائیں کیونکہ فارسی کا ایک قول ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حاکموں کا مزاج عجیب ہوتا ہے کبھی

www.taemeernews.com

تعریف پر گالی دیتے ہیں اور کبھی گالی دینے پر خلعت بھی بخش دیتے ہیں۔)

ہاں تو بات فنکاروں کی ہو رہی تھی اور ہونی چاہیے تھی ہالینڈ کی بات لیکن ذکر پاکستانی فنکاروں کا آگیا۔ یہی تو اس ساری کتاب میں عیب ہے کہ بات کسی ملک کی ہو اپنا ملک ضرور یاد آتا ہے اور طرح طرح یاد آتا ہے۔

اس بار اپنا ملک یوں یاد آیا کہ ہالینڈ میں میوزک کے فنکاروں یعنی موسیقاروں نے ایک عجیب و غریب انجمن بنا رکھی ہے۔ ایسی انجمن چھوٹے سے پیمانے پر بعض یورپین ملکوں میں موجود ہے مگر برلن اور ایمسٹرڈم کی انجمنیں اپنے حسنِ انتظام اور آمدنی کے لحاظ سے سب پر بازی لے گئی ہیں۔

اس انجمن کا انگریزی مخفف نام ہے بوما BUMA اور دور دور کے لوگ اسے BUMA OF HOLLAND بوما آف ہالینڈ کے نام سے پکارتے ہیں

قصہ کیا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ سب دھنیں بنانے والے سب گانے والے اپنی دھنیں اور طرزیں اور گیت اس انجمن کے ذریعے کاپی رائٹ کرا لیتے ہیں۔ آپ نے ایک دھن بنائی یا ایک گیت گایا یا ایک نغمہ ایجاد کیا اسے بوما نے پیٹینٹ کر دیا اور کتاب میں آپ کے نام پر اندراج ہو گیا۔ اب آگے سنیے۔

سارے ملک کے ہوٹلوں، کلبوں، ریستورانوں، رقص گاہوں کے مالکوں پر قانوناً فرض ہے کہ جب وہ کوئی گت، کوئی گیت، کوئی دھن، کوئی طرز بجائیں اس کا مکمل ریکارڈ رکھیں اور مہینے کے مہینے مقررہ شرح کے حساب سے اس کا معاوضہ بوما کو بھیج دیں۔ بوما اپنے اخراجات کا تھوڑا سا کمیشن کاٹ کر رقم اُنگ یا قانونی زبان میں "مصنف" کو پہنچا دیتی ہے کبھی کبھار بڑی مارکیٹ والے فنکار رائلٹی بھی لے لیتے ہیں کبھی کبھی نئی طرز بنانے بغیر نئے گیت لکھے بغیر ایڈوانس لے لیتے ہیں اور جب موڈ آئے کام کر کے انجمن کے حوالے کر دیتے ہیں۔

اور جناب اس انجمن کی یعنی فنکاروں کی مجموعی آمدنی کروڑوں سے اوپر ہے۔ اس کا دفتر تیرہ منزلہ ہے اور اپنا ہے۔ اس کا اسٹاف ایک عام سرکاری محکمے کے اسٹاف سے کئی گنا زیادہ ہے۔ اس کے افسران کو ہزاروں گلڈر تنخواہ ملتی ہے۔

اور جناب اس انجمن کی اپنی پولیس بھی ہے جسے سرکار نے قانون کے تحت اجازت دے رکھی ہے کہ وہ جب چاہے کسی بھی ہوٹل کلب رقص گاہ تفریح گاہ کا موسیقی والا حساب چیک کر سکتی ہے فرض کیجیے آپ نے میری دھن اپنے بینڈ سے بجوا دی اور اس کا اندراج نہیں کیا۔ بوما کے انسپکٹر صاحب نوٹس دیے بغیر کا دیجے وہاں عین موقع پر پہنچ کر نوٹس لیتے ہیں کہ کیا "تفریح" ہو رہی ہے اور فوراً اندراجات کی چیکنگ یعنی جانچ پڑتال شروع کر دیتے ہیں کیونکہ وہ انکم ٹیکس انسپکٹر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ذرا غور فرمایئے موسیقی کا معاملہ اور انکم ٹیکس انسپکٹر کے اختیارات بھی۔

www.taemeernews.com

کہتے ہیں کہ مشرق ہے اور مغرب مغرب ......

بوما نے بین الاقوامی معاہدوں کا جال بھی پھیلا رکھا ہے۔ ڈچ موسیقاروں کا فن کہیں بھی استعمال ہو اس کا معاوضہ متعلقہ ملک اُسے ادا کرے گا اور بوما متعلقہ فنکار کو ادا کرے گی بعض صورتوں میں یہ معاوضے لاکھوں ڈالر تک پہنچ جاتے ہیں۔ کہتے ہیں ایک نوعمر نومشق دُھن نویس کی ایک دُھن امریکہ میں چل گئی سال بھر کے اندر اندر وہ راک فیلر نہیں تو سیٹھ داؤد کو آنکھیں دکھانے لگا۔

تو یہ کیفیت موسیقاروں کی ہے اور وہ بھی یورپ کے ایک چھوٹے سے ملک ہالینڈ میں جس کی آبادی کل ایک کروڑ بھی رکھی ہے۔ میں ایمسٹرڈم کسی کام سے آؤں بوما ضرور آتا ہوں۔ بوما اسٹیشن سے کوئی دو میل دور ہے۔ نہر کے کنارے ایک تنگ مگر لمبی سڑک پر واقع ہے۔ اس سڑک کا نام بھی معقول ہے یعنی ہیرن گراخت۔ ہیرن کہتے ہیں شرفا کو اور گراخت راستے کو۔ گویا اس کا نام کراچی کے عربی داں اردو نویسوں کی زبان میں ہوا شارع شرفا لیکن مجھ پر چھوڑا جائے تو میں اسے جیبے والی سڑک کہوں گا۔ شرفا کا طبقے سے کوئی واضح تعلق ہو یا نہ ہو مگر اس ہیرن گراخت کا ضرور ہے کیونکہ یہاں کی فضا میں عجب کھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے جس سے روپے کی بارش ہوتی ہے۔ کہاں موسیقی کہاں روپے کی بارش مگر بہت سی باتیں جو ابھی تک ایشیا میں مبالغہ ہیں یورپ میں سچ ہیں۔

کیوں بھئی کیا ارادہ ہے کیا یہاں بھی موسیقاروں کی انجمن بنوا دگے یہی گھپلے پیدا کرکے تو تم نے گلڈ کا چکر چلایا اور نتیجہ نہیں نکلا۔ آج تک کاپی رائٹ قانون بن جانے کے باوجود اس کا نفاذ تو ہوا نہیں ہے۔ اب فنکاروں کو بھی چھاننے کا ارادہ ہے۔ ارے میاں انھیں گانے دو ہمیں سننے دو۔ وہ بدحال ہیں تو ہم کون سے خوش حال ہیں۔

بہرحال اے فن پرست خواتین اور اے فن پرست حضرات اور اے فن پرست افسران اور اے فن پرست عوام یہ بھی ہالینڈ کے فنکاروں ہی کی کہانی ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس فنکاری کی زبانی ہے جسے یقین نہ آئے وہ مغرب کے شہر ایمسٹرڈم کی ہیرن گراخت پر اپنی آنکھوں سے بوما نام کا مقام عالی شان ملاحظہ کرے اور جسے بے دیکھے یقین آ جائے وہ فنکاری کو دعا سے خیریت یاد کرے۔ رہے فنکار تو وہ جانیں اور ان کا کام۔ ہاں انجمن سازی کی ضرورت محسوس فرمائیں تو اس حقیر فقیر کی نری خدمات حاضر ہیں۔ صرف اتنا ملحوظ خاطر رکھا جائے کہ بوما ایک دن میں نہیں بنی تھی جب بڑے بڑے استادوں کو ایکا کرکے برسوں اپنے حقوق کے لیے لڑنا پڑا تھا تب جاکر حکومت نے ان کے حقوق مانے اور جب ہی قانونی تحفظ کرنے والوں سے منوا لیے۔ اب اگر اسے بڑے لوگ ان کی تعمیر ہی میں کچھ کر دکھانا چاہیں اور آپ ان سے ذکر کرتے گاتے ہی گاتے رحلت فرمانا چاہیں

www.taemeernews.com

تو یہ آپ کا اختیار ہے کہ ہم ٹھیرے سیلانی جوگی، ہمارا کام بات کہہ دینا ہے:

ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

چلتے چلتے میری برلن کی کہانی بھی یاد کر لیجیے۔ آئی ایم سوری مجھے خود یاد نہیں کہ میں نے گیما GEMA آف برلن کا ذکر کیا تھا یا نہیں۔ برلن میں بھی ایک ایسی ہی انجمن ہے اس کا نام گیما ہے۔ وہ ایک نئی سات منزلہ عمارت ہے شیشے کی طرح چمکتی اور ستاروں کی طرح دمکتی ہوئی عمارت۔ وہ بھی فنکاروں کی آمدنی سے انہی کی آمدنی کے لیے بنی ہے اور مغربی جرمنی کے موسیقاروں کے حقوق کی حفاظت کرتی ہے۔ مگر خیر چھوڑیے آپ تو فانی بدایونی کا یہ شعر پڑھکر چپ ہو رہیے کہ اس خطے میں یہی کچھ چلتا ہے:

کچھ اُمید کرم میں گزری عمر
کچھ اُمید کرم میں گزرے گی

اور جتنا گایا ہوا اس پر خوش رہیے اور جتنا گا سکیں گائیے اور ریڈیو پاکستان اور آرٹس کونسل سے اُمید کرم رکھے جائیے گزر ہی جائے گی کیونکہ استاد ذوق بھی فرما گئے ہیں کہ:

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

سو آپ! ہالینڈ کے فنکاروں کو ہنسنے دیجیے آپ کے لیے آنسوؤں کے خزانے کھلے ہوئے ہیں۔ ہزار ہا عمدہ سے عمدہ قنوطی اشعار کی بارش ہو رہی ہے بس اسی کے مزے اٹھائیے۔ باقی کام آنے والی نسلیں کر لیں گی۔ اور وہ بھی نہ کریں تو کیا غضب ہو جائے گا۔ کیونکہ بہر حال ان کی بھی:

کچھ اُمید کرم میں گزرے گی

اسی ہیرن گراخت کے ساتھ ساتھ ایک اور پتلی سی سڑک قیصر گراخت ہے۔ جہاں مقامی ادیبوں کی انجمن ہے۔ یہ انجمن بالکل انٹلیکچوئل ہے معرف ایک پتلا سا ماہانہ رسالہ نکالتی ہے اور ہفتے کے ہفتے ایک دن ادبی بحث کرتی ہے۔ اپنے حلقۂ ارباب ذوق سے ملتی جلتی ہے سوائے اس کے کہ حلقہ رسالہ نہیں نکالتا بلکہ اتوار کے اتوار صرف مباحثہ کرتا ہے۔ یہ بھی ادب کا ایک موثر اور پاکیزہ پہلو ہے کہ ایک طرف لوگ باوزن ادیبوں کا اشاعت گھر قائم کیے مادی دنیا میں سرگرم عمل ہیں تو دوسری طرف صرف ادب برائے ادب کا جھنڈا بھی بلند رکھنا چاہیے۔ حلقے کی طرح یہاں بھی خاموش ادیب اور بحث کرنے والے ادیب بہت ہیں۔ ان کے رسالے میں ایک تصویر ٹامس مان کی ہاتھ آئی ہے جو لوگ ٹامس مان سے واقف ہیں ان کی یہ نادر تصویر دیکھکر خوش ہوں گے۔ یہ خاتون بیگم ٹامس مان [illegible]

www.taemeernews.com

ہیں۔ ان کے بعد مرحوم ڈچ ادیب مینو ڈیر براک اور ان کے برابر ٹامس مان صاحب ہیں۔

ادیبوں کا قصہ چل پڑا تو ان دوسرے ادیب صاحب کو بھی دیکھ لیجیے۔ شاید انگریزی داں لوگوں نے ان کے ترجمے پڑھے ہوں۔ یہ حضرت ہیں ہوزر وینڈیلو۔ انگریزی میں جوزونڈیلو کہلاتے ہیں۔ مگر خیر ہوزا اور جوز کا قضیہ چھوڑیئے ان کی بے تکلفی ملاحظہ کیجیے کہ خاصے مشہور اور کھاتے پیتے ہو کر برسرِ عام نل کا پانی پی رہے ہیں۔ اپنے ہاں تو نشے کی حالت میں ہونے کے علاوہ کوئی ادیب بھائی سڑک پر گلاس سے بھی پانی نہیں پیتا مگر یہ ادیب فقط ادیب ہی نہیں بلکہ ایک عام آدمی بھی ہے۔ سیدھا سادا عام آدمی خیر آگے پھر حدِ ادب شروع ہو گئی۔

اب چونکہ بات بات میں حدِ ادب شروع ہو جاتی ہے اس لئے میں نزاعی معاملات سے گزرتا ہوا ایک دم بات ہی پلٹ دیتا ہوں۔ یہ دیکھیے یہ ایمسٹرڈم کا اسٹاک ایکسچینج ہے۔ آ با سٹے کا بات ہے بھئی واہ عالی صاحب تم کھوب ساعر ہے اپن کو ستا باجی میں بھی لے جاتا ہے بس یار ستا کراؤ۔ یہ پوئٹری اور پھنکاری کیا کیا بولتا رہتا ہے گانے میں جر در مجا ہے پن پوئٹری کا ملک کو کوئی جر درت نہیں۔ اصل بات سٹے کی ہے چاہے وہ ایمسٹرڈم میں ہو چاہے نیویارک میں چاہے کراچی میں۔ تم پوئٹ لوگ پتا نہیں کدھر رہتا ہے۔ ارے یار ستا تہ ہو تو دنیا کیسے چلے ایک نیویارک اسٹاک ایکسچینج بند ہو جائے تو آدھی دنیا کی ایڈ کا ناس ہو جائے سمجھا نہیں۔ یہ جو ایڈ آتا ہے کس طرح آتا ہے بھائی بیوپاری کے پیسے سے آتا ہے اور بیوپاری کے پاس کوئی تمھارے باپ کا مال ہے جو تمھیں ایڈ دیتا رہے گا اسے بھی ٹیکس دینے کے لیے چار پیسے کمانے ہوتے ہیں۔ تو اگر اسٹاک ایکسچینج نہیں ہو گا تو وہ کدھر سے کمائے گا۔ ہاں جرا دکھاؤ نا ادھر کیا حساب کتاب ہے بھئی یہ اسٹاک ایکسچینج اچھا معلوم ہوتا ہے لندن جیسا گل غپاڑہ نہیں ہے۔ مگر تمھارا پوئٹری کی سنگت سے فیر اچھا ہے ——

لو بھائی ون گاگ، لو بھائی لو برانڈ ن، لو بھائی ڈچ موسیقار و گت ساز و فنکار رہو تم سے تو اب تمھاری لالٹین کھینچی نہیں جاتی کہاں تم لوگوں کا صرف فن ہی فن اور کہاں اسٹاک ایکسچینج کے چھناکے، اگر ایک داؤ عمدہ لگ جائے تو فن ون سب کی سرپرستی ہو سکتی ہے۔ اب یہاں تو میں افسر ہونے سے رہا یورپ میں افسر کو گھاس برابر نہیں سمجھتے، ادھر پیسہ چلتا ہے۔ ایشیا میں پیسہ ویسہ تو ہے نہیں اس لیے فن ون کے قصے میں ابھی تک افسر ہی چل رہا ہے لیکن اسے لیجیے پھر حدِ ادب شروع ہو گئی —— لاحول ولا قوۃ ....

www.taemeernews.com

فلاحی مجرّسی

میری اگلی منزل سوئٹزرلینڈ تھی۔ ماؤنٹ بلانک کی برف پوش چوٹی۔ جینوا کے "بین الاقوامی مناظر" اور جھیل لے مان کے نیلگوں پانی میں چمکتی ہوئی روشنیاں۔

مگر اس دن جب میں ایمسٹرڈم ہوائی کمپنی میں اپنی نشست مخصوص کرانے گیا تو پروگرام میں گڑبڑ ہوگئی۔ ٹیلیویژن پر جنرل ڈیگال کے خلاف الجزائر والے فرانسیسی جنرلوں کی بغاوت پر تبصرہ ہو رہا تھا، طرح طرح کے مناظر دکھائے جا رہے تھے، ایک طرف جنرل سلان کا اعلان بغاوت اور فوجی تیاریاں دوسری طرف جنرل ڈیگال کی قوم سے اپیل۔ پھر انھوں نے پیرس کے بازاروں، کلبوں اور ریسٹورانوں کے مناظر دکھائے جہاں لوگ اس بغاوت پر سخت خفا تھے۔ یکایک مجھے ایک پھریری سی آئی اور میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے ایک بے خطر اخباری نامہ نگار کی طرح پیرس کا آنکھوں دیکھا حال لکھنے کے لیے دوبارہ پیرس پہنچ جانا چاہیے اور میں نے پیرس کے لیے نشست مخصوص کرالی۔

"مگر جناب ہم اس بات کی ذمے داری نہیں لے سکتے کہ آپ کا جہاز اڑ بھی جائے گا کیونکہ پیرس کا ہوائی اڈا بند ہو جانے کا امکان بہت زیادہ ہے۔"

"معلش،" میں نے کہا۔ (معلش، جس کے معنی عربی میں ہیں، کوئی پروا نہیں)

اور رات ایمسٹرڈم کے ہوائی اڈے پر پہنچ گیا۔

مگر پیرس جانے والی تمام پروازیں منسوخ ہو چکی تھیں۔ ہوائی اڈے پر پیرس جانے والے مسافروں میں ایک ہیجان بپا تھا۔ وہ بہت سے تھے اور بھانت بھانت کے لوگ تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں خوبصورت مرد یا عورت قسم کی چیز تھی ہی نہیں۔ بھئی معاف کیجیے گا میں خوبصورت عورتوں ہی کو نہیں خوبصورت مردوں کو بھی دیکھ کر ذرا خوش سا رہتا ہوں۔ ویسے خوبصورتی کسے کہتے ہیں، یہ الگ بحث طلب بات ہے۔

تو میں نے باقی رات ہوائی اڈے پر گزاری۔ ایمسٹرڈم کا ہوائی اڈا بجائے خود ایک تفریح کا مقام ہے،

www.taemeernews.com

ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ ہر وقت ریستوران کھلے ہوئے ہیں۔ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ روشنیاں بہت اور رنگ بھی۔ میں بہت دیر گھوما پھر تھک گیا اور میری نگہ انتخاب ایک موٹی بھاری بھرکم بڑی بی پر پڑی جو سگریٹ اور سگار بیچ رہی تھیں پھر مجھ پر کھلا کہ ہالینڈ اصل میں اس سے بہت زیادہ ہے جو میں نے دیکھا ہے۔ شاید آپ ان باتوں سے غرض نہ رکھیں مگر میں بیان پر مجبور ہوں۔

بڑی بی بیوہ تھیں مگر انھیں سرکاری پنشن ملتی تھی۔ ہالینڈ میں تقریباً سبھی لوگ بیمہ شدہ ہوتے ہیں اور ان کے انتقال پُر ملال کی صورت میں ان کے خاندان کو کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے لیکن کوئی فلسفی قنوطی صاحب بیمہ کرائے بغیر رخصت ہو جائیں تب بھی ان کے نابالغ بچوں کو ریاست تعلیمی پنشن دے گی اور اگر بیوہ ساٹھ برس کی ہوگئی ہے یعنی کام کے قابل نہیں ہے تو بیوہ کو بھی پنشن ملے گی۔ بچوں کے سلسلے میں پنشن کا حساب یوں ہے کہ اگر باپ مرگیا اور ماں کام کرنے والی ہے تو پنشن کم اور اگر ماں باپ دونوں مرگئے تو پنشن زیادہ اور وہ بالکل سرکاری ذمے داری میں پلتے ہیں۔ اگر باپ مرگیا اور ماں زندہ ہے مگر کام کے قابل نہیں تب بھی پنشن گزارے کے قابل ملے گی۔ یہ بڑی بی پنشن پاتی ہیں مگر ذمے داریاں زیادہ ہونے کی وجہ سے کام بھی کر رہی ہیں۔

اسی طرح اس ملک میں سب کو علاج کی گوناگوں آسانیاں ہیں۔ ایک مختصر رقم سے ایک جامع قسم کا بیمہ کرا لیجیے، بیمار پڑے تو علاج مفت پڑے گا۔ اگر آپ کا کوئی عضو کٹ گیا، ہاتھ پاؤں بے کار ہو گئے فالج ہو گیا یعنی کام سے جاتے رہے تو آپ کو گزارا الاؤنس ملے گا خواہ آپ نے پرائیویٹ بیمہ کرایا ہو یا نہ کرایا ہو کیونکہ آپ کا لازمی بیمہ ہو چکا ہے یعنی آپ کسی قسم کے بھی مزدور کارکن کاروباری افسر اہل قلم یعنی کچھ بھی رہے ہوں آپ کا جبریہ بیمہ ہو چکا ہے صرف وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جو نہ کام کریں نہ آرام چاہیں یعنی مجھ جیسے ادیب شاعر لوگ ـــــ سو ان کا قصہ کم از کم ہالینڈ میں یہ ہے :

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

معاف کیجیے گا میں آپ کو نہایت ذلیل اور شرمناک باتیں بتا رہا ہوں۔ ایک ایشیائی شاعر ایک غزل گو ایک عجم خود شریف پاکستانی کو ایسی رذیل اور مادی اور بھینچو باتوں سے اپنے ناظرین کو بور کرنا نہیں چاہیے جب کہ ساتھ ہی تھوڑی سی دور ایک پیارے محبوب ملک میں کرسٹین کیلر موجود ہو بلکہ خود ہالینڈ میں کرسٹین کیلروں کی کمی نہ ہو اس وقت اپنے سفلہ پن کا احساس نہایت شدت سے ہو رہا ہے مگر کیا کروں ہر آدمی کی ایک طبیعت ہوتی ہے میری بھی ہے۔ بچھو کو کوئی پیار سے بھی اٹھائے وہ ڈنک ضرور مارے گا۔ مجھے آپ کچھ سمجھ کر پڑھیں کہیں سمجھ کر پڑھیں تب انشورنس سماجی حقوق تربیت اطفال وغیرہ کے اشغلے ضرور چھوڑوں گا میں کسی ملک میں ہوں مجھے

www.taemeernews.com

پاکستان ضرور یاد آئے گا۔ خود دادا جان مرحوم و مغفور کا اصول تھا کہ :

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بھلا بتائیے کہ برس جاتے جاتے وقت گزارنے کو ملی بھی تو ایک بڑھیا اور اس سے گپ بھی ہوئی تو سوشل سیکورٹی جیسے خشک موضوع پر۔ ارے بھئی اگر بات ہی کرنی تھی تو جمہوریت پر کرتے۔ حق رائے دہی کا مسئلہ سمجھتے، فنڈامینٹل رائٹس یعنی بنیادی حقوق پر بحث کرتے وہ نہ سمجھتی تو اُسے سمجھاتے کیونکہ اگر بنیادی عدالتی حقوق ہی نہ ہوں تو آدمی کو علاج معالجہ کرانے یا انشورڈ ہو کے بیٹھ جانے سے کیا فائدہ؟ پھر یہ کہ سوشل سیکورٹی ایک خشک موضوع ہے۔ اس کا کوئی جذباتی نعرہ بھی نہیں بنتا۔ آخر ہوتا چلے آدمی یورپ میں چند مہینے رہ کر ٹھنڈے پڑ گئے۔ سب جذباتیت بھول گئے۔ نعرے فراموش کر دیئے اور کرنے لگے وہی بورژوا بنیوں جیسی باتیں کہ صاحب ملک میں طبی آسانیاں ہوں اور بیواؤں کی اور بچوں کی پنشن ہو اور یہ ہو اور وہ ہو۔ ابے اپنی اصلیت پر آجا:

اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

مگر یہ غافل مغل بچہ (جو بدقسمتی سے افغان نہیں ہے) اب بڑی بی سے بے کاروں کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔

"بڑی بی آپ کے ہاں بیکاروں کا کیا علاج ہوتا ہے؟"

"برخوردار" بڑی بی اپنا حساب کتاب برابر رکھے جاتی ہیں "اول تو ہمارے ہاں کام اتنا ہے کہ بیکار بہت کم ہوتے ہیں۔ زیادہ تر وہ لوگ بیکار سمجھے جاتے ہیں جو ایک نوکری چھوڑ کر دوسری بہتر نوکری تلاش کر رہے ہیں۔ کیونکہ حکومت نے ایک قانون بنا رکھا ہے جس کی رو سے اصولاً کوئی آدمی بے روزگار نہیں رہ سکتا اور جو بے روزگار ہو جائے اسے مدت بے روزگاری میں گزارا الاؤنس ملتا ہے۔ شادی شدہ اور بچوں والے کو زیادہ اور کنوارے کو کم۔"

یہ معلومات بھی میرے لیے بڑی تکلیف دہ ہیں۔ نہ ان میں کوئی مزا ہے نہ حلاوت، پھر بھی میں حاصل کیے جاتا ہوں۔ شاید اس لیے کہ میں نے بے کاری اور بیکاری سے پیدا شدہ گوناگوں ذلتوں کے مزے بہت اٹھائے ہیں۔ شاید اس لیے کہ میں بچوں والا ہوں اور شاید اس لیے بھی کہ میرے بہت سے عزیزوں، دوستوں اور شناساؤں کی بے روزگاری، ان کی بیویوں کی بیوگی اور ان کے بچوں کی یتیمی میرے سر سے بیسے پنے پتا ہے

www.taemeernews.com

ضمیر پر بار بار طعنوں کی ٹھوکریں مارتی رہتی ہے۔

مگر اب آپ اس کو اس کو برداشت نہیں کر سکتے۔ آخر نان سنس کی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں آپ کا مزاج جانتا ہوں اور اس سے ذرا بھی ہوں اس لیے میں ان بڑی بی کو چھوڑ کر ایک نائٹ کلب میں چلتا ہوں کیونکہ صبح تک پیرس جانے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

ایمسٹرڈم کے نائٹ کلب یورپ میں کسی نائٹ کلب سے کم نہیں:

وہی رنگت، وہی خوشبو، وہی شان دلآویزی

مگر ایک میز پر دو تین سے زیادہ مہمان نظر نہیں آتے۔ لوگ بکھرے بکھرے بیٹھے ہیں۔ پیرس اور لندن کی طرح بڑی بڑی پارٹیاں بنا کر نہیں بیٹھتے۔ اتفاق سے اس رات اس نائٹ کلب میں ایک ادیب شہیر بھی مل گئے مجھے دیکھ کر بڑے اخلاق سے اُٹھے ہاتھ ملایا "ساتھ والی" سے ملوایا اور خالی خالی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں منتظر کہ یہ مجھے اکیلا دیکھ کر بیٹھنے کو کہیں گے مگر وہ ہمہ تن اخلاق بنے صرف کھڑے رہے۔ یہاں تک کہ میں نے تعظیماً سر جھکایا اور ایک خالی میز پر جا کر بیٹھ گیا اور وہ اپنی کرسی پر جیسے اطمینان کا سانس لے کر پھر براجمان ہو گئے۔

بہت دنوں بعد جب میں نے یہ واقعہ ایک فرانسیسی دوست کو سنایا تو اس نے کسی تعجب کا اظہار نہیں کیا "حیرت ہے کہ آپ نے یہ بات وہاں بہت دیر میں محسوس کی"۔ وہ بولا "ہالینڈ والے یعنی ڈچ تو یورپ کے چینی کہلاتے ہیں۔ کنجوس مکھی چوس"۔

ظاہر ہے کہ چین کا تصور یورپ میں ابھی وہی پرانا تصور ہے افیمی اور کنجوس چینیوں کا تصور۔

اسی شام مجھ پر یہ بات بھی کھلی کہ ہم لوگوں میں جو ساتھ کھانا کھا کر اپنے اپنے بل الگ ادا کرنے کا طریقہ رائج ہو جائے اسے ڈچ طریقہ کیوں کہتے ہیں۔ ہوا یہ کہ تھوڑی دیر بعد وہاں ایک اور ڈچ ادیب تشریف لے آئے جو مجھے دیکھ کر خود میری طرف آئے اور اجازت لے کر ساتھ بیٹھ گئے۔ وہ انگریزی خوب بولتے تھے اس لیے مجھے بھی بڑی فرحت ہوئی۔ چند لمحے بعد ان کی "ساتھ والی" بھی آگئیں اور ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گئیں۔ وہ دونوں ناچے۔ دونوں نے تھوڑا بہت کھایا پیا اور پھر بیرے سے بل لانے کو کہا جو ایک لمبا چوڑا بل لایا۔ انھوں نے ڈچ زبان میں اس سے کچھ کہا۔ اور چند لمحے میں وہ تین بل لے آیا۔ ایک تو انھوں نے اپنے سامنے رکھا۔ ایک خاتون ساتھی کے سامنے اور ایک میرے سامنے۔ میں حیران اور کچھ خجل بھی۔ میں نے اصرار کیا کہ تینوں بل میں ادا کروں گا۔ مگر وہ مسکرائے۔

"آپ نے ہماری دعوت نہیں کی تھی میرے دوست؟

مگر یہ خاتون تو آپ کی دعوت پر آئی ہیں۔"

www.taemeernews.com

"نہیں صاحب یہ بھی اپنے طور پر ہی آئی ہیں، انھیں معلوم تھا کہ میں آج شب ادھر آؤں گا۔ کہنے لگیں میں بھی آجاؤں، میں نے کہا آجاؤ، چنانچہ یہ بھی آگئیں۔ آپ یقین کیجیے کہ یہ میری مہمان نہیں ہیں نہ مجھ میں اتنا دم ہے کہ اس طرح دعوتیں کروں اور یہ بھی ضروری ہے کہ جاننے والے مل بیٹھیں اور گپ کریں اور کچھ وقت اچھا گزاریں اس لیے ہمارا طریقہ یہ ہے کہ اپنا اپنا بل خود ادا کر دیتے ہیں مگر چونکہ آپ غیر ملکی ہیں اس لیے آپ اجازت دیں تو آپ کا بل ہم دونوں مل کر ادا کر دیں۔

"جی نہیں:" میں نے گھبرا کر اپنا بل جھپٹ لیا۔

تو دوستو ڈچ طریقِ میزبانی یا طریقِ مہمانی اسے کہتے ہیں۔ پتا نہیں یہ طریقہ اچھا ہے یا ہمارا جس میں لاکھ کا گھر خاک ہو جاتا ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ وہ کلچر ہی کیا جس میں لاکھ کا گھر خاک نہ کیا جائے۔ کلچر جیسے لفظ کا مزا ہم لوگ ہی جانتے ہیں، یہ سالے یورپ کے "چینی" کیا جانیں۔

میں آپ کو ڈچ ادب اور ادیبوں کی نگارشات کے بارے میں کچھ بتاتا مگر اس کہانی کی یہ نہج ہی نہیں ہے۔ میں نے ہر جگہ کے ادیبوں سے بقول کسے "مذاکرات" کیے مگر وہ آپ کے بقول آپ کو "سوٹ" نہیں کرتے۔ کیونکہ ماہناموں اور روزناموں میں کچھ نہ کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔

مگر میں کرسٹین کیلر کہاں سے لاؤں، میں نے آپ کو پھول دکھائے، ہواچکیاں دکھائیں، بین الاقوامی عدالت دکھادی۔ ملکہ اور ملکہ کا خاندان دکھا دیا۔ ڈچ ۶۰۔ اکثر پسندوں کے منصوبوں کی جھلکیاں دکھائیں جس طرح اس قوم نے سمندر کا سینہ چیر کر زمین نکالی ہے اس کا حال سنایا۔ یہاں کے عملی ادیبوں کی حوصلہ مندی اور فنکاروں کی انجمن سازی کا حال سنایا، طبی امداد کے منصوبوں، بیکاری کی پینشن، بیواؤں کے الاؤنس تک پہنچ گیا مگر ابھی کوئی کرسٹین کیلر نہیں آئی۔ ایک قاری کے بقول یار یہ ہالینڈ سالا خالی خالی جا رہا ہے۔

اب میں ہمت کروں تو آپ کو مصوّر ون گاگ اور مصوّر ریمبرانٹ کے چکر میں ڈالوں۔ ریمبرانٹ ایک بہت بڑا یعنی عظیم مصوّر گزرا ہے۔ میرے پاس اس کے مرقعوں کے بہت سے کارڈ موجود ہیں مگر حضرت مصوّری کے معاملے میں بات کرتے:

کٹتی ہے زباں میری

کیونکہ ہمارے ملک میں مصوری پر بات کرنا چند مخصوص طبقوں کی اجارہ داری ہے۔ وہ کھل کر بات بھی نہیں کرتے اور برابر نقادانِ مصوری کی حیثیت سے امریکی بھائیوں کی دعوت پر باہر جاتے رہتے ہیں اور واپس آکر نہ خود کچھ بتلاتے ہیں نہ کسی کو بتانے دیتے ہیں اور جو "ان کے معاملے" میں دخل دے اس کا کسی نہ کسی بہانے بیڑا

www.taemeernews.com

کر دینے پر تل جاتے ہیں یہ بندہ حقیر و فقیر ویسے ہی گوناگوں مشکلات میں گرفتار رہتا ہے اگر مصوری پر بھی بات کرنے لگا تو نہ جانے اور کن مصائب میں گرفتار ہو جائے کیونکہ اس عاجز کے خیال میں مصوری صرف خواص کے لیے نہیں عوام کے لیے بھی ہے آرٹس کونسل ہی کے لیے نہیں بلکہ سڑکوں گلیوں اور جھونپڑیوں کے لیے بھی ہے لیکن ابھی اس منزل تک پہنچتے پہنچتے کچھ وقت اور لگے گا اس لیے فی الحال آپ ایسا کیجیے کہ ـــ میری طرح چپ رہیے۔
اور اب واپس ہوائی اڈے پر چلیے جہاں سے اگر جہاز پیرس کے لیے نہ اڑا تو جینوا کے لیے ضرور اڑے گا۔

www.taemeernews.com

پھر کچھ گھنٹے پیرس میں

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

وہ عجیب دن

آخر کار ایمسٹرڈم کے ہوائی اڈّے پر اعلان ہوگیا کہ پیرس کا ہوائی اڈّا سرکاری طور پر کھل گیا ہے مگر جانے والے اپنے اپنے طور پر سوچ سمجھ کر جائیں۔

میرا خیال ہے کہ اس صبح جانے والے کُل اٹھائیس مسافر تھے۔ ان میں سات تو سفید سیٹھ لوگ تھے جو کاروباری غرض سے جا رہے تھے۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور ٹکٹ منسوخ کرا دیے۔ آپ جانیں دھندے میں سیاسی خطرات مول نہیں لیے جاتے۔ سیٹھ لوگ کسی ملک کے ہوں، دھندے میں مندا برداشت نہیں کرسکتے۔

کچھ ادھر ادھر فضول سے ان جانے لوگ تھے پانچ چھ ٹورسٹ تھے مگر سیر تماشے والے ٹورسٹ۔ انھوں نے سوچا کہ پیرس میں خالی سڑکیں اور اندھیری راتیں ملیں تو سیر کا مزا کیا خاک آئے گا۔ سو وہ بھی گول ہوگئے۔

کچھ فرانسیسی تھے، ان میں دو معمر خواتین بھی تھیں مردوں نے کہا آپ نہ چلیے۔ پتا نہیں جہاز پہنچتے پہنچتے شہر کا کیا حال ہو شاید باغی فوجیں اتر رہی ہوں یا شہر کے کسی حصے میں بغاوت ہوگئی ہو یا کم از کم جنرل ڈیگال کی وفادار فوج ہی گھوم رہی ہو۔ مگر ان خواتین نے رکنا منظور نہ کیا۔ انھوں نے کہا ہم نے دوسری جنگ عظیم دیکھی ہے۔ پیرس پر جرمنوں کا قبضہ دیکھا ہے۔ ہم اپنے ملک کی سیاست میں حصہ لینے سے بالکل نہیں ڈرتے آخر ہم فرانسیسی ہیں، فرانس ہمارا ہے، پیرس ہمارا ہے۔

تین صحافی تھے، ایک امریکن، ایک جرمن اور ایک فرانسیسی۔ امریکن کوئی زوردار صحافی نہیں تھا۔ بس یورپ مجموعی طور پر دیکھنے آیا ہوا تھا۔ باقی دونوں نے بہت زور دیا کہ یہ موقع نہ چھوڑو، مگر اس کی طبیعت ادھر نہ آئی "آپ نے دو یارو"۔ اس نے کہا" میں یہ کہانی لکھنے کے لیے تو بھیجا نہیں گیا، نہ یہ میرے ملک کا معاملہ ہے نہ میرا اخبار مجھے ٹکا دے رہا ہے، میں اپنی جان عذاب میں کیوں ڈالوں؟"

فرانسیسی تو خیر بے تاب تھا ہی بلکہ وہ اپنی چھٹی منسوخ کروا کے واپس جا رہا تھا۔ مگر جرمن کی ہمت ...

www.taemeernews.com

قابلِ داد تھی۔ اس نے اپنا سامان جلدی جلدی دوبارہ ٹھیک کیا۔ ایک بڑا بکس وطن چلتا کیا، ساتھ ایک چھوٹا بکس رکھا، کیمرہ گلے میں ڈال لیا اور ٹائپ رائٹر ہاتھ میں اٹھا لیا۔

اس کا ٹائپ رائٹر دیکھ کر مجھ رائٹر کے دل میں ایک شعلہ بھڑکا مگر ایک لمحے میں وہ شعلہ خوف اور اندیشوں کے تھپیڑوں نے سرد کر دیا۔ میں نے ان چند منٹ میں پوری طرح اپنا محاسبہ کر ڈالا۔

"آخر میں اس قضیے میں کیوں پڑوں" میں نے سوچا "میرے اپنے مسائل کم ہیں جو میں پیرس میں جنرل ڈیگال کے خلاف بغاوت کے مناظر دیکھنے کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالوں۔"

جان ہے تو جہان ہے پیارے

پھر میں نے دنیا کے تمام ہیرو قسم کے حضرات کی تاریخ یاد کی اور ہیرو لقمے سے دوبارہ متاثر ہوا۔ مجھے کرسٹوفر کاڈویل یاد آیا جو ایک نوجوان مصنف تھا اور ہسپانوی نہیں تھا مگر اسپین کی خانہ جنگی میں جنرل فرانکو کے خلاف رضاکار فوجوں میں شامل ہو کر لڑا اور مارا گیا۔ "لاحول ولا قوۃ۔ ارے میاں کہاں تم کہاں کرسٹوفر کاڈویل، تم اپنے برصغیر کی آزادی میں تو لڑے نہیں بلکہ سرکاری نوکریاں تلاش کرتے پھرتے تھے۔"

"اس وقت میں بچہ تھا یعنی نوعمر۔"

"مگر غزلیں تو کہتے تھے۔"

"ہاں غزلیں تو کہہ لیتا تھا۔ بات یہ ہے کہ شاعری تو ہمارا ثقافتی ورثہ ہے نا اور میرے کیس میں تو....."

"مگر آزادی کے بعد آپ کا ریکارڈ کیا رہا یعنی جب آپ بالکل نوعمر نہیں تھے اس وقت سے آج صبح تک۔"

میں نے گھبرا کر ہتھیار ڈال دیے اور مسرت سے جرمن صحافی ٹائپ رائٹر کو دیکھتے ہوئے کاؤنٹر کا رخ کیا کہ اپنا ٹکٹ منسوخ کراؤں اور جنیوا کا رخ کروں، پُرسکون جنیوا جہاں فوجوں اور بغاوتوں کا سلسلہ مدت سے بند ہے۔

مگر۔ عین اس وقت جب کاؤنٹر والی لڑکی مسکرا مسکرا کر ہم بھگوڑوں کے ٹکٹ کینسل یعنی منسوخ کر رہی تھی، وہ آ گئی۔

ظاہر ہے کہ "وہ" ایک عورت تھی لیکن اس کے یا کسی عورت کے عورت ہونے میں میرا کوئی قصور نہیں، یہ بات کوئی جرم ہے کہ میں رہا سہا "سچا" اور "آنکھوں دیکھا" حال لکھ سکوں؟ میں بالکل سچ لکھنے کا دعویٰ کب کرتا ہوں جو لکھتا ہوں وہ جھوٹ نہیں ہوتا، یہ الگ بات ہے کہ میری تحریر ابھی مکمل نہیں ہے۔

تو وہ ایک دم کاؤنٹر پر پہنچی اور ہم لوگوں کی بھیڑ چیرتی ہوئی ٹکٹ والی خاتون پر دھاڑی۔

"مجھے اسی پرواز سے پیرس کا ٹکٹ چاہیے یہ لو رقم جلدی سے ٹکٹ دے دو میرا بکس سامنے رکھا ہوا ہے

www.taemeernews.com

کوئی لے نہ جائے۔"

"ہاں مادام کئی نشستیں خالی ہوئی ہیں مگر پہلے میں ان صاحب کا ٹکٹ دوسری پرواز کے لیے ٹھیک کر لوں ابھی آپ کو ٹکٹ دوں گی" کاؤنٹر والی لڑکی نے میری طرف اشارہ کیا اور میں نے اپنا ہیٹ میڑھا کر لیا۔

"اوہ یہ بزدل لوگ" مادام شاید بے سوچے چیخیں "کیا یہ سب بھاگ رہے ہیں"۔

مرد تلملا کر رہ گئے مگر کیا کر سکتے تھے، بولنے والی ایک خاتون تھی اور اس کا رنگ بالکل گونتابی تھا۔

"مگر میں تو پیرس کی نشست پکی کرانے آیا ہوں" میں ایک دم بے اختیار ہو کر بولا۔

"آپ کی نشست تو ہے ہی پکی" لڑکی مجھے حیرت سے دیکھنے لگی "ابھی شاید آپ نے جنیوا جانے کے لیے کہا تھا۔"

"ہاں میں جنیوا بھی جاؤں گا۔ میرا مطلب تھا کہ آپ پیرس کے بعد جنیوا بھی لکھ دیجیے۔ یہ انٹرنیشنل ٹکٹ ہے نا" میں نے ایشیائی جہالت کے بارے میں سب کے قیاسات محکم کر دیئے۔

"آہ موسیو تو پھر آپ نے سب کا وقت ضائع کیا۔ آپ پیرس میں بھی جنیوا لکھوا سکتے تھے۔ اسے دیکھیے جنیوا لکھا ہوا تو پہلے سے موجود ہے آپ پیرس میں صرف اپنی مطلوبہ پرواز بتا دیتے" وہ برا مان گئی۔ ماننا ہی تھا۔

"تو کیا میں اسی پرواز سے پیرس جا سکتا ہوں" یہ بات میں نے کاؤنٹر والی لڑکی سے اس طرح کہی کہ میں اس غصہ ور خاتون کو خطاب کر رہا تھا۔

"ضرور ضرور" سب مل کر چیخے "آپ فوراً پیرس جا سکتے ہیں۔ برائے خدا ہمیں آگے بڑھنے دیجئے۔"

جہاز ایک گھنٹے میں پیرس پہنچ گیا اب اس میں آٹھ یا نو مسافر تھے جن میں ایک وہ بھی تھی۔

پیرس پہنچتے پہنچتے میں نے اسے جتا دیا کہ مجھے اپنا ٹکٹ بدلوانا تھا مگر اس کے غصے سے برانگیختہ ہو کر اپنی جان خطرے میں ڈال رہا ہوں۔

"آہ موسیو" وہ کھل کھلا کر ہنسی "مگر آپ سخت مایوس ہوں گے۔ میری شادی اسی ہفتے میں ہونے والی ہے۔"

"مگر محترمہ میری شادی تو کئی سو ہفتے پہلے ہو چکی ہے۔"

اب اس نے مجھے کسی قدر تعجب اور خشمگیں نظروں سے دیکھا۔ مگر میں نے پروا نہ کی۔ میں پروا کرتا بھی تو کیا کر لیتا۔

"بات یہ ہے محترم خاتون" میں نے نہایت سکون سے کہا "ابھی کوئی بین الاقوامی قانون ایسا نہیں

جس کی رو سے ایک شادی شدہ مرد ایک غیر شادی شدہ یا شادی شدہ خاتون کے طعنوں سے جوش میں نہ آسکے۔"

وہ بے تحاشا ہنسنے لگی ــ اور پیرس آگیا۔

ہوائی اڈّا بالکل سنسان تھا۔ شاید ہمارا جہاز پہلا جہاز تھا جو ہوائی اڈا بند ہوکر کھلنے کے بعد یہاں پہنچا تھا۔ صبح کے آٹھ یا نو بجے ہوں گے مگر پورا ماحول جیسے جامد اور خاموش تھا۔ ایک صاحب ہمارے پاسپورٹ اس بار نہایت سختی سے ایک کمرے میں لے گئے اور کوئی آدھ گھنٹہ واپس نہ آئے۔ وہ خاتون فرانسیسی صحافی سے فرانسیسی زبان میں ایک زوردار مناظرہ کر رہی تھیں، جرمن کیمرے میں فلم ڈال رہا تھا، معمر خواتین سکون کے ساتھ بُنائی کر رہی تھیں اور میں ــ میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ میرا جوش بالکل وقتی تھا، میں نے نہایت سخت غلطی کی تھی ــ مگر آدمی عورت کے بارے میں عام طور پر غلطی ہی کرتا ہے۔ مجھے عورتوں کے خلاف طرح طرح کے "اقوالِ زرین" یاد آرہے تھے۔

اس دوران میں ایک پولیس والا تین بار میرے پاس سے گزرا۔ چوتھی بار وہ میرے قریب آکر بیٹھ گیا اور فرانسیسی میں کچھ بولا۔

میں نے انتقاماً اس خاتون کو زور سے پکارا "محترمہ لے مادام۔ یہ صاحب کچھ تفتیش کرنا چاہتے ہیں، کیا آپ ترجمانی فرما سکیں گی؟"

آہا۔ میری درخواست پر ایک بجلی سی کوندگئی، وہ گولی کی رفتار سے دوڑ کر میرے قریب پہنچیں اور فرانسیسی میں پولیس والے سے لڑنا شروع کر دیا۔ پھر ان کی لڑائی رُک گئی۔

"یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا آپ الجزائری ہیں؟"

"یہ میرا پاسپورٹ کیوں نہیں دیکھتے" میں نے سوچا اس بورڈم میں تھوڑی دیر کو پراسرار ہی بن جاؤ۔ پولیس والا اور بھی چوکنا ہوگیا اور اس نے جلدی جلدی ان سے کچھ کہا جس کا جواب انھوں نے خود دے دیا مگر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے لڑنے مرنے پر کمر باندھ لی۔

"کیوں۔ کیا فرانس میں الجزائریوں کا آنا منع ہے"۔ میں نے تلخی سے کہا "آپ لوگ ان پر حکومت تو کیے جاتے ہیں اور یہاں ان کا داخلہ بھی منع ہے"۔ مجھے اپنے اندر ایک ہوگس ساکرسٹوفر کاڈویل پیدا ہوتا محسوس ہوا خصوصاً میں اس وقت میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں ایک عمدہ سیاسی تقریر کر گزروں۔ خوش قسمتی سے فرانسیسی پولیس والا بھی ذہن کا سیدھا سا سرکاری ملازم نہیں تھا جس کے لیے سیاست میں حصہ لینا منع ہو، وہ سخت سیاسی آدمی ثابت ہوا اور الجزائریوں کے خلاف بلکہ جنرل ڈیگال کے خلاف بھی۔ ہم دونوں

نے کوئی بیس منٹ تقریریں کیں، کچھ کا ترجمہ خاتون محترم نے کیا کچھ کا نہیں کیا۔ کچھ وہ اکیلا فرانسیسی میں بولا کچھ میں اردو میں بھی بولا بلکہ میرا خیال ہے کہ میں نے اردو میں تمام دائیں بازو والے فرانسیسیوں کو گالیاں دیں اور اتنا اچھی طرح یاد ہے کہ اس سپاہی کو چند گندی گالیاں بھی دیں جن کی مجھے عادت نہیں ہے۔

میرا پاسپورٹ چیک ہو کر آ گیا لیکن چونکہ میں ان تمام مسافروں میں اکیلا غیر یورپین تھا اور عرب قسم کا معلوم ہوتا تھا اس لیے حکم ہوا کہ "آپ کی حفاظت کی خاطر ایک سپاہی سفارت پاکستان تک ساتھ جائے گا" ان کا اصل مقصد میری پکی شناخت کرنا تھا۔

"ٹیکسی کا کرایہ کون دے گا" میں نے نہایت بدتمیزی سے پوچھا۔

"کیوں کیا آپ خود شہر نہیں جاتے"۔

"نہیں میں تو پہلے بس میں جاتا پھر پیدل اپنا سامان ہاتھ میں اٹھا کر مگر میں نے سنا ہے کہ آج بس چل ہی نہیں رہی اس لیے میں پیدل شہر جاتا" بات نامعقول تھی کیونکہ شہر بہت دور ہے مگر اصولی اور قانونی تھی اس لیے محتسب صاحب پھر واپس پولیس والے کمرے میں چلے گئے اور چند منٹ بعد تشریف لائے اس دوران میں وہ خاتون میری رفاقت کے لیے ٹھیری رہیں اور ان کی رفاقت کے لیے جرمن صحافی ٹھیر گیا اور جرمن صحافی کی خاطر فرانسیسی صحافی کو بھی ٹھیرنا پڑا کم از کم ان لوگوں نے بیان یہی دیا۔

"حکومت فرانس نے طے کیا ہے کہ آپ کی حفاظت کی خاطر آپ کی ٹیکسی کا کرایہ وہ خود ادا کرے گی۔" لڑاکے سپاہی نے گویا ایک منشور پڑھا۔

"میں حکومت فرانس کا شکریہ ادا کرتا ہوں مگر میں پہلے کپڑے بدلنا چاہتا ہوں اس لیے آپ کو انتظار کرنا ہو گا"۔

سب ہنسنے لگے اور پھر سب ساتھ دو ٹیکسیوں میں روانہ ہو گئے میرے ساتھ تھے جرمن صحافی اور خاتون اور لڑاکا سپاہی اور ایک باتونی ڈرائیور جو تھوڑی تھوڑی انگریزی جانتا تھا۔

چند لمحے بعد معلوم ہوا گویا پورا فرانس پیرس کی سڑکوں پر نکل آیا ہے۔

اس دن فرانس کی عظیم ہڑتال ہوئی تھی اور بقول کسے پیرس کی جدید تاریخ میں سب سے بڑا جلوس نکلا تھا۔ یہ جلوس ڈیگال کی حمایت میں، اور الجزائری آزادی کے دشمن جنرل سلان کی مخالفت میں نکلا تھا۔ سیاسی قیادت پر فوجی سیادت کے خلاف فرانس کا سب سے بڑا مظاہرہ۔

یہ وہ پیرس تھا جہاں لاکھوں طلبہ اور انٹلکچوئل اور مزدور طبقوں کے لیڈر جنرل ڈیگال کے خلاف کھلی باتیں کرتے ہیں ان کے "بے تحاشہ" اختیارات کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہیں جنرل ڈیگال پر حملے کے کئی

www.taemeernews.com

منصوبے بنائے گئے۔

اسی پیرس میں ان ہزاروں فرانسیسیوں کے خاندان رہتے ہیں جو الجزائر میں فرانسیسی محاذ پر مارے گئے، زخمی ہوئے بے کار ہو گئے اور مارے جا رہے ہیں۔

اسی پیرس میں دائیں بازو والوں کا ایک طاقتور گروہ رہتا ہے جو الجزائر سے کسی قیمت پر سمجھوتے کے لیے تیار نہیں اور جو باغی جنرل سلان اور اس کے ساتھیوں سے عملی ہمدردی رکھتا ہے۔

مگر یہی پیرس جنرل ڈیگال کی ایک آواز پر لبیک کہتا ہوا باغی جنرلوں کے خلاف اپنی تاریخ کا عظیم ترین مظاہرہ کر رہا ہے۔ باغی جنرلوں نے الجزائر سے دھمکی بھیجی تھی کہ الجزائر سے سمجھوتہ کیا گیا تو وہ پیرس پر قبضہ کر لیں گے۔

"ہم بغاوت کو کچل دیں گے۔"

"فرانس کا فیصلہ پیرس کرے گا الجزائر میں نہیں ہو گا۔"

"باغیو پیرس کو گندہ کرنے مت آؤ۔"

یہ ان کے نعرے تھے۔ تقریباً سب پیرس والوں کے نعرے۔ یہ وہ لوگ تھے جو الجزائر کو غلام بھی رکھنا چاہتے تھے مگر چونکہ "ان کا مرکز" ان کا سربراہ جنرل ڈیگال ضابطے کے ساتھ الجزائر کا مسئلہ طے کر رہا تھا (خواہ ان کی رائے میں غلط کر رہا تھا) اس لیے وہ جنرل ڈیگال کے ساتھ نہ ہوتے ہوئے بھی باغی جنرلوں کے خلاف تھے۔

"مرکز، مرکز ہے ہم مرکز کی حفاظت کریں گے۔"

"ڈیگال ہو یا ڈیگال نہ ہو فرانس زندہ باد"

"فرانس زندہ باد"

"باغی مردہ باد"

جنرل سلان کا دارخطا ہو گیا۔ باغی جنرلوں نے دور الجزائر میں بیٹھ کر بغاوت کا منصوبہ بنایا تھا۔ ان کا نعرہ تھا الجزائر پر فرانس کی بالادستی۔ اور یہ نعرہ سبھی کو محبوب تھا مگر کانٹے کی بات یہ تھی کہ یہ نعرہ فرانس میں لگے تو قانونی اور فرانس سے باہر لگے تو غیر قانونی تھا۔

ماہرین کہتے ہیں کہ اس وقت پیرس فوجوں سے بالکل خالی ہو چکا تھا۔ پورے فرانس میں تھوڑی سی فوج تھی کچھ نیٹو میں مصروف تھی باقی الجزائر میں پڑی تھی اور اگر باغی اپنی ہوائی فوجیں پیرس میں اتار دیتے تو جنرل ڈیگال کے پاس ان سے نمٹنے کے لیے ذرا بھی فوجی طاقت موجود نہ تھی۔

مگر جنرل ڈیگال کے پاس فرانس تھا۔ پیرس تھا۔ پیرس فرانس کا مرکز جو اپنی مرکزیت کی توہین برداشت

نہیں کر سکتا تھا۔

ہزاروں فوٹوگرافر اور ٹیلی ویژن والے ان جلوسوں کی تصویریں لے رہے تھے جو پیرس کے چپے چپے پر جمع ہو گئے تھے جنرل ڈیگال برابر الجزائری فوجوں کے نام پیغام نشر کر رہے تھے جس میں انھیں حکم دیا تھا کہ اپنے جنرلوں کو خود گرفتار کرلیں۔

دوسرے دن تک پیرس جیت گیا اور بغاوت ناکام ہو گئی بلکہ پیرس اسی شام تک جیت گیا تھا کیونکہ میں بطور خاص پیرس کا محلہ زمش گراں یعنی پگال دیکھنے گیا تو وہاں ناچ گانے اور ناچ گانے والیوں میں کوئی تبدیلی کوئی بے رنگی نہ پائی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے دن میں اس ملک پر کوئی اہم واقعہ گزرا ہی نہیں۔ چھم چھا چھم چھم تاک دھنا دھن دھن۔ تاک دھنا دھن دھن۔

مجھے پیرس سے ڈر سے لگنے لگا۔ یہ شہر کیسے کیسے انقلاب لا سکتا ہے اور کیسے کیسے انقلاب روک سکتا ہے۔

"پیرس کو سمجھنا ہے تو پیرس کے بن کر رہو۔" رات کو رخصت ہوتے وقت جرمن صحافی بولا۔ بات یہ ہے کہ وہ خاتون تو صبح تھوڑی دیر بعد ہی غائب ہو گئی تھیں اور میں نے جرمن کے سہارے پیرس کی ہڑتال اور جلوس دیکھا تھا۔ ویسے وہ خاتون بائیں بازو کی "ایک" ورکر "تھیں" بالکل انقلابی۔ کہاں وہ کہاں یہ حقیر فقیر۔

جرمن نے بات پتے کی کہی مگر یہی اصول ہر شہر ہر ملک پر عائد ہوتا ہے مثلاً:

پاکستان کو سمجھنا ہے تو پاکستانی بن کر رہو

اب اس سے قبل کہ یار لوگ اس مشورے کو غلط سلط سیاسی معنی پہنانے لگیں۔ میں پیرس سے چل دیتا ہوں۔ اپنے ملک والوں کو کوئی اچھی مثال نہیں دینی چاہیے۔ وہ اسے طعنہ سمجھتے ہیں اور برا ماننے لگتے ہیں۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ میں پیرس والوں کے "ایمان اتحاد تنظیم" کا ذکر ہی نہ کروں اور جنیوا روانہ ہو جاؤں۔ یوں بھی مناسب ہے کہ اس موسم میں دل ہر گوشۂ بساط:

دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

www.taemeernews.com

سوئٹزرلینڈ

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

چوں چوں کا مربّہ

اب میں سوئٹزرلینڈ پہنچتا ہوں یعنی اس ملک میں پہنچتا ہوں جو اپنے سرکاری اور ٹورسٹ بیورو والے اشتہارات کے مطابق دنیا کا سب سے عجیب ملک ہے۔

واہ بھئی! میں اسے دنیا کا سب سے عجیب ملک کیسے مان لوں؟ کیا خود میرا ملک دنیا کا سب سے عجیب ملک نہیں ہے؟ اور پاکستان میں تو یہ بات ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ بہت دنوں تک تو باہر والی دنیا پر بھی یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

کیا آپ میرا مطلب سمجھے؟ خدا کرے نہ سمجھے ہوں۔ میری نیت بھی نہیں کہ آپ یہ چھوٹی سی اور واضح بات تک نہ سمجھیں کیوں کہ آپ تو سمجھ لیں گے اور ہنس دیں گے مگر ممکن ہے کہ "وہ" بھی سمجھ لیں اور سمجھتے ہی میرا بیڑا کر دیں۔

چلو یار سوئٹزرلینڈ دکھاؤ۔ ایسی باتیں کرنے سے کیا فائدہ۔ آدمی کو کچھ کہنا ہو تو کھل کر کہے، ورنہ چپ سادھ لے۔ چپ میں بھی بڑی برکت ہے۔ کسی کو پتا ہی نہیں چلنے پاتا کہ آپ کے حالات کیا ہیں؟ اور اگر چھوٹ بھیجے آس پاس ہوں تو آپ کی خاموشی بقراطیت بہ طرح طرح کی عظمتوں کے غلاف چڑھے رہتے ہیں۔ اچھا بھیا۔

چل مرے خامے بسم اللہ

گر خنداری زبان میں یہ ملک ایک چوں چوں کا مربہ ہے۔ یہاں تین زبانیں بولی، لکھی اور پڑھی جاتی ہیں۔ مگر ملک میں زبان کے معاملے پر تلوار نہیں چلتی ——

—— کیسے سست اور بے وقوف لوگ ہیں۔ مگر ہیں۔ انھیں آپ کیا کہہ سکتے ہیں۔

یہاں تین نسلوں کے لوگ رہتے ہیں۔ نسلیں نہ کہیے "قومیتیں" کہیے۔ یعنی جرمن، فرانسیسی اور اطالوی۔ یہ لوگ اپنی اپنی زبانیں بولتے ہیں۔ اپنی زبانوں کے اخبار اور رسالے چھاپتے ہیں۔ مگر جب ان سے ان کی شہریت پوچھی جائے تو کسی کمپلکس کے بغیر اپنے آپ کو سوئس بتاتے ہیں۔ "سوئس" یعنی سوئٹزرلینڈ کا باشندہ۔ معاف کیجیے گا لفظ

www.taemeernews.com

کمپلکس کے جو ترجمے اب تک اردو میں ہوئے ہیں ان میں سے کوئی بھی میرے لیے قابلِ قبول نہیں ہے، ورنہ میں ضرور دوبارہ لغت دیکھتا۔ جس بھائی بہن کو برا ماننا ہو مان جائیں۔

جنیوا میں بڑی سردی ہے۔ یہ مہینہ مئی کا ہے جب ہمارے ہاں:

آتے ہیں پسینوں پہ پسینے

پورا مصرع ہے "اور آتے تھے پسینوں پہ پسینے"۔ مگر چونکہ فدوی اور گستاخیوں کے ساتھ ساتھ اساتذہ کرام کے کلام میں کتر بیونت بھی کرتا ہے اس لیے اس دفعہ استاد ذوق کے بھائی مارگیا یوں بھی فدوی کھلے طور پر غالب کا طرفدار ہے۔

یا اللہ یہ مئی ہے یا دسمبر، ہوا تیز آتی ہے اور منہ پر، زور کے سرد طمانچے پڑتے ہیں کہ سوئٹزرلینڈ کی "بیوٹی" (یعنی یوٹی ہر قسم کی) کی طرف نظر نہیں جاتی۔ پیرس سے چلتے وقت میں نے اوورکوٹ بکس میں بند کر دیا تھا۔ اور جب تک کسٹم سے بکس نہ مل جائے اور کوئی مقام تنہائی برائے خود نمائی دستیاب نہ ہو مجھ پر کیا گزرے گی۔ مگر مجھ پر کچھ بھی نہ گزری۔ کسٹم کاؤنٹر پر ایک بیزار سے اور خفا خفا سے افسر صاحب کھڑے تھے۔ کہنے لگے "آپ کا سامان کون سا ہے" میں نے اشارے سے بتایا۔ کہنے لگے "پاسپورٹ؟" میں نے جیب سے نکالا۔ کہنے لگے کچھ ظاہر کرنے کو ہے؟ میں نے کہا پونڈ، فرانسیسی فرانک، ٹریولرز چیک ہیں لیجیے میں آپ کو فہرست بنا دیتا ہوں۔ کہنے لگے ہم پیسے نہیں پوچھتے۔ آپ جتنا چاہیں لائیے جتنا چاہیں لے جائیے۔ کوئی سی کرنسی لائیے کوئی سی کرنسی لے جائیے، ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے پاس افیون، چرس، گانجا، بھنگ، جعلی نوٹ، گھڑیاں یہ سب مال کتنا ہے؟ میں نے کہا ایک گھڑی ہے۔ کہنے لگے معاف۔ میں نے کہا باقی بکس کھول لیجیے۔ فرمایا اتنا وقت نہیں۔ آپ تشریف لے جائیے۔

مزدوریوں تو یورپ بھر میں آسانی کے ساتھ نہیں ملتا، سوئٹزرلینڈ میں تو ملتا ہی نہیں، چنانچہ پھر دو عدد بکس اور ایک عدد بیگ اور ایک عدد اپنی بوڑھی جان کا بوجھ اٹھانا پڑا۔ ہائے میر تقی میر:

تیر جی اس طرح سے آتے ہیں
جیسے کنجر کہیں کو جاتے ہیں

جان کی امان پاؤں تو مزید یہ عرض کر دوں کہ اس وقت اپنا بھی ایک مصرع یاد آیا جو کبھی سخت گہری قسم کا فلسفیانہ مضمون لگتا تھا مگر آج معلوم ہوا کہ وہ بالکل غزل وزل یا فلسفے کا مضمون نہیں تھا۔ عرض کیا ہے:

عالی جی اب آپ چلو تم اپنے بوجھ اٹھائے

گھپلے میں دوسرا مصرع بھی سن لیجیے:

ساتھ بھی دے تو آخر پیارے کوئی کہاں تک جائے

www.taemeernews.com

مگر یہ مصرع یاد آنے کا فائدہ یہ ہوا کہ بندہ تمام بوجھ اٹھائے پورے دو میل تک چلتا رہا۔ راستے میں رک رک کر آتی جاتی ٹیکسیوں پر حسرت سے نظر کرتا تھا، اور بہ زبان انگریزی امداد کے نعرے لگاتا تھا مگر وہ زبان انگریزی جو پاکستان میں امتیاز فوقیت سمجھی جاتی ہے جنیوا جیسے بین الاقوامی شہر میں بالکل کام نہ آئی۔ میں بذریعہ بیان ہذا ان تمام خواتین و حضرات کی تردید کرتا ہوں جن کا بیان یا خیال ہے کہ جنیوا میں انگریزی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ اس سرد موسم میں قدما کے اشعار آب دار میری جان لے کر رہیں گے۔ اب دیکھیے اس شعر کا کوئی موقع نہیں مگر وہ برابر زور مار رہا ہے:

یوں پھریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے

اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

بچّے اس کا مطلب اور موقع محل پوچھنا چاہیں تو میں بتا سکتا ہوں کہ میں انگریزی دان اہل کمال ہوں یعنی انگریزی خوب بولتا لکھتا، پڑھتا گاتا ناچتا ہوں۔ مگر یہاں آکر کھلا کہ اس کمال کی کوئی قدر ہی نہیں، ان سے چاہے انگریزی میں بات کرو یا اردو میں وہ جواب فرانسیسی زبان ہی میں دیں گے۔ لہٰذا بڑی خرابی کے بعد ایک ہوٹل میں جگہ ملی۔ جس کی واحد خصوصیت یہ تھی کہ وہاں کمرۂ استقبالیہ والی "مس صاحبہ" ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتی تھیں۔ کہنے لگیں "یہاں آج ذرا سردی ہے۔ مگر آپ اوور کوٹ پہن لیں اور جھیل جنیوا پر چلے جائیں تو سوئٹزرلینڈ ایسا خراب محسوس نہ ہوگا۔"

جھیل جنیوا یقیناً قدرت کا ایک کارنامہ ہے۔ کشمیر کی جھیل ڈل جیسی خوبصورت تو نہیں مگر آراستہ پیراستہ بہت ہے۔ چاروں طرف ریستوران، ہوٹل، رہائشی بنگلے (بنگلوں کو شاطو کہتے ہیں) بنے ہوئے ہیں۔ اس جھیل پر دو تین پل بنا دیے گئے ہیں۔ ضرور یہاں استاد ذوق کے معنوی شاگرد پائے جاتے ہیں یعنی:

پل بنا۔ چاہ بنا۔ مسجد و تالاب بنا

جھیل جنیوا ایک چھوٹا سا سمندر ہے جو تین ملکوں کی حدود بناتے ہوئے ان میں تقسیم ہو جاتی ہے یعنی سوئٹزرلینڈ، جرمنی اور فرانس۔ پچھلی بڑی جنگوں میں یہ مفروروں اور جاسوسوں کے لیے آب حیات کا کام کرتی تھی۔ اور اب ہم ٹورسٹ سیاحوں کو بھاتی ہے۔

میں نے اب تک یورپ کا خاصا حصہ دیکھ لیا ہے۔ مگر جنیوا ہر شہر سے زیادہ صاف ستھرا شفاف اور روشن نظر آتا ہے۔ سڑکیں شیشے کی طرح چمکتی ہیں۔ پٹریوں پر سگرٹ کی ڈبیوں، ماچسوں اور جلی ہوئی سگریٹوں کا پتا ہی نہیں چلتا، تھوک تو کوئی پھینکتے ہی نہیں۔ دکانوں کی آرائش پرانی وضع کی ہے مگر نہایت مہنگی، کھانا لندن سے کم از کم چار گنا زیادہ۔

www.taemeernews.com

شہر پہاڑی پر ہے مگر بسوں اور موٹروں کے علاوہ ٹرام بھی چلتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ صرف آس پاس ہیں اور یہ جگہ پہاڑی نہیں حالانکہ سب پہاڑی مقام ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے ایک جفاکش اور محنت پیشہ قوم نے رگڑ رگڑ کر میدان بنا دیا۔ مگر آپ پھر برا مان جائیں گے آپ کو اس سے قطعی دلچسپی نہیں کہ سوئٹزر لینڈ والوں نے ان اونچی نیچی پہاڑیوں میں اپنی محنت سے ایک میدانی مقام تیار کر لیا ہے۔ آپ کے حسابوں تو یوں چاہیے تھا کہ پگڈنڈیوں چٹانوں پر چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنائے بیٹھے رہتے۔

مگر ہوا یہ کہ آج یہ صرف سولہ ہزار مربع میل پر مشتمل سرزمین دنیا کی سب سے اچھی گھڑیاں بناتی ہے، سب سے اچھی ریلیں اور دوسری فولادی چیزیں بناتی ہے اور کپڑے بناتی ہے اور اپنی سڑکیں صاف رکھتی ہے۔ آپ یہ بھی جان کر خوش ہوں گے کہ پورے سوئٹزرلینڈ میں ایک رتی بھر فولاد پیدا نہیں ہوتا، نہ ایسی ونڈر فل کپاس پیدا ہوتی ہے اور نہ کوئی اور کام کا خام مال پیدا ہوتا ہے مگر یار لوگ ہیں کہ نازک ترین مشینیں بنانے میں امریکنوں تک سے ہزاروں میل آگے نکل گئے ہیں۔ یہ سب کچھ کیوں ہے، اس کا جواب میں دینا ہی نہیں چاہتا لیکن اس کا جواب نہایت سیدھا ہے جس پر نہ کسی کو اعتبار آئے گا اور نہ کوئی اس کو پسند کرے گا۔ اور وہ جواب ہے "محنت یعنی ہارڈ ورک یعنی محنت محنت محنت۔ آئی ایم سوری۔ آئیے ذرا اس ملک کی سیاحی ہو جائے۔

www.taemeernews.com

نون یا غنّہ —— غمزدہ گائیڈ

اب سوئٹزرلینڈ کی سیر آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔ اگر آپ پہاڑوں کے شوقین ہوں تو میں آپ کو ایلپس ALPS کی چوٹیوں پہ لے چلوں، کوہ ایلپس یوں تو یورپ کے کئی ملکوں یعنی جرمنی، فرانس، اٹلی اور سوئٹزرلینڈ کا مایہ افتخار ہے لیکن سوئٹزرلینڈ میں اس کی حیثیت ایک تاج کی سی ہے، چمکتا دمکتا شاندار تاج جس کے کنارے اور نوکیں اپنی اپنی جگہ ایک حیثیت رکھتی ہوں۔ ایک کہاوت کے بقول کوہستان ایلپس سارے یورپ کا ہے مگر سوئٹزرلینڈ صرف ایلپس کا ہے۔ آپ نے ماؤنٹ بلانک کا نام ضرور سنا ہوگا۔ ماؤنٹ بلانک نام کی روشنائی بھی ہمارے ملک میں چلتی ہے۔ اس کا اصلی تلفظ ہے مون بلان اور مون کے نون پر غنّہ ہے یعنی نام ہوا موں بلاں۔ ذرا ملاحظہ کیجیے ماؤنٹ بلانک کی آواز کتنی کرخت بلکہ کریہہ ہے اور موں بلاں میں کیسا شہد ملا ہوا ہے وجہ وہی (یہ بات بہت بار دہرائی گئی ہے یعنی انگریز بہادر کے لب ولہجے کی مجبوری جس نے دہلی کو ڈلہی بنا دیا تھا — مگر یہ پھر وہی پرانا قصہ شروع ہو جائے گا اور امرا، رؤسا، افسران اور انگریزی کے پروفیسران ناک بھوں چڑھانے لگیں گے۔)

تو موں بلاں یہاں سے صاف نظر آتا ہے۔ موں بلاں یورپ بھر میں سب سے اونچا پہاڑ ہے یا پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔ اس پر یورپ والے سخت ناز کرتے ہیں بڑی بڑی مہمات بھیجتے ہیں، ہوائی جہاز آس پاس گزرے تو پائلٹ بھائی بار بار چیخ چیخ کر ناظرین کو موں بلاں دیکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ پتا نہیں قانونی طور پر موں بلاں کی چوٹی اس ملک میں شمار ہوتی ہے یا کسی اور ہمسائے کے علاقے میں آتی ہے مگر ہمیں آپ کو اتنی باریکیوں سے کیا تعلق ہمارے لیے تو یہ کافی ہے کہ جنیوا کی کسی بھی معقول بلندی سے دیکھا جائے اور موسم صاف ہو تو موں بلاں سفید برف جیسی چٹان کی طرح نظر آجاتی ہے اور اگر آپ کا جی چاہے تو ٹورسٹ بیورو والے آپ کو ایک دن کے اندر اندر اس کی نشیبی گھاٹیوں میں پہنچا دیتے ہیں۔

www.taemeernews.com

ویسے موں بلاں کچھ بے نہیں۔ شاید سولہ ہزار فیٹ ہوگی جغرافیہ والے اس کی اونچائی زبانی یاد رکھتے ہیں۔ یہاں اپنی ذات کی خلیجوں اور دلدلوں سے نکلنے کا یارا نہیں کسی بلندی کو کیا یاد رکھیں گے۔

ان تو اسی طرح دوسری پہاڑیاں (یا ادب سے بولا جائے تو پہاڑ) ہیں جن پر یورپ والوں اور خصوصاً خاص سوئٹزرلینڈ والوں کو ناز ہے۔ اور آپ کو بھی ناز کرنا چاہیے۔ مثلاً سوئستانی لوگ ایک چوٹی کا بار بار ذکر کرتے ہیں جس کا نام ہے مونتی روزا کی دوفور چوٹی۔ مونتی روزا کا انگریزی تلفظ ہوتا ہے۔ دی ماؤنٹ آف روزیا اور اگر فارسی بولنے والے مغل سوئٹزرلینڈ کو فتح کر لیتے تو اس کا نام رکھتے۔ کوہ گلاب اور اگر یہ چوٹی کہیں دلّی میں ہوتی تو ہم اسے گلابی پہاڑی کہا کرتے۔ مگر ان میں سے کوئی واقعہ بھی پیش نہیں آیا۔ مغل بچے زیادہ سے زیادہ ترکی تک پہنچ سکے۔ اور مونتی روزا کی چوٹیاں اپنا دامن بچائے ہوئے اپنی ہی "پبلک" کے لیے محفوظ رہ گئیں۔

مونتی روزا کی اونچائی شاید سوا پندرہ ہزار فیٹ ہے۔ گلگت اور اسکردو کے آس پاس پچاسیوں مقامات اس سے زیادہ اونچے ہوں گے۔ ہنزہ تک جاتے جاتے سترہ اٹھارہ ہزار فیٹ بلند چوٹیاں برابر آنکھ مارتی نظر آتی ہیں۔ مگر؛

ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

یار لوگوں کو سیاحت کا شوق چرّاتا ہے تو ادھر جانے کے بجائے مونتی روزا والے سوئٹزرلینڈ کی طرف رخ کرتے ہیں۔ کیونکہ اصل مقصد پہاڑ یا پہاڑ کی چوٹی دیکھنا نہیں بلکہ مشاہدۂ نازنینانِ یورپ ہوتا ہے۔

تو یہ ملاحظہ فرمائیے ایک نازنین میرے کشکولِ سیاحت میں بھی آپڑی۔ مگر یہ نازکم ہیں نین زیادہ ہیں۔ ان صاحبہ کو میں نے ٹورسٹ بیورو سے بڑی منت سماجت کے بعد "حاصل" کیا ہے۔ فرانسیسی نژاد سوئستانی ہیں انگریزی خوب پڑھی ہے۔ مگر تلفظ میں فرانسیسی کا لہجہ ہے۔ عمر ٹھیک ٹھاک ہے مگر بتانی نہیں چاہیے۔ خواتین اپنی عمر بتاتی ہیں نہ بتلانے دیتی ہیں۔ اب یہ محترمہ نوجوان قطعی نہیں۔ بھدی بھی نہیں مگر ہر بات بڑے بھولپن سے کرتی ہیں۔ چھ سوئس فرانک یعنی کوئی دس روپے فی گھنٹہ "فیس" ہے۔ اگر بیچ میں چائے، کھانے کا وقت ہو جائے تو۔

کبھی ہم ان کو کبھی اپنی جیب دیکھتے ہیں

ان کا نام مادموزیل (یعنی مس) [illegible] ہے۔ ...... جو انگریزی میں "اردا س" کہلاتا ہے اور بہت بڑا ہی لگتا ہے۔ ابھی انھوں نے اپنا پہلا یعنی اصلی نام نہیں بتایا۔ یہ ماں ارکین قوم ہی ہے کہ جب تک اپنا پہلا نام بتایا اور دوسرے کو مسٹر یا مس یا مسز کہے بغیر اس کا بھی پہلا نام نہ لینے لگے۔ یورپین عام طور پر اور خاص طور پر فرانسیسی نژاد لوگ شروع شروع میں محتاط بنے رہتے ہیں۔ آخر کی نوبت ہی نہیں آتی [illegible] ہم اپنے جیبوں کی بات کر رہے

www.taemeernews.com

مس اروآ بنیادی طور پر غم زدہ خاتون ہیں۔ مادموزیل کا چھدا ساتھ لگا ہوا ہے اس لیے مجھے پوچھنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی کہ طلاق یافتہ ہیں یا اصلی تے وڈی بن بیاہی کیونکہ یورپ میں اگر طلاق ہو جائے تو خواتین اپنے پرانے خاندانی نام سے پکاری جاتی ہیں جس کے پہلے مس لگا دیا جاتا ہے۔

مادموزیل اروآ نے مجھے جنیوا کی سیر خوب کرائی۔ وہ ان تمام مقامات کو ہزار بار دیکھ چکی ہوں گی۔ مگر میرے ساتھ انھوں نے کسی قسم کی بوریت کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ ہر عمارت، ہر عجائب گھر، ہر کارخانے میں مجھ سے زیادہ دلچسپی دکھائی۔ اور جو ... ہر جگہ کہتی ہیں "یہ دیکھیے یہ ہے پیلے دی نے سوں" (PALAIS DEE NATIONS) یعنی مقام اقوام، لاحول ولا قوۃ۔ یہ کیا ترجمہ ہوا۔ پھر قوموں کا محل نہیں جی محل اقوام۔ یہ بھی نہیں۔ بھئی یہ تمام اقوام عالم کے نام سے منسوب ہے، اقوام متحدہ کا علاقائی مرکز ہے، کوئی سویٹ سا نام سوچو۔ تو وہ آپ سوچیے میری سمجھ میں تو ایک اپنی ہی قوم مشکل سے آتی ہے بھلا اقوام عالم کا مزاج میں کیا خاک جانوں گا، ہاں اس میں گھوم پھر کر دادا جان مرحوم و مغفور کا ایک شعر ضرور یاد آتا ہے:

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

کیونکہ یہاں پری چہرہ لوگ بہت ہیں۔ ملک ملک کی لڑکیاں دفتر سنبھالے بیٹھی ہیں۔ وہ اتنی ساری اور اتنی پیاری ہیں کہ ایک نظر میں دیکھی نہیں جاتیں اور:

طاقت ربا وہ ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے

سچ یہ ہے کہ آج پہلی بار غالب کی اس ردیف کا مزہ آیا مگر بڑے میاں کا کمال ملاحظہ فرمائیے کہ صرف کلکتے تک پہنچے تھے اور زیادہ سے زیادہ سو پچاس لیڈیاں دیکھی ہوں گی پھر بھی ایسی گمبھیر باتیں کہہ گئے کہ آج جنیوا کے پیلے دی نے سیوں میں،

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

"... ہاں مولانا حالی شاعری اسی کو کہتے ہیں" وطن سے کسی بقراط کی آواز آتی ہے" یہ نہیں کہ آپ موضوعاتی ... اور وقتی ہنگامہ پسندی کے سہارے اپنی عظمتوں کے جھنڈے لہرانے لگیں۔"

... جواب نہیں دیتا۔ کسی بھی اور تلخ بات کا جواب دینا یوں بھی مشکل ہوتا ہے۔ جبھی بزرگوں نے ... کہ ایسے موقع پر یا تو دوسری باتیں چھیڑ دو یا منہ کھول کر ہنسنے لگو کم از کم فوری طور پر بات آئی گئی ... صاحب میں ... ہوتی رہتی ہے تو بھائی صاحب ضمیر صاحب کا تو کام ہی یہ ہے

موقع دیکھتے ہیں نہ محل دیکھتے ہیں۔ نہ فائدہ نہ زیاں ذرا سی کوئی بات ہوئی اور پوچھنا شروع کر دیا۔ سوال کی اسی چبھن کے علاج کے طور پر خطابات، پرمٹ، لائسنس، عہدوں اور انعامات کے ٹیکے جاری کیے گئے ہیں۔

اور مادموزیل ارو! کہیں آپ تو میری بلند خیالی نہیں سن رہیں۔ کہیں میرے ماتھے کی شکنوں آنکھوں کی افسردگی اور اضطراب سے آپ مجھے پہچاننا شروع نہ کر دیں۔ نہیں مادموزیل میں کوئی ایسا ضمیر پرست آدمی نہیں ہوں۔ ہوتا تو آپ سے شرف ملاقات حاصل ہونے کا موقع کیسے ملتا۔ بس آپ یوں سمجھیے کہ میں ایک بوگس سا سیاح آدمی ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں اپنے اندر کی مسافتیں طے نہیں کر سکتا اور گھبرا کر باہر گھومنے نکل آیا ہوں۔

لیکن! مادموزیل خود ایک غم زدہ خاتون ہیں۔

"اب آپ یہ دیکھیے کہ ہم سوئٹزرلینڈ یورپ بھر میں سب سے زیادہ خوش حال قوم ہیں۔ ہم سو برس سے غیر جانبدار ہیں۔ کسی سے لڑتے جھگڑتے نہیں۔ سب کو یہاں پناہ دیتے ہیں۔ بالکل بین الاقوامی بنے ہوئے ہیں۔" ان کا دکھ ابلنے لگتا ہے "لیکن ہمارا بھی ایک مسئلہ ہے اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا کوئی مسئلہ نہیں کوئی نصب العین نہیں، کوئی ہمارا دشمن نہیں، دوست نہیں، حلیف نہیں، ہم ایک مجلسی گیشا کی طرح ہیں جس کا کام سب کو خوش کرنا ہے اور جسے خوش کرنے کی ذمہ داری کسی پر نہیں۔"

"معاف کیجیے مادموزیل گیشا کی مثال کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔" میں نہ جانے کیوں لقمہ دیتا ہوں شاید مادام کو ہماری مجلسی طوائفوں اور رکابی سیاستدانوں کے متعلق علم نہیں مگر سوری، میری مثال بھی غلط معلوم ہوتی ہے۔

"اچھا تو کوئی اور مثال سہی" وہ لاپروائی سے کہتی ہیں "مطلب یہ ہے کہ ہم بے نصب العین جیے جاتے ہیں اور اسی لیے ہمارے ہاں خودکشی کی وارداتیں عام ہیں۔"

یا اللہ یہ تو ایک بالکل نیا سوئٹزرلینڈ ابھر رہا ہے۔ میں تو ان کے بڑے رعب میں تھا۔ یہ لوگ جو ذرہ فولاد پیدا کیے بغیر بے مثال فولادی چیزیں بناتے ہیں۔ یہ ملک جو اتنا دشوار گزار اور اتنا مختصر ہوتے ہوئے بھی صنعت و تعلیم اور کاروبار میں انتہائی بلندی تک پہنچ چکا ہے جہاں قدرت نے حسین حسین مناظر نہایت فراخ دلی سے جمع کر دیے ہیں۔ جہاں جھیل جنیوا ہے۔ شہر لوزان ہے۔ جہاں کے شہری جنگ کے خطرے سے بالکل آزاد رہتے ہیں۔ کیا یہ ملک بھی غمگین ہو سکتا ہے۔

"جی ہاں یہ ایک غمگین ملک ہے اس لیے کہ اس کے پاس سب کچھ ہے" وہ کہے جاتی ہیں "ہمارا

www.taemeernews.com

زرمبادلہ اتنا مضبوط ہے کہ ہمارے ہاں خود ہماری یا دنیا کی کسی کرنسی کو لانے یا لے جانے پر کوئی پابندی نہیں۔ ہمارے بینکوں میں دنیا بھر کے امرا اپنا سرمایہ محفوظ کرتے ہیں۔ ہم دنیا بھر کو گھڑیاں، مشینیں اور کپڑا بھیجتے ہیں۔ ہمارے ہاں بمشکل ہی کوئی بے روزگار نظر آئے گا۔ بیواؤں کی پنشن، اپاہجوں، زخمیوں اور ضعیفوں کے وظائف مقرر ہیں۔ کسی کو کل کی فکر نہیں۔ ہمارے ہاں مذہبی رواداری ہے اور ہمیں تحریر و تقریر کی پوری آزادی ہے مگر۔"

"مگر ـــــ" میں سوال بن جاتا ہوں۔

"مگر ہماری کوئی ذہنی یا روحانی منزل نہیں، جس تک پہنچنے کے لیے ہمیں جدوجہد کرنی پڑے۔ موسیو کیا آپ میرا مطلب سمجھ گئے؟"

"سمجھ گیا" میں کھٹ سے جواب دیتا ہوں مگر اصلیت یہ ہے کہ میں کچھ بھی نہیں سمجھا۔ افلاس، غلامی اور جہالت سے مارا ہوا میرا ایشیائی ذہن ایسی فضولیات کیسے جذب کر سکتا ہے، خدا کرے آپ بھی کچھ نہ سمجھے ہوں یہاں شاعری کی ٹانگ توڑتے ہوئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ:

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

یا الہیٰ یہ ماجرا کیا ہے، یہ خاتون مجھے ایک روشن اور خوب صورت ملک دکھانے چلی ہے یا اپنے روحانی خلاؤں کی سیر کرانا چاہتی ہے، میں کوئی SPACEMAN یعنی خلا باز تو ہوں نہیں۔ نہ مجھ میں خلا بازی کا بوتا ہے میں تو اصولاً ایک قلا باز اور گاہے گاہے ایک ہوا باز ہوں۔ میں من کی بھول بھلیوں سے کبھی کا باہر نکل آیا اب میں واپس نہیں جانا چاہتا۔ اے محترم پیاری خاتون بکواس بند کرو اور مجھے سوئٹزرلینڈ یعنی سوئس لوگوں کی زمین، ٹھوس سطح زمین پر لے کر چلو۔

"ہماری آبادی ساڑھے پچاس لاکھ ہے ہمارا سب سے بڑا شہر زیورک ہے جو جرمن زبان بولنے والے علاقے میں ہے اور جہاں دنیا بھر کے مریض علاج اور آرام کے لیے آتے ہیں۔" وہ فر فر بول رہی ہیں میرے اعصاب کو دوبارہ سکون مل رہا ہے۔ اعداد و شمار روح کی بھول بھلیوں سے تو بہتر ہیں۔

"زیورک کی آبادی ساڑھے چار لاکھ ہے۔ بیل کی آبادی ڈھائی لاکھ۔ جنیوا کی آبادی پونے دو لاکھ اور ـــــ ہمارے مقام برن کی آبادی ایک لاکھ ۶۴ ہزار ہے۔"

"ـــــ آپ کا بے حد ممنون ہوں۔"

ہم آخر کار اپنے مقام پر آ گئے۔ شہر برن ہے خاموش اور خوب صورت اور تقریباً مردہ، [illegible] جیسے ایک نوجوان حسین عورت کی لاش حنوط کر کے شیشے کے بکس میں

www.taemeernews.com

رکھ دی جائے اور دیکھنے والے اسے صرف دیکھ سکیں چھو نہ سکیں۔"

ہا ہیں۔ یہ عورت تو بد معاش معلوم ہوتی ہے۔ میں ضلع جگت کا عادی ایشیائی چھوٹے کی بات پر بھڑک اٹھتا ہوں، ضرور اس میں کوئی دعوت پوشیدہ ہے۔

"ابھی آپ نے کیا فرمایا" میں معصوم بن جاتا ہوں میں نے ... یا اس طرح ... اس کا مطلب کم از کم یہ نہیں کہ آپ مجھے چھ فرانک فی گھنٹہ دیں کہ میرے بدن کو چھو لینے کے حقدار ہو جائیں؟"

قاعدے سے مجھے پانی پانی ہو جانا چاہیے اگر یورپ نے میری کھال اور بھی موٹی کر دی ہے ... ڈالا۔

"جی نہیں میری گزارش ہے کہ میں آپ کی رائے سے اختلاف رکھتا ہوں۔ میرے خیال میں ایک مرد خوب صورت عورت بھی دیکھنے کی شے ہے۔ میں ... دیکھتے دیکھتے ایک عمر گزار سکتا ہوں۔"

میں سمجھا تھا کہ بات ٹل گئی مگر اب مادموزیل ارد آبالکل بُرا مان گئیں۔ ایک دم بُرا مان گئیں۔ ایک ... سے انھوں نے اپنا پرس اٹھایا اور زمین پر پاؤں پٹخ کر ناک کی سیدھ میں روانہ ہو گئیں۔

"اگر عورت کے بارے میں آپ کا یہی تصوّر ہے تو تو رسٹ بیورو سے کہیے کہ آپ کو قاہرہ کے عجائب خانے تک پہنچا دے وہاں آپ کو بہت سی حنوط شدہ لاشیں مل جائیں گی۔" چلتے چلتے انھوں نے فرمایا اور میں حیران پریشان اکیلا رہ گیا۔ میں ان کی فیس بھی ادا نہ کر سکا۔ ان سے معذرت بھی نہ کر سکا۔ سامنے سے موں بلاں کی چوٹی نے آنکھ ماری۔ "مائی ڈیر پہاڑیوں کی چوٹیاں ... ہم ... جمے تو رہتے ہیں۔ آؤ اس طرف چل پڑو میری برف پوش چٹانیں تمھیں جیسے بیوقوفوں کی منتظر رہتی ہیں۔"

www.taemeernews.com

ایک شہر اور تین بندر

مادموزیل اروآ کی خفگی نے میرے دل پر اتنا برا اثر کیا کہ میں فوراً جنیوا سے لوزان روانہ ہوگیا۔ ویسے یہ بھی میری بے غیرتی کی نشانی ہے کیوں کہ لوگ تو عورتوں سے مشتعل ہو کر جانیں دے بیٹھتے ہیں مگر شاید مجھے جان بہت پیاری ہے یا مجھے مادموزیل اروآ پیاری نہیں تھیں۔ خدا معلوم اصلیت کیا تھی۔ سچ صرف اتنا ہے کہ میں اس واقعے سے ایک دم گھبرا گیا اور ترکِ جاں کی بجائے ترکِ مکاں کر گیا۔

لوزان بڑا صلح کل آشتی پسند مقام ہے جبھی یہاں بڑے بڑے "صلح نامے" ہوتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اسی مقام پر وہ مشہور — یا بدنام — صلح کانفرنس ہوئی تھی جس میں اتاترک مصطفیٰ کمال نے انگریزوں کی قسمت کا پردہ فاش کیا تھا اور اب سنتا ہوں کہ لوزان کے بالکل سامنے یعنی جھیل لوزان کے پار جو فرانسیسی قصبہ ایویاں Evian ہے وہاں حکومت فرانس اور الجزائر کے حریت پسند قیدیوں یعنی بن باللہ وغیرہ میں "صلح صفائی" کی بات چیت ہو رہی ہے۔ بن باللہ اور ساتھی روزانہ ہیلی کاپٹر پر یہاں لائے جاتے ہیں اور "گفت و شنید" ہوتی ہے۔

میں بھی اپنے ایک دشمن سے گفتگو کرنے لوزان آیا ہوں اور میرا وہ دشمن ہے میری اپنی ذات، میرا اپنا ضمیر، میری اپنی شخصیت۔

لوزان بہت صلح کل اور پرفضا مقام ہے۔ شاید یہاں اپنے آپ سے میری صلح ہو جائے، شاید کوئی معاہدہ ہو جائے، شاید ہم اپنے اپنے علاقے، اپنے اپنے مفادات تقسیم کر لیں۔ شاید شاید۔

میں پلاس فرانسوا کے پاس ایک چھوٹے ہوٹل میں ٹھیرتا ہوں۔ پلاس فرانسوا لوزان کا ایک چوک ہے۔ نہایت مصروف چوک، بڑا سا پوسٹ آفس، بڑی بڑی دوکانیں، سڑکوں پر ٹرام چلتی ہے۔

www.taemeernews.com

اور یہ پلازا فرانسوا خود ایک پہاڑی ہے مکمل پہاڑی جسے برسوں کی محنت کے بعد فیشن ایبل شہری کپڑے پہنا دیے گئے ہیں۔ اگر کہیں کہیں اونچی نیچی سڑک نظر نہ آئیں اگر اس کے بالکل نیچے دوسری سڑکیں گلیاں اور مکانات روشن نظر نہ آئیں تو خیال بھی نہیں آتا کہ یہ مقام پہاڑی بھی ہو سکتا ہے۔

سچ ہے خدا کے بعد کائنات میں سب سے طاقت ور شے انسان ہے۔

پلازا فرانسوا سے کوئی دو سو فٹ نیچے ایک سڑک ہے جس پر ریلوے اسٹیشن ہے۔ اس سڑک سے کوئی چار سو فٹ نیچے ایک اور سڑک ہے جو جھیل لوزان کے کنارے کنارے چلتی ہے۔ اوپر والی سڑک سے جھیل والی سڑک تک ایک زیر زمین ٹرام کار آتی اور جاتی ہے۔ یا اللہ یہ دنیا کیسے کیسے عجوبوں سے بھری ہوئی ہے۔ پلازا فرانسوا کی بلندی سے چار آنے دے کر اس ٹرام میں بیٹھو، دو تین منٹ میں گولی کی سی رفتار سے جھیل لوزان تک اتار لاتی ہے اور اسی طرح واپس پہنچا دیتی ہے اور تماشا یہ کہ پورا رستہ پہاڑ کے اندر سرنگ کاٹ کر بنایا گیا ہے۔

جھیل لوزان کے جس کنارے پر میں گھومتا ہوں اس کا نام ہے اُوشی انگریزی میں OUCHY لکھا ہوا تھا پڑھنے والے نے اوشی پڑھا۔ اوشی سے مجھے اوشا یاد آئی۔ اوشا جو کوئی میری جاننے والی نہیں بلکہ جو صبح کی دیوی کا نام ہے۔ صبح کی دیوی جس کے لیے میں نے بہت سے دوہے کہے مگر جو مجھے کبھی نہیں ملی۔

اوشی پر ایک دیوار اور فوارہ لگا ہوا ہے جس کے اوپر اور دائیں بائیں تین بندر بیٹھے ہیں۔ ایک نے کانوں پر ہاتھ رکھ چھوڑے ہیں، ایک نے منہ بند کر رکھا ہے، ایک نے آنکھیں ڈھک لی ہیں۔

یہ بندر کہتے ہیں:

SPEAK NO EVIL

برائی کی بات مت کرو

SEE NO EVIL

برائی مت دیکھو

HEAR NO EVIL

برائی کی بات مت سنو

میں ایک انسان ان تین بندروں کے آگے گم سم کھڑا ہوں۔

www.taemeernews.com

یہ تین بندر جو سوئٹزرلینڈ کے شہر لوزان میں مجھے نظر آئے آج تک میرا تعاقب کر رہے ہیں۔ یہ بندر زندہ بھی نہیں تھے بلکہ سفید پتھر کے بنے ہوئے تھے۔ ایک بڈھا تھا ایک بندریا معلوم ہوتی تھی اور ایک بچہ بندر تھا مگر یہ بڑے بے کاٹے بے بھاگے دوڑے مجھے برابر بھبکیاں دے رہے ہیں۔

یہ کہتے ہیں:

HEAR NO EVIL

برائی مت سنو

SPEAK NO EVIL

برا مت بولو

SEE NO EVIL

برا مت دیکھو

میں جانتا ہوں کہ یہ بندر ایک خاص مکتبۂ خیال کے منادی ہیں اور بیسویں صدی کے بندر نہیں ہیں میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کی باتیں نظریاتی اعتبار سے سچ ہوتے ہوئے بھی عملی زندگی میں بوگس اور ناقابلِ عمل ہیں۔ اگر کوئی دل گردے کا آدمی ہوتا تو وہ ان پر ایک طائرانہ نظر ڈالتا اور آگے بڑھ جاتا مگر میں ایک گناہ گار آدمی ہوتے ہوئے بھی بنیادی طور پر ایک کمزور آدمی ہوں میں ان بے جان پتھر کے بندروں کے طلسم میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ سامنے جھیل لیمان Lake Leman ہے جسے میں نے غلطی سے جھیل لوزان بھی کہہ دیا ہے۔ یہ جھیل خود ایک طلسماتی شے معلوم ہوتی ہے۔ اس کا پانی نیلا اور ستھرا ہے۔ اس کے تین طرف چھوٹے چھوٹے خوبصورت پہاڑ ہیں۔ اس کے سامنے والا کنارا فرانس کی سرحد ہے اور اس سرحدی قصبے کا نام جڑ ایسیل ہے یعنی ای ویاں۔ جھیل میں چھوٹی چھوٹی اور بڑی بڑی کشتیاں دوڑ رہی ہیں۔ چھوٹی کشتی پیڈل سے چلتی ہے۔ ایک سوئس فرانک یعنی ڈیڑھ روپیہ فی گھنٹہ کرائے پر ملتی ہے۔

مجھے پیڈل چلانے میں تھکن محسوس ہوتی ہے لیکن سہل طریقہ یہ ہے کہ کشتی بیچ جھیل میں لے جا کر پیڈل چلانے بند کر دو اور اونگھنے لگو۔ یہاں تک کہ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل آ جائیں۔ ہوا سرد ہو جائے۔ پانی کی خنکی محسوس ہونے لگے اور کنارے کی روشنیاں جگمگ جگمگ کرنے لگیں۔ چلتے وقت آئس کریم بسکٹ کافی ... بہت سا ذخیرہ لے جاؤ۔ شام کو بھوک لگے تو کھاؤ پیو اور تازہ دم ہو کر پیڈل چلاتے ہوئے کنارے پر پہنچ جاؤ۔ کشتی سنگل بھی ہوتی ہے یعنی ایک نشست اور ڈبل والی بھی

www.taemeernews.com

جس میں آپ بھی،

لالہ رخے سمن برے

کو لے جا سکتے ہیں۔ ڈبل نشست والی میں پیڈل چار ہوتے ہیں جو چار آہنی چپوؤں کو حرکت دیتے ہیں۔ اگر ساتھ والی جی دار ہے یا گھر والی ہے تو خود بھی پیڈل چلائے گی اور اگر آپ کا عشق زیادہ پر تکلف اور ایشیائی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا بوجھ بھی آپ ہی کھینچیں گے۔

موٹر لگی ہوئی کشتیاں بھی بے شمار ہیں اور صرف بادبانوں والی بھی۔ موٹر والی کشتیاں پچاس پچاس میل فی گھنٹے کی رفتار سے بھاگتی ہیں۔ مگر جلد باز قسم کی نظر آتی ہیں، بادبانی کشتی کی کیا بات ہے ایک تو نرم خرام اور رنگ برنگا بادبان جب ہوا کے تھپیڑوں کے ساتھ لچکتا مٹکتا ہے تو بقول فانی؛

کیا جانیے دل پہ کیا گزر جائے

مگر میں نے ان تمام سہولتوں کا کوئی لطف نہیں اٹھایا۔ میں ان بندروں کو دیکھ کر بھاگا تھا مگر تھوڑی دیر بعد پھر وہیں واپس آ گیا۔ میں نے پیڈل والی کشتی کرائے پر لی (سنگل ملی تھی آپ ڈبل سمجھ لیں) مگر چند گز گیا تھا کہ بندروں کی خاموشی نے واپس کھینچ لیا۔ پھر میں تمام کار میں بیٹھ کر پلازا فرانسوا کی بلندیوں پر چڑھ گیا مگر آدھ گھنٹے کے بعد بندروں کی کشش نے پھر گھسیٹ لیا یا اللہ یہ بندر میرے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں۔

مائی ڈیئر تم بڑے خوش قسمت ہو کہ تمھارے پیچھے صرف پتھر کے تین بندر ہی پڑے ہیں۔ اس ہنگامہ پرور دنیا میں نہ جانے کس کس کے پیچھے کون کون پڑا ہوا ہے۔ بادشاہوں کے خلاف وزیر ہیں۔ وزیروں کے خلاف عوام ہیں۔ عوام کے خلاف خواص ہیں خواص کے پیچھے وقت کا دھارا ہے کہ ان کی مضبوط دیواریں توڑ کر اپنے ساتھ بہالے جانا چاہتا ہے۔ سرکاری پارٹیوں کی دُم حزب اختلاف نے دبا رکھی ہے۔ صدر قسم کے لوگ غیر صدر قسم کے لوگوں سے ڈر رہے ہیں۔ غیر صدر صدر روں سے لرزہ براندام ہیں۔ کہیں فوج سول کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ کہیں سول نے فوج کو ٹھنڈا کرنے کی ٹھانی ہے۔ ناشر ادیب کو کھائے جاتا ہے۔ ادیب قاری کو گمراہ کر رہا ہے۔ قاری سب کا بیڑا کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ اس جنگ زرگری میں، اس ہنگامے میں، اس نفسا نفسی میں اگر تمھارے دشمن صرف تین بے جان بندر ہی پیدا ہوئے تو یار تم بڑے لکی ہو نہایت لکی ایک دم فرسٹ کلاس خوش قسمت۔

مگر میں نے بھی ان تین بندروں سے لڑنے کی ٹھان لی میں ان مجسموں کے آگے کھڑا ہو گیا اور ان کی "ایسی تیسی" شروع کر دی۔

"کیوں بے" میں نے اس بندر سے خطاب کیا جس نے اپنی آنکھیں ڈھانپ رکھی ہیں۔ "کیوں بے یہ تو کیا بتاتا ہے کہ SEE NO EVIL یعنی برائی مت دیکھو۔ برائی سے تیرا کیا مطلب ہے۔ برائی یعنی EVIL یعنی شیطنت، یعنی گناہ۔ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھ اور یہ بتا کہ میں کیا دیکھوں اور کیا نہ دیکھوں۔ مثلاً یہ سامنے جھیل نیان کے کنارے جو ننگی ٹانگوں اور ابھرے سینوں والی دوشیزاؤں کا ہجوم ہے اسے نہ دیکھوں اور لٹے بانہ کو خوانچے والا جو چاکلیٹ بیچ رہا ہے اسے دیکھے جاؤں یا اوپر آسمان کو تکے جاؤں جس کے بارے میں سائنس کہتی ہے کہ وہ حد نظر ہے اور کچھ نہیں ہے۔ اس کا رنگ نیلا نہیں ہے، وہ خلا ہے، خلا ہی خلا۔ جس کے آر پار کچھ نہیں، جس کی کوئی حد نہیں۔ یا میں اس جھیل کے نیلے پانیوں پر نظریں گاڑ دوں جس میں مچھلیاں اور کچھوے اور کیکڑے اور گھونگے ایک دوسرے کو کھائے جاتے ہیں۔ اگر اس جھیل میں یہ خوبصورت لڑکیاں تیر کر ان بے جان موجوں میں جان نہ ڈالیں تو یہ ساری جھیل اور اس کا نیلا پانی میرے کس کام کا۔ یہ پانی یوں بھی کڑوا ہے۔ صاف کیے بغیر پینے کے کام بھی نہیں آسکتا۔ یا میں سامنے والے گرجا کے سنہری کلس دیکھے چلا جاؤں، یہ کلس جو نہ منہ سے بولتے ہیں نہ سر سے کھیلتے ہیں بس چپ چاپ ساکت و جامد اپنی جگہ نصب ہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ میں تیری طرح اپنی آنکھیں بند کر لوں کیونکہ برائی اور شیطنت اپنی آنکھوں میں نہیں بلکہ میرے گرد و پیش میں ہے۔ جونہی آنکھیں کھلیں گی اچھا بھی نظر آئے گا برا بھی نظر آئے گا یعنی جو کچھ آمنے سامنے اردگرد آگے پیچھے ہے وہ سب دیکھنا پڑے گا۔ بول بیٹا اب کیا کہتا ہے۔"

وہ بندر آنکھیں ڈھانپے بیٹھا رہا۔

"اور تم میاں HEAR NO EVIL والے بقراط ذرا تم فرماؤ کہ اگر کان کھلے رکھے جائیں تو گناہ کی دھمک کیسے سنائی نہ دے گی۔ دنیا کی تین ارب آبادی میں سے کم از کم ایک ارب آدمی بول رہا ہے اور ان میں کم از کم پچاس کروڑ آدمی جھوٹ بول رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے ہیں۔ جھوٹے نعرے لگا رہے ہیں، جھوٹا پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ جھوٹ، شیطنت، برائی، گناہ، ان سب کے نقارے دھما دھم بج رہے ہیں۔ اگر میرے کان کھلے ہوئے ہیں تو ان آوازوں کو کانوں میں داخل ہونے سے کیسے روکا جاسکتا ہے۔ اور اگر تمہاری طرح کان بند کر کے بیٹھ جاؤں تو سچائی کی وہ مدھم دھیمی دھیمی گنگناہٹ جو ان ڈھولوں اور نقاروں کے باوجود بھی کبھی کانوں کے کسی پردے کے کسی گوشے تک پہنچ جاتی ہے وہ کیسے پہنچے گی۔"

مگر وہ بندر تو کانوں پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہے اس نے میری یہ بات بھی نہیں سنی۔ وہ برائی سے اتنا ڈرا ہوا ہے کہ کوئی بات سننے کا رسک بھی نہیں لینا چاہتا۔

www.taemeernews.com

" اور مسٹر SPEAK NO EVIL تم کیا کہتے ہو تم کہتے ہو SPEAK NO EVIL یعنی بُری بات مت بولو۔ تو بھائی پھر کھاؤ کماؤ کیسے۔ میرا افسر کہتا ہے کیوں مسٹر میری فلاں اسکیم کیسی ہے۔ میں ہاتھ باندھ کر عرض کرتا ہوں حضور والا بوگس ہے، غلط ہے، عوام کے فائدے کی نہیں، لوگ ناپسند کریں گے۔ وہ کہتا ہے ڈیم فول تم ناکارہ آدمی ہو تم کو عقل سے دور کا واسطہ نہیں۔ تمھاری رپورٹ خراب، گیٹ آؤٹ۔ دوسرا افسر کہتا ہے تم وہاں سے کیوں نکالے گئے۔ میں کہتا ہوں صاحب وہ ایک غلط بات کر رہے تھے۔ اوہو اچھا تو تمھارا افسر غلط بات کرتا ہے اور تم ماتحت اچھی بات کرتے ہو تو پھر ہمارا تمھارا گزارا کیسے ہوگا۔ گیٹ آؤٹ۔ میں گیٹ آؤٹ ہو جاتا ہوں۔ یار دوست تھوڑی سی ہمدردی کر کے بھول جاتے ہیں۔ دشمن خوش ہوتے ہیں۔ رقیب مذاق اڑاتے ہیں۔ عزیز رشتہ دار نالائق سمجھتے ہیں۔ اور بال بچے بھوکے مرنے لگتے ہیں۔ ان کے اسکول میں انھیں حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ بلکہ وہ اسکول جا ہی نہیں سکتے، کیونکہ میرے پاس فیس ادا کرنے کے لیے نوکری نہیں ہے۔

پھر میں دکان کر لیتا ہوں مجھے بلدی میں ... دکھانی ہوتی پڑتی ہے۔ گھی میں تیل، آٹے میں برادہ، دال میں کنکر۔ گاہک مجھ سے پوچھتا ہے کیوں جانی گھی خالص ہے نا۔ میں کیا جواب دوں تمھاری طرح منہ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤں اور کہوں SPEAK NO EVIL گاہک چلا جائے گا۔ اور اگر کہوں کہ جناب سو فی صدی خالص ہے۔ قرآن مجید کی قسم ذرا ملاوٹ نہیں۔ گاہک خوشی خوشی خریدے گا۔ مجھے نفع ملے گا۔ میرے بچے اسکول میں ذلیل نہیں ہوں گے۔ میری بیوی شام کو میرا استقبال تازہ تازہ مسکراہٹ سے کرے گی۔ میں بی ڈی کا الیکشن لڑوں گا اور پھر اسمبلی کا ممبر اور ہو سکتا ہے کہ وزیر بھی ہو جاؤں اور بڑی بڑی شاندار تقریریں بھی کروں۔ رفاہ عامہ کے کارنامے سرانجام دوں اور ملکی تاریخ میں ایک مدبر کی حیثیت سے اپنا نام بھی چھوڑ جاؤں مگر تم یہی کہو گے کہ منہ پر ہاتھ رکھ لو ..... SPEAK NO EVIL واہ بے تین بندرو! یورپ کے ایک معمولی سے شہر کی ایک جھیل کے کنارے بیٹھے ہم بیسویں صدی کے عملی آدمیوں کو خوب بے وقوف بنا رہے ہو۔"

مگر اب بھی بندر نہ بولتے ہیں نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں چنانچہ میں اپنا دل ٹھنڈا کر کے پھر ریسٹورنٹ کے بلاز فرانسوا پر چڑھ جاتا ہوں۔ جہاں روشنیاں ہیں اور خوبصورت عورتیں ہیں اور عمدہ ریستوران ہیں اور پختہ چمکتی ہوئی سڑکیں ہیں۔ اور یہ بھولے رہتا ہوں کہ یہ سڑکیں یہ بلند عمارتیں یہ روشنیاں ایشیا اور افریقہ میں اندھیرا کر کے حاصل کی گئی ہیں۔ اور ان عمارتوں سے

www.taemeernews.com

لوپ میں ان تمام قوموں کی زندگی اور تازگی کا رس نچوڑ کر جمع کیا گیا ہے جنھیں صدیوں یورپی استحصال پسندوں نے اپنی مصنوعات کی مارکیٹ بنا کر اس قابل کر دیا کہ آج وہ "پس ماندہ" یا "نو ترقی پزیر" اقوام کہلاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ بال کی کھال نکالنے سے کیا فائدہ، بال کو بھی تکلیف ہوگی اور ممکن ہے کہ اس تفتیش اس تجزیے میں خود اپنی کھال ادھڑ جائے کیونکہ جو لوگ اس قسم کے خیالات رکھیں یا ان کا اظہار کریں، وہ آزاد دنیا میں مشتبہ قرار دے دیے جاتے ہیں۔

www.taemeernews.com

تحفے ۔ ساس اور نند

بس میں سامنے والی دکان میں داخل ہوتی ہوئی ایک نازنین کا پیچھا کرنے لگتا ہوں مگر دکان میں داخل ہوتے ہوتے وہ نازنین غائب ہو جاتی ہے اور ایک بڑی بی قسم کی خاتون نہایت پیار سے میرے آگے آکھڑی ہوتی ہیں ۔

وہ فرانسیسی میں کچھ بولتی ہیں ۔

میں انگریزی کی ٹانگ توڑتا ہوں ۔

وہ مسکراتی ہیں ۔

میں شرمندہ ہوتا ہوں اور سگاروں کے ایک بکس پر ہاتھ رکھ دیتا ہوں ۔

"آہ ۔ سگار" وہ مزید بولتی ہیں مگر میری سمجھ میں یہی دو لفظ آتے ہیں انھوں نے ڈبا پیک کرنا شروع کر دیا ۔

یکایک میں نے ذرا بلند آواز سے کہا" کیا یہاں کوئی انگریزی جانتا ہے ؟"

بہت سے خواتین و حضرات نے مڑ کر مجھے دیکھا ، کچھ برا نہ مانے مگر ایک بالکل ہی بڑی بی آگے بڑھیں ۔

" میں انگریزی جانتی ہوں ۔"

" دیکھیے محترمہ میں یہ پیکٹ پاکستان کے شہر ڈھاکا بھیجنا چاہتا ہوں ۔ آپ میری مدد کیجیے :"

بڑی بی نے میری بہت مدد کی ۔ ہم برابر والے پوسٹ آفس میں گئے وہاں انھوں نے بڑی تمام میرا پیکٹ کسٹم اور ڈاک کی بندشوں سے پار کرایا ۔ ڈاک والی لڑکی کام ختم کرنے کے لیے بے تاب تھی ۔ چھٹی کا وقت ہو رہا تھا ۔

www.taemeernews.com

"آپ پتا لکھیے"

چند منٹ مجھے کوئی پتا نہیں سوجھا۔ پھر مجھے ایک ایک کر کے ڈھاکے کے دوست یاد آنے شروع ہوئے۔ فلاں تو بالکل احسان نہیں مانے گا۔ فلاں گلڈ کے خلاف بیان دیتا رہتا ہے۔ فلاں انگلیں بلیک میں بیچ دے گا، فلاں میرے لیے کبھی کچھ نہیں لایا۔ فلاں ایسا ہے۔ فلاں ویسا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ سب میرے نہایت شریف اور عمدہ دوست ہیں۔ مگر میں اپنے ساٹھ روپے صرف دوستوں میں ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

یکایک مجھے ایک زبردست پتا یاد آیا اور میں نے قلم نکال کر فوراً لکھ دیا۔

ہز ایکسی لنسی جنرل اعظم خاں
گورنر مشرقی پاکستان
ڈھاکا (پاکستان)

لڑکی نے فوراً بڑی بی کی مدد سے پتا پڑھا۔ بڑی بی ہز ایکسی لینسی پڑھتے وقت سراپا عقیدت ہو گئیں اور ٹکٹ والی لڑکی تو گویا مجھ پر بہ سر و جان سے عاشق ہو گئی ـــ افسوس کہ میں اس پر آدھی جان سے بھی عاشق نہ ہو سکا کیونکہ مجھے تمام صبر و ضبط اور ہمت کے باوجود ان خاموش بندروں کی بھبکیاں سنا رہی تھیں۔

"اوہ کیا آپ ہز ایکسی لینسی کے دوست ہیں؟"

بڑی بی نے خود پوچھا۔ میں کیوں بتاتا کہ ہمارے ہاں گورنر کو ہز ایکسی لینسی نہیں کہا جاتا۔

"بہت" میں نے بے پروائی سے کہا "ہمارے ملک میں گورنر کیا، صدر بھی ادیبوں کی بہت عزت کرتے ہیں اور میں تو ملک کا ایک بہت بڑا ادیب ہوں۔"

"او، سچ، آپ ادیب ہیں۔ میرا بیٹا آرٹسٹ ہے۔" بڑی بی نے تو گویا چاہت کے مارے مجھے گلے لگا لیا مگر پھر وہ اداس ہو گئیں "لیکن اس کا گورنر تو کیا میئر بھی قدرداں نہیں کیونکہ اس کی بیوی کی بنائی تصویریں پسند نہیں ہوتی۔"

"ہم سے تو گورنر و وزرا ہر وقت پڑے رہتے ہیں۔ کوئی مجھے کھانے پر بلاتا ہے، کوئی سستے دعوت دیتا ہے، کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے دینے پر تیار رہتا ہے۔" میں نے ہنکارنا شروع کیا ـــ

www.taemeernews.com

حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ مجھے گورنر تو کیا کسی کمشنر نے بھی گھاس نہیں ڈالی، اس لیے کہ کمشنر لوگ آرٹس کونسل وغیرہ جیسے بے ضرر اور حکام پرست اداروں کی سرپرستی تو کر لیتے ہیں کیونکہ وہاں نہ کوئی ان کی دانش وری کی قلعی کھول سکتا ہے نہ ان پر فرض ہے کہ وہ "فنون" سے اپنی دلچسپی کا دانشورانہ حق ثابت کریں۔ لیکن ادب و دب کے معاملے میں کچھ برس سے ادیبوں نے روایت ڈال دی ہے کہ بھیا افسر ہو گے اپنی جگہ، ادب کے معاملات میں حصہ لو گے تو ادیب کا جامہ پہن کر آنا پڑے گا اور ادیب کا جامہ عام طور پر تار تار ہی رہتا ہے۔

اب چونکہ روایت نئی ہے اور بہت سے صرف شوقین افسران کو بری لگتی ہے اس لیے انھوں نے میرا خاصا پٹڑا کر رکھا ہے اور شاید بالکل ہی پٹڑا کر دیں گے مگر روایت قائم ہو گئی ہے اور میرا پٹڑا بھی ہو گیا تب بھی قائم رہے گی۔

لاحول ولاقوۃ، میں لوزان کے پلازا فرانسوا سے کہاں آ کے گرا ہوں۔ کیسی بلندی کیسی پستی۔

(معاف کیجیے گا مجھے معلوم ہے کہ اب آپ کا دھیان بھی اس ناول کی طرف جائے گا جس کا نام ہے ایسی بلندی ایسی پستی مگر اسے سرقہ نہیں قرار دیجیے ہمیں نے ایسی کی جگہ کیسی ہی تو لکھا ہے یار لوگ تو پورے کے پورے مضامین کی ایسی تیسی کر دیتے ہیں)

بہرحال میں لے دو سگار کا بکس یہ جانتے ہوئے بھی جنرل اعظم خاں کو روانہ کیا کہ وہ سگار نہیں پیتے لیکن مجھے امید تھی کہ جب ڈھاکے پہنچ کر میں ان سے گلڈ کے کسی جلسے میں آنے کے لیے کہوں گا تو وہ ان سگاروں کو نہ بھولیں گے۔

لیکن اصل میں سارا قصور اس گلابی رنگ والی نازنین کا تھا جس کے پیچھے میں دکان میں داخل ہوا تھا اور جو اپنی میراث میں کاؤنٹر پر کھڑی ہوئی بڑی بی کو میرے حوالے کر کے ہجوم نازنیناں میں معدوم ہو گئی تھی۔

اب وہ ترجمان بڑی بی میرے ساتھ ہو گئیں اور میں نے انھیں ترجمانی کے حسان میں چائے پینے کی دعوت دی۔ انھوں نے سامنے والی دکان سے اپنی بڑی بیٹی کو ساتھ لے لیا کیونکہ دکانیں بند ہو رہی تھیں اور لوگ چھٹی کر رہے تھے۔ ان کی صاحبزادی کی عمر بھی کوئی پچاس برس تھی۔

"میرا بیٹا بڑا ونڈرفل آرٹسٹ ہے اور کافی روپیہ کما سکتا ہے مگر میری بہو سخت بدمعاش ہے۔"

"یعنی جینڈیکیڈ"، میں نے بڑے اشتیاق سے سوال کیا

"بیڈ کیرکٹر نہیں یعنی جنسی طور پر آوارہ نہیں لیکن ویسے بہت بُری ہے" انھوں نے میری ناپسندیدگی کا خیال کیے بغیر اس کی مزید برائی جاری رکھی۔

"وہ ہر اتوار کو اسے میرے پاس لانے کی بجائے اپنے میکے والوں میں لے جاتی ہے۔ وہ کھاتے پیتے لوگ ہیں اس لیے کبھی پکنک پر لے جاتی ہے کبھی پہاڑیوں کی چوٹیاں سر کرانے لے جاتی ہے۔ ایک بار میرے بچے کی ٹانگ ٹوٹتے ٹوٹتے رہ گئی۔"

"مگر ممی اس کا بایاں ہاتھ بری طرح چھل گیا تھا" نند نے لقمہ دیا۔ "بایاں ہاتھ چھل گیا تھا اور مجھے اطلاع بھی نہیں دی گئی۔" انھوں نے آہیں بھرنی شروع کیں۔

"ہمارا بھائی ہماری طرف سے ایک طرح مر چکا ہے۔ حالانکہ ہم تین بہنوں میں ایک ہی بھائی ہے" نند کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔ یا اللہ یہ یورپ ہے یا پاکستان کا کوئی گاؤں۔

"اور موسیو پوئٹ وہ لڑکی کوئی خاص خوب صورت بھی نہیں میرے بیٹے کو رجھانے کے لیے اوّل بن گئی تھی ورنہ وہ ماڈل بھی نہیں ہے۔"

"آئی سی" میں تائیداً سر ہلاتا ہوں۔

"اور اس نے اس کا بہت بڑا بیمہ کرا کے اپنے اور اپنے دو بچوں کے نام کرا لیا ہے اور ہمیں خبر بھی نہیں کی۔"

"وہ اس کی موٹر خود چلاتی ہے اور ہمیں اس میں آج تک نہیں بٹھایا۔" نند لقمہ دیتی ہیں۔

"بچوں کو ہمارے پاس ہفتے کی شام چھوڑ کر میاں بیوی اتوار کی رات واپس لینے آتے ہیں۔"

"آپ بچوں کو واپس کر دیا کیجیے" میں نے خوشامدانہ طور پر ہمدردی کی۔

"واہ! کیوں یہ آپ نے کیا کہا۔ ہم اپنے بچوں کو کیوں نہ رکھیں۔ موسیو آپ تو بہت سخت دل آدمی معلوم ہوتے ہیں۔" بڑی بی نے مجھے نہایت خشمناک نظروں سے دیکھا۔

"میرا مطلب تھا جب ان کا آپ کے ساتھ سلوک ایسا ہے تو میں بات کرتے کرتے رہ گیا کیونکہ انھوں نے اپنا بٹوا کھول کر چھ فرانک نکالے اور دھڑ سے میز پر رکھ دیے۔

"یہ رہے آپ کی چائے کے دام۔ ہم آپ کی نوازش سے باز آئے آپ بالکل شاعر نہیں لگتے آپ کوئی بہت بے رحم آدمی ہیں۔" وہ ایک دم چل پڑیں اور ان کے ساتھ ہی نند صاحبہ بھی کھڑی ہو گئیں۔

"اگر آپ کو میرے شوہر نے مدعو نہ کیا ہوتا تو میں اور میری والدہ آپ کی بکواس سننے کے لیے خالی نہ ہوتے۔" نند صاحبہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا اور ساس صاحبہ یعنی اپنی اماں جان کے ساتھ روانہ ہو گئیں۔

www.taemeernews.com

میں ان اکیلی خواتین پہ دم کھاتا ہوا اکیلا رہ گیا۔ پاکستانی ساس اور نند اور یورپین ساس اور نند میں کتنی پیاری مماثلت ہے۔ ساس نند بہو سب جگہ ایک جیسی ہوتی ہیں۔ بلکہ سب انسان ایک جیسے ہوتے ہیں۔

لوزان کی پہاڑیوں پر میں پھر بقراطیت کے سمندر میں غوطے کھانے لگا اور یکایک مجھے وہ تین بندر یاد آگئے جو کہتے ہیں کہ:

SPEAK NO EVIL

HEAR NO EVIL

SEE NO EVIL

پھر میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں انگوٹھوں اور ہتھیلیوں سے اپنی آنکھوں اور کانوں اور منہ کو ڈھانپ لیا اور کرسی پر دھڑ سے گر پڑا۔

لیکن اس عمل میں مجھے تکلیف بہت ہوئی۔

www.taemeernews.com

دو رکنی پان اسلامک کانفرنس

اب میں پلازا فرانسوا کے ریستوران میں اکیلا رہ گیا۔ میں بہت دیر تک تو اپنے تین بندر دوستوں کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے آنکھیں کان اور منہ بند کیے بیٹھا رہا۔ مگر مشکل یہ آپڑی کہ وہ بندر تو پتھر کے تھے اور قرنوں سے ایسے ہی بیٹھے ہیں۔ میں گوشت پوست والا آدمی۔ میری رگوں میں خون دوڑتا ہے۔ آنکھوں میں روشنی ہے، کانوں میں قوت سماعت موجود ہے۔ میں کب تک ان تین ہدایات کے پرچم لہرائے گونگا بہرا اندھا ہو بیٹھا رہوں گا۔

HEAR NO EVIL

SPEAK NO EVIL

SEE NO EVIL

چنانچہ میں نے ایک دم جھرجھری لے کر آنکھوں کانوں اور منہ پر سے ہاتھ اٹھا لیے اور ایک دم زندگی اپنی پوری تابانیوں، قوتوں، نیکیوں اور بدیوں کے ساتھ فواروں کی طرح پھوٹنے لگی۔

آہ زندگی جیسی بھی ہو ہے بڑی خوبصورت۔ یہ دیکھو سامنے گلہائے رنگ رنگ چلے جا رہے ہیں۔ موٹریں دوڑ رہی ہیں۔ ٹرام کا زناں زناں چل رہی ہے۔ موسم ٹھنڈا ہوتے ہوئے بھی شرابی ہے۔ دکانوں کی پیشانیوں پر روشنیاں ہی روشنیاں ہیں۔ بجلی کی روشنیاں، جوانی کی روشنیاں۔

مگر پھر مجھے ان دو معزز اور محترم خواتین کا خیال آیا جنھوں نے بے سبب میری بے عزتی کی تھی۔ میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا۔ میں نے تو ان کی بہبودی کی الفت میں بولنا شروع کیا تھا مگر وہ پتا پونی کی محبت میں مجھ سے خفا ہوگئیں۔ خداوندا خواتین عام طور پر ایسی کیوں ہوتی ہیں۔ اب مجھے سوئٹزرلینڈ

www.taemeernews.com

جیسے ترقی یافتہ ملک کے قوانین یاد آنے شروع ہوئے۔ یہاں بظاہر تو خواتین مردوں کے شانہ بشانہ نظر آتی ہیں مگر ابھی تک انھیں برابر کے سیاسی حقوق نہیں دیے گئے ہیں۔ صرف ایک شہر یعنی کنٹون جیل میں سوئس خواتین نے زور لگا کر کچھ حقوق حاصل کیے ہیں۔ ورنہ ابھی بہت سی ایسی منزلیں سر کرنی باقی ہیں جو پاکستانی خواتین کبھی کی سر کر چکی ہیں۔ ابھی ۱۹۵۹ء میں مساوی حقوق کا ایک مسودہ قانون عام رائے شماری کے لیے پیش ہوا اور مسترد ہو گیا۔ کیا سمجھے۔ خود یورپ کے ایک امیر ترین اور سب سے زیادہ صنعتی ملک میں عورتوں کے مساوی حقوق کا قانون منظور نہیں کیا گیا۔ کیوں نہیں کیا گیا۔ اس کا جواب مردوں کی بجائے عورتیں ہی دے سکتی ہیں اور سچا جواب مردوں کو پھر بھی نہیں ملے گا کیونکہ مشرق کے قدیم دانشوروں کا قول ہے کہ کسی معاملے میں بھی عورت مرد سے سو فی صد سچ نہیں بول سکتی بلکہ عورت کو جاننا ہو تو عورت ہی کے ذریعے جانو یا عورت بن کر جانو۔ ظاہر ہے کہ دوسری ترکیب میرے لیے بالکل ناقابل استعمال ہے۔

اب میں نے ان معمر خواتین کو معاف کر دیا، ہاں اس میں دیر ضرور لگی۔ اگر وہ نوعمر طرح دار ہوتیں تو کبھی کا معاف کر چکا ہوتا، بلکہ مجھ سے ان کے خفا ہونے کی نوبت ہی نہ آتی۔ اللہ بخشے ایشیا کے مشہور بقراط جمیل الدین عالی مرحوم کا قول ہے کہ کوئی جوان عورت کوئی غلطی نہیں کر سکتی۔ یہ سوئٹزرلینڈ والے تو اتنے ترقی یافتہ ہونے کے باوجود گاودی ہیں کہ اب تک خواتین کو مساوی حقوق نہیں دیے۔ ان لوگوں میں غزل گو شعرا نہیں گزرے نا۔ ہائے کیسی کیسی اچھی آبادیاں کن کن ثقافتی نعمتوں سے محروم ہیں۔

"السلام علیکم" یکایک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ریستوران کی نیچے والی سیڑھی پر ایک نوجوان خوب صورت گندمی رنگ کا آدمی کھڑا تھا۔

"وعلیکم السلام" میں نے اس طرح بے اختیار ہو کر کہا جیسے دل سینہ چاک کر کے باہر آ جائے گا۔ مگر اب وہ پھٹا عربی بولنے لگا۔

"لا عارف العربی" میں نے رٹا ہوا جملہ کہا جس کا مطلب یہ ہے کہ میں عربی نہیں جانتا۔

"انگلش"

"یس" میں نے خوشی خوشی جواب دیا۔

واہ کیا فخر کی بات ہے۔ قرآن کی زبان، رسول کی زبان ایشیا و افریقہ کی ایک بڑی زبان عربی ——

یہ ناواقفیت، اور سات سمندر پار والے لٹیروں، استحصال پسندوں، غاصب حکمرانوں کی زبان ——

www.taemeernews.com

پر یہ خوشی اور یہ فخر۔

(امید ہے کہ یہ سطور افسران بالا کی نظر سے نہیں گزریں گی۔ اردو تحریر میں یہی خوبی ہے کہ "بڑوں" کی نظر سے بچی رہتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جھٹ بھیتے محتسب گا ہے گا ہے ان کی توجہ ہم جیسے نابکاروں کی طرف مبذول کرا دیتے ہیں)

وہ صاحب عبدالسلام مہدوی تھے۔ وہ ایک عرب ملک کے تھے۔ اور میں نے ان سے وعدہ کر لیا تھا کہ اگر کبھی میں نے ان کے بارے میں کچھ لکھا تو ان کے ملک کا نام نہیں لکھوں گا کیونکہ وہ پان اسلامک یعنی کل اسلامی ممالک میں ایک اسلامی حکومت والی تحریک کے حامی اور منّاد تھے۔ وہ لوزان یونیورسٹی میں کوئی تحقیق کر رہے تھے۔ میری تصویر اسی صبح ایک اخبار میں لوزانی ادیبوں کی مہربانی سے چھپ گئی تھی وہ ان کے ذہن میں تھی باقی انھیں کچھ یاد نہیں تھا بہرحال مجھے پہچان لیا تھا۔

اس بات صلح پسند لوزان میں ایک زبردست اسلامی کانفرنس ہوئی جس میں بارہ سوئس فرانک یعنی کوئی اٹھارہ پاکستانی روپے خرچ ہوئے کانفرنس پانچ گھنٹے جاری رہی اور اس میں جملہ زبانیں بولنے والے اسلامی ملکوں کے تمام اتفاقات، اختلافات، مقامی اور بین الاقوامی سیاست پر سیر حاصل تبصرے ہوئے۔ اختتام پر کانفرنس نے صرف ایک قرارداد منظور کی اور وہ یہ کہ ایک اور بین الاقوامی اسلامی کانفرنس یعنی موتمر عالم اسلام منعقد ہونی چاہیئے۔

عبدالسلام مہدوی بڑے دردمند آدمی نکلے۔ وہ ان عربوں سے بہت مختلف تھے جنھیں میں نے عرب دنیا میں دیکھا تھا۔ عرب دنیا میں تو اتحاد العربیہ یعنی عرب قوموں کا اتحاد پہلا اور آخری نعرہ معلوم ہوتا ہے، اسلام و سلام ایک فروعی شے ہے، بقول جنرل کریم قاسم مرحوم "مسلمان تو ہم ہیں ہی ہمارا مسئلہ تو عرب قوموں کی یکجہتی ہے آپ لوگ ذرا نو مسلم ہیں اس لیے آپ اسلام پر زیادہ زور دیتے ہیں"

مگر عبدالسلام مہدوی دنیائے اسلام کو ایک رشتے میں پرویا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک اسلامی حکومت، ایک مرکز اور بہت سے صوبے۔ ایک بین الاقوامی طاقت جس کی وجہ اتحاد صرف اسلام ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ سچ کہتے تھے، میں کئی گھنٹے ان کی مدلل مخلصانہ اور جوش ایمان سے بھرپور گفتگو سنتا رہا۔ بہت سی باتیں وہ تھیں جو علامہ جمال الدین افغانی سے لے کر علامہ اقبال اور قائداعظم تک فرما گئے ہیں۔ مگر۔ مگر۔ میں دل ہی دل ہنستا بھی رہا۔

www.taemeernews.com

"یہ بے چارے اسلامی مرکزیت کی باتیں کر رہے ہیں۔ یہاں اپنے مغربی علاقے میں ون یونٹ کا مسئلہ ابھی تک ذہنی طور پر طے نہیں ہوا۔ مہاجر اور مقامی کا مسئلہ طے نہیں ہوا۔ میں خود پورا نہ سہی مگر آدھا میراث بھی کہلاتا ہوں۔ میں پاکستانی قومیت کے لیے گیت لکھتا ہوں، مضمون لکھتا ہوں، انجمنیں بناتا ہوں۔ اپنی مقدرت بھر کام کرتا ہوں مگر وہی تلیر کا تلیر، مہاجر کا مہاجر کہلاتا ہوں، میری اولاد اسی پاکستان میں پیدا ہوئی، پروان چڑھی مگر وہ بھی مہاجر والے کوٹے میں ہے۔ پٹھان اب بھی پٹھان ہے۔ پنجابی اب بھی پنجابی ہے۔ سندھی اب بھی سندھی ہے اور ان میں بھی خٹک، ترین، یوسف زئی، مہمند راجپوت، اعوان، آرائیں، گوجر، سید، جاٹ، مغل، شیخ اور نہ جانے کون کون سی برادریاں ہیں جن میں آج بھی الکشن کے لیے برادری کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔ اور مشرقی پاکستان کا تو قصہ ہی دوسرا ہے۔ بنگالی اور غیر بنگالی، بہاری اور غیر بہاری، پھر یہ نواکھالی کا ہے، وہ کومیلا کا ہے، وہ چاٹگام کا ہے، وہ سلہٹ کا ہے، وہ میمن سنگھ کا ہے ......"

اور یہ صرف ایک اسلامی ملک کا حال ہے، ایک نئے اسلامی ملک کا حال جس کا نام پاکستان ہے اور جو ابھی صرف سترہ برس پہلے صرف اسلام ہی کی بنیاد پر بنا تھا، دنیا بھر کی تاریخ میں پہلا نصب العینی ملک، پہلا ملک جو کسی نصب العین کی بنیاد پر بنایا گیا۔ اس ملک کا یہ حال ہے تو پیارے عبدالسلام مہدوی باقی دنیائے اسلام کے بارے میں تم سے کیا بحث کروں۔ بس تمہاری کامیابی کے لیے دعا کرسکتا ہوں۔ ہمارے علامہ اقبال بھی کہتے کہتے مر گئے کہ،

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

اور لوگ سن سن کر اور پڑھ پڑھ کر روئے اور انھیں حکیم الامت کا خطاب بھی دیا اور ان کا ایک شاندار مقبرہ بھی بنا دیا جہاں دنیا بھر کے عمائد کو نذر عقیدت پیش کرنے لے جایا جاتا ہے اور ان کے نام پر اکادمیاں بھی قائم کی گئیں اور ہر زمانے میں ہر لیڈر ان کے اقوال، ان کے اشعار نقل کرتا رہا اور کرتا رہتا ہے جیسے میں کر رہا ہوں اور پھر بھی میری طرح اس کے دل میں اپنی اکائی کا چور چھپا رہتا ہے، اپنی اکائی، اپنی انا، اپنی برادری، اپنا قبیلہ، اپنا صوبہ:

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

یہ جو تم کہتے ہو:

www.taemeernews.com

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاکِ کاشغر

ارے بھائی یہ تو ہمارے علامہ اقبال کا شعر ہے، انہیں خوب یاد ہے، اسی مضمون کے ہزاروں شعر اور اقوال خود مجھ کو یاد ہیں مگر تم دیکھتے نہیں کہ میری کھال کے نیچے کیسے کیسے تعصبات چھپے بیٹھے ہیں۔ بس خدا تمہیں کامیاب کرے، آمین ثم آمین۔ مگر آئی ایم سوری میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا مجھے واپس جا کر اپنی نوکری اپنے بال بچوں کا انتظام کرنا ہے۔

مگر عبدالسلام مہدوی ذرا دل شکستہ نہیں ہوتے، ان کی آنکھوں میں جو حرارت ہے وہ میری سرد مہری سے کم نہیں ہوتی، خدا کرے کم نہ ہو، خدا کرے مجھ جیسے لوگ کم ہوتے جائیں اور عبدالسلام مہدوی جیسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جائے، آمین ثم آمین۔

جب میں اور عبدالسلام مہدوی جدا ہوئے تو مجھے یقین تھا آج نہیں تو کل، کل نہیں تو اگلی صدی میں ایک نہ ایک دن ایسی ایک بین الاقوامی کانفرنس ضرور ہوگی جس میں مجھ جیسا کوئی مندوب نہیں ہوگا اور وہ کانفرنس ضرور کامیاب ہوگی۔

معلوم نہیں وہ کانفرنس کہاں ہوگی اور کون سے مذہب کے لوگ منعقد کریں گے مگر وہ کانفرنس ضرور منعقد ہوگی ـــــ اور کامیاب ہوگی۔

ٹھینک یو مائی ڈیر یونان۔ تو نے آج مجھے ایک پیارا سا تصور، ایک خواب ایک امید کا تحفہ دے دیا ہے۔ وہ تحفہ عبدالسلام مہدوی کے ہاتھوں ملا ہو یا تیری پر سکون روشنیوں کے ملے جلے اثرات نے عطا کیا ہو، یا پتھر کے ان بین بندروں نے میرے تحت الشعور میں داخل ہو کر کوئی گڑبڑ کی ہو، جنھیں مینے زندہ رہنے کے لیے بہ ظاہر بھگا دیا تھا۔ بہر حال میں یہ تحفہ اپنے سینے سے لگا کر رکھوں گا اور جہاں جہاں گیا اس کی نمائش کروں گا۔

ب کیا آپ یہ جان کر خوش ہوں گے کہ میں اس ریستوران سے باہر نکلتے ہی سب کچھ بھول گیا ... مہدوی ... ملاقات کا وعدہ کر کے کبھی دوبارہ ان سے نہیں ملا اور دوسرے دن چار گھنٹے جیل ... میں گزارے اور تیسرے دن چار گھنٹے دور اونچی پہاڑیوں پر جا کر اسکی انگ یعنی برف پر ... کوشش کی ... کامیاب ... اور تیسرے دن ایک اشاعت گھر میں جا کر پاکستانی کتابوں کی

www.taemeernews.com

تعدادِ اشاعت دس لاکھ فی سال بتا کر اپنے معصوم یورپین سامعین کو حیرت میں غرق کر دیا، اور چھٹے دن ایک عظیم مصنف کا مہمان جن کراس کی برف پوش یا برف زدہ کٹیا میں اپنی ایک "عظیم تصنیف" کا آخری باب پورا کرنے کے بہانے سے فرد کش ہو گیا، حالانکہ عظیم تو کیا میری جھولی میں کوئی تصنیف ہی نہ تھی۔

آپ خوش ہوں نہ ہوں، مگر ایسا ہوا، عام طور پہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے نہیں۔ میں کہہ دیتا ہوں گو جیسا کہ پہلے میں نے کہا ہے میں بھی ہمیشہ بالکل ہی سچ نہیں بولتا ہاں میرا یہ دعویٰ ضرور ہے کہ میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ جھوٹ نہیں ہوتا۔

وہ عظیم مصنف جس سے میں نے اپنے آپ کو ایشیا کے ایک عظیم نوجوان مصنف کی حیثیت سے متعارف کرایا، امریکہ و یورپ کا بدنام ترین آدمی ہے۔ میں نے اس کے ساتھ بہت سا وقت گزارا۔ اور عجیب طرح گزرا۔ اس کا نام تھا ہنری ملر۔

www.taemeernews.com

اُن خاتون کی سرگرمیاں

جب سورج ڈوب گیا
جاگ اٹھے رات کے اندھیارے

ان اندھیاروں میں نہ جانے کون کون کس کس کے ساتھ یا کس کس سے ملنے نکلا ہوگا اور ان اندھیاروں میں میری بھی ایک خاتون سے ملاقات ہوئی مگر افسوس کہ آپ کی توقعات پوری نہیں ہوسکتیں۔ یہ ملاقات خفیہ ضرور تھی اور لوزان جیسے روشن شہر کی ایک زیرزمین تاریک گلی میں ہوئی تھی مگر اس کا مقصد معاملات من و تو نہیں تھا بلکہ ایک بدنام مصنف کی تلاش تھی۔ وہ مصنف جس کا نام ہنری ملر ہے اور جو عام طور پر ہجوم عاشقاں سے بچنے کے لیے چھپ چھپ کر رہتا ہے۔

ہنری ملر آج شاید دنیا کا سب سے دولت مند ادیب ہے۔ اس کی کتابوں کے ترجمے روسی — اور اردو ہندی کے علاوہ دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں ہو چکے ہیں اس کی کتابیں بار بار ضبط ہوئی ہیں اور پھر طویل مقدمات کے بعد "آزاد" کی گئی ہیں۔ بارہ زبانوں میں اُس کی بیسیوں سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں۔ اس سے امریکی، انگریز، جرمن، فرانسیسی، اسپینی، اطالوی اور دیگر تمام یورپین قوموں کے "شرفا" نفرت کرتے ہیں کیونکہ وہ ان کے بقول ننگی تحریریں لکھتا ہے یعنی جنسی موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے لیکن وہی تمام شرفا اپنی خلوتوں میں اسے پڑھتے بھی ہیں۔ شرفا اس سے اس لیے بھی نفرت کرتے ہیں کہ وہ ان کی کھوکھلی اور نمائشی زندگی، طور طریقوں، قول و فعل کے تضاد کا پردہ چاک کرتا رہتا ہے۔ نئی نسل اسے پوجتی ہے، پرانی نسل اس سے ڈرتی ہے۔ امریکی اس سے سخت ناخوش ہیں کیونکہ اس نے امریکی سرمایہ داری کا پول امریکہ میں اور امریکہ سے باہر بیٹھ کر کھولا ہے۔ سب اس سے ناخوش ہیں اور سب

www.taemeernews.com

اسے پڑھتے ہیں اور پڑھتے جاتے ہیں۔ ایک نقاد کے بقول ہنری ملر کی عظمت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ نوبل پرائز کمیٹی ابھی تک اسے نوبل ادبی انعام دینے کی ہمت نہیں کر سکی۔

مگر میں ہنری ملر سے اس لیے ملنے کو بے تاب نہیں تھا کہ وہ ایسا مشہور یا بدنام ادیب ہے یا میں خود اس کی عریاں نویسی کا عاشق ہوں بلکہ اس لیے کہ وہ اس زمانے میں لوزان میں کہیں چھپا ہوا الجزائری حریت پسندوں کو روپیہ بھیجنے اور بھجوانے کا انتظام کر رہا تھا۔

الجزائری جنگ آزادی کے سلسلے میں سفید فام ادیبوں میں سے ژاں پال سارتر کا نام سب نے سنا ہے۔ سارتر نے فرانسیسی ہوتے ہوئے بھی کھل کر پیرس کی گلیوں، کلبوں، ریستورانوں اور اخباروں میں فرانس کے شدت پسند دائیں بازو والوں کے خلاف جہاد کیا۔ اس کے بہت سے ساتھی ادیب پکڑے گئے۔ اسے نوبل انعام سے کئی سال محروم رکھا گیا، لیکن سارتر کی بات اور ہے۔ وہ ایک رومانوی شخصیت بن گیا ہے وہ نرالی باتیں کھل کر کرتا ہے اور ان کی خوب پبلسٹی ہوتی ہے۔ ہنری ملر کے بارے میں شاید یہ پہلا انکشاف ہے کہ اس نے الجزائر کی جنگ آزادی میں اپنی آمدنی سے لاکھوں ڈالر دیے اور ان کی خفیہ تحریک کو یورپی ہمدردان الجزائر سے رابطہ قائم کرنے میں عجیب و غریب خدمات انجام دیں۔

اگر یہ بات لندن ٹائمز یا نیویارک ٹائمز میں لکھی جاتی تو شاید امریکی اور یورپی دنیا میں کھلبلی پڑ جاتی کیونکہ سفید فام دنیا کو آج تک الجزائری تحریک آزادی سے ہنری ملر کا عملی تعلق معلوم نہیں ہے لیکن یہ بات اردو میں لکھی جا رہی ہے اور ایک مضمون کے وسطی حصے میں لکھی جا رہی ہے اس لیے اسے کوئی صحافیانہ انکشاف بھی تصور نہیں کیا جائے گا، نہ یہ خبر امریکی دنیا تک پہنچ سکے گی۔ میرا ابھی ہنری ملر سے وعدہ تھا کہ جب تک الجزائر آزاد نہیں ہو جاتا میں یہ بات نہیں لکھوں گا۔ اس وقت میں نثر نویس بھی نہیں تھا لیکن چونکہ میں نے اس سے عہد لیا تھا کہ میں ایک نہ ایک دن مشہور نثر نویس ادیب اور شاعر اور الم غلم قسم کی چیز ہوں اس لیے اس نے مجھ سے قسم لی تھی کہ اس تحریک میں اس کا کردار کسی پر ظاہر نہ ہو کیونکہ اس کی مستقل رہائش پیرس میں تھی اور وہ امریکی شہری تھا اور اس تحریک سے وابستگی کا حال کھل جانے پر اس کے کام میں سخت دشواریاں پیش آنے کا اندیشہ تھا۔ یوں بھی وہ سیاسی قسم کا ادیب نہیں ہے۔ اس کی عمر ۷۲ برس کی تھی اور وہ عملی سیاست کے خارزار میں داخل ہونے کا قائل نہیں تھا۔

www.taemeernews.com

مگر اسے الجزائر کی جنگِ آزادی سے گہری دل چسپی تھی۔ مجھے ہنری ملر سے جن خاتون نے ملوایا ان کا نام اب بھی شائع کرنے کی اجازت نہیں ہے کیونکہ وہ یورپین حُریت پسندوں کے ایک ایسے خفیہ گروہ سے تعلق رکھتی ہیں جو آج بھی افریقی مقبوضات کی آزادی کی تحریکوں سے وابستہ ہے۔ کاش میں ان کی تصویر چھاپ سکتا۔ کاش میں ان کا پتا بتا سکتا۔ مگر یہ بات میرے ان کے معاہدے کے خلاف ہے۔ وہ ایک مخلوط النسل ادھیڑ عمر کی خاتون ہیں۔ پانچ چھ زبانیں جانتی ہیں۔ ان کے پاس کئی ملکوں کے پاسپورٹ کئی ناموں سے ہیں۔ اور وہ اس زمانے میں زیادہ تر وقت لوزان اور پیرس کے درمیان سفر میں گزار رہی تھیں۔ میں ان سے اتفاقیہ طور پر ایک اشاعت گھر میں ملا جہاں وہ خفیہ لٹریچر چھپوانے آتی تھیں۔ پمفلٹوں کے کئی بنڈل لے کر جا رہی تھیں کہ ایک بنڈل گر گیا اس وقت وہ دور جا چکی تھیں۔ میں اشاعت گھر سے نکل رہا تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ مفت کی بے گار ہے مگر پھر میں نے وہ بنڈل اٹھا لیا اور دوڑا دوڑا ان تک پہنچا۔

"آپ کا یہ بنڈل گر گیا تھا۔" میں نے بڑی ملائمت سے کہا۔ مجھے ان کی شکل دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی۔ مگر مجھے توقع تھی کہ وہ جواب میں چند اچھے الفاظ ضرور کہیں گی۔

"ہو آر یو (تم کون ہو)" وہ ایک دم ڈر سی گئیں اور ایک دم درشتی اختیار کر لی "یہ بنڈل میرا نہیں ہے" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئیں۔ یہاں سے مجھے شبہ پیدا ہوا میں نے بنڈل کھولنا چاہا مگر اس پر پلاسٹک کی سخت سُتلیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میں نے بڑھ کر پھر انھیں روک لیا۔

"مگر محترمہ میں نے خود اسے آپ کی بغل سے گرتے دیکھا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں اسے سامنے کی پٹری پر پھینک سکتا ہوں"

وہ اس وقت سخت گھبرائی ہوئی تھیں۔ وہ ایک لمحے ساکت رہیں۔ پھر انھوں نے ایک دم اپنے کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا پستول نکال لیا۔

"سنو مسٹر اگلے منٹ میں تمھیں گولی مار دوں گی۔ اس بنڈل سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں پولیس کو آواز دیتی ہوں"

میں چپ کھڑا رہا مگر انھوں نے پولیس کو آواز نہیں دی۔ یا تو میں ڈر گیا تھا یا حیرت میں مبتلا تھا۔ یا میں غیر شعوری طور پر زندگی میں پہلی بار اچانک ایک ڈرامے میں شامل ہو جانے کی اضطراری کیفیات میں گھر گیا تھا۔

www.taemeernews.com

"تم ہو کون" آخر کار انھوں نے ذرا ملائمت سے پوچھا۔

"میں ایک پاکستانی ہوں"

"او پاکستانی۔ تب تو شاید تم مسلمان بھی ہوگے"

اب مجھے ان کے لہجے سے اندازہ ہوگیا کہ وہ بات کرنے کے موڈ میں ہیں۔

"الحمد للہ" میں نے زور دے کر کہا

"کلمہ پڑھو"

میں نے کلمہ پڑھا

"قل ہو اللہ پڑھو"

میں نے قل ہو اللہ پڑھی۔ ظاہر ہے کہ میرا لہجہ عربی نہیں تھا مگر میں نے پوری قل ہو اللہ پڑھ دی۔

"اچھا تو موسیو پاکستانی تم ایک مسلمان ہو یا کم از کم ایشیائی ہو تو یہ بنڈل یہیں پھینک کر الٹے پاؤں واپس چلے جاؤ۔ اگر تم سچے ہو تو میں کل تمہیں بلاز افرانسوا پر فلاں ریستوران میں چھ بجے شام کو ملوں گی۔ اگر تم میرا کہنا نہیں مانو گے تو میں پولیس کو بلاتی ہوں یا تم پر گولی چلا دوں گی"

"مگر مادام آخر معاملہ کیا ہے۔ معاف کیجئے۔ آپ مجھے کچھ تو بتائیے۔ کیا یہ بنڈل آپ کا ہے۔ اور اس میں کیا ہے" اس وقت تک میں نے دیکھ لیا کہ کوٹ کے اندر ان کی بغل میں دبے ہوئے دو تین ویسے ہی بنڈل موجود تھے۔

"تم اپنا پاسپورٹ مجھے دکھاؤ"

"مگر میرا پاسپورٹ تو ہوٹل میں رکھا ہوا ہے"

"اچھا تو تم خدا کے نام پر یہ بنڈل سامنے پھینک کر واپس دور تک چلے جاؤ۔ بس اب میں گولی چلانے والی ہوں" یہ کہہ کر انھوں نے دوسرا ہاتھ جیب میں ڈالا اور کوئی دو تین سو فرانک کے نوٹ زمین پر پھینک دیے۔

"اگر تم چاہو تو یہ روپے بھی لے جاؤ۔ ورنہ میں کہوں گی کہ تم مجھ سے روپے چھین رہے تھے"

پھر ایک لمحے بعد انھوں نے وہ دو بنڈل بھی زمین پر پھینک دیے۔

"اور یہ جان لو کہ میرا ان بنڈلوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اب قانونی طور پر بالکل تنہا ہوں"

میں اس دوران صرف اتنا سمجھ سکا کہ یہ کوئی جاسوس خاتون ہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں ملک ملک

www.taemeernews.com

کے جاسوس سرگرم کار رہتے ہیں مگر میں حیران تھا کہ انھوں نے مجھ سے کلمہ کیوں پڑھوایا۔ ایک سورت کیوں پڑھوائی اور اب مجھے کیا سمجھ کر مرنے مارنے پر تیار ہوگئی ہیں۔ میں نے گھبرا کر واپسی کا فیصلہ کرلیا۔

"بہت اچھا۔ آئی۔ ایم سوری۔ میں نے بنڈل نیچے رکھ دیا۔ میں اجازت چاہتا ہوں۔ لیکن اگر اس تمام قصے کا تعلق کسی اسلامی بات سے ہے تو آپ یقین رکھیے کہ میں کم از کم پیدائشی طور پر ایک مسلمان ضرور ہوں اور یوں ہی اس قضیے میں پھنس گیا ہوں السلام علیکم"، میں چل پڑا۔ "وعلیکم السلام" انھوں نے نہایت فصیح عربی لہجے میں جواب دیا "تمھارا نام کیا ہے اور کہاں رہتے ہو۔"

میں نے اپنا نام اور ہوٹل کا نام بتا دیا اور الٹا واپس ہوگیا مگر آپ جانیں ہیں صرف ایک غزل گو قسم کا سیاح آدمی۔ طرح طرح کے وسوسے مجھے ستانے لگے اور میں نے بار بار مڑ کر پیچھے دیکھنا شروع کر دیا خاصی دیر تک وہ ساکت و صامت کھڑی مجھے دیکھتی رہیں۔ جب میں بہت دور ہوگیا تو انھوں نے ایک ٹیکسی روکی۔ جب وہ بالکل دھندلی نظر آرہی تھیں ——— اور میں بھی انھیں دھندلا نظر آرہا ہوں گا۔ تو وہ مجھے جھکتی ہوئی نظر آئیں اور پلک جھپکتے ٹیکسی میں سوار ہوگئیں۔ ٹیکسی بجلی کی طرح سامنے والی گلی میں مڑ گئی۔

وہ دو تین گھنٹے میں نے اس چھوٹے سے ڈرامے کی گتھیاں سلجھانے میں گزارے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ اس اشاعت گھر میں جاکر تحقیق کی جائے کہ یہ خاتون کون ہیں اور کیا مانگ گئی ہیں پھر میں نے طے کیا کہ میرا پرائیویٹ جاسوسوں کی طرح زندگی گزارنا مناسب نہیں رہے گا۔ کسی نے دو ہاتھ مار دیے تو باقی دانت بھی جاتے رہیں گے کیونکہ برلن میں ایک خاصی معقول داڑھ یوں ہی مفت میں ضائع ہوگئی ہے۔

مگر مجھے اعتراف ہے کہ اگلے دو تین گھنٹے تک خود کو نہایت اہم سمجھتا رہا۔ میں نے اپنا مفلر گلے پر پوری طرح لپیٹ لیا۔ ہیٹ کا چھجا آگے سے کافی نیچے کرلیا، اور کوٹ کے کالر پورے اٹھا لیے اور اپنے آپ کو جاسوسوں یا خفیہ تحریکوں کے گروہ کا ایک فرد محسوس کرنے لگا۔ میری چال بھی بہت سست اور محتاط ہوگئی اور میں نے چھوٹی چھوٹی نسبتاً تاریک گلیوں کے کئی چکر لگائے اور ان میں جو کوئی آتا جاتا اس پر نہایت گہری نظر ڈالی۔ پھر میں تھک کر کھانا کھانے ایک ریستوران میں بیٹھا تو میں نے اپنی ٹوپی بھی نہیں اتاری اور لوگ مجھے بار بار حیرت سے دیکھتے رہے۔

ہنری ملر

دوسری صبح جب میں ناشتے کے لیے باہر نکلا تو سامنے ایک چھوٹی سی کا میں مادام ایک نہایت اجلا اور پیارا لباس پہنے نظر آئیں۔

"سلام علیکم موسیو عالی۔"

"وعلیکم السلام" مجھے بڑی حیرت ہوئی۔

"آئیے ہم ساتھ ناشتہ کریں گے۔"

مادام اپنے ذرائع سے میرے بارے میں تحقیق کر چکی تھیں۔ انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ میں یونیسکو کا ایک ایشیائی تیم ہوں اور لوزان میں اشاعتی طریقے دیکھنے آیا ہوں۔ میرے ہوٹل کا بندوبست یونیسکو نے کیا ہے۔ مجھ سے ملنے جلنے کوئی نہیں آتا۔ میرا پاسپورٹ واقعی پاکستانی ہے۔ غرض یہ کہ میں ایک بالکل بوگس آدمی ہوں۔

وہ بہت خوش تھیں۔ انھوں نے مجھے مختصراً بتایا کہ وہ الجزائری تحریک آزادی میں کسی قسم کا کوئی کام کر رہی ہیں اور کل والا بنڈل فرانسیسی پمفلٹوں کا مجموعہ تھا۔ انھوں نے جس طرح یک دم مجھے اعتماد میں لیا اس سے زندگی میں شاید پہلی بار مجھے اپنے وجود پر اپنی ذات پر ایک چھوٹے سے فخر کا احساس ہوا۔

"میں آپ کو کوئی ایجنٹ سمجھی تھی۔ یہاں ہر طرح کے لوگ گھومتے ہیں نا۔ آپ کوئی بھی ہو سکتے تھے۔ مجھ سے یہ غلطی دوسری بار ہوئی کہ ایک بنڈل گر گیا اور مجھے خبر تک نہ ہوئی۔ ایک غلطی پہلے بھی ہوئی تھی جس کے نتائج بڑے سنگین ثابت ہوئے لیکن یہ بنڈل کوئی خفیہ دستاویز کا نہیں تھا۔ خیر آپ یہ قصہ چھوڑیئے مجھے اپنے بارے میں کچھ بتائیے۔ میں آپ کی شرافت سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔

www.taemeernews.com

شاید آپ ہمارے دستے میں شامل ہو کر کام تو نہیں کر سکتے کیونکہ یہ بڑی جان جوکھوں کے کھیل ہوتے ہیں۔ مگر آپ اپنے ملک میں اس تحریک کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کر سکتے ہیں۔"

میں چپ چاپ شرمندہ سا بیٹھا رہا۔ میں اپنے ملک کے مسائل پر تو زندہ اور آزاد قوموں کی طرح کام نہیں کر سکتا۔ الجزائری جنگ آزادی کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ میرے اپنے ملک میں خاصے آزاد لوگ غلام بنے بیٹھے ہیں۔ سخت معاشی عدم مساوات ہے۔ ایک بڑی آبادی تعلیم سے محروم ہے ایک بڑی آبادی بھوکی مرتی ہے۔ میں اس کے لیے کیا کر رہا ہوں۔ میں نے اس کے لیے کیا کیا ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں اور جو کچھ کر بھی سکتا ہوں کیا وہ کرتا ہوں — !!!

یکایک مجھے الجزائر پر اپنے دوہے یاد آئے۔ میں نے ان کا ٹوٹا پھوٹا ترجمہ مادام کو سنایا۔

"دیکھیے میں تو صرف ادیب ہوں میں نے یہ بارہ دوہے لکھے ہیں۔"

"فقط۔" جب انھوں نے فقط کہا تو اس کا تلفظ ہمارے فقط سے مختلف تھا۔ ہم بولتے ہیں فقط یعنی قاف متحرک ہوتا ہے مگر انھوں نے قاف ساکن بولا۔ میں الجزائری جنگ آزادی بھول کر عربی اور اردو ملفظات کے فرق پر سوچنے لگا۔ بقراط لوگ اسے ریسرچ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں واضح اور شدید اور تکلیف دہ مسائل حاضرہ سے بھاگ کر جن غاروں میں پناہ لی جاتی ہے ان میں ایک غار ریسرچ یعنی علم تحقیق کا بھی ہے۔

"یعنی آپ کے اسلامی ملک میں الجزائر کے لیے کوئی خاص کام نہیں ہو سکتا۔" انھوں نے پھر زور دے کر پوچھا۔

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

مجبوراً میں نے مختصراً ان چندوں وغیرہ کا حال بتایا جو ہمارے ملک میں جنگ الجزائر کے لیے کبھی نہیں کیے گئے۔ ان قراردادوں کا ذکر کیا جو کبھی منظور نہیں ہوئیں کیونکہ ایسی قراردادیں وغیرہ بائیں بازو والے دانش ور ٹائپ کے لوگ منظور کر سکتے ہیں اور ہمارے ہاں بایاں بازو یا غائب ہے یا منسوخ ہو گیا ہے۔ دایاں بازو بے چارہ اپنی ہی تن پروری میں مصروف ہے۔ بہرحال میں انھیں صرف اتنا ہی بتا سکا کہ ہماری حکومت نے الجزائر کی عارضی یعنی باغی حکومت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اس خبر پر وہ بہت خوش ہوئیں۔

"شکر ہے کہ ایک طاقت ور اور بڑا ملک کسی نہ کسی حد تک ہمارے ساتھ ہے۔" انھوں نے

www.taemeernews.com

بڑے خلوص اور جذبے سے کہا۔ میرا جی چاہا کہ میں ان کے گلے سے لگ کر رونے لگوں، پتا نہیں کیوں۔

"آپ دیکھیے کہ امریکی ادیب تک اس تحریک کی امداد کر رہے ہیں۔" انھوں نے شاید بھولے سے کہہ دیا۔

"کون؟ میں چونک گیا۔ امریکہ میں چاچا چاچا کے علاوہ اور کیا رکھا ہے۔ میں نے سوچا شاید ہیمنگ وے ہوگا کیونکہ وہی اسپینی خانہ جنگی میں حریت پسندوں سے ہمدردی کرتا تھا۔

(واضح رہے کہ اس وقت تک میں امریکہ نہیں گیا تھا۔)

"جی نہیں ہنری ملر۔"

"ہنری ملر" مجھے سخت حیرت ہوئی "مگر وہ حضرت تو عریاں نویسی اور گوشہ نشینی کے لیے مشہور ہیں۔"

"جی ہاں وہی ہنری ملر آج اسی لوزان میں بیٹھا ہماری تحریک کے لیے خود اپنا روپیہ بھجوا رہا ہے اور ___ خیر۔"

"مادام برائے خدا مجھے اس سے ملوا دیجیے۔ کیا میں اس سے مل سکتا ہوں۔" میرے دل میں ہنری ملر سے ملاقات کے لیے شعلے بھڑکنے لگے۔

بمشکل مادام مجھے ہنری ملر کا پتا بتانے پر تیار ہوئیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ "پبلک" سے بچنے کے لیے چھپ کر رہتا ہے۔ اور رہنے کی جگہیں بدلتا رہتا ہے۔" اگر وہ مل جائے تو میری قسمت"۔ انھوں نے کہا وہ شام تک اس کا پتا معلوم کر لائیں گی۔

جب مادام رخصت ہوئیں تو میں رو رہا تھا۔ میں ان کے آگے اپنے آپ کو ایک بہت حقیر آدمی سمجھ رہا تھا۔ مجھے اپنی تمام گزشتہ زندگی پر شرم آرہی تھی میں نے اپنی دانست میں جو بڑے یا اچھے اچھے کام کیے تھے وہ مسخرہ پن نظر آرہے تھے۔ میں نے بہت دن بعد بہت ہی دن بعد ایک "بڑا آدمی" دیکھا تھا۔ ایک عورت جس نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال رکھی تھی۔ اور جسے اپنا نام چھپوانا بھی منظور نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے اپوا کی آپائیں یاد آگئیں جو تصویر کھنچوائے بغیر کسی اچھے کام کا لطف نہیں اٹھا سکتیں۔

خیر یہ تقابل بھی مادام گم نام کی سخت توہین ہے۔ ارے بھائی، وہ زندہ لوگ ہیں۔
تم بہو بیٹیاں یہ کیا جانو۔

www.taemeernews.com

اس شام کو جب سورج ڈوب گیا اور رات کے اندھیارے جاگ اٹھے تو مادام مجھے لوزان کی ایک تنگ و تاریک تقریباً "زیرزمین گلی" کے ایک ریستوران میں ملیں۔ ان کے ساتھ چند مشتبہ قسم کے آدمی تھے۔ چند یورپین تھے اور باقی عربی النسل لگتے تھے۔ وہ سب فرانسیسی بول رہے تھے۔ مادام نے میرا کسی سے تعارف نہیں کرایا بس قہوے کی ایک پیالی میرے آگے بڑھادی۔ وہ لوگ آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے تھے میری سمجھ میں دو تین لفظ آئے۔ بن باللہ۔ فرحت عباس۔ او۔ اے۔ ایس۔ ڈیگال۔ بات یہ ہے کہ اس زمانے میں بن باللہ فرانس کی قید میں تھے اور روز کسی مقام سے لوزان کے سامنے والے فرانسیسی قصبے ایوی ان میں فرانسیسی نمائندوں سے مذاکرات کے لیے لائے جاتے تھے۔

"کاش میں اس تحریک کا ایک معمولی سا سپاہی ہوتا۔" میں نے سوچا "کاش۔ کاش۔"

پھر مادام نے ایک آدمی سے کچھ کہا۔ اس نے پنسل سے ایک کاغذ پر مجھے ہنری ملر کا پتا لکھ دیا اور مادام نے مجھے بڑے پیار مگر عجلت سے رخصت کر دیا۔

ایک گھنٹے بعد میں نے ہنری ملر کو جا لیا۔ وہ اوشی پر یعنی جھیل لے مان کے کنارے ایک گندے سے ہوٹل میں مقیم تھے۔ جب میں نے منیجر سے کہا کہ میں ہنری ملر سے ملنا چاہتا ہوں تو وہ بہت حیران ہوا اور اس بات ہی سے انکاری ہو گیا کہ بڑے میاں وہاں مقیم ہیں۔ میں نے کہا اچھا میرا ایک پرچہ اوپر بھیج دو اگر وہ خود نہ ملنا چاہیں تو میں واپس چلا جاؤں گا۔

"میں ایک پاکستانی شاعر ہوں، میں نہ صحافی ہوں جسے آپ کا انٹرویو لینا ہو، نہ کسی FAVOUR یعنی کرم کا طلب گار ہوں، نہ آپ کا عقیدت مند ہوں جو ایک نظر آپ کو دیکھنے یا بات کرنے کا متمنی ہو بلکہ خود ایک بہت بڑا اور یعنی مغرور ادیب ہوں مگر بس آپ سے بات کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

یہ پرچہ لکھ کر میں نے اوپر بھیجا۔ چند لمحے بعد ایک ٹھگنے قد کا بڈھا ٹائی باندھتا ہوا نیچے آیا۔ اس نے اوور کوٹ شانوں پر ڈال رکھا تھا۔

"وہ پاکستانی شاعر کون ہے؟" اس نے منیجر سے پوچھا

"میں۔ مسٹر ملر مجھ سے ملیں گے یا نہیں" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہاں ہاں او بیوقوف، میں خود ہنری ملر ہوں" یہ کہہ کر اس نے میرے شانے پر زور سے ہاتھ مارا اور ہنسنے لگا۔

"تو تم بہت مغرور ادیب ہو۔ ہوں! کس زبان میں لکھتے ہو۔ میں نے تو تمھارا نام سنا نہیں"

www.taemeernews.com

میں نے بتایا کہ اردو دُنیا کی اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق پانچویں سب سے بڑی زبان ہے، یہ الگ بات ہے کہ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ میں اردو میں کم از کم پانچویں نمبر کا عظیم ادیب ہوں۔

پتا نہیں اسے یقین آیا یا نہیں۔ شاید نہیں آیا مگر وہ مجھے ساتھ لے کر گھومنے نکل گیا۔

جب ہنری ملر نے میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چہل قدمی شروع کی تو میں اپنے آپ کو بہت IMPORTANT یعنی اہم آدمی سمجھنے لگا۔ مجھے اپنے وہ سب معاصرین یاد آئے جو اخلاقاً تو میرے شعر و عر کی تعریف کر دیتے ہیں مگر اصل میں مجھے نہایت بوگس شاعر سمجھتے ہیں۔ وہ افسر بھی یاد آئے جن کی تنخواہ یا سینیارٹی مجھ سے دو چار یا دس قدم آگے ہے۔ یا جو میری سروس سے بہتر سروس میں صوبائی نمائندگی یا سیاسی گٹھ جوڑ یا "بڑی" رشتے داری وغیرہ کی وجہ سے بھرتی ہو گئے اور اس بنا پر مجھے (اور سب 'دوسروں کو') ایک حقیر کیڑا سمجھتے ہیں اور غوں غاں کرتے رہتے ہیں۔

(تحریر کی خوبی دیکھیے کہ میں ان افسران کا حوالہ نہیں دے رہا جو اپنی ذاتی لیاقت کی بنا پر میری سروس سے بہتر سروسوں میں گئے ہیں۔ اسی کو ادبی صداقت پر صحافت کے مہلک اثرات کہا جاتا ہے) تو مجھے سب ایسے لوگ یاد آئے جو مجھے نہیں مانتے اور میں نے سوچا کاش ہنری ملر مجھے شانہ بشانہ لے کر میرے ملک میں چلتا یا کسی ایسے ملک میں چلتا جہاں لوگ کم از کم اسے پہچانتے تاکہ وہ میرے بارے میں جستجو ہی کرتے آخر ہمارے ملک میں جو کم نام یا گم نام حضرات (اور خواتین) عمائد و مشاہیر اور وزرا اور صدروں کے ساتھ آگے بڑھ بڑھ کر بلکہ بعض اوقات فوٹو گرافروں سے سازش کر کے تصویریں کھنچواتے اور چھپواتے اور پھر اپنے گھروں کی بیٹھکوں (یعنی ڈرائنگ روم) میں نمایاں طریقے سے آویزاں کرتے ہیں تو یہ ایک فطری بات ہے نا، پھر آخر میں کیوں اس فطری احساس کو کامپلیکس سمجھوں۔ یہ سالا اتنا مشہور و معروف بڈھا مجھے لوزان کی اندھیری اور ویران سڑکوں پر لیے پھر رہا ہے تو مجھے اس سے کیا فائدہ۔ نہ قدر دان نہ فوٹو گرافر نہ پبلسٹی!!!

"دیکھو ہم جھیل کے کنارے کنارے تاریک راستوں پر چلیں گے تاکہ لوگ مجھے پہچان کر بات چیت میں نہ الجھالیں" یکایک ہنری ملر نے خود کہا۔ میں چونک گیا۔ کیا اس نے میرے دل کا چور پکڑ لیا تھا یا اس نے واقعی ایک یک طرفہ قسم کی معصومانہ بات کہی تھی۔

دنیا عجیب تماشا ہے۔ ایک آدمی ہے کہ شہرت سے تنگ آگیا ہے۔ ایک آدمی ہے کہ کسی نہ کسی

www.taemeernews.com

بہلانے شہرت چاہتا ہے۔ پیٹ بھرے اور بھوکے ہر شعبۂ زندگی میں ہوتے ہیں۔

پھر مجھے اپنا مشن یاد آیا جو میں اضطراری طور پر اپنے بنیادی چھٹ پن کی وجہ سے بھول گیا تھا۔ ارے میں اس بڈھے سے شہرت کی خاطر یا تعلقات بڑھانے کی خاطر ملنے تھوڑا ہی آیا تھا مجھے تو اس کی الجزائری تحریک آزادی میں حصہ لینے کا شوق اس سے ملنے پر بھڑکا رہا تھا۔ اوہو۔ ملاحظہ فرمایئے آدمی کیسے نوبل یعنی با عزت مقدس اور پوتر مقاصد لے کر چلتا ہے اور کیسی کیسی دلدلوں میں پھنس جاتا ہے۔ چلیے آپ برا نہ مانیے آپ نہیں پھنستے ہوں گے۔ دس کروڑ پاکستانیوں میں سے کوئی نہیں پھنستا ہوگا، سب مقدس، منزہ، پوتر مقاصد لے کر چلتے ہیں اور کسی دلدل میں نہیں پھنستے، میں اکیلا مجرم ہی، سو ہوں، سفرنامہ بھی تو میرا ہے اور یہ مشہور مصرع بھی نہایت غلط ہے کہ:

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا

آمدم بر سر مطلب (گو ذرا دیر لگ گئی)

"مسٹر، آپ الجزائریوں کی مدد کیوں کر رہے ہیں۔" میں نے دل کڑا کر کے اپنے وعدے سے خلاف انٹرویو شروع کر ہی دیا۔

"میں کس سالے کی مدد کر رہا ہوں۔" اس نے تقریباً ایک موٹی سی گالی دی۔ "میرا سیاست سے کیا تعلق۔ اگر تمھیں یہ بکواس کرنی ہے تو یہیں سے واپس ہو جاؤ۔"

میں نے بھی غصے میں ایڑی ماری اور واپس ہونے لگا "گڈ بائی" میں نے زور سے اور جلدی سے کہا۔

"گڈ بائی" اس نے بھی غصے سے کہا۔ "او لونڈے تو بالکل گدھا ہے اور گدھا ہی رہے گا تو فراڈ بھی معلوم ہوتا ہے، پتا نہیں تجھے کس حرامزادے نے میرا پتا بتا دیا۔"

گالی سن کر ایک دم میرا جی چاہا کہ میں پلٹ کر ایک گھونسہ ماروں۔ چھوٹے قد کا نحیف بڈھا جواب بھی نہیں دے سکتا۔ میں یکایک غصے کے عالم میں مڑ گیا اور تیزی سے اس کی طرف واپس ہوا۔

"اچھا تو اب مجھ پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ ابے تم ایشیائی مرچ کھانے والے اتنے جذباتی کیوں ہوتے ہو۔"

میرے قدم رک گئے۔ وہ آہستہ آہستہ خود میرے قریب آیا۔

"اچھا فرض کرو تم مجھے مار بیٹھو" اس نے اطمینان سے بولنا شروع کیا۔ "... ظاہر ہے کہ خوب مارو گے۔ میں کمزور ہوں زمین پر گر جاؤں گا۔ تمھیں اپنی طاقت کا زعم بڑھ جائے گا۔ اور پھر تم جوش میں اندھے ہو جاؤ گے اور شاید میرے لاتیں بھی مارو۔ میرے سخت چوٹیں لگیں گی۔ اگر کوئی بچانے نہ آیا تو میں پڑا

www.taemeernews.com

رہ جاؤں گا اور تم بھاگ جاؤ گے۔ پھر تم رات تک لوزان سے جنیوا اور وہاں سے کسی اور ملک کی طرف بھاگ جاؤ گے۔ مجھے ابھی طرح تمھارا نام بھی یاد نہیں ہوا ہے۔ تم کبھی گرفتار نہیں ہوسکو گے ثبوت و بیت کا چکر بھی تو ہوتا ہے نا۔ قانون سب جگہ گواہی مانگتے ہیں۔ وہ میں کیسے دوں گا۔ پھر کیا ہوگا تم آزاد مزے سے گھومو گے میں ہسپتال میں دو چار ہفتے رہ کر نکل آؤں گا یا مر جاؤں گا۔"

میں چپ رہا۔

"یہی ہوگا نا۔" اس نے زور دے کر پوچھا

میں اب بھی چپ رہا۔

"اس سے تمھیں جو فوائد حاصل ہوں گے ذرا وہ گنوا دو۔ میں کوئی کھو نسے بازی کا عالمی چیمپئن تو ہوں نہیں جو تم یہ کہتے پھرو کہ میں نے عالمی چیمپئن کو مار گرایا۔ میں تو ایک بڈھا سڑی بدمزاج ادیب ہوں تمھیں کس قسم کے فخر یا اطمینان کا احساس ہوگا۔"

میں اب بھی چپ رہا مگر اب وہ تیز ہوگیا۔

"ابے لونڈے۔ الو۔ جانتا ہے کہ اگر تو مجھے اس وقت مار گرائے گا تو فتح میری ہوگی اور تیری شکست اتنی بڑی ہوگی کہ تو تمام عمر روئے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے زور سے ایک دھپ میرے مارا اور میرا ہاتھ کھینچ کر بیٹھا تھ لے لیا۔ میں ایک فرمانبردار گائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ بہت دیر تک ہم کچھ نہ بولے بلکہ میری تو سوچنے کی قوت بھی ماؤف ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ میں ایک غبی یعنی کند ذہن آدمی ہوں آپ سوچیے کہ اس سب کا مطلب کیا نکلتا ہے افراد بالا سوچیں حاکمان با اختیار سوچیں۔ ڈنڈ پیلنے والے جیدار سوچیں یعنی طاقت کا استعمال کرنے والے سوچیں۔ مجھے تو صرف اتنا یاد ہے کہ میں پانچ فٹ ساڑھے آٹھ انچ کا تگڑا اور کڑیل جوان ایک کمزور بڈھے کے معاملے میں:

گالیاں کھا کے بے مزا تو ہوا

مگر کچھ کہہ نہ سکا کچھ کر نہ سکا بس ایک سدھی ہوئی گائے کی طرح اس کے ساتھ ہوگیا ـــ

رات کے کھانے پر اس نے اپنا ہاتھ میرے سامنے کھول دیا۔

"اچھا غور سے دیکھو اور میری موت کا وقت مقام اور سبب وغیرہ بتاؤ۔"

"میں نے آپ سے کب کہا کہ میں ہاتھ دیکھنا جانتا ہوں۔"

"ارے بیوقوف تم ایشیائی نہیں ہو۔ ہندوستان پاکستان کے سب آدمی ہاتھ دیکھنے کے لئے مشہور ہیں۔

www.taemeernews.com

تمھارے ہاں نجومی نہیں ہوتے۔ تم لوگ زائچے نہیں بناتے۔"

"یہ سب زیادہ تر ہندوؤں میں ہوتا ہے میں تو مسلمان ہوں۔"

"ارے ہوگے تم مسلمان مگر تم ہاتھ دیکھنا ضرور جانتے ہوگے۔ سب اُدھر والے ہاتھ دیکھتے ہیں۔"

"میں نہیں جانتا" میں نے جھجک کر کہا "میرا اس پر اعتقاد بھی نہیں ہے۔"

"ہائیں بیوقوف۔ اعتقاد بھی نہیں ہے۔ پورے انڈین فلسفے کی توہین کرتا ہے۔"

"میں انڈین نہیں ہوں۔"

"ارے انڈیا پاکستان کا قصہ چھوڑ، سچ بتاؤ تم لوگ بچپن سے ہاتھ دیکھنا نہیں سیکھتے۔"

"نہیں۔"

"اوہو۔ مجھے اُدھر آنا پڑے گا۔ میں اُدھر آنا چاہتا ہوں۔ مگر بس نہ جانے کیوں یورپ سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ بھئی میں تم لوگوں کو دیکھنا اور سمجھنا چاہتا ہوں۔ اچھا تو لاؤ میں تمھارا ہاتھ دیکھوں۔ میں نے تو اس مضمون کو خوب پڑھا ہے اور میں نے بدھ فلسفے کو بھی خوب پڑھا ہے۔"

اب مجھے مزا آنے لگا کہ اتنا بڑا اور تجربے کار آدمی بدھ فلسفہ جیسے مضمون کو نجوم، جوتش، علم جفر اور ریکھاؤں کے تماشے میں کیسا گڈمڈ کر رہا ہے۔ یہ شخص کبھی برصغیر ہند و پاک میں رہا ہی نہیں، ورنہ اسے آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا۔ یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے برصغیر میں سب بدھ فلسفے سے واقف ہیں اور صبح شام ہاتھ دیکھتے اور ستاروں کی چالیں شمار کرتے رہتے ہیں۔

پھر اس نے میرا ہاتھ دیکھا۔ خوب حساب لگائے۔ ایک موٹا شیشہ اپنے کمرے سے لایا اور ایک کتاب بھی، میرے ہاتھ کی ریکھائیں دیکھتا اور کتاب پڑھتا، مجھ سے سوالات کرتا جاتا اور حساب لگاتا۔

مگر جو باتیں اس نے مجھے بتائیں وہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گا کیونکہ یہ قصہ مشہور امریکی ادیب ہنری ملر کا ہے۔ مجھ غریب پاکستانی چھٹ بھیّے کا نہیں۔

ہم نے ادب کے علاوہ ہر موضوع پر باتیں کیں۔ ادب پر بات کرنے کا میں یوں بھی اہل نہ تھا ـــــ نہ ہوں ـــ ویسے اصولاً ہر آدمی ہر بات کرنے کا اہل ہوتا ہے کیونکہ جمہوریت کے معنی بھی یہی ہیں کہ دفاع اور اقتصادی منصوبہ بندی، ادب اور ایٹمی توانائی کے بارے میں ہر آدمی کو اپنا فیصلہ دینے کا حق ہو۔ یہ جو "ماہرین" اور "ٹکنیکل" اور اسپیشلسٹ لوگوں کے طبقے پیدا ہوگئے ہیں یہ سب غیر جمہوری اقتدار کی علامات ہیں۔ بہرحال شاید یہ میرا اپنا احساسِ کمتری تھا یا ہنری ملر کی ہوشیاری کہ ادب کی بات نہ ہونے پائی۔

www.taemeernews.com

ہم برابر ملتے رہے وہ ایک بہت خوبصورت، پاک، منزہ اور عظیم آدمی ثابت ہوتا رہا، وہ آدمی جس کی کتابیں اب جا کر امریکی سپریم کورٹ کے فیصلوں کے بعد امریکہ میں چھپی ہیں اور جس کا نام نقش نگاری میں پہلے نمبر پر لیا جاتا ہے اور جس کی بیشمار سوانح عمریاں متعدد زبانوں میں چھپ چکی ہیں، اپنی بہت بڑی آمدنی کا بہت بڑا حصہ الجزائری حریت پسندوں کو دے رہا تھا اور انگولا بھجوا رہا تھا اور ..... اور .....

یہ اس کے راز ہیں۔ اس کا نام "فہرست چندہ دہندگان" میں کبھی نہیں آیا!!!

واضح رہے کہ خود مجھے آدم جی اور داؤد ادبی انعامات کے منتظم کی حیثیت سے صدر پاکستان کے سامنے ان خانوادوں کے پچیس پچیس ہزار سالانہ کی خطیر امداد پر ہر سال بار بار خراج عقیدت پیش کرنا پڑتا ہے:

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

ترجمہ: راہوں کا فرق دیکھو کہاں سے کہاں تک ہے۔

مگر اس فارسی مصرع سے کام نہیں چلے گا۔ شکوہ جواب شکوہ مصنفہ علم خود ملاحظہ ہو۔

شکوہ: بہت نم ہے یہی مٹی اسے زرخیز کر ساقی

جواب شکوہ: خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی

نوحہ بطرز قوالی: کیا کیا نہ کیا گلڈ میں کیا کیا نہ کریں گے

معذرت برائے ریکارڈ و حوالہ جات مستقبل:

ہائے مجبوریاں زمانے کی

چلیے اپنی تو چھٹی ہوئی "ہائے مجبوریاں زمانے کی" مگر ہنری ملر الجزائری جنگ آزادی اور انگولا کی جنگ آزادی اور .... میں دامے درمے کیوں حصہ لے رہا ہے جبکہ وہ سوشلسٹ بھی نہیں ہے اور سیاسی آدمی بھی نہیں ہے اور اسے اپنی سیاسی پبلسٹی کا شوق بھی نہیں ہے۔

"وہ اس لئے کہ میں ایک انسان ہوں اور میرے پاس میری ضرورت سے زیادہ روپیہ آتا ہے۔ فرض کر دمیں الجزائری ہوتا تو میں فرانسیسیوں کے جنگل میں پھنسا ہوا کیا سوچ رہا ہوتا۔ میں اس ہنری ملر اور سارے ہنری ملروں کو گالیاں دے رہا ہوتا جو میری مدد کو نہیں آتے۔ اگر میں انگولا کا کالا افریقی ہوتا تو پرتگالیوں کے ظلم وستم برداشت کرتے کرتے کیا مجھے یہ خیال نہ آتا کہ یا الٰہی یہ باقی دنیا کیا کر رہی ہے؟"

خواتین حضرات! کیا آپ ہنری ملر کی وضاحت سے اتفاق کرتے ہیں؟ جو اتفاق کرتے ہیں وہ سیدھا ہاتھ

www.taemeernews.com

اٹھائیں مگر یاد رکھیں کہ انھیں امریکی ماہرینِ جبلتی بایاں بازو قرار دیں گے۔ اس لیے آجکل مناسب یہ ہے کہ آپ کوئی ہاتھ ہی نہ اٹھائیں۔ بلکہ صرف گردن ہلا دیں۔

ظاہر ہے کہ میں ذاتی طور پر اس وضاحت سے اتفاق نہیں کرتا بھئی واہ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ میں کبھی چار پیسے جوڑنے کے قابل ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ دنیا سالی تو بہت بڑی ہے کسی نہ کسی حصے میں جنگِ آزادی ہوتی ہی رہے گی، لوگ کہیں نہ کہیں بھوکے مرتے ہی رہیں گے۔ شاید خود میرے محلے میں، میرے گاؤں، میرے ضلع، میرے شہر، میرے ملک میں بہت سے لوگ بھوکے ہیں، ننگے ہیں، یہ بھی تو ایک طرح کی غلامی ہے نا، تو اب میں سینما نہ دیکھوں بلکہ تین روپے بچا کر یتیم خانے میں بھیج دوں، کار نہ خریدوں بلکہ پندرہ بیس ہزار روپے کسی کار خیر پر ضائع کر دوں تاکہ کوئی میرا اسٹیٹس یعنی سماجی حیثیت ہی تسلیم نہ کرے۔ عمدہ گرم کپڑے نہ بناؤں تاکہ جمخانے کے بیرے شام کو اور افسر لوگ دن کو مجھے اپنے احاطوں میں گھسنے ہی نہ دیں۔ واہ بھئی بہتری طرح واہ، یہ خوب کہی کہ انسان کو انسان کی مدد کرنی چاہیے۔ آخر حکومتیں کس لئے ہیں بھئی جی یہ باتیں تو ہم مذہبی کتابوں میں بھی پڑھ آئے ہیں۔ یہ نہیں چلیں گی۔

"ایک دن وہ ضرور آئے گا" وہ جیسے بیچ میں سے بولتا ہے "ایک دن وہ ضرور آئے گا جب سب ملک آزاد ہوں گے اور پھر سب ملکوں کے ذرائع پیداوار آزاد ہوں گے یعنی چند ہاتھوں کے قبضے میں نہیں رہیں گے۔ اور ان ذرائع کی منصفانہ تقسیم ہوگی۔" واہ بڈھے یہ تو تو عالمی حکومت کی بات کر رہا ہے یعنی پوری دنیا کی ایک با انصاف گورنمنٹ جو پوری دنیا کے ذرائع پیداوار یعنی دولت کا ایک ایسا بجٹ بنائے گی کہ کوئی انسان ننگا بھوکا نہیں رہے گا۔ بھئی واہ اسی کو انگریزی میں یوٹوپیا (UTOPIA) یعنی خیالی پلاؤ پکانا کہتے ہیں۔ ابھی آزاد ملکوں میں تو منصفانہ تقسیم ہوتی نہیں ہے۔ غلام ملکوں کو آزاد اور پھر ترقی یافتہ ہوتے کتنی صدیاں لگیں گی۔ ابھی اقوام متحدہ میں کشمیر کا مسئلہ تو طے کرنے کی طاقت ہے نہیں — ساری دنیا کی ایک گورنمنٹ کیسے بنے گی، کب تک بنے گی اور اگر میرے سامنے نہ بنی اور مجھے کوئی فائدہ نہ ہوا تو میں اپنی کار بیچ کر اپنی عزت کیوں خراب کروں۔

"بڈھا سٹھیا گیا ہے" میں نے سوچا۔ مگر کیا میں اقرار کروں کہ اس دن سے میں بھی سٹھیا گیا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے اپنی کار اب تک نہیں بیچی اور میرے کپڑے اب بھی قیمتی ہوتے ہیں۔

www.taemeernews.com

عاشق ہو کر بھاگ گیا

پھر ایک دن ہنری ملر نے مجھے اپنے پرائیویٹ بنگلے کی چابی دے دی۔ میں نے کہا تھا کہ میری ایک "عظیم تصنیف" نامکمل پڑی ہے اور میں کسی گوشۂ سکون کی تلاش میں ہوں۔ اب تک وہ یہ جان چکا تھا کہ میں کسی عظیم تصنیف کا اہل ہی نہیں ہوں۔ پھر بھی اس نے مجھے اپنے ایک پرائیویٹ بنگلے کی چابی دے دی۔ یہ بنگلہ لوزان سے اسّی میل دور اوپر پہاڑوں میں تھا' چاروں طرف برف جمی ہوئی تھی بلکہ اس کی چھت پر بھی برف جمی ہوئی تھی جسے مہینے میں ایک بار کوئی ٹھیکیدار صاف کرتا تھا تاکہ چھت ٹوٹ نہ جائے۔ اُس نے خود میرے لیے سامان خور و نوش خریدا' مکھن توس' جما ہوا گوشت' بہت سارے انڈے مرغیاں کوئی تین سو روپے کا سامان۔ ایک گرم ٹوپی بھی خرید کر دی۔ دستانے بدلوائے۔ ایک پرچہ محافظ کے نام لکھا کہ یہ میرے مہمان ہیں اور یہ بھی لکھا کہ ہو سکے تو انھیں برابر کے گاؤں والی دو چار خواتین سے ملوا دینا تاکہ یہ کبھی کبھار اُن سے مل لیا کریں۔

جب وہ خواتین سے تعارف کے فقرے لکھ رہا تھا تو میری طرف آنکھ اٹھا کر مسکرایا۔

"بیٹا ان سے کوئی بیہودہ حرکت مت کر بیٹھنا۔ فوراً جوتے پڑ جائیں گے' یہ بڑے خوش اخلاق مگر سخت لوگ ہیں۔"

پھر وہ رک گیا: "مگر ہاں تم نوجوان آدمی ہو گندمی رنگ یہاں ذرا پسند بھی کیا جاتا ہے۔ تمھاری آنکھوں میں ایک غمزدگی کا تاثر بھی ہے شاید تمھارا ایشیائی جادو چل جائے۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے آنکھ ماری جنگ الجزائر میں حصہ لینے والا امیر امریکی بوڑھا کیا بھر پور انسان تھا۔

وہ کٹیا بہت ٹھنڈی تھی۔ وہ گاؤں والیاں سخت بور اور بھدی نکلیں۔ ان کی ناکیں سرخ تھیں اور وہ انگریزی بالکل نہیں بول سکتی تھیں۔ میں ان سے صرف ایک بار ملا۔ انھیں دس انڈے دے کر پچاس سگریٹ لیے کیونکہ انھیں پیسے نہیں بلکہ انڈے چاہئیں تھے۔ اور نیچے یعنی آبادی تک آنے میں پیسوں اور وقت کا نقصان

www.taemeernews.com

تھا اس لئے ہم نے بارٹر تجارت کی۔ میں سگریٹ بھول گیا تھا۔ ان کی دو مرغیاں مر گئی تھیں۔

میں اس کُٹیا میں تین دن رہا۔ محافظ روز میرے پاس مرغی کھانے اور ناشتہ اور کھانا پکانے آجاتا تھا یعنی میرے لئے کھانا پکا کر معاوضے میں میرا مہمان ہو کر میری مرغی کھاتا تھا۔ اور مجھے سوئستانی مذہبی رہنماؤں اور رومانوں کے قصّے سناتا تھا۔ اس کی انگریزی خاصی رواں تھیں مگر اسے سوئٹزرلینڈ، فرانس، انگلستان اور امریکہ کے علاوہ اور کسی ملک کے متعلق اتنا ہی معلوم تھا جتنا مغربی ماہرین ایشیا کو ایشیا کے متعلق معلوم ہے۔

وہ محافظ صرف دو وقت آتا تھا۔ دن تو خیر جیسا تیسا گھوم پھر کر کٹ جاتا تھا لیکن رات کو مجھے اکیلے میں بہت ڈر لگتا تھا۔ پہلی رات تو بہت ہی خطرناک طور پر ڈر لگا۔ باہر برفیلی ہوا زور زور سے چلتی تھی۔ سردی ماسکو جیسی اور آتشدان نہایت فرسٹ کلاس تھا۔ مگر اس میں بار بار لکڑی ڈالنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ بستر میں چار کمبل تھے مگر لحاف کا مزا کہاں میں نے اوورکوٹ بھی اوپر ڈال لیا۔ یہاں تک کہ دوسری مسہری بھی اپنے اوپر الٹی کر کے بچھالی تاکہ بوجھ سے گرمی پیدا ہو اور کسی نہ کسی طرح صبح ہو گئی۔ دوسرے دن محافظ چار کمبل اور دے آیا مگر اس رات آٹھ کمبلوں کا بوجھ بہت لگا۔ بار بار طرح طرح کے خواب دیکھے۔ تیسری صبح جب میں دو انڈے دو توس اور محافظ مرغی کی دو ٹانگیں کھا چکا اور وہ شام کے لیے کسی "تفریح" کا انتظام کرنے کا وعدہ کر کے چلا گیا تو مجھے نہ جانے کیوں ایک دم ہر طرف سے بالکل اطمینان ہو گیا۔ میں برفانی اور چپ چاپ پگڈنڈیوں پر دور تک چلتا رہا۔ اور جب واپس آیا تو ذرا تھکن کا احساس نہیں ہوا۔ مجھے اس وقت کوئی فکر نہ تھی۔ میں اپنے گھر اپنے بچوں اپنے ملک کو بھول چکا تھا۔ یونیسکو اور اس کے فیلوشپ کو بھول چکا تھا۔ ہنری ملر کو بھول چکا تھا۔ یہ بھی بھول چکا تھا کہ یہ کٹیا یہ بنگلا مجھے عارضیاً ملا ہے۔ میں اس تنہائی میں ایک آزاد آدمی ایک بادشاہ کی طرح گھوما جیسے ایک طاقتور باز آسمان کی پہنائیوں میں پرواز کرتا ہو۔ میں نے دُنیا تیاگ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب سارے علائق چھوڑ کر اکیلا صحراؤں اور ویرانوں اور برف پوش پہاڑوں میں رہا کروں گا اور بڑے بڑے انقلابی خیالات تحریر میں لا کر سال میں ایک بار کراچی بھیج دیا کروں گا۔ کسی کو دس دفعہ غرض پڑے گی تو چھاپ دے گا نہیں تو میرا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ بدقسمت لوگ خود میرے خیالات زریں سے محروم رہیں گے۔

شام ہوتے ہوتے میں اپنے مستقبل کا فیصلہ کر کے پوری طرح مطمئن ہو چکا تھا اور بنگلے میں داخل ہو کر آرام کرسی پر اس طرح پاؤں پھیلا دیئے تھے گویا اب یہاں سے اُٹھنا ہی نہیں ہے۔

مگر پھر ایک دم احساس ہوا کہ سگریٹ ختم ہو چکے ہیں۔ سامنے آتشدان میں دو چار ٹوٹے پڑے ہوئے تھے وہ کب تک چلیں گے۔ کھانا دیکھا تو ابھی دو تین دن اور گزر سکتے تھے مگر سگریٹ، سگریٹ کا کیا ہوگا۔

www.taemeernews.com

بجلی کی طرح میں نے اپنا سامان باندھا اور سامنے گاؤں کی طرف بھاگا تاکہ لوزان جانے والی بس پکڑ لوں بس آدھے گھنٹے بعد آئی اور اتنی دیر میں نے تقریباً ہر نظر آنے والے مرد اور عورت سے سگریٹ مانگا اور صرف ایک بڑی بی نے ایک گیلا سگریٹ عنایت کیا۔

لوزان پہنچ کر میں بھاگم بھاگ ہنری ملر کے ہوٹل پہنچا تو وہ غائب تھا۔ ہوٹل والے نے کہا وہ کسی دوسرے ہوٹل میں چلے گئے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ آپ کا پتا لے لیا جائے۔ وہ خود فون کر کے معلوم کر لیں گے۔

دوسرے دن بالکل صبح ہنری ملر نے مجھے فون کیا اس کی آواز بھاری سی تھی۔

"ہلو ہنری" میں بے اختیار چیخا۔ "میں آ گیا ہوں۔ تم کہاں ہو؟ میں تم سے ملنے کے لئے بیتاب ہوں۔"

"تم خیریت سے ہو" اُس نے سرد مہری سے پوچھا

"ہاں میں اچھا ہوں مگر میں تم سے ابھی ملنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں نہیں میں تم سے نہیں مل سکتا۔ میں صرف اسی کا منتظر تھا کہ تم واپس آجاؤ۔ اب میں اس شہر سے جا رہا ہوں میں تم سے ملنا نہیں چاہتا۔ میں تم سے ڈرنے لگا ہوں، مجھے تم سے نفرت ہو گئی ہے۔"

"خدا کے لئے مسٹر ملر" میں گڑگڑانے لگا۔ "خدا کے واسطے ایک بار مجھ سے مل لو۔ میں تم سے بہت تھوڑی سی باتیں کروں گا، میں تمھارا بہت ممنون ہوں۔ مجھے تمھاری چابی بھی واپس کرنی ہے آخر میں نے تمھارا کیا قصور کیا ہے" میں تقریباً چیخنے لگا "مجھے تم سے بہت عقیدت ہو گئی ہے۔ بڑے مصنف میں تمھارا ادنیٰ نیاز مند اور قدردان ہوں تم مجھ سے کیوں نفرت کرتے ہو۔"

"چابی کو جھیل لے مان میں پھینک دو۔ میں اب اس دنیا میں نہیں جاؤں گا۔ تو ایشیائی ہے ایشیائی تم کیسے ہو تم مجھے چھوڑ کر آرام کرنے میرے ہی بنگلے میں گئے اور یہ نہ سوچا کہ مجھے تم سے گہری دلچسپی ہو گئی تھی۔ تم نے مجھ سے بنگلا کیوں مانگا۔ تم نے میری آنکھیں نہیں دیکھی تھیں۔ خود غرض بے وقوف۔"

"مگر مسٹر ملر۔ پلیز۔ خدا کے لیے ایک بار مجھے صفائی کرنے دو۔ میں بے گناہ ہوں۔ پھر بھی معافی مانگنے پر تیار ہوں۔ مجھ سے نفرت نہ کرو۔ خدا کے لیے۔"

"شٹ اپ یو فول۔ اب میں تم سے نہیں مل سکتا۔ مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔ او یو فول۔ الو گدھے کیا تم اب تک یہ نہیں سمجھے کہ مجھے تم سے سخت محبت ہو گئی ہے۔ تم میری کمزوری بنتے جاتے تھے۔ اب میں تمھارا پتا ایک دم کاٹ کر اس ملک سے جا رہا ہوں اور اگر تم مجھے ڈھونڈنے ابھی فرانس گئے تو میں پہنچنے کا پتہ ٹیلی گرام سے بھیجوں گا۔ پھر ملنا۔ MY LOVE میرے پیارے گدھے۔ اگلے برس یا اس سے اگلے برس جب میں تمھیں بھول

www.taemeernews.com

جاؤں۔ گڈبائی۔ گڈبائی " آواز دھیمی پڑ گئی اور ٹیلیفون بند ہوگیا اور میں روتے روتے خود لوزان سے زیورک روانہ ہوگیا جہاں چند روز ٹھیر کر مجھے امریکہ جانا تھا۔

www.taemeernews.com

زیورک اور جوتے

وہ پرواز پون گھنٹے کی تھی اور خوشگوار تھی جہاز گرم اور آراستہ تھا۔ ائر ہوسٹس بقول کسے فس کلاس تھی ساتھی اور ساتھنیں سب دیکھنے اور دکھانے کے قابل مگر مجھے بڈھا بنری ملر اس طرح یاد آرہا تھا کہ میں اس پرواز کا لطف نہ اٹھا سکا۔

لوزان سے زیورک ریل بھی جاتی ہے اور سڑک بھی مگر وہ رستہ کوئی بارہ چودہ گھنٹے کا ہے میں اتنا گھبرا گیا تھا کہ لوزان سے سیدھا جنیوا آیا۔ جنیوا کے اسٹیشن ہی پر ہوائی جہاز کی گاڑی مل گئی۔ ائرپورٹ پہنچا اور چند لمحے میں زیورک کی طرف اڑنے لگا۔

پہلے نیچے سُرخ سُرخ رنگ کی چھتوں والے مکان نظر آئے۔ شاطولینی بنگلے۔ ہرے ہرے کھیت بہت گہرا سبزہ بہت سُرخ پھول بہت تروتازہ فصلیں اور پھر جہاز اونچا ہوتا گیا اور سوئٹزرلینڈ کی بالکل وسطی سمت میں پرواز کرنے لگا جہاں اس ملک کا جرمن شہر یعنی زیورک واقع ہے۔

اس وقت بہت سی ننگی بھوری چٹانیں نظر آئیں ان پر برف نہیں تھی اور وہ بالکل تنہا تھیں آس پاس یا نیچے وادیوں میں آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ جہاز بہت اونچا نہیں جا رہا تھا کوئی پندرہ سولہ ہزار فٹ ہوگا۔ سب کچھ صاف نظر آتا تھا۔ ان بھوری ننگی پہاڑیوں کی چوٹیاں صاف نظر آ رہی تھیں اور مجھے اپنی تنہائی اپنے اکیلے پن کا احساس شدید تر ہو گیا مگر بعد مجھے ایک دم ان بھوری بھوری بے جان چٹانوں سے حسد ہونے لگا۔ حسد آپ جانتے ہیں ایک انسانی کمزوری ہے کسی کو کسی سے بھی حسد ہو سکتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ دیکھا جائے تو دنیا کا کاروبار حسد پر قائم ہے جسے کبھی صحت مند مقابلے کا نام دے دیا جاتا ہے کبھی انقلاب کا۔ مجھے اصولاً کسی سے حسد نہیں ہونا چاہیے کیونکہ حسد کرنے والے کو اپنے بارے میں کچھ نہ کچھ اعتماد یا خوش فہمی ہونی چاہیے تب جا کر وہ حسد کو بُرا سمجھنے اور کہنے کے قابل ہوتا ہے اور یہاں اپنی کیفیت یہ ہے کہ بقول سابق شاعر جمیل الدین عالی مرحوم:

www.taemeernews.com

کسی میں عیب نکالیں تو کیا کہ ہم اپنا
ز فرق تا بہ قدم کر چکے ہیں نظارا

مگر علمائے نفسیات یہ بھی فرما گئے ہیں کہ حسد کرنے کے لئے ضروری نہیں کہ آدمی یعنی حسد کرنے والا معقول اور متوازن اور صاحب اہلیت بھی ہو بلکہ کبھی کبھی لوگ ایک دم بے وجہ بھی حسد کرنے لگتے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں ان اکیلی بھوری پہاڑی چٹانوں سے حسد کرنے لگا۔ میرے دل میں ان کے خلاف نفرت کے شعلے بھڑکنے لگے۔

" دیکھو یہ سالیاں کیسی سر اٹھائے صدیوں سے مزے کر رہی ہیں نہ انھیں نوکری کی ضرورت ہے جس کے لئے جھوٹ بولنا پڑتا اور طرح طرح کی بے ایمانی اور خوشامد کرنی پڑتی اور خود داری قربان کرنی پڑتی ہے نہ ان کے بال بچے ہیں جنھیں پالنے کے لئے سو سو جتن کرنے پڑتے ہوں نہ انھیں بھوک لگتی ہے نہ پیاس لگتی ہے نہ انھیں جنس کی بھوک ستاتی ہے نہ انھیں عشق کی آگ جلاتی ہے مزے سے سر اٹھائے جمی جمائی کھڑی ہیں۔"

پھر مجھے ایک دم یاد آیا کہ میں تو عادی حاسد ہوں جہاں کسی کو اپنے سے بہتر پوزیشن میں دیکھا حسد کرنے لگا۔ مثلاً مجھے لیاقت علی خاں مرحوم سے سخت حسد تھا کہ یہ آدمی پاکستان کا پہلا وزیر اعظم کیوں ہے اور میں کیوں نہیں ہوں پھر مجھے ایک ایک کرکے تمام اپنے سے "بہتر" لوگ یاد آنے شروع ہوئے' وہ لاکھوں ہوں گے اور مجھے ان سے حسد ہوا۔ ان سب افسروں سے حسد ہوا جن کا میں ماتحت رہا۔ حالانکہ ان میں سے چند مجھ پر مہربان بھی رہے اور بعض تو بہت ہی مہربان رہے۔ مجھے اپنے مربی قدرت اللہ شہاب سے حسد رہا کیونکہ وہ میرے افسر تھے اور انگریزی مجھ سے بہتر لکھتے تھے۔

پھر مجھے یاد آیا کہ میں جگر صاحب سے بھی جلتا تھا جن کا میں اپنے بقول عاشق صادق رہا ہوں اور اب فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری اور اپنے پیارے بنگالی دوست شاعر جسیم الدین سے حسد کرتا ہوں کہ وہ اتنے اچھے شاعر کیوں ہیں اور میں کیوں نہیں ہوں' میں عصمت چغتائی' کرشن چندر' غلام عباس سے بھی جلتا ہوں یعنی سب سے فرسٹ کلاس ادیبوں اور شاعروں سے حسد کرتا ہوں۔ میں بابائے اردو کا ایک مخلص ترین کارکن رہا ہوں مگر اصل میں میری خاصی عمر اسی جلن میں گزری کہ میں بابائے اردو کیوں نہیں کہلاتا' یہ کیوں کہلاتے ہیں۔

سو تو میں بڑا نیچ آدمی ہوں۔ اے بھوری بھوری پہاڑی چٹانو! مجھے معاف کرنا میں اس جہاز میں بیٹھا بیٹھا تم سے حسد کر رہا ہوں تو یہ کوئی تمہارا میرا معاملہ نہیں ہے' میرا یہ قضیہ تو پوری دنیا سے چل رہا ہے اور چلتا ہے کہ میں چونکہ آج پریشان ہوں اور تم پرسکون نظر آئیں اس لئے ایک دم تم سے جلنے لگا' میری طبیعت ہی ایسی ہے شاید عام لوگوں کی طبیعت ایسی نہ ہوتی ہو کیونکہ دنیا میں برے لوگ کم اور اچھے لوگ زیادہ ہوتے ہیں'

www.taemeernews.com

اور میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں اس لئے تمھیں گالیاں دینے لگا۔ میں نے یہ نہ سوچا کہ تم کو جاڑوں میں برف دبا لیتی ہے۔ گرمیوں میں بارشیں۔ تم بے آب وگیاہ ہو خشک ۔ جو تمھارا کوئی سنگی ساتھی نہیں نہ کوئی تمھارے ساتھ مل کر ہنسنے رونے والا۔ نہ جانے تم پر کیا گزرتی ہوگی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ نہ جانے ان تمام لوگوں کے اپنے اپنے کیا کیا مسائل اور مصائب ہوں گے جن کا مجھے احساس بھی نہیں ہوتا کس کس نے اپنے اپنے مقام تک پہنچنے کے لیے کیا کیا محنت کی ہوگی۔ کس کس کی کون سی بات خدا کو پسند آئی ہوگی کس کس کو خدا نے کن کن صلاحیتوں سے نوازا ہے۔

دوستو، بزرگو، افسرو، شاعرو، ادیبو اور پہاڑو مجھے معاف کرنا میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی نیچرل ہوں۔ ایک دم ہنستا ایک دم روتا ایک دم جلتا اور ایک دم حسد کرتا ہوں —— اور ایک دم بھول بھی جاتا ہوں اگر کسی نے مجھ سے حسد کیا ہو تو میں نے اُسے معاف کیا اور جس جس سے میں نے حسد کیا ہے وہ سب خدا کے نام پر اور میری کمزوریوں کے نام پر مجھے معاف کردیں۔

اب ہنری طرح پھر یاد آیا۔ خوب آدمی ہے۔ مجھ سے محبت کرتا تھا اور کہتا تھا کہ میں تم سے نفرت کرتا ہوں بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں بھیا اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آتا لوگ کہتے ہیں کہ فحش نویسی کے باوجود یہ آدمی دنیا بھر میں سب سے اچھی انگریزی لکھتا ہے۔ یہ اتنا مشہور مصنف کیوں ہے۔ یہ اتنا امیر آدمی کیوں ہے، یہ الجزائریوں کی جنگ آزادی میں کیوں شریک ہے اور میں کیوں شریک نہیں ہوں۔

یکایک علامہ اقبال کا ایک مصرع میرے سر پر ہتھوڑے کی طرح لگا۔ اور میں اس کی تاب نہ لاکر بیہوش ہوگیا مصرع شاید یہ تھا:

۱ کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو

واہ حضرت علامہ اس غریب الوطنی میں بھی ایک اتنا زوردار گُرز مارا کہ چودہ طبق روشن ہوگئے۔

مگر زیورک روشن نہیں ہے۔ سوئٹزرلینڈ کا یہ سب سے بڑا شہر کہر کے دھندلکوں میں لپٹا ہوا ہے۔ سُنا کہ بارش ہوئی تھی اور یہاں بارش کے بعد تھوڑی دیر تک کہر آلود سا ابر باقی رہتا ہے۔ اچھا باقی رہے۔ اپن کو روشنیوں کا کیا کرنا ہے یہی نا کہ اندھیروں میں یاد آنے لگتی ہیں۔

زیورک بھی ایک پوری پہاڑی پر آباد ہے مگر یہاں نہ کیس لوزان بلکہ جنیوا کی نسبت سے بھی زیادہ چوڑی ہیں جھیل یہاں بھی موجود ہے اور اس کے گرد وہی روشن ریستوران وہی ہوٹل وہی عیش گھر ہیں جیسے جنیوا میں نظر آتے ہیں، لوگ البتہ زیادہ صحت مند معلوم ہوتے ہیں، یہ جرمن نسل ہے۔ جنیوا اور لوزان فرانسیسی نژاد لوگوں کے علاقے ہیں۔ نرم و نازک، میٹھے اور گرم لوگ، یہ زیورک کے جرمن نژاد مضبوط ہیں مگر ذرا ٹھنڈے لگتے ہیں، زبان

www.taemeernews.com

جرمن ہے' انگریزی بمشکل چلتی ہے مگر چل جاتی ہے۔

زیورک کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ سوئٹزرلینڈ یورپ کا ون یونٹ ہے۔ تین زبانیں بولنے والا ایک ہی ملک' ایک سیاسی وحدت' ایک حکومت جس میں ڈیڑھ سو برس سے کوئی بغاوت نہیں ہوئی' کوئی انقلاب نہیں ہوا۔ کوئی خون خرابہ نہیں ہوا۔ ارے بھئی یہاں کے وزیراعظم کا نام کیا ہے' یہاں صدر کون ہے۔ کیا غضب ہے کہ میں اتنے دن سے سوئٹزرلینڈ میں ہوں اور کہیں سیاست کا ہنگامہ نظر نہیں آتا۔ انٹلکچوئل لوگ اول تو کم ہوتے ہیں اور جو ہوتے ہیں وہ اقتصادی ترقی سے تنگ آکر خودکشی' تصوف اور فلسفے کے چکر میں مبتلا ہیں۔ اخبار دنیا بھر کی خبریں چھاپتے ہیں اپنے گھر کے جھگڑے فساد کی خبر ہی نہیں دیتے۔ پوچھا تو کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں جھگڑا فساد ہوتا ہی نہیں۔ ہم کوئی جرمنی ہیں' ہم کوئی فرانس ہیں' ہم کوئی تمہارا ون یونٹ ہیں۔

پھر آپ کیا ہیں۔

ہم سوئٹزرلینڈ ہیں۔

میرا نیشنل ہوٹل میں ٹھہرا جو زیورک یونیورسٹی کے علاقے میں ہے۔ یہاں سڑک اوپر کی طرف چڑھتی ہے۔ اور چڑھتی چلی جاتی ہے' یہاں تک کہ سڑک ایک سرنگ کے آگے رک جاتی ہے اور اس سرنگ میں سے لوزان کی طرح ایک سرنگی ٹرام کار چلتی ہے جو زیورک کو انتہائی بلندی تک لے جاتی ہے۔ میں کئی کئی بار ایک چوتھائی زندگی میں اس بلندی پہ پہنچ کر اپنا منظر بناتا ہوں۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا لیتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

ویسے یہ شعر مرزا غالب کا ہے اور زیورک کی اس بلندی سے بہت بلند ہے جہاں کھڑے ہو کر میں اسے جھوم جھوم کر پڑھ رہا ہوں۔ آخر ان میں اور مجھ میں یہی تو فرق ہے لیکن اب میں ان کا پیڑا کرنے والا ہوں اور کمال دیکھیے کہ اسی غزل کے مطلع سے ان کا پیڑا کر دوں گا۔ پہلے مطلع یاد کر لیجیے:

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

اب دیکھیے میرے ہاتھوں اس پری وش کا کیا حال ہوا اور اس کا ذکر سن کر آپ کا کیا حال ہوگا۔

مجھے [illegible] زیورخ میں [illegible] کا [illegible] کاتی ضرب المثل ہے' میرا جوتا گھس گھس کر میرے شعروں کی طرح بالکل سپاٹ [illegible] ہو گیا ہے میں نے سوچا امریکہ میں پھنسنے کی بجائے یہیں جوتا خرید لیا جائے۔ چنانچہ میں افشاں و

www.taemeernews.com

خیزاں جوتے کی تلاش میں روانہ ہوا۔

زیورک کے اسٹیشن کے بالکل سامنے ایک عظیم الشان دکان ہے جس پر JELMOLI لکھا ہوا ہے۔ رات کو یہ حروف رنگ برنگے قمقموں میں بدل جاتے ہیں اور خوب چمکتے ہیں۔ اس نام کا تلفظ ہے یل مولی کیونکہ یہاں J کو Y کی طرح بھی بولا جاتا ہے مجھے یوں بھی جل مولی کہنا اچھا نہیں لگتا کیونکہ اس میں انگریزی تلفظ کی بو آتی ہے یل مولی کی کیا بات ہے میٹھی تازہ خوشبو دار مولی کی طرح لگتی ہے۔

یل مولی ڈیپارٹمنٹل اسٹور ہے یعنی یہاں ہر قسم کی ضروریات خانہ داری ملتی ہیں اور تحفے تحائف بھی۔ آٹھ منزلہ یا شاید دس منزلہ عمارت ہے جس میں آکر طبیعت باغ باغ اور جیب داغ داغ ہو جاتی ہے۔ جب میں جوتا ڈیپارٹمنٹ میں پہنچا تو جیب میں کل سو فرانک یعنی کوئی ڈیڑھ سو روپے رہ گئے تھے۔

حسب معمول ایک خشمناک بڑی بی نے میرا استقبال کیا۔ یہ اس محکمے کی جمعدارنی تھیں۔ انگریزی بول رہی تھیں مگر انھیں یہ بہت برا لگا کہ میں صرف یورپی زبانوں میں صرف انگریزی ہی بول سکتا ہوں۔

"مجھے جوتا چاہیے" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"کس قسم کا"

"ایک معقول مضبوط سا جوتا" میں سوال پر حیران ہوا۔

"آہ مسٹر آپ میری بات نہیں سمجھے" انھوں نے چاروں طرف دیکھا "اے ماریا ادھر آؤ۔"

اور ماریا دوڑ کر آئی۔ وہ ایک مضبوط نوجوان ہرنی کی طرح تھی۔ اب انھوں نے اس سے جرمن میں اور اس نے مجھ سے انگریزی میں سوال و جواب کیے۔

"کون سا جوتا چاہیے۔ باتھ روم کے چپل۔ اسپورٹس کے جوتے۔ برف پر چلنے والے جوتے۔ پہاڑوں پر چڑھنے والے جوتے۔ دفتری جوتے۔ صبح کے جوتے۔ شام کے جوتے۔ ڈانس کے جوتے اور کس طرح کے ڈانس کے جوتے کس رنگ کے، کس قیمت، کس سائز کے جوتے ــــ"

ماریا کا لہجہ اتنا پیارا تھا کہ میں نے ہر بات دوبارہ پوچھنی شروع کر دی۔ بڑی بی تنگ آگئیں۔ پھر دوسرے گاہک آگئے، وہ مجھے ماریا کے سپرد کر کے یا ماریا کو میرے سپرد کر کے کسی اور کونے میں جا کر جوتوں کے ڈھیر میں غائب ہو گئیں۔

جب وہ چلی گئیں تو میں صاف بولنے لگا اور ماریا کی ہر بات سمجھنے لگا ــــ انگریزی جو بڑی بی کی موجودگی میں ٹوٹی پھوٹی تھی فوراً نہایت فصیح و بلیغ ہو گئی۔ شاید میں نے آکسفرڈ کا استائل بھی اختیار کرنے کی کوشش کی۔ ماریا یہ بات سمجھ گئی مگر برا نہ مانی۔

www.taemeernews.com

اصول نفسیات نسواں کے حساب سے اسے خوش ہونا چاہیے تھا۔ میں نے کہا میں ایک انڈین پرنس ہوں اور ہر طرح کے جوتے خریدنا چاہتا ہوں۔ اس نے گھڑی دیکھی ۔ مطلب یہ تھا کہ وقت کم رہ گیا ہے۔ میں نے اپنی کلائی اس کے آگے بڑھا دی اور گھڑی کی چابی الٹی گھما کر وقت آدھ گھنٹہ پیچھے کر دیا ۔

تب وہ زن شرما گئی اور ادائیں دکھانے لگی ۔

اب! اے دیکھنے والو مجھے ہنس ہنس کے نہ دیکھو۔

کیونکہ اس جرمن نژاد انگریزی بولنے والی حسینہ نے مجھے اپنے سامنے ایک کرسی پر بٹھایا خود ایک چھوٹے سے اسٹول پر بیٹھی سامنے جوتے کا اسکیل رکھا اور وضع وضع کے جوتے اس غریب فقیر ناچیز غزل گو و ناولیسٹ کے بدنما میلے کچیلے پاؤں پر آزمانے شروع کیے۔ شکر ہے کہ میری جرابیں بالکل نئی تھیں۔ ورنہ میں ویسے ہی وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا ۔

ذرا تصور فرمائیے۔ کیا آپ پر بھی یہ عالم گزرا ہے کہ

عشاق کی رگت کو حسیں کھینچ رہے ہیں

ایک جانِ جمال، حور تمثال یعنی غالب والی پری وش جس کے جوتے کھاتے کھاتے تمام اردو فارسی شعرا کی نسلیں گزر گئیں، اپنی کمپنی کے دس پانچ فیصد کمیشن کے لیے ایک کالے آدمی کے پاؤں میں اپنے نازک نازک ہاتھوں سے جوتے پہناتی ہے بند باندھتی ہے کھولتی ہے اور ہماری پسند یا ناپسند کی شکل دیکھ کر خوش یا ملول ہوتی ہے۔ عشق یا جوتے کا ذکر آپ نے بہت سنا ہوگا مگر جوتے اور عشق کا ذکر شاید اردو میں پہلی بار سن رہے ہوں گے۔

اب قصہ یہ تھا کہ وہ میرے پاؤں پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ اس کی ایک اس سے ذرا کم رو ساتھی دوڑ دوڑ کر جوتوں کے ڈبے لاتی تھی اور وہ جلد جلد ایک ایک جوتا پہناتی تھی مگر ہم جوتے دیکھنے کی بجائے اس کو دیکھے جاتے تھے اور زیادہ تر جوتوں پر کسمسا کر بے چینی کا اظہار کر دیتے تھے۔ واہ دادا جان تم کہاں، ہم کہاں۔ فرماتے تھے:

اسد خوشی سے مرے ہات پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

کئی مغل بچوں کی یہ شان ہوتی ہے کہ محبوب کے پاؤں دبا رہے ہیں۔ بڑھے ادھر دیکھو مغل بچہ یہ ہوتا ہے کہ آرام کرسی پر پاؤں پھیلائے تقریباً لیٹا ہے۔ امریکن سگریٹ کا دھواں بھق بھق اڑا رہا ہے اور ایک طناز مہ جبیں اسے جوتے پہنا رہی ہے۔

www.taemeernews.com

یا اللہ نہ جانے اس بیان سے کتنے دوست احباب اور دشمن رقیب بن گئے ہوں گے۔

آخر پرنس جمیل الدین آف ایکس وائی زیڈ اسٹیٹ نے گیارہ جوڑے پسند کیے جو سبھی بیحد قیمتی تھے ایک غلط ہوٹل کا پتا لکھوایا۔ نہایت شان سے حکم دیا کہ کل صبح پہنچا کر رقم وصول کر لیے جائیں۔ بیس فرانک ماریا کو دس اس کی ساتھی کو اور دس درزن صاحبہ کو بطور ٹپ پیش کیے جس پر انھیں میری شہزادگی کا اور بھی یقین آگیا۔

میرے نیچے اترتے اترتے انھوں نے منیجر کو میری خریداری کی اطلاع دے دی۔ اس نے مجھے گرم کافی پسٹری اور کیک پیش کیے، میں نے اسے ایک سگریٹ پلایا اور اسے اگلے "کسی دن" آکر اپنے دوستوں کے لیے قیمتی تحائف خریدنے کی دھمکی بھی دی۔ چلتے وقت وہ بڑی لجاجت سے مسکرایا اور مجھے مجبوراً اسی کے سامنے ایک ٹیکسی روک کر اس میں بیٹھنا پڑا۔ حالانکہ مجھے پیدل اپنے ہوٹل واپس پہنچنا چاہیے تھا۔

دوسرے دن میں نے زیورک کے وہ مشہور اسپتال دیکھے جہاں دنیا کے مریض امرا اپنے وہم کا علاج کرانے آتے ہیں میں نے کئی مریضوں سے بات چیت بھی کی، وہ بڑی اعلیٰ قسم کی بیماریوں میں مبتلا تھے جو کسی غریب آدمی کو نہیں ہوتیں اور ایشیا میں تو عام طور پر ایسی بیماریوں کی نہ اجازت ہے نہ ان کے نام جانے جاتے ہیں۔ یہ خواتین و حضرات ہر سال ان اسپتالوں میں ایک طرح موسم گرما گزارنے آتے ہیں۔ اسپتال کیا ہیں محلات اور باغات ہیں۔ اکیلے ٹہلنے کی روشیں، دوکیلے ٹہلنے کی روشیں، کتب خانے، ٹینس گراؤنڈ، بلیرڈ روم، مریض کا کمرہ بادشاہوں کی آرام گاہ کی طرح سجا ہوا ہے۔ نرسیں حوروں کو شرماتی ہیں۔ ڈاکٹر بقراطوں کے باپ لگتے ہیں کئی مریض ایسے منگیتر ہیں جنھوں نے منگنی تو کر لی مگر شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہو سکے، اس لیے بقراط ڈاکٹر ان میں صلح صفائی کراتے ہیں۔ کچھ امیر امریکی خواتین "کسی پسندیدہ" مریض سے محبت کرنے کے چکر میں مریض بنی بیٹھی ہیں، کچھ مریضوں کو امیر بیواؤں کی تلاش ہے جو کہ از کم زکام کھانسی میں تو مبتلا ہوتی ہی ہیں۔

ویسے زیورک شاید دنیا کا سب سے زیادہ صاف شہر ہے، ایک بار میں ایک سڑک پر لگی ہوئی مشین سے آئس کریم کا ایک کپ نکال کر کھاتے چلا۔ قاعدے سے مجھے وہیں کھا کر کپ کو مشین کے نیچے والے حصے میں پھینک دینا چاہیے تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔ میں تھوڑی دور جا کر ایک بنچ پر بیٹھ گیا آئس کریم کھائی اور کپ پھینکنا چاہا مگر تمام سڑک پر کوئی کاغذ کا پرزہ تک نظر نہ آیا لوگ آس پاس سے گزر رہے تھے شرم کے مارے کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ کپ ہاتھ میں لے کر ڈسٹ بن یعنی کوڑے کے بکس کی تلاش میں چلا۔ کہیں نظر نہیں آیا بیچ شہر میں پہنچ کر خالی کپ ہاتھ میں اور بھی برا لگا۔ یا اللہ کیا کروں۔ کپ کو جیب میں رکھ لیا تو وہ پھول سی گئی گیلی الگ ہوئی۔ باہر نکالا ایک اخبار خرید کر اس میں کپ کو لپیٹا اور پھر چلا۔ صاحبو اس ایک

www.taemeernews.com

آئس کریم نے مجھے کوئی تین میل چلایا آخر ہار کر واپس ہوا اپنے ہوٹل پہنچا اور بیرے کی مدد سے خلاصی پائی مگر آج تک یاد ہے کہ زیورک کی جتنی شاہراہوں یہاں تک کہ گلیوں سے بھی میں گزرا ہوں ان پر سگریٹ کا ایک ٹوٹا بجھتا تک نظر نہ آیا۔ خدا جانے اس کا راز کیا ہے یہاں تو جب تک پان چبا کر سڑک پر نہ تھوکا جائے کلچر یعنی ثقافت وغیرہ کا لطف ہی نہیں آتا!

اب میں زیورک کو اور زیورک کے ساتھ آپ کو بھی الوداع کہتا ہوں۔ میں امریکہ جا رہا ہوں۔ میں نے امریکہ اور طرح دیکھا ہے' چاچا چاچا والا امریکہ نہیں' ہالی ووڈ کی فلموں والا امریکہ نہیں بلکہ امریکیوں کا امریکہ۔ لیکن اب میں لکھتے لکھتے اور آپ پڑھتے پڑھتے تھک گئے ہیں' کم از کم سرکاری محکمۂ تعلقات عامہ کے ایک ذمہ دار افسر نے میری ہمدردی میں یہی کہا ہے اور آپ جانیں کہ اس محکمے کا ہر افسر اپنے عہدے کی بنا پر دانشور اور جینیئس ہوتا ہے اور اس کا فیصلہ ناطق۔ مجھے اپنی تھکن کا تو اتنا احساس نہیں' ہاں آپ کی تھکن سے خوف آتا ہے اس لیے اگر آئندہ کچھ ہفتے غیر حاضر ہو جاؤں یا بالکل ہی خدمت میں حاضر نہ ہو سکوں اور کسی بھائی بہن کو کبھی کوئی بات بری لگی ہو تو معاف کر دیجیے گا بلکہ دعائے خیر سے یاد فرمائیے گا کسی مصنف میں بہت سی خوبیاں ہوتی ہیں کسی میں بہت سی خامیاں۔ میں اپنا شمار دوسرے طبقے میں نہیں کرتا پہلا طبقہ مجھے اپنے میں شمار نہیں کرتا اس لیے مزید الجھن میں پڑنے سے بہتر یہ ہے کہ چپ سادھ لی جائے اس طرح افسر بھی خوش رہیں گے اور امرا بھی اور رؤسا بھی اور ـــــ آپ بھی ـــ

www.taemeernews.com

امریکہ

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

نیا کولمبس

ضبط کریں سب کب تک آہ
چل مرے خامے بسم اللہ

مشرق وسطیٰ، روس اور یورپ کے مقامات آہ وفغاں سے گزر کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ سفرنامہ چھپنے چھپانے کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ یار لوگ (جو خود نہیں لکھتے) کہتے تھے ہم بور ہو گئے۔ کچھ لوگ پہلے ناراض برہم ہوئے اور پھر افسردہ نیت (اس کا زعونیت سے کوئی تعلق نہیں) ہراتر آئے۔ میں تھک گیا، ڈر گیا، سہم گیا اور چپ ہوگیا تاکہ یہ سب قصہ بٹے کھاتے میں ڈال دیا جائے جسے انگریزی میں WRITE OFF کرنا کہتے ہیں: "پبلک" اپنے محبوبوں کو جس شدت سے پسند کرتی ہے اسی تیزی سے بھلا بھی دیتی ہے۔
مگر ——————

ایک چیز ہوتی ہے "شائقین"۔ شائقین نے بہت ستایا۔ دوسری چیز ہوتی ہے بری عادت یعنی لکھے جانے کی عادت۔ بات کہے جانے کی عادت، کچھ کیڑے مکوڑے ایسے ہوتے ہیں جو برابر کلبلاتے رہتے ہیں۔ ہاتھی ان پر پاؤں دھر دے تو زمین میں دھنس جاتے ہیں۔ (بشرطیکہ زمین نرم ہو) اور پھر مٹی سے باہر نکل کر رینگنے اور کلبلانے لگتے ہیں۔ یہ مثال خراب ضرور ہے مگر انکسار کا تقاضا کچھ ایسا ہی تھا، ورنہ میں اس افسانوی پرندے کی بھی مثال دے سکتا تھا جو آگ میں کود جاتا ہے، جل جاتا ہے اور اپنی راکھ سے دوبارہ پیدا ہو جاتا ہے۔

لیکن یہ سب بقراطیت ہے اور شاید وقت سے پہلے ہو رہی ہے جسے فارسی میں پیش از مرگ واویلا کہتے تھے —— اب کچھ نہیں کہتے کیونکہ ہم جیسوں کو ——

موت آتی ہے پر نہیں آتی

لہٰذا آئیے امریکہ کی سیر ہو جائے اور پھر ممکن ہو تو جزیرہ ہوائی، جاپان، ہانگ کانگ، تھائی لینڈ،

www.taemeernews.com

برما سے بھی گزر لیا جائے۔ تاکہ راؤنڈ دی ورلڈ یعنی پوری دنیا کے گرد چکر لگانے کی حسرت آپ کو نہ رہے اور اس چکر کو پہلی بار اردو میں چکرا دینے کی کوشش تشنۂ تکمیل نہ رہنے پائے۔ پتا نہیں آپ کو دنیا سے زیادہ دلچسپی ہے یا اردو سے بہر حال میں دونوں کے چکر میں مبتلا رہ چکا ہوں۔

سوئٹزرلینڈ میں زیورک سے ایک لمبا تڑنگا موٹا تازہ جہاز مسمی D.C.8 مجھے لے کر اڑا اور کوئی ایک گھنٹے میں یورپ عبور کر کے بحر الکاہل کو پار کرنے لگا۔ یہ دنیا کا دوسرا سب سے بڑا سمندر ہے اور نئی اور پرانی دنیا کو ایک دوسرے سے ملاتا ہے۔ یا جدا کرتا ہے۔ نہ جانے اس کا نام بحر الکاہل کیوں رکھ دیا گیا۔ تیس ہزار فٹ کی بلندی سے بھی کہیں کہیں لہروں کے اتار چڑھاؤ صاف نظر آتے ہیں جیسے ایک نیگرو دیا کرنیں لے رہا ہو۔ مغربی دنیا نے اس کا نام اٹلانٹک رکھ چھوڑا ہے اور بات سمجھ میں بھی آتی ہے کیونکہ اس کی وجہ تسمیہ معلوم ہی نہیں ہو سکتی لیکن بحر الکاہل کے صاف معنی ہیں سست سمندر۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب جہاز راں سمندر کے بیچ تک پہنچے ہی نہیں بس کنارے کنارے دو چار سو میل گھوم گھام کر چلے آتے تھے ورنہ اس غضب ناک خطرناک سمندر کو کاہل نہ کہتے جو تین کروڑ انیس لاکھ مربع میل پر پھیلا ہوا ہے اور جس کی معلوم گہرائیاں ساڑھے بارہ ہزار فٹ یعنی چار ہزار گز تک جاتی ہیں۔ نامعلوم گہرائیوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ گہرائی پڑھ یاد آیا کہ بحر الکاہل تو بہت بڑا سمندر ہے حضرت انسان ابھی اپنے چھوٹے سے وجود کی بلندیاں، پستیاں گہرائیاں اور اتھاہ پن نہیں ناپ سکے ہیں۔

شاید کوئی طالب علم قاری دنیا کے سب سے بڑے سمندر کا نام اور گہرائی جاننے کے لیے بے چین ہو رہا ہو سو وہ کسی اگلی نشست میں۔ اگر بہت بے صبری ہو تو جغرافیے کی کتابیں موجود ہیں۔

میں پہلا کولمبس نہیں ہوں جس نے بحر الکاہل پار کیا، نہ میں پہلا بقراط مسافر ہوں جو ساڑھے پانسو میل فی گھنٹے کی رفتار سے وہ سمندر پار کر رہا ہو جسے پہلے ساڑھے چار مہینے میں عبور کیا جاتا تھا۔ مگر میرے لیے تو یہ پہلا بحر الکاہلی سفر ہے اس لیے اگر اس کاہلی کا اثر مجھ پر ظاہر ہو رہا ہو تو آئی ایم سوری۔

اس جہاز میں فرسٹ کلاس بھی ہے جیسی بین الاقوامی جہازوں میں ہوتی ہے یہاں تک کہ روس میں بھی ہوتی ہے یعنی فرسٹ کلاس سیکنڈ کلاس کا فرق ہر جگہ موجود ہے اور اب تو ہمارے ہاں فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس بلکہ تھرڈ کلاس شہری بھی ہونے لگے ہیں یا ہوتے تو پہلے ہی تھے اب کھل کے کہلائے جانے لگے ہیں۔ اس لیے میں فرسٹ کلاس والوں کو زیادہ حسد کی نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ صرف رشک کر کے رہ جاتا ہوں۔ حسد حرام ہے۔ رشک شاید مباح ہے یا بہ حالت مجبوری جائز ہے لیکن جب فرسٹ کلاس والے سیکنڈ یا تھرڈ

www.taemeernews.com

کلاس والوں سے میل جول بڑھانے لگیں تو گھپلا ہو جاتا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور اگر فرسٹ کلاس والا واقعی فرسٹ کلاس چیز ہو تو لمحے بھر میں تھرڈ کلاس والا فرط عقیدت سے اس پر وفا و محبت کے پھول نچھاور کرنے لگتا ہے۔

ایسا ہی واقعہ بحر اکاہل کی اس طویل پرواز میں فدوی جمیل الدین عالی مسافر ٹورسٹ کلاس کے ساتھ پیش آیا۔ ٹورسٹ کلاس میں اس دن میں اکیلا رنگ دار یعنی غیر سفید آدمی تھا۔ آس پاس سفید لوگ میم لوگ اور بابا لوگ بھرے ہوئے تھے۔ انگریز ویسے ہی باضابطہ تعارف کے بغیر بات نہیں کرتے یورپین زبان سے مجبور امریکی بے تکلف ہوتے ہیں مگر بات چیت کی کوئی سبیل ضرور ہونی چاہیے۔ بہر حال بہت وقت خالی خولی گزر گیا تھا کہ سامنے والی فرسٹ کلاس کا دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر کے پھولدار قمیص والے امریکی نمودار ہوئے۔ انھوں نے درمیانی راستے پر آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا اور دائیں بائیں نشستوں پر بیٹھے ہوئے تقریباً ہر مسافر پر گہری نظر ڈالی۔ ان کی حرکات اتنی سست اور مشتبہ تھیں کہ دو چار لوگوں نے ان کی طرف اشارہ کر کے کھسر پھسر بھی کی۔ میں سمجھا یہ کوئی بین الاقوامی پولیس والے ہیں جو کسی جاسوس یا اسمگلر کی تلاش میں ہیں۔ کاش یہ مجھے مشتبہ سمجھ لیں۔ میں نے سوچا، دو چار روز تو مزے سے کٹ جائیں گے۔

اور انھوں نے ایک دم میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ہائی" انھوں نے فرمایا۔ ہائی کا مطلب امریکی تہذیب میں ہے ہاؤ آر یو' یا اردو میں کہو بھئی' کہیے، جناب، آہا، آغا وغیرہ ہوتا ہے۔

"ہائی" میں نے بھی جھٹ سے جواب دیا۔

"عرب یا اسپینی"

"پاکستانی"

"آہا ویری گڈ۔ پاکستان ہمارا بہت قریبی دوست ہے" انھوں نے سرپرستانہ لہجے میں کہا "میں اکیلا بور ہو گیا ہوں میرے ساتھ کے مسافر ایک سرکاری وفد کے ارکین ہیں۔ میں نے سوچا شاید ٹورسٹ کلاس میں کوئی دلچسپ شخصیت مل جائے۔"

"مجھے یقین ہے کہ آپ ایک دلچسپ شخصیت سے مل رہے ہیں"۔ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"آئیے تو پھر ادھر بیٹھیں" انھوں نے فرسٹ کلاس کی طرف اشارہ کیا جہاں نشستوں کے علاوہ تاش کھیلنے اور گپ لڑانے کے لیے صوفوں کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ ان کا نام مسٹر اسمتھ سمجھیے کیونکہ ابھی میں نے ان سے

www.taemeernews.com

ان کا اصلی نام شائع کرنے کی اجازت مانگی ہے جو نہیں ملی۔ وہ امریکہ کے ایک بڑے کاروباری بینکر اور لقراط ہیں۔ ان کا نام نامی ہمارے ملک میں بھی خاصے لوگ جانتے ہوں گے۔ اپنی حیثیت کی وجہ سے وہ دانشور بھی ہیں۔ کیونکہ دانشور کی جدید تعریف، قدیم تعریف سے بہت مختلف ہوگئی ہے۔ قدیم زمانے میں دانشور علمی دانشور ہوتا تھا یعنی لکھتا پڑھتا ناچتا گاتا تھا۔ وکالت کرتا تھا۔ مصوری کرتا تھا تعلیم و تدریس کرتا تھا یعنی کسی نہ کسی قسم کے دانشورانہ اظہار میں مصروف رہتا تھا۔ جب سے دانشوری ایک فیشن بنی ہر آدمی جس کے پاس ایک اچھا ڈرائنگ روم ہے، یا کاروبار ہے، یا عہدہ ہے، یا پچھلے بازی میں کسی علمی تحقیقی فنی ادارے سے متعلق ہوگیا ہے یا ان میں اس کا کوئی عزیز رشتے دار پھنسا ہوا ہے، وہ بھی دانشور ہے۔ آپ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے بلکہ اگر وہ "مگر" ثابت ہوا تو آپ ہی کو بگاڑ کے رکھ دے گا۔ خیر یہاں بگاڑنے بنانے کا قصہ نہیں ہے، بنانا بگاڑنا تو صرف پیدا کرنے والا ہے۔ ساری بات یہ تھی کہ یہ صاحب ذہن تو تھے ہی حالات نے یا اللہ نے امیر کبیر بنایا ہے تو "مفکری" بھی بطور شغل کر لیتے ہیں۔ اے بھائی کس زمانے میں ایسی باتیں کر رہا ہے جبکہ ہر آدمی ریس کھیلنے رنڈی بازی کرنے یا پتنگ اڑانے کے علاوہ یا اس کے ساتھ ساتھ مفکری بھی کر لیتا ہے۔

گندم اگر بہم نرسد بھس غنیمت است

مسٹر اسمتھ مفکر امریکہ یقیناً "دلچسپ آدمی نکلے" انھوں نے افرو ایشیائی زبانوں کے ماخذ سے لے کر راکٹ ایجاد ہونے کے بھنک اثرات تک ہر موضوع پر بالکل بگس گل افشانی فرمائی۔ ایسے موضوعات پر فدوی بھی بند نہیں ہے بلکہ بہت ہی کھلا ہوا ہے۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں ایک دوسرے سے آداب گفتگو برتنے، مسکرانے اور COURTESY دکھانے کی بجائے بیچ بیچ میں لقمے دینے لگے ——— اور قطع کلام کا برا بھی ماننے لگے۔

گفتگو کے دوران ایک ایئر ہوسٹس مجھے مشتبہ نظر سے دیکھتی ہوئی گزری، پھر دوبارہ گزری اور کیبن کے کیبن میں گئی۔ ایک موٹا تازہ کپتان قسم کا ہوا باز باہر آیا اور ہمیں دیکھ کر اندر چلا گیا۔ پھر ائیر ہوسٹس اندر گئی اور واپس آکر ہمارے قریب کھڑی ہوگئی۔ وہ ایک بھدی سی لڑکی تھی اس لیے میں نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہ دی۔

"سوری سر" اس نے جیسے میرے منہ کے آگے منہ لا کر رکھ دیا ہو۔ "کیا آپ ٹورسٹ کلاس کے مسافر نہیں ہیں"

"یس یس ہو واٹ" میری بجائے مسٹر اسمتھ نے تڑخ کر جواب دیا۔

"تو جناب انھیں اس لاؤنج میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے" اس نے بھی بیباکی سے چیلنج کیا۔ میں نے مسٹر اسمتھ کو نہایت مظلوم نظروں سے دیکھا۔ میں نے کوشش کی کہ میری آنکھوں میں آنسو آجائیں مگر اب یاد نہیں آتا کہ

www.taemeernews.com

آنسوؤں نے میرے فراڈ کا ساتھ دیا یا نہیں۔ آنسو چاہنے والے محبوب کی طرح ہوتے ہیں۔ ساتھ آپ کے دل سے ہیں مگر اپنی انفرادیت اور طنطنہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ـــــــ آنسو، دل، ہاتھ، یہ کیا محاورے بازی ہے !!

" اچھا تو ان کا ٹکٹ فرسٹ کلاس کا بنا دیجیے"۔ مسٹر اسمتھ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک موٹا سا بٹوا نکالا اور سو سو ڈالر کے کئی نوٹ ہوا میں لہرائے۔ ایئر ہوسٹس قدرے پریشان ہو گئی اور گومگو کے عالم میں پھر کپتان کے کیبن کی طرف رُخ کیا۔ آ کر بولی جناب اس طرح ٹکٹ نہیں بنتا۔ فرسٹ کلاس میں کوئی نشست بھی خالی نہیں ہے۔ میں اٹھنے لگا مگر مسٹر اسمتھ نے میرے شانے پر تقریباً ایک گھونسا مار کر مجھے دوبارہ صوفے میں دھانس دیا۔ ان کی امریکیت پوری شان سے جلوہ گر ہو گئی۔

" بس تو اب ان کی اور میری لاش ایک ساتھ یہاں سے اُٹھے گی" یہ کہہ کر انھوں نے سامنے سے ایک سیب اٹھا کر تراشے بغیر کھانا شروع کر دیا۔ میں نے اضطراری کیفیت میں دوسرا سیب اُٹھا کر چھری سے تراشنے پر کمر باندھی۔ پھر مسٹر اسمتھ نے اپنا کارڈ جیسے ائر ہوسٹس کے منہ پر دے مارا جسے وہ لے کر چلی گئی۔ اب وہ کپتان نما شخص پھر آیا اسے دیکھتے ہی مسٹر اسمتھ اٹھ کر دو قدم اس کا استقبال کرنے پہنچے۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ مسکرایا اور پھر مسٹر اسمتھ اس کے ساتھ کیبن میں چلے گئے اور دو منٹ بعد بٹوا بند کرتے ہوئے واپس آ گئے۔ بیٹھتے وقت انھوں نے بٹوا نہایت احتیاط سے پتلون کی پیچھے والی جیب میں رکھ لیا اور صوفے پر پاؤں پسار لیے۔

" ہاؤ مچ " میں نے آنکھ ماری۔

" جسٹ اے ہنڈرڈ" (صرف سو ڈالر) انھوں نے اطمینان سے جواب دیا۔

" یہ آپ نے کیوں کیا "؟

" بس ایسا ہی ہوتا ہے میں آپ کی بے عزتی یعنی جدائی برداشت نہیں کر سکتا تھا"

" مگر آپ نے ایک ایشیائی کے سامنے ایک مغربی کپتان اور ایک بڑی مغربی کمپنی کی عزت جو خراب کر دی"

" شٹ اپ۔ یار تم بالکل لونڈے ہو۔ میں کروڑپتی آدمی ہوں میں خوب جانتا ہوں کہ میری عزت اپنی نظر میں خود کتنی ہے"۔ آؤ اپنی باتیں دوبارہ شروع کریں۔ پھر ......" نیویارک آ گیا۔

میں زیورک سے چار بجے سہ پہر چلا تھا اور نیویارک پہنچا تو شام کے چھ یا ساڑھے چھ بجے تھے۔ قصہ یہ ہے کہ جتنا مغرب کی طرف جاؤ وقت اپنی طرف بڑھتا جاتا ہے اور جتنا مشرق کو جاؤ وقت ہاتھ سے نکلتا جاتا ہے۔ زیورک سے نیویارک کوئی ساڑھے سات گھنٹے کی اڑان ہو گی، گو فرق صرف دو گھنٹے کا پڑا اپنے وقت میں فرق

www.taemeernews.com

پڑنے سے آدمی کی اوقات میں کیا فرق آجاتا ہے.....

یہ آئی ڈل وائلڈ ہوائی اڈا ہے۔ ادھر جیٹ جہاز اور غیر ملکی پروازیں آتی ہیں۔ مقامی پروازوں کے لیے دوسرا ہوائی اڈا ہے جس کا نام ہے لاگارجیا۔

آئی ڈل وائلڈ ایک عجیب و غریب ہوائی اڈا ہے' ہر بڑی ہوائی کمپنی کا اپنا دفتر الگ ہونے کے علاوہ مسافروں کی نشست گاہ' ریستوران' کسٹم کاؤنٹر وغیرہ سب الگ الگ ہے۔ ایک کمپنی کے دفتر سے دوسری کمپنی کے دفتر تک میل میل بھر کا فاصلہ ہے۔ آنے والا مسافر تو خیر بآسانی بس یا موٹر تک لے جایا جاتا ہے لیکن جانے والا مسافر اگر اچھی طرح نہ جانتا ہو کہ اس کی کمپنی کا کاؤنٹر کہاں ہے تو صاف بیڑا ہو جائے۔ ہر نشست گاہ یعنی ویٹنگ روم میں ڈاک کے ٹکٹوں کی خود کار مشینیں نصب ہیں' بیچر کارڈ بک رہے ہیں' کتابوں کی دکان' چائے' کھانا' شراب اور دس دس پندرہ پندرہ پبلک ٹیلیفون۔ ایک بیمہ مشین بھی لگی ہوئی ہے جو یورپ میں کم از کم مجھے نظر نہیں آئی۔ بیمہ مشین عجیب و غریب شے ہے' ایک چھوٹے ریفریجریٹر کے برابر ہوتی ہے۔ سامنے بیمے کی رقم اور پالیسی کے نرخ لکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً

بیمہ ۲۴ گھنٹے رقم ایک لاکھ ڈالر فیس پچیس سینٹ یعنی ایک روپیہ

آپ پچیس سینٹ کا سکہ ڈالیے اور بٹن دبائیے' کھٹ سے سامنے ایک فارم نمودار ہوگا جس کے نیچے ایک کاربن کاپی جڑی ہوئی ہے' مشین کے ساتھ ایک نیلی سخت نوک کی پنسل ایک ڈوری میں بندھی ہوئی ہے (نہ جانے یار لوگ پنسل کیوں نہیں توڑ لیتے کیونکہ اپنے ہاں تو پبلک ٹیلیفونوں کی گراریاں تک چرا لیتے ہیں) بس اس پنسل سے فارم بھر دیجیے۔ چند خانے بھرنے پڑتے ہیں۔ دستخط فرمائیے' اپنے وارث کا نام پتا تحریر فرمائیے اور دوسرا بٹن دبا دیجیے۔ کھٹ سے کاغذ گھوم کر اندر چلا جائے گا اور اس کی کاربن کاپی باہر نکل آئے گی جو دندانے دار کاغذ پر ہے۔ آپ نے اپنی کاپی پھاڑی' برابر سے ڈاک کا ٹکٹ لیا اور اپنے وارث یا وارثہ یا وارثین کے نام پالیسی پوسٹ کر دی کیونکہ لیٹر بکس بھی ساتھ ہی لگا ہوا ہے۔ اللہ اکبر۔

اس وقت تو میں مشین استعمال نہ کر سکا مگر سوچا واپسی پر دس لاکھ ڈالر کا بیمہ کراؤں گا۔ واہ رے امریکہ۔

اللہ دے رقم تو مشینیں چلائیے

مسٹر ممتاز کو لینے ان کی بالکل نو عمر بیگم اور دو بچے آئے تھے' ان کی اپنی کار تھی جو ڈرائیور چلا رہا تھا۔ یہ امریکہ میں بڑی شان کی بات ہے کہ کار پر ڈرائیور ہو اور اگر ڈرائیور سفید فام ہو تو اور بھی شان کی بات ہے اور اگر امریکی جو [illegible] تک یقیناً [illegible] پڑتی ہے۔

www.taemeernews.com

لیکن کسٹم سے گزرتے وقت ان کی امارت بالکل کام نہ آئی۔ کسٹم والے انھیں اور سارے سفید مسافروں کے سامان کی سخت پڑتال کرتے رہے۔ صرف وہ بور مسافر تو باعزت چلا گیا' باقی تمام فیشن ایبل خواتین و حضرات کو قطار باندھنی پڑی کسی کا سامان کھولے بغیر نہیں چھوڑا گیا۔ امریکی کسٹم دو چیزوں کی بڑی جستجو کرتا ہے ایک تو نشہ آور چیزوں کی کیونکہ یہاں یہ وبا عام ہے اور اسمگلر لوگ بڑے بڑے بہروپ بھر کر نشہ آور چیزیں لاتے ہیں دوسرے امریکی سونا نہیں لانے دیتے چاہے وہ تولہ بھر ہو۔ زیور کی بات الگ ہے۔ سونا لانے دیتے ہیں نہ لے جانے دیتے ہیں۔ ایک تیسرا وہم بھی انھیں یہ رہتا ہے کہ چین کی بنی ہوئی کوئی چیز ان کے ملک میں ان کا شہری نہ لائے غیر ملکی لا سکتا ہے مگر امریکی شہری جمہوریہ چین کا رومال یا پنکھا بھی نہیں لا سکتا۔ غور کیجیے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے مگر بس ان پر ایک طرح قومی وقار کا بھوت چھا گیا ہے کسٹم افسران نے نہایت بیدردی سے سارے مسافروں کا سامان کھنگال ڈالا میں چپ کھڑا رہا۔ جلد چلنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اکا دکا افسر گزرتا تو ان کی جستجو اور احتیاط کے بارے میں سوال کرتا جب میری باری آئی تو میں نے پاسپورٹ دکھایا اور ساتھ لگے ہوئے کاغذات۔

"آہا — یونیسکو۔"

"پہلے پاکستان"

میں ایک دم جذبات میں بہہ گیا۔

"ہاں ہاں پہلے آپ پاکستانی ہیں پھر یونیسکو کے آدمی ہیں۔ برا مت مانو مسٹر شاید پہلی بار آئے ہو۔"

"آئی ایم سوری"

"مگر سامان تو کھولنا ہی پڑے گا' آپ ڈپلومیٹ تو ہیں نہیں۔"

میں نے بکس کھول دیا۔ انھوں نے ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور اسے بند کر کے چاک لگا دیا۔ ساتھ والے مجھے رشک اور تعجب سے دیکھنے لگے۔

"یہ لیجیے آپ کا کسٹم ہو گیا"۔ افسر مسکرایا۔ اس کی امریکی ذہانت عود کر آئی۔ "آل فری۔"

آل فری یعنی مفت۔ مجھے یہ بات بہت پسند آئی۔

مسٹر احمد سے میری دوستی ان کی شاندار کار کے سامنے ختم ہو گئی۔ انھوں نے مجھے ساتھ بیٹھنے کی اجازت تک نہ دی حالانکہ وہ کار بہت بڑی تھی اور میں اور میرا بکس اس میں سما جاتے تب بھی دو آدمی اور بیٹھ سکتے تھے۔

"اچھا گڈ بائی' یہ میرا کارڈ ہے مگر دو ہفتے تک فون نہ کرنا میں بہت مصروف رہوں گا۔ تم کہاں ٹھہرو گے۔"

www.taemeernews.com

میں نے انھیں اپنا کارڈ دیا مگر میں تو پورے چھ ہفتے معروف رہوں گا از راہ کرم مجھے تلاش کرنے کی کوشش مت کرنا کیونکہ میرے پاس اپنے ایک سو ڈالر موجود ہیں اور میں نہ کسی ہوائی کمپنی کا مالک ہوں نہ کسی جہاز کا پائلٹ"۔ میں نے جوابی جوتا مارا۔

مسز اسمتھ نے یہ گفتگو کسی قدر حیرت کے ساتھ سُنی لیکن وہ برابر اخلاقاً مسکراتی رہیں۔ مسٹر اسمتھ کار میں بیٹھے بیٹھے ایک دم باہر نکل آئے اپنا کارڈ میرے ہاتھ سے چھین لیا اور دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گئے۔

"اچھا تو اب میں خود تمھیں تلاش کروں گا تم یقیناً احساس کمتری کے ایک بہت پرانے مریض ہو۔"

اب میں ایک ٹیکسی میں ایک ایسے شہر کی طرف چلا جس کے بارے میں میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں جانتا اور جو دنیا کا سب سے زیادہ دلچسپ، سب سے زیادہ امیر، سب سے زیادہ خوفناک اور سب سے زیادہ پیچیدہ شہر کہلاتا ہے یعنی اب اس ملک میں میرا پہلا روز شروع ہوا ہے جو دنیا کا امیر ترین اور عجیب ترین ملک ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ عرف چچا سام کا وطن جس کا گیہوں کھاتے کھاتے میری معصوم ایشیائی آنتیں طرح طرح کے جسمانی اور ذہنی عذابوں میں مبتلا ہو گئی تھیں۔

www.taemeernews.com

یہ بھول بھلیاں

مسافر، مورخ معلم نہ تھا
سو وہ ترجمہ اک غلط لکھ گیا

ہوا یہ کہ پچھلی قسط میں سمندر اٹلانٹک کے معاملے میں ایک ہمالا جیسی غلطی سرزد ہوگئی۔ آجکل یوں بھی دنیا بھر میں آزادیٔ تحریر کا فلسفہ گھپلے میں پڑا ہوا ہے۔ آزادیٔ اغلاط بھلا کیسے گوارا ہوسکتی ہے۔ چنانچہ یاروں نے بقول ان کے پچاس ٹیلیفون میر خلیل الرحمان کو کیے اور بقول میرے چالیس مجھے کیے۔ شکر ہے کہ خطوط ہڑتالی ڈاکیوں نے دبا لیے ورنہ سارا قصہ "ریکارڈ" پر آجاتا۔ غلطی یہ تھی کہ میں نے اٹلانٹک کا ترجمہ بحرِ اوقیانوس کے بجائے بحرالکاہل لکھ دیا اور یہی نہیں بلکہ میری سطریں دیر تک اس کی موجوں سے کھیلتی رہیں۔

مجھے اس غلطی کا اعتراف ہے، امید ہے شرفا معاف کردیں گے اور مذاق اڑانے والے اپنا باقی غصہ دوسری غلطی کے لیے اٹھا رکھیں گے کیونکہ اگر لکھائی اسی رفتار سے جاری رہی تو محاورے میں

ابھی ایسی ہی غلطیاں اور بھی ہیں

ویسے اگر اس سمندر کا نام بحرالکاہل بھی ہوتا تو کیا فرق پڑتا، سوال تو سارا سمندر یا سمندروں کا ہے، میں بحرالکاہل یعنی پیسفک پر بھی اڑ چکا ہوں بلکہ جزیرہ ہوائی کے دورانِ قیام میں بحرالکاہل میں تیر بھی چکا ہوں۔ سمندر انسان سے بڑھ کر تو نہیں ہیں، یہاں تو انسان ایک دوسرے کو مدتوں جاننے پہچاننے کے بعد وقت کے ساتھ بھول جاتے ہیں، نہ صرف ان کے نام، ان کے چہرے بھول جاتے ہیں بلکہ ان کے احسانات، ان کی محبت اور ان کی نفرت کو بھی فراموش کردیتے ہیں۔

مگر بات نیویارک کی ہونی چاہیے۔

تو یہ نیویارک ہے۔ اس نام کے بارے میں یہ سچ ہے کہ انگریز آبادکاروں نے اس مقام کا نام اپنے آبائی

www.taemeernews.com

وطن انگلستان کی یاد و احترام میں ڈیوک آف یارک سے منسوب کرتے ہوئے نیویارک رکھ دیا تھا۔ مگر یہ اس کا پہلا نام نہیں ہے۔ کتاب سامنے رکھ کر گزارش ہے (اس وقت میرا چہرہ بھی مورخین اور معلمین کی طرح سنجیدہ ہے) کہ :

۱۔ سب سے پہلے ۱۵۲۴ء میں خلیج نیویارک شاہ فرانسس اول کے فرستادہ ایک اطالوی مہم جو نے دریافت کی۔ اس کا نام تھا گیوانی دی ورازانو۔ مگر میں جانتا ہوں کہ یہ نام آپ کو یاد نہیں رہے گا۔ کیوں رہے؟

۲۔ ۱۶۰۹ء میں ایک انگریز ہنری ہڈسن نے تجارتی مقاصد کے لیے اسے بندرگاہ بنایا اور پھر شمال کو مڑتے ہوئے وہ دریا دریافت کیا جو اب دریائے ہڈسن کہلاتا ہے۔ واضح رہے کہ نیویارک شہر دو دریاؤں اور ایک سمندر یعنی اوقیانوس کے بیچ میں ایک جزیرہ ہے۔ دو دریا الگ الگ بہتے ہوئے دو طرف سے سمندر میں گر جاتے ہیں ایک کا نام ہے 'ایسٹ ریور' دریائے شرق اور دوسرا دریائے ہڈسن۔ پتا نہیں دریائے شرق اب تک کسی قسمت آزما کے نام سے منسوب کیوں نہیں کیا گیا معلوم ہوتا ہے یہ سب جمہوریت کے کرشمے ہیں کہ یار لوگ کسی چیز کو کسی سے بہ آسانی منسوب نہیں ہونے دیتے۔ ہڈسن کا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا کہ آیا دیکھا اور نام رکھ دیا۔

ویسے یہ حضرت ہنری ہڈسن صاحب تھے تو انگریز مگر ملازم ولندیزیوں کے تھے۔ اُس زمانے میں ایک قوم کے طالع آزما دوسری قوم کی فتوحات اور فوائد کے لیے کام کرنا زیادہ عیب نہیں سمجھتے تھے۔ اب یہ بات بری سمجھی جاتی ہے مگر شکر ہے کہ کم از کم ہمارے ملک میں اب بھی امریکہ اور برطانیہ پرستوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو یورپی بزرگوں کی روایات نبھائے جاتی ہے۔ وضعداری اسی کو کہتے ہیں۔

۳۔ ۱۶۲۶ء میں ایک ولندیزی پیٹر فی اٹ صاحب نے اس پورے جزیرے کو سرخ ہندیوں سے مبلغ چوبیس ڈالر یعنی کوئی ایک سو روپے میں خرید لیا۔ ذرا اندازہ کیجیے آج نیویارک کی کیا قیمت ہے اس کے ایک ایک انچ کی کیا قیمت ہے جو اندازہ نہ ہو سکے تو قریبی دفتر دلالی سے رجوع کیجیے۔

اس وقت اس جزیرے کا نام تھا مین ہٹی یا مین ہٹے جو ایک مقامی یعنی ریڈ انڈین تھا اور بعد میں مین ہے ٹن کہلایا۔ مین ہیٹن کو لوگ نیویارک سے الگ کوئی چیز سمجھتے ہیں۔ ایک طرح یہ سچ بھی ہے کیونکہ ایک تو ہے ریاست نیویارک یعنی پورا صوبہ۔ ایک ہے نیویارک شہر جس میں متصل آبادی لانگ آئی لینڈ کا علاقہ بھی شامل کر لیا جاتا ہے اور ایک ہے جزیرہ نیویارک یعنی خالص نیویارک۔ جسے ہمارے امریکہ پلٹ بھائی صرف مین ہے ٹن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اونچی اونچی عمارتیں وال اسٹریٹ، براڈوے سب اسی مین ہے ٹن میں پائی جاتی ہیں مگر یہ لفظ ناکسار کی زبان پر بڑا دو چڑھ کر پھسل جاتا ہے اس لیے میں اسے نیویارک ہی کہوں گا۔

www.taemeernews.com

۴۔ ۱۶۵۳ء میں ویسٹ انڈیا کمپنی نے جو ولندیزیوں یعنی ہالینڈ والوں نے بنائی تھی اس علاقے پر باضابطہ قبضہ کرلیا اور اپنے آبائی شہر کی یاد میں اس کا نام نیوایمسٹرڈم رکھ دیا۔ دیکھا آپ نے بات یوں آگے بڑھتی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بات بھی یوں ہی آگے بڑھتے بڑھتے دلّی تک پہنچ گئی تھی۔

۵۔ مگر — صرف گیارہ برس بعد جب یہ انگریزوں کے قبضے میں آگیا تو اس کا نام نیویارک رکھ دیا گیا۔

۶۔ مزید مگر — ۱۶۷۳ء میں اس پر پھر ولندیزیوں نے قبضہ کرلیا اور اس بار انھوں نے اس کا نام بدل کر نیو اورینج رکھ دیا۔ ویسے اورینج سنگترے کو کہتے ہیں لیکن اورینج ایک علاقے کا نام تھا۔ ولندیزیوں کو سنگترے سے کوئی خاص محبت نہیں تھی۔

۷۔ ایک ہی برس بعد پھر انگریزوں کا پلّہ بھاری پڑا۔ انھوں نے اسے پھر حاصل کیا اور ضد میں پھر نیویارک نام رکھا۔ اب کوئی سو برس یعنی ۱۷۸۳ء تک اس پر قابض رہے جب انھیں انھی کے بیٹوں پوتوں نے نکال باہر کیا۔ امریکہ کو انگلستان کی محکومی سے آزاد کرکے جمہوریہ بنایا اور شہر کو وسعت دی۔

تو اصولاً اس کی عمر کوئی تین سو برس ہے یعنی اس وقت سے جب ویسٹ انڈیا کمپنی نے اسے باقاعدہ شہر بنا کر اس کا نام نیوایمسٹرڈم رکھا تھا۔ ویسٹ انڈیا کمپنی ہر جگہ فیل ہوئی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کامیاب ہوئی۔ سنا ہے اس کی کامیابی میں ہندوستانیوں کا بہت دخل تھا۔ واللہ اعلم۔

ہمارے حسابوں اس شہر کی کوئی خاص تاریخی اہمیت نہیں ہے۔ یہاں آزد باز و موہن جو داڑو اور ٹیکسلا پڑے ہوئے ہیں۔ لاہور اور ملتان ہیں۔ ڈھاکہ ہے جو ہم اس کی قدامت کی دھونس میں نہیں آتے۔ مگر یہ چارہ محب وطن امریکی اسے اپنے قدیم ترین شہروں میں گنتا ہے اور اس کے ہر دور کی بڑی بڑی ہسٹریاں لکھتا ہے۔

اصلی جزیرہ مین ہٹن کوئی بارہ میل لمبا ہوگا (اس وقت کتاب سامنے نہیں ہے اس لیے انچوں فٹوں اور گزوں کی غلطی معاف) چوڑائی ایک انچ سے لے کر دو سوا دو میل تک ہوگی۔ ایک انچ بلکہ صفر چوڑائی وہاں ہے جہاں اس کا لمبوترا کونا سمندر کو چھوتا ہے۔ یہاں سے جزیرہ پیچھے کی طرف جاتے جاتے چوڑا ہوتا گیا ہے۔

مگر ہم یہ نیویارک نہیں مانگتا ہم کو لڑکی والا اور ڈالر والا نیویارک دکھاؤ۔ بھائی تم وکت جائع کرتا ہے کام کا بات بولو سالا مجنوں ہوا تاریکھ کا چوپڑی بن گیا اپن کو تاریکھ نئیں چاہیے مجا مانگتا ہے۔

تو پیارے مجے کے لیے ڈالر کا جرورت ہے اور ڈالر اپن کو بہوت کم ملا ہے بیک منی ہوتا تو جازتی مجا ابھی تو یونیسکو کی پگار پر گجارا کرنا ہے اس لیے آہستہ چلو لڑکی بھی آئیگا مجا بھی آئیگا۔ جرا دم تو آہستہ آہستہ۔

www.taemeernews.com

ایک قول کے مطابق نیویارک صرف امریکہ میں ہے مگر امریکہ نہیں ہے یا دوسرا قول پسند آئے تو وہ بھی حاضر ہے کہ نیویارک ہی امریکہ ہے۔ نیویارک نہیں تو امریکہ کچھ نہیں۔ لیکن

یاروں نے کہا سب قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

چنانچہ کل سب سے پہلے میں تنخواہ لینے یو۔این کے دفتر پہنچوں گا۔ شام شہر پہنچتے پہنچتے آ ندا آگئی۔ ٹیکسی نے ٹرمینل پر اتار دیا جہاں ایک پیغام کی توقع تھی پیغام یہ ملا۔ خاصا سادہ اور رنگین تھا۔

"منجانب مس میری جے روڈ نگراں انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل اسٹڈیز۔

آپ کا پروگرام قیام وطعام ہمارے انتظام میں ہے، ازراہ کرم ۴۲ نمبر گلی ایک نمبر سڑک پر ٹیوڈر ہوٹل میں تشریف لے آیئے، میں سفید رنگ کا لباس پہنے تنکوں کی ٹوپی پہنے انتظار گاہ میں بیٹھی ملوں گی۔"

معاف کیجیے گا میں نے نیویارک جیسے عظیم اور امیر شہر کی اسٹریٹ کا ترجمہ گلی اور اے وے نیو کا ترجمہ سڑک لکھ دیا مگر یہ میرا قصور نہیں بلکہ آغا اشرف مرحوم کی یاد میں ہے جو نیویارک میں برسوں مقیم رہے اقوام متحدہ کے سکریٹریٹ میں اعلیٰ عہدوں پر کام کیا اور جنھوں نے کبھی اردو میں انگریزی کا لفظ استعمال نہ کیا۔ وہ پہلے پاکستانی تھے جن سے وہاں ملاقات ہوئی اور انھوں نے ہی نیویارک کا پرچہ ترکیب استعمال عطا کرتے وقت یہ الفاظ استعمال کیے۔

نیویارک کوئی نو سڑکوں اور کوئی ڈھائی سو گلیوں میں بٹا ہوا ہے۔ سڑکیں ہیں اے وے نیو یعنی لمبی لمبی شاہراہیں جو بہت سے مقامات پر تقریباً متوازی بن جاتی ہیں اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر انھیں گلیاں کاٹتی جاتی ہیں۔ دو گلیوں کے درمیانی فاصلے کو بلاک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بلاک کا ترجمہ مجھے آغا اشرف مرحوم نے نہیں بتایا۔ سڑک لمبی ہوتی ہے یعنی جزیرے کی لمبائی میں چلتی ہے اور گلیاں چوڑائی میں۔ ان سڑکوں اور گلیوں کی شکل کچھ یوں ہے۔

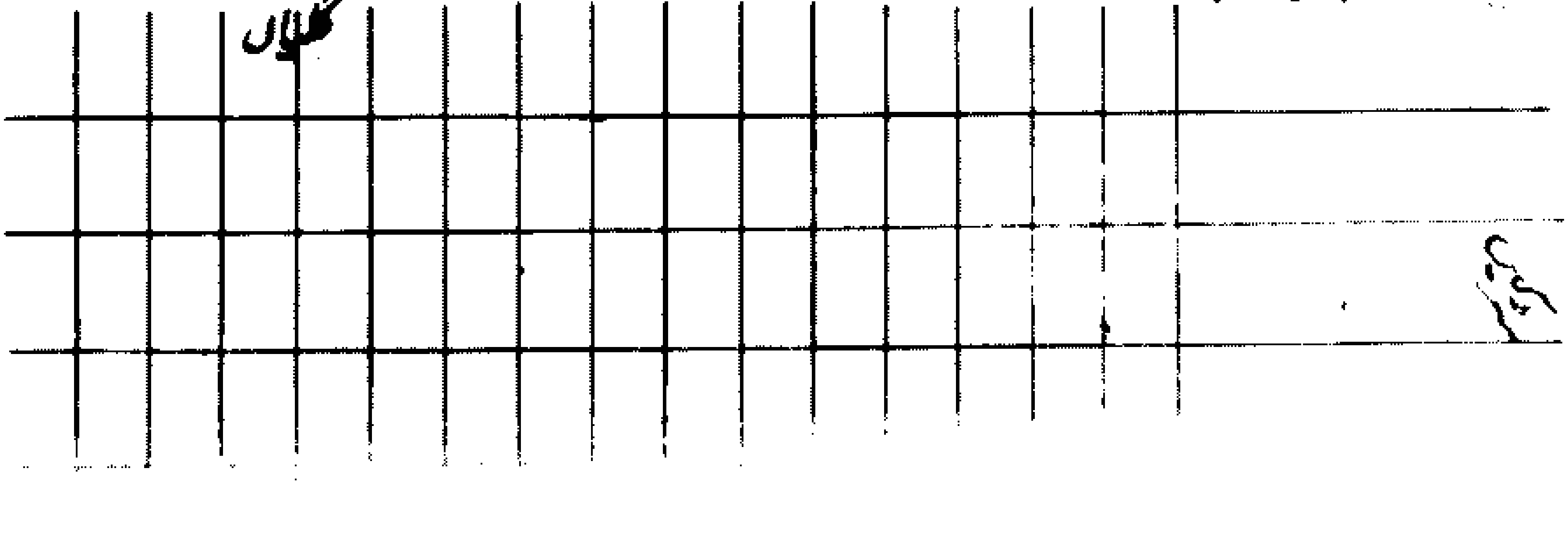

www.taemeernews.com

اس طرح یہاں فاصلے زیادہ بھی ہوں مگر پتے آسانی سے مل جاتے ہیں۔ ایک قول کے مطابق نیویارک دنیا کا "آسان ترین" شہر بھی ہے۔

ٹیوڈر ہوٹل ۴۲ نمبر کی گلی کے بالکل اس کونے پر تھا جہاں سے سڑک نمبر ایک گزرتی ہے۔ دوسری ٹیکسی لی اور دم بھر میں پہنچ گیا کیونکہ ٹرمینل اڑتیس نمبر یا چونتیس نمبر کی گلی اور سڑک نمبر دو پر واقع تھا۔ اندر داخل ہوا تو صرف ایک خاتون نظر آئیں جن کے دانت بڑی حد تک باہر نکلے ہوئے تھے یعنی چوکا بہت اونچا تھا وہ بہت دُبلی پتلی بھی تھیں۔

"کاش یہ مس روتہ ہوں" میں نے بے اختیار سوچا۔ مگر وہ خالص مس روتھیں۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔

"آپ یقیناً ڈاکٹر عالی ہیں"

یا اللہ یہاں بھی یونیسکو کی کسی ناواقف، نااہل خاتون اہلکار نے میرے نامۂ اعمال میں مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دلوا رکھی ہے۔

"جی ہاں میرا نام عالی ہے" میں نے محتاط ہو کر جواب دیا۔ اب میں کیا کہتا کہ میں ڈاکٹر واکٹر نہیں ہوں صرف ایک تھرڈ کلاس گریجویٹ ہوں جسے قسمت کی نیرنگیوں نے آپ کی خدمت میں پہنچا دیا ہے۔

مس رو نہایت محترم خاتون تھیں مگر میں نے ان سے ہاتھ ملاتے وقت بڑی شدت سے سوچا کہ کاش میں بی اے میں فیل ہی ہو جاتا۔

"آپ ادھر سامان رکھوا دیجیے اور واپس آجائیے تو باتیں ہوں میں نے سوچا ہے کہ کھانا ساتھ کھایا جائے۔" انھوں نے بڑی متانت سے فرمایا۔ ان کے حساب سے اس وقت کھانے کا وقت تھا مجھے زیورک کے حساب سے سخت نیند آرہی تھی مگر خاتون ہوتی ہے۔

کمرہ اٹھارویں مالے یعنی اٹھارویں منزل پر ملا۔ زندگی میں پہلی بار اتنی "بلند قیامی" میسر ہوئی۔ جب سامان رکھا جا رہا تھا تو میں نے کھڑکی کھول کر باہر جھانکا ا۔ ۔ دل دہل گیا۔ موٹریں ماچس کے ڈبوں جیسی نظر آئیں۔ مرد عورتیں گڈے گڑیا جیسے ــ اتنی چوڑی گلی ایک پتلی سی نہر معلوم ہوئی میں نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی۔

"فرض کرو یہ لفٹ چلتے چلتے بند ہو جائے یا کہ ں خراب ہو جائے اور ہوٹل والے کہیں کہ صاحب آج تو پیدل ہی زینہ چڑھ جائیے۔" میں نے لفٹ میں اترتے ۔ ہوتے سوچا مگر اتنی ہی دیر میں گراؤنڈ فلور یعنی زمینی منزل آگئی اور میں اور مس رو ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔

www.taemeernews.com

"دس سینٹ کے سکے کو ڈائم کہتے ہیں اور پانچ سینٹ والے کو نکل (نِکل) پچیس سینٹ والے کو کوارٹر کہتے ہیں اور یہ پینی ہے۔ ایک سینٹ۔ خرید و فروخت میں پینی بہت کام آتی ہے کیونکہ بہت سی چیزوں پر جس طرح ٹیکس لگایا گیا ہے اسے ادا کرنے کے لیے پینی کی ضرورت بار بار پڑتی ہے" مس رو نے مجھے ضروری تعلیم دینی شروع کر دی۔ اور سکے تو خیر ٹھیک تھے مگر پینی تانبے کی ایک چھوٹی سی بدنما چیز تھی۔ اپنا چھوٹا چھید والا پیسہ اس سے اچھا ہوتا ہے۔ مگر وہ پیسہ ہے' یہ پینی ہے۔ پیسہ روپے کا سواں حصّہ ہے پینی ڈالر کا سواں حصہ ہے اور روپیہ روپیہ ہے۔ ڈالر ڈالر ہے اور

ڈالر ہے ڈالر تری کیا بات ہے واللہ

پھر مس رو نے مجھے ترتیبی کھانا کھلایا' یعنی کھڑا کھانا کھلایا' ایک کونے پر دکان میں لے گئیں جسے ڈرگ (DRUG) اسٹور کہتے ہیں۔ عام طور پر کونے میں ہوتا ہے' کبھی کبھی بیچ عمارت میں بھی ہوتا ہے' نام ڈرگ اسٹور یعنی دوائیوں کی دکان ہے اور خدمت ہر طرح کی انجام دیتا ہے۔ کتابیں' کھلونے' روزمرہ کام آنے والی اشیا' کپڑے' سائیکلیں' اخبار' الم غلم سب کچھ بھرا ہوتا ہے' اور ایک کونے میں کھانے پینے کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ پانچ سات اونچے اونچے اسٹول' ایک لکڑی کی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے ہیں' دوسری طرف بجلی کے چولھے گرم ہیں جلدی والا کھانا یعنی انڈا مرغی مچھلی۔ دودھ۔ کافی۔ چائے۔ شربت۔ کوکا کولا بلکہ کولا ہر قسم فوراً مل جاتا ہے' سروس نہیں ہوتی یعنی ریستوران کی طرح الگ میز اور میز پر میز پوش اور اس پر کانٹے چھری اور کسی خادم یا خادمہ کے آنے جانے کا چکر نہیں ہوتا۔ بلکہ سامنے والا مرد یا عورت آرڈر سنتے ہی مطلوبہ کھانا سامنے رکھ دیتا ہے۔ انڈے تلنے یا آملیٹ تیار کرنے میں دیر لگتی ہے۔ سِکے ہوئے توس درکار ہوں تب بھی دو چار منٹ لگتے ہیں ورنہ کھٹ سے بھُنی ہوئی مرغی تلی ہوئی مچھلی ریفریجریٹر میں سے نکالی اور سامنے رکھ دی سینڈوچز بنے بنائے رکھے ہوتے ہیں آپ پسند کے بنوا بھی سکتے ہیں۔

ڈرگ اسٹور کی خوبی یہ ہے کہ کھانا جلد اور ریستورانوں کی بہ نسبت بہت سستا مل جاتا ہے۔ امریکی شرفا' یعنی متوسط درجے کے لوگ عام طور پر دن کا کھانا ڈرگ اسٹور ہی میں کھاتے ہیں۔ کل کھانا پچاس سے ساٹھ سینٹ کا پڑتا ہے۔

فورتھ سیکنڈ اسٹریٹ' یعنی گلی نمبر بیالیس نیویارک کی مشہور ترین گلی ہے۔ بہت سے اسکائی اسکریپر یعنی آسمان چھونے والی عمارتیں یہیں واقع ہیں۔ یہ آگے جا کر ٹائم اسکوائر سے بھی گزرتی ہے۔ جہاں ہر وقت روشنیوں کا طوفان رہتا ہے۔ اس کا پہلا کونا یونائیٹڈ نیشنز سے شروع ہوتا ہے یعنی یونائیٹڈ نیشنز بالکل اس کے سامنے واقع

www.taemeernews.com

ہے۔ زودار تنخواہ یا نشگان پر دین کو پہلے پہل اسی گلی پر واقع ہوٹلوں میں ٹھیرایا جاتا ہے تاکہ شروع میں دفتر آنے جانے کی دقت نہ ہو، پٹڑی پر چلتے وقت اگر ادھر دیکھنا پڑے (اور دیکھنا پڑتا ہے) تو بار بار ہیٹ ہاتھ سے پکڑنا ضروری ہے ورنہ گر جائے گا۔ عمارتیں برابر چالیس چالیس پچاس پچاس منزل اونچی ہیں۔

نیویارک عمارتوں کا جنگل ہے۔

اسی گلی میں مس میری بجے رو نے مجھے آٹومیٹک ریسٹوران دکھایا اور دس سینٹ والی چائے پلوائی۔ یہ ریسٹوران بیالیس نمبر گلی اور سٹرک نمبر تین کے کناوے پر ہے۔ بہت بڑا ہال ہے جس میں صرف ایک خاتون ایک بکس سنبھالے بیٹھی ہیں۔ لوگ انھیں ڈالر دے دے کر چھوٹے سکے لیتے ہیں اور دیواروں میں گڑی ہوئی شیشے کی الماریوں کی طرف مڑ جاتے ہیں۔ یہ الماریاں پیچھے سے لوہے کی ہیں مگر سامنے شیشے کے چھوٹے چھوٹے بند خانے بنے ہیں، باہر سے اندر رکھی ہوئی پلیٹیں اور ان میں کھانا نظر آتا ہے، سامنے کھانے کا نام لکھا ہوا ہے اور قیمت درج ہے، ہر خانے میں سکہ ڈالنے کا چھید ہے۔ آپ کو پچیس سینٹ والی مرغی کی ٹانگ چاہیے بس سکہ ڈال دیجیے کھٹ سے ڈبہ کھل جائے گا، آپ پلیٹ نکال لیجیے۔ وہ خاصی گرم ہوتی ہے یعنی اس میں کھانا گرم ملے گا یعنی ان الماریوں میں ہیٹنگ سسٹم موجود ہے یہی کیفیت چائے اور کافی کی ہے۔ بڑے بڑے نل لگے ہوئے ہیں۔ ساتھ سکہ ڈالنے کا چھید ہے، ایک طرف بڑی بڑی میزوں پر چائے کی پیالیاں رکھی ہوئی ہیں۔ پورے پورے ہال میں سیکڑوں چھوٹی چھوٹی میزیں اور ان کے گرد کرسیاں ہیں۔ آپ نے پیالی اٹھائی نل کے قریب گئے اور دس سینٹ کا سکہ ڈالا، نل آپ ہی آپ چلے گا اور صرف اتنی دیر کہ پیالی بھر جائے۔ دودھ دار چائے چاہیے تو اس کا نلکا الگ ہے۔ کافی کا نلکا الگ ہے۔ ٹھنڈے مشروبات کے نل الگ ہیں اور صرف گلاس بھرنے کی حد تک چلتے ہیں اور آپ ہی آپ بند ہو جاتے ہیں۔ آپ کی میز پر چمچے اور شکردانیاں موجود ہیں آپ چاہیں تو بے اندازہ شکر پھانک سکتے ہیں اور چمچے بھی چرا سکتے ہیں۔ مگر میں نے پوچھا تو مس رو برا مان گئیں۔

"ہمارے ہاں جرائم بہت ہوتے ہیں مگر چمچے چرانے کا شوق ابھی عام نہیں ہوا ہے۔" انھوں نے بڑے سلیقے سے اپنی خفگی کا اظہار کیا۔

چلتے وقت میں نے انھیں دکھا کر شکر کے دو چمچے پھانکے اور ایک چمچا کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ وہ پہلے سُن سی ہو گئیں اور پھر ہنسنے لگیں۔

میں نے منہ پھاڑ پھاڑ کر جمائیاں لینی شروع کیں شاید مجھ پر نیند کا غلبہ تو تھا۔ یہ نہ تھا مگر میں چاہتا تھا کہ مس رو سے آزاد ہو کر ٹائم اسکوائر میں گھوموں۔

www.taemeernews.com

"آئیے اب میں آپ کو واپس لے چلوں" مس روسے گویا حکم دیا: "آپ تھک گئے ہیں اور نیویارک میں ایک بالکل اجنبی کا رات کو اکیلے گھومنا درست نہیں۔ دو چار روز میں شہر سمجھ لیجیے تو گھومیے گا" انھوں نے یا تو میرے دل کا چور پکڑ لیا یا اتفاقاً وہی بات کہہ دی۔

ایک فرمانبردار طالب علم کی طرح میں مس رو کی انگلی پکڑے ہوٹل نیوڈر پہنچا، وہ صبح کے لیے ہدایات دے کر بڑے وقار سے رخصت ہوگئیں۔

ایک دم مجھے احساس ہوا کہ

ہم بھری دنیا میں تنہا ہوگئے

اس شہر کی آبادی اسی لاکھ سے اوپر ہے دولت ہزاروں، اربوں ڈالروں میں شمار نہیں کی جاسکتی۔ اونچی اونچی عمارتیں اور عجائب خانے، نائٹ کلب، کتب خانے، سینما، اور لڑکیاں یعنی انگریزی بولنے والی لڑکیاں اور کالے باشندے، اور جرائم پیشہ افسانوی کردار اور اقوام متحدہ اور کل چھ سو ڈالر یعنی اس تمام تماشے کو چھ سو ڈالر مہینے میں دیکھنا ہے اور روٹی کپڑا بھی اسی میں پورا کرنا ہے۔ واہ میاں آتش لکھنوی خوب یاد آئے:

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

www.taemeernews.com

یو این میں دلّی والے

صبح جب دروازہ خاور کھلا
سامنے یو۔این کا تھا دفتر کھلا

اور میں نے ٹیوڈر ہوٹل عرف فلک نما (حیدرآبادی حضرات معاف فرمائیں) کی اٹھارویں منزل سے چائے کے لیے ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا کہ

دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

یعنی ہر جب آیا کہ اوپر چائے کی ایک پیالی کا چارج ایک ڈالر ہوگا منظور ہو تو بھجوا دی جائے۔
ایک ڈالر میں ایک چائے!!!

پھر ایک سمت سے اُمید کی صدا آئی

یعنی ٹیلیفون دوبارہ بجا اور کوئی فصیح و بلیغ اُردو میں بولا
"عالی میاں بول رہے ہیں"۔
میرا دل دھڑک کر باہر آگیا۔ آواز نہایت نرم اور لہجہ نہایت شیریں۔ یا اللہ یہ کون ہے
"ارے بھئی میں آغا اشرف بول رہا ہوں"
آغا صاحب کو میں نے نیویارک سے سرسری طور پر اپنے آنے کی تاریخ سے مطلع کر دیا تھا۔ انھوں نے یونیسکو برانچ کی معرفت مجھے کھود کھاد کر نکال ہی لیا' حالانکہ یورپ اور امریکہ میں "احباب" کی یہ حالت ہے کہ اگر گڑگڑا گڑگڑا کر بھی انھیں ہوائی اڈے تک آنے یا "بعد میں" ملنے کے لیے لکھا جائے تو مصروفیات کے بہانے کنی کاٹ جاتے ہیں۔
"نہیں آپ چائے نہ پیجیے۔ صرف شیو کیجیے' ایک اچھی سی ٹائی باندھیے۔ تب پر ... ہو لی جائیے

www.taemeernews.com

پھر آپ ناک کی سیدھ میں یو این آجائیے کسی چوبدار، پہرے دار، دربان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں پہلے دروازے میں بے باکانہ داخل ہو جائیے۔ اُلٹے ہاتھ کو لفٹ ملیں گے اور مسکراتی ہوئی کوئی سفید یا حبشن لڑکی۔ اگر وہ نہ بھی مسکرائے تو آپ مسکرائیے، وہ جواباً ضرور مسکرائے گی۔ آپ کہیے دس نمبر، وہ آپ کو دسویں منزل پر اتار دے گی۔ سیدھے ہاتھ کو مڑیئے ایک کمرے پر میرا نام لکھا ہوگا ـــ اور اندر گرم گرم چائے ہوگی۔ اگر میں نہ ہوا تو برابر والے کمرے میں میٹنگ ہو رہی ہوگی، آپ چائے پی کر انتظار کیجیے میں پندرہ منٹ میں آجاؤں گا۔ خبردار، کہیں جھجکیے گا نہیں، ورنہ دو تین جگہ پاس بنوانے پڑیں گے۔"

اور پانچ منٹ میں بجلی کی طرح میں اس ہدایت نامہ یونائیٹڈ نیشنز پر حرف بہ حرف عمل کرتا ہوا آغا اشرف کے کمرے میں پہنچ گیا، وہ چائے کے ساتھ ساتھ خود بھی موجود تھے۔

"میں میٹنگ سے بھاگ آیا" وہ مسکرائے۔ وہ میرے دوست نہ تھے، عربک کالج کے پرانے طالب علموں میں سے تھے مگر بہت سویٹ آدمی تھے، بہت خوش شکل بھی تھے۔

"اب بات چیت ناشتے پر ہوگی، میں ناشتہ کر آیا ہوں، مگر آپ کو ناشتہ کرنا سکھاؤں گا، اور دو چار آدمیوں سے ملوا دوں گا۔ یونائیٹڈ نیشنز سے متعارف کرا دوں گا تاکہ ایک ہی دن میں آپ بالکل فرسٹ ہو جائیں۔ چلیے اب چوتھے ملے پر چلتے ہیں۔"

یو۔ این کا عام ریستوران چوتھی منزل پر ہے مگر یاں ٹھہریے یہ انتالیس منزل کی شیشے میں لپٹی ہوئی اگر گند رشند عمارت خود یو این نہیں ہے بلکہ یو۔ این کا سکریٹریٹ ہے جسے ہم یو۔ این کہتے ہیں۔ اصل یو۔ این تو اس کے برابر والی سفید گنبد والی عمارت ہے یعنی اقوام متحدہ کا اجلاس عام۔ حفاظتی کونسل۔ الم کونسل نظم کونسل سب اس سفید گنبد والی عمارت میں سمائے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ سکریٹریٹ کے لیے یہ شیش محل بنا دیا گیا ہے جو نیویارک ہی نہیں، بلکہ دنیا بھر کی عمارتوں میں ایک منفرد طرز تعمیر کا نمونہ کہا جاتا ہے، بہر حال اس وقت بھوک میں طرز تعمیر کا خیال کیسے آسکتا ہے، مجھے تو ناشتہ چاہیے اور ناشتہ چوتھی منزل یا بقول آغا صاحب چوتھے ملے کے ریستوران میں ملے گا۔

ریستوران ایک بہت بڑا ہال ہے اس کی دیوار بھی شیشے کی ہے اور سامنے ایسٹ ری ور یعنی دریائے مشرق بہہ رہا ہے، سامنے کیا بلکہ اس عمارت کے قدموں میں بہہ رہا ہے۔ اگر شیشے کے ساتھ میز مل جائے تو چائے پینے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے مگر عام طور پر یہی منصب مشکل سے ملتا ہے، یار لوگ جمے ہوئے ہوتے ہیں اور بعض ایسے جم کر بیٹھتے ہیں کہ اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ یہ حضرات زیادہ تر افریقی اور لاطینی امریکہ کے

www.taemeernews.com

ہوتے ہیں جو یوایں میں اپنے کوٹے کی دعولنس میں ملازم ہیں اگر کام آدھ گھنٹہ کریں اور ریستوران میں آٹھ گھنٹے بیٹھیں تب بھی ان کی کارکردگی پر حرف زنی نہیں ہو سکتی ورنہ دوسرے دن ان کا ملک سفید ملوکیت کے خلاف چیخ پکار شروع کر دے گا۔ ویسے واللہ اعلم بالصواب۔

اس ریستوران میں بیرے سروس نہیں کرتے بلکہ سیلف سروس ہے یعنی اپنی خدمت آپ کی جاتی ہے ایک طرف انواع و اقسام کے خواتین و حضرات آہنی چمکیلے کاؤنٹر کے پیچھے انواع و اقسام کے کھانے تقسیم کر رہے ہیں کیو لگا ہوا ہے پلیٹ ہاتھ میں ہے آپ کی باری آئے تو سامنے رکھے ہوئے کھانوں کو دیکھنا شروع کر دیجیے بوکھلا کر جلد انتخاب نہ کیجیے کیونکہ ناشتے کے لیے بھی کوئی تیس چالیس قسم کی اشیا منتظر انتخاب ہیں۔

میں نے جلدی سے دو انڈے دو توس بغیر مکھن ایک پنیر کا ٹکڑا ایک گوشت کا ٹکڑا اور کافی کی ایک پیالی انتخاب فرمائی۔ انتخابی کارروائی کے بعد دوسرا مرحلہ ہوتا ہے خزانچی یا محتسب خوراک کے آگے سے گزرنے کا۔ کبھی کبھی اس منصب پر کوئی نوعمر قتالہ العالم بھی فائز نظر آتی ہے لیکن عام طور پر درشت رو سخت زبان سخت نظر بزرگ خواتین ہی موجود رہتی ہیں۔ وہ ایک نظر میں پلیٹ کی قیمت معلوم کر لیتی ہیں اور تقریباً ڈانٹنے کے لہجے میں مطالبہ کرتی ہیں۔

"بچھتر سینٹ"

"بچھتر سینٹ" میں نے منہ سے تو کچھ نہ کہا مگر شاید میری آنکھیں تڑپ سی گئیں آغا صاحب ساتھ ساتھ تھے۔ انھوں نے ٹہوکا دیا "پیسے دے کر آگے چلیے پھر بات ہو گی۔"

اب ہم میز کے گرد آ بیٹھے میں نے کاغذ نکالا۔ انھوں نے قلم اور میں نے حساب لگایا۔

ایک ڈالر میں سو سینٹ۔

ایک ڈالر میں تقریباً پانچ روپے۔

"ارے آغا صاحب یہ ناشتہ تو کوئی چار روپے کا پڑا۔"

آغا محمد اشرف مرحوم کے چند اقوال زریں:

۱۔ جب تک امریکہ میں ہو ڈالر کو پاکستانی کرنسی میں مت شمار کرو۔

۲۔ ایک ڈالر کو ایک روپیہ جانو مگر شاہی زمانے کا روپیہ یعنی جب بڑے بڑے شرفا کی تنخواہ دس بارہ روپے ماہوار ہوتی تھی۔

۳۔ ناشتے میں دو انڈے نہ کھاؤ۔

www.taemeernews.com

۴۔ پنیر بھی مت کھاؤ۔

۵۔ گوشت کا ٹکڑا بھی مت کھاؤ۔

۶۔ ایک انڈا اور دو توس اور دودھ کی ایک پیالی پینتیس سینٹ میں نہایت اچھا ناشتہ ہوتا ہے۔
یہاں کا دودھ نہایت عمدہ خالص اور ٹھنڈا ہوتا ہے۔

۷۔ جتنی چادر دیکھو اتنے ہی پاؤں پھیلاؤ، بلکہ پاؤں پھیلاؤ ہی نہیں۔

مقطع کا بند یہ ہے کہ ایک ڈالر کو ایک روپیہ جانو۔ سو اب میں نے سوچا کہ میری تنخواہ چھ سو روپے مہینہ ہے۔ اور چھ سو روپے مہینے والا آدمی چار روپے کا ناشتہ نہیں کر سکتا مگر پھر غلطی ہوئی چھ سو روپے مہینے والا آدمی بارہ آنے روز کا ناشتہ نہیں کر سکتا۔ نہیں یار کر تو سکتا ہے۔

آغا صاحب گوشت نہیں کھاتے تھے شراب نہیں پیتے تھے، پابند اوقات تھے، تمباکو کو ہاتھ نہیں لگایا لیکن معدے کی بیماری میں مبتلا ہو کر مر گئے جب میں نے انھیں دیکھا تو ان کی صحت قابل رشک تھی، اس کے ایک سال بعد وہ کراچی آئے ایک دن رہ کر لاہور گئے اور مر گئے۔ میں گوشت کھاتا، سگریٹ پیتا، پابندیٔ اوقات سے کوسوں دور طرح طرح کی بد پرہیزیوں میں مبتلا، زندہ ہوں اور ان کا ذکر کتنا عجیب لگ رہا ہے۔

"اے میری، یہ ہمارے ملک کے شاعر ہیں، یونیسکو کے فیلوشپ پر کل ہی آئے ہیں، جاؤ ذرا انھیں جلدی جلدی یو۔این تو دکھا لاؤ، تفصیل سے یہ پھر دیکھ لیں گے۔ ہاں پیٹر سے میں کہہ دوں گا" —— آغا صاحب نے ایک معقول صورت قدرے موٹی مگر بیحد خوش مزاج انگریز لڑکی سے مجھے ملوایا جو ان کے کسی ساتھی کی سکریٹری تھی۔ اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک کچھ شبہے اور کچھ استعجاب کی نظر سے دیکھا اس حد تک کہ میں برا ماننے لگا۔ مگر آغا صاحب بہت خوش ہوئے، وہ ایک دم ہنسنے لگے اور پھر میری بھی قہقہے لگانے لگی، میں ایک عالم میں کیا کرتا میں بھی ہی ہی ہی کرنے لگا۔

"یہ میری بڑی شریر لڑکی ہے۔ اچھا اب رخصت۔"

میری واقعی بڑی دلچسپ لڑکی تھیں یعنی تھی تو وہ نا کتخدا مگر فل خاتون یعنی کچھ معزز قسم کی شخصیت تھی، اس لیے میں نے "تھیں" کا لفظ استعمال کیا۔

"آپ برا مان گئے تھے نا؟"

"نہیں۔"

"...دی میں یا بنی تھی" وہ پھر ہنسنے لگی اور میں بھی ہنسنے لگا۔

www.taemeernews.com

تو جناب یہ یو این کا سکریٹریٹ ہے، انتالیس منزل کی عمارت جو پوری ائرکنڈیشنڈ ہے۔ اس میں بھانت بھانت کے لوگ کام کرتے ہیں بلکہ اگر مجھے اجازت ہو تو کہوں بھانت بھانت کے لوگ موجود ہوتے ہیں کام کم کرتے ہیں۔ کام وام کی اصلیت میں بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال تو یہ چکنا فرش یہ تیز رفتار لفٹ یہ شیشے کی دیواریں یہ بارعب خاموش ماحول محسوس ہونے دیجیے "ونڈرفل" میں ہر بات پر ہر جگہ کہتا ہوں وہاں بلا میری نے میرا نام ونڈرفل رکھ دیا ہے۔

وہ پہلے مجھے تیسری منزل پر لائی وہاں سے ایک طویل برآمدے میں سے گزارتی ہوئی ایک بھول بھلیاں میں لے گئی جس نے سکریٹریٹ اور اقوام متحدہ کی عمارت کو ملا رکھا ہے۔ اب میں اس کا نقشہ کیا بتاؤں بس یوں سمجھیے کہ آن کی آن میں اس عمارت سے اقوام متحدہ کی عمارت میں پہنچ کر میں اپنے آپ کو ایک خاموش باوقار اور قالینوں سے پٹے ہوئے برآمدے میں پاتا ہوں۔ اس برآمدے میں سے آپ یو این کے تمام "عظیم" کمرے دیکھ سکتے ہیں۔

یہ جنرل اسمبلی ہے جہاں ہر سال ساری قوموں کے بقراط جمع ہوکر زیادہ تر فضول اور کبھی کبھی کام کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ بڑا وسیع ہال، ہزاروں کرسیاں، کرسیوں کے آگے ڈیسک، اور ڈیسکوں پر کان میں لگانے والے آلے جن کے ذریعے آپ اپنی پسند کی پانچ زبانوں میں سے کوئی سی زبان سن سکتے ہیں۔ اس وقت جنرل اسمبلی نہیں ہو رہی تھی، ہال خالی تھا اور اس میں ہلکا ہلکا اندھیرا بھی تھا۔ اس ہال میں کھڑے ہوکر میں نے چند منٹ مراقبہ کیا مگر دنیا میرے سامنے نہ آئی۔ میں نے بہت چاہا کہ میرے خیال کی آنکھیں ایک دم اس کرے کی ساری آبادی کو اس ہال میں جمع دیکھ لیں اور بہت سی سفید گوری نیلی پیلی بھوری اقوام دوڑ دوڑ کر اس کے کونوں کھدروں میں بھر بھی گئیں مگر ہال پھر بھی خالی نظر آیا۔ دور افق پر ستر کروڑ چینی اپنی دنیا الگ بنائے ہوئے معلوم ہوئے۔ اب مجھے اپنی ناکامی کا احساس ہوا۔ اس ہال کے اتھلے پن پر ہنسی آئی۔

"ستر کروڑ چینیوں کے بغیر یہ ادارہ کیسے کام کر سکتا ہے۔ یہ ہال کیسے بھر سکتا ہے۔ ٹھونس ٹھانس الگ بات ہے کیوں میری"

"تم سب ایشیائی پیدائشی فلسفے باز ہوتے ہو۔ مسٹر ونڈرفل تم تو اس وقت یہ ونڈرفل ہال دیکھو اور اس کا فرش اور یہ اونچی چھت اور یہ سامنے والی تصویر اور یہ بجلی پانی کا انتظام۔ باقی باتیں اپنے ہوٹل میں جاکر خط لکھتے وقت کسی دوست کے سر پر دے مارنا۔"

یہ حفاظتی کونسل ہے آپ کونسل کی طرح ایک میز لگی ہوئی نظر آئے گی جس کے گرد ممبر بیٹھے

www.taemeernews.com

ہیں مگر جہاں سے یہ تصویریں لی جاتی ہیں، وہ حصہ بھی اسی ہال میں شامل ہے، وہاں مبصرین، ناقدین صحافی اور دیگر افراد بیٹھتے ہیں۔ سیکورٹی کونسل کا ہال بھی اس وقت خالی ہے لیکن کیا پتا کل تک بھر جائے۔ یہ کونسل صرف چوبیس گھنٹے کے نوٹس پر بلالی جاتی ہے۔ کچھ پتا نہیں دنیا میں کس وقت کہاں کیا جھگڑا ہو اور کونسل بلالی جائے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ کبھی اس کا کوئی نتیجہ نکلتا ہے اور کبھی نہیں نکلتا۔ عام طور پر یہی مشہور ہے کہ یہ کونسل بھی ایک نام کی قسم کی مجلسِ مذاکرہ ہے خدا جانے اصلیت کیا ہے۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ اس کے ست رکن ہوتے ہیں جن میں پانچ تو پکے یعنی مستقل ہیں اور جنھیں ویٹو یعنی حق استرداد حاصل ہے اور دعا رضی طور پر باقی ملکوں میں سے ایک مقررہ طریقہ کار کے مطابق منتخب ہوتے رہتے ہیں اور انھیں ویٹو یعنی حق استرداد بھی حاصل نہیں۔

ویٹو کا کیا مطلب سمجھے آپ سنا تو بہت ہوگا، میں نے بھی بہت سنا تھا اور شاید سمجھا اب تک نہیں ہوں مگر یہاں بیٹھ کر ایک مزے کا حساب سامنے آیا ہے۔ ذرا ملاحظہ کیجیے:۔

اقوام متحدہ ساری دنیا میں سلامتی کی ضامن ہے، اب ایک طرف تو ساری دنیا کو سامنے رکھیے جو کوئی تین سو تین ارب انسانوں کی آبادی ہے اور دوسری طرف یہ کہ

امریکہ	آبادی	اٹھارہ کروڑ
روس	"	بیس کروڑ
فرانس	"	سات یا آٹھ کروڑ
برطانیہ	"	سات یا آٹھ کروڑ

ان سب کو بڑے سے بڑے ملک کے معاملے میں انفرادی طور پر ویٹو کا حق ملا ہوا ہے۔ فرض کیجیے ہندستان چین، پاکستان یعنی کوئی ایک سو تیس کروڑ انسانوں کا کوئی سنگین معاملہ حفاظتی کونسل کے سامنے پیش ہے، اور امریکہ، روس، فرانس تینوں ایک رائے پر متفق ہیں لیکن صرف برطانیہ متفق نہیں تو وہ اپنا حق استرداد استعمال کر سکتا ہے یعنی آٹھ کروڑ آدمیوں کا ایک ملک نہ صرف ایک سو تیس کروڑ آدمیوں کی آبادی پر بھاری ہے بلکہ اپنے ساتھیوں یعنی کوئی پچاس کروڑ انسانوں کی نمائندگی کرنے والے اور حق استرداد رکھنے والے ملکوں پر بھی بھاری ہے۔

کشمیر کے معاملے میں کئی بار حفاظتی کونسل کے جملہ اراکین ایک رائے پر متفق ہو گئے مگر اکیلے روس نے ویٹو کر دیا۔

حق استرداد

www.taemeernews.com

پانچ ملکوں کا حق استرداد جو پوری دنیا کی آبادی کے جمہوری حقوق سے زیادہ وزنی ہے۔
جمہوریت کے علمبرداروں کے لیے لمحۂ فکریہ۔

دوستو کل یعنی مستقبل کی بات الگ ہے مگر آج کی حقیقتیں نہ جھٹلاؤ، اقوام متحدہ کا خوبصورت بلند بانگ منشور ملاحظہ کرو، وعدے وعید دیکھو عمارت یا عمارتیں دیکھو، فنڈ دیکھو، اور حق استرداد یا ویٹو کی طاقت دیکھو اور غور کرو کہ پہلے وقتوں کے چند بدنام مفکرین کیا کہہ گئے ہیں۔

" اے مہاراج، سچ تو یہ ہے کہ طاقت ہی سب سے بڑا سچ ہے " چانکیا جو قدیم ہندو عہد کا ایک وزیر باتدبیر گزرا ہے، اپنی کتاب راج نیتی میں لکھ گیا ہے مگر بات بہت کڑوی ہے، بہت بُری لگتی ہے، اس لیے بیچارے پر آج تک گالیاں پڑتی ہیں۔

تو ان پانچ طاقتوں کو ویٹو کا حق کیوں ملا۔ اس لیے کہ انھی طاقتوں نے مل جل کر اقوام متحدہ بنائی تھی۔ ہم آپ تو بعد کے تازہ واردان بساط ہوائے دل ہیں۔ سو کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہو۔

ایک اور مزے کی بات یہ کہ چین کی جگہ فارموسا چین کی کرسی پر قبضہ کیے بیٹھا ہے اور یار لوگ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے مصداق تماشا دیکھے جاتے ہیں کبھی کبھار ہلکا سا احتجاج کر دیتے ہیں اور بس۔ آخر یہ کیا مذاق ہے کہ ایشیا میں سے حفاظتی کونسل کے پانچ مستقل اراکین میں صرف ایک ہو یعنی چین اور وہ بھی فارموسا والا ننھا منا سا سوا کروڑ آدمیوں کا چین جب کہ اصلی تے وڈا چین ستر کروڑ آدمیوں کا ایک سیل بے پناہ ہے جو اُسے نہ مانے، نہ دیکھے، وہ کیا کہلائے گا۔ اصلی تے وڈا بالقراط مگر ہمارے حبس تعالیٰ میں سے کھار ہے ہو اسی میں بھید کر رہے ہو۔ اگر تمھیں یہ سب احساس تھا تو یہاں آنے کی پابندی کیا تھی۔ یہاں آنے کی لاج تو رکھو۔ یہ تو اقوام متحدہ کا لٹریچر۔ اس میں اس کے بڑے بڑے کارنامے درج ہیں۔ آخر بیچاری کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہے۔ فلاں سن میں فلاں ملک کا تصفیہ یہ تھا کہ ....

مگر ویٹو کا ہتھوڑا میرے سر پر دھماکے کیے جاتا ہے۔

ویٹو۔

ویٹو۔

ویٹو۔

" تمھارے ملک کے ایک بڑے ذہین آدمی تھے۔ بخاری صاحب۔ " میری بولی، وہ یو این کے اولین اعلیٰ عہدیداروں میں تھے اور ویٹو کے اوّلین مخالفین میں شامل تھے۔ آج تو سبھی ویٹو کی مخالفت کرتے ہیں اس۔۔۔

www.taemeernews.com

یہ تو یوں ایک نہایت مقدس ادارہ تھی لیکن بخاری صاحب اس پر برابر طنز کرتے رہتے تھے۔ میں نے انھیں خوب دیکھا ہے۔"

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا

ایک دم میرا جی مچل گیا، میں نے حفاظتی کونسل پر لعنت بھیجی اور دوڑا دوڑا آغا صاحب کے پاس پہنچا۔

"آغا صاحب چاہے نوکری رہے یا جائے مگر مجھے ابھی بخاری صاحب کی قبر دکھا کر لائیے۔"

آغا صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"کیا آپ بھی اُن کے شاگرد تھے؟"

"نہیں۔"

"دوست۔"

"نہیں۔"

"پھر؟"

"صرف خانہ زاد اور مرید اور مداح۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ عام طور پر پاکستانی بھائی یہاں تک کہ بخاری صاحب کے بہت سے شاگرد بھی یہاں آ کر پہلے نائٹ کلب اور شاپنگ کا پروگرام بناتے ہیں۔ آج تک کسی نے مجھ سے پہلے دن یہ فرمائش نہیں کی۔ میں اپنے کام کا بڑا پابند ہوں اور ان کا مزار یہاں سے پچاس میل دور ہے مگر آئیے میں آپ کو ابھی وہاں لے چلوں۔"

"آپ کو ان سے کیا نسبت تھی؟" میں نے بے تکی سی بات کی۔

"وہ میرے استاد بھی تھے اور وہی مجھے یہاں لائے تھے۔" آغا صاحب نے آنکھیں صاف کیں اور جیسے میری انگلی پکڑ کر ایک بزرگ کی خدمت میں روانہ ہو گئے۔

لمحے بھر میں میرے دل سے اس انتالیس منزلہ عمارت، اس خوبصورت ریستوراں، ان بارعب کمروں کی یاد محو ہو گئی۔ جب نیویارک کو بھول گیا، امریکہ کو بھول گیا اور ایسا معلوم ہوا جیسے مدتوں بعد کسی بڑی ہی مقدس مہم پر روانہ ہو رہا ہوں۔

www.taemeernews.com

پاکستان اور بڑے بخاری

اب ذرا غور کیجیے کہ یونائیٹڈ نیشنز کے اڑتالیس منزلہ شیش محل یعنی سکریٹریٹ میں جو شہر نیویارک میں واقع ہے ایک ایشیائی دوسرے ایشیائی سے ایک تیسرے مرے ہوئے مرحوم و مغفور اور عملاً بے کار ایشیائی یعنی بڑے بخاری بطرس مرحوم کا ذکر کرتا ہے اور پھر دونوں سب کام کاج چھوڑ چھاڑ اس مرحوم کا مدفن دیکھنے روانہ ہو جاتے ہیں جبکہ نہ تو یہ حکم حاکم ہے نہ اس سے خوشنودی حاکم کی اُمید ہے نہ تمغا ملنے کا چانس نہ خطاب کا امکان نہ ترقی روزگار کا میدان نہ پرمٹ نہ لائسنس نہ فیکٹری۔

ظاہر ہے کہ یہ بیوقوفی نہیں تو کم از کم جذباتیت ضرور ہے' پڑھے لکھوں کے بقول خالی خولی سطحی جذباتیت' جس نے ایشیا کو اس پست سطح پر پہنچا دیا۔ میں پڑھے لکھوں سے یوں بھی مرعوب رہتا ہوں اور جب وہ بڑے لوگ ہو جائیں تو ان کی غیر سنجیدہ اور سرسری باتیں بھی اعلیٰ ارشادات اور گنجہائے گرانمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن آغا محمد اشرف تو خود پڑھے لکھے تھے۔ افسر بھی تھے اور برسوں دیار مغرب میں اس وقت گزار چکے تھے جب لندن کا نام نامی اسم گرامی ایک چیز سمجھا جاتا تھا۔ اور اب وہ یو این سروس کے ایک خاصے سینیئر افسر ہو چکے تھے۔ ان کی بیگم ولایتی یعنی انگریز تھیں' امریکہ میں ذاتی مکان تھا' غرض سب کچھ پاکستانی ولایتیوں سے زیادہ ولایتی تھا۔ وہ اپنے کام کی ذمے داریاں بھی خوب سمجھتے تھے۔ یو این میں یوں بھی ہفتے اتوار کو پوری چھٹی ہوتی ہے۔ (جیسے یورپ اور امریکہ میں ہوتی ہے) یعنی کل پانچ دن کام ہوتا ہے اس لیے کسی ذمے دار آدمی کے لیے ایک دن کے چند گھنٹے ضائع کرنا ایک غیر معمولی بات ہے۔ میں تو چلیے نیا آدمی' جذباتی' بوگس' بیکار مگر آغا صاحب کو کیا ہو گیا تھا؟

ظاہر ہے کہ آغا محمد اشرف نبیرۂ آزاد کو ایشیا ہو گیا تھا' یا دوسرے لفظوں میں کلچر ہو گیا تھا' کلچر جس کے معنی خالص مادیت پسندی سے مختلف ہیں' جس میں احسان فراموشی' شریف دشمنی' آزار دہی کے عناصر ذرا کم

www.taemeernews.com

ہی شامل ہیں اور جس میں جذبات اور خودداری اور وقار جیسے بہ ظاہر بوگس بے فائدہ فلسفوں کا خاصا حصہ پایا جاتا ہے سُنا ہے جسے کلچر کی بیماری ہو جائے وہ ناسازگار آب و ہوا میں جلد ہی مر جاتا ہے اور اگر جی بھی جائے تو پنپنے نہیں پاتا۔ اب دیکھیے نا آغا صاحب نہایت ملائمت سے کہہ سکتے تھے کہ شام کو چلیں گے' کل چلیں گے' یا اتوار کو چلیں گے' میں برا بھی نہ مانتا' یوں بھی مجھے بُرا ماننے کا حق نہیں تھا لیکن ورکنگ ڈے یعنی کام کے وقت میں ان کے عذر کا بُرا ماننا ویسے ہی غلط ہوتا پھر میرا غصّہ انھیں نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ میری خوشی انھیں فائدہ نہیں پہنچا سکتی تھی میں ان کا قدیم دوست نہ تھا' ہیرو نہ تھا' افسر نہ تھا' اور وہ کوئی ایسا فرشتہ بھی نہ تھے جو لوگوں کے جذبات یا خواہشات کی تکمیل کرنے پر مامور کیا گیا ہو۔

یا شاید یہ بخاری مرحوم کی کشش تھی' ان کی کرامات تھی' ان کے نام کی مقناطیسیت تھی۔ واللہ اعلم بالصواب

آغا صاحب کا گھر نیویارک سے چالیس پچاس میل دور ایک گاؤں میں تھا جس کا نام ہے اسکارس ڈیل۔ اسی گاؤں سے آٹھ نو میل آگے وہ قبرستان ہے جہاں بخاری صاحب دفن ہیں۔ آغا صاحب نے اپنی بیگم کو فون کیا کہ موٹر ریلوے اسٹیشن پر لے آئیں اور چند لمحوں میں ہم دونوں نیویارک کے پنسلوینیا اسٹیشن سے ایک زیرِ زمین ٹرین میں اسکارس ڈیل کی طرف روانہ ہو گئے۔

نیویارک شہر سے زیرِ زمین ریلوں کے علاوہ باقی سب ریلیں بھی یعنی شہر سے باہر جانے والی ریلیں بھی پہلے زیرِ زمین چلتی ہیں۔ اسٹیشن بھی زیرِ زمین واقع ہیں۔ شہر میں زمین کے اوپر تو جگہ ہے نہیں۔ یار دوگوں نے یہ بڑے بڑے عجب نما زیرِ زمین اسٹیشن بنا رکھے ہیں باہر جانے والی گاڑیاں بھی دس بیس منٹ زمین کے اندر اندر چلتی ہیں اور پھر باہر میدانوں میں آ جاتی ہیں۔ ہماری اسکارس ڈیل والی گاڑی پہلے تو اندھیرے میں چلی' اور پھر ایک دم اُجالے میں دوڑنے لگی وہ بہت تیز گاڑی تھی' چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر بھی ٹھہرتی تھی اور تیز بھی چلتی تھی۔ کوئی پون گھنٹے میں اسکارس ڈیل کا اسٹیشن آ گیا جس پر پلیٹ فارم نہ تھا۔ ایک جھٹکے سے گاڑی کھڑی ہو گئی اور ہمارے اُترتے اترتے روانہ ہو گئی۔ یہ وہاں کی گاڑی میں بڑی آفت ہے۔ آپ کو اپنی منزلِ مقصود سے چند منٹ پہلے سامان سنبھال کر تقریباً کودنے کے لیے تیار رہنا چاہیے ورنہ آپ کے اور آپ کے سامان میں جدائی ہو جائے گی یا آپ اگلے اسٹیشن پر اتریں گے اور اگر وہاں بھی نہ اُترے تو پھر شاید امریکہ پار کر کے کسی بڑے جنکشن ہی پر اُتریں گے۔

آغا صاحب کی بیگم گاڑی لیے موجود تھیں۔ شرفا جو نیویارک سے باہر رہتے ہیں عام طور پر ریل میں شہر آتے جاتے ہیں شہر میں پارکنگ کے چکّر سے بچ جاتے ہیں۔ ڈرائیو کرنے کی زحمت اور خطرات سے آزاد رہتے

www.taemeernews.com

ہیں اور وقت بھی بچ جاتا ہے۔ خیر یو این کا تو اپنا زیر زمین گیراج ہے جس میں تین ہزار موٹریں سما سکتی ہیں لیکن بہت سے یو این والے اپنی گاڑیاں نہیں لاتے، وقت خاصا بچتا ہے کیونکہ نیویارک شہر میں ٹریفک خاص طور پر دفتر آنے جانے کے اوقات میں ایک عذاب الٰہی سے کم نہیں۔ اس عذاب میں یہ حقیر کئی بار پھنسا اور طرح طرح کے نقصان اٹھائے مگر اسے باقی آیندہ میں شمار فرمائیے۔

ایک پُر بہار وادی سی ہے جس کے ایک کونے میں وہ قبرستان ہے جہاں بخاری صاحب دفن ہیں۔ موٹر کھڑی کرنے کے بعد آغا صاحب نے میرا ہاتھ پکڑا اور گھاس کے ہرے ہرے تختوں پر سے گزرتے ہوئے ایک خالی خولی صاف شفاف خطے کے آگے ٹھہر گئے۔

"یہ بخاری صاحب ہیں" انھوں نے ہری ہری دوب کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر کسی قبر کسی کتبے کسی تعویذ کا نام نشان نہیں۔

"کہاں" میں نے بے اعتباری سے پوچھا۔

"بس یہ سامنے"۔ انھوں نے انگلی جھکائی "یہ بالکل آپ سے ایک فٹ آگے۔"

وہ گھاس کے ایک لمبے سے قطعے کا ایک حصہ تھا اور چاروں طرف کہیں بھی نہیں کھینچی گئی تھی۔ بس ایک چھوٹا سا پودا ایک طرف لگا ہوا تھا وہ بھی بہت ہی چھوٹا اور بے پھول کے تھا۔

میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سفید اور بھوری بھوری قبریں بھی تھیں اور کتبے بھی۔ چھوٹے چھوٹے احاطے بھی تھے۔

"یہاں کوئی کتبہ بھی نہیں لگ سکتا تھا" میں نے سوال کیا جیسے ان پر الزام لگا رہا ہوں

"اہلِ پاکستان سے پوچھیے"

آغا صاحب مر گئے اور مجھے مرنا ہے اس لیے روایت میں کوئی غلطی ہو تو قصور ان کا نہیں میرے حافظے کا ہوگا۔ مگر جو مجھے یاد رہا وہ یہ کہ جب بخاری صاحب دفن کر دیے گئے تو یونائیٹڈ نیشنز والوں نے پاکستانی سفارت خانے سے کہا کہ آئیے مل جل کر ایک قبر بنوا دیں یا کتبہ لگوا دیں کہ یہ مرحوم آپ کے ملک کا بھی بڑا آدمی تھا اور اس کا مدفن بے نام و نشان نہ رہ جائے اور پھر فائل چل پڑی اور وہ آج تک چل رہی ہے۔

"اگر آپ یا کوئی جاننے والا ساتھ نہ ہو اور کوئی مدفن دیکھنے آئے تو اسے کیسے پتا چلے گا؟"

"سامنے قبرستان کا دفتر ہے، وہاں جائیے، مرحوم کا نام، وفات کا سن یا مہینہ یا تاریخ بتائیے، وہ رجسٹروں کی مدد سے پیمائش کرتا ہوا یہاں لا سکتا ہے، بڑی دیر لگتی ہے۔ فیس خاصی دینی پڑتی ہے۔ اور جوں جوں زیادہ وقت

www.taemeernews.com

گزرتا جائے گا رجسٹر بوجھل یا پرانے یا نئے ہو جائیں گے"۔ وہ پھر آبدیدہ ہو گئے۔

خواتین و حضرات! آپ یہ ملاحظہ فرمائیے۔ یہ گھاس کا تین گز احاطہ سید احمد شاہ بخاری پطرس کی قبر ہے جو گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل اور آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل اور پاکستان کے مستقل مندوب اقوام متحدہ اور پھر خود اقوام متحدہ کے انڈر سکریٹری تھے جو ایک بہت بڑے ادیب مانے جاتے تھے' جن کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا' جن کا حلقۂ اثر اس سے بھی زیادہ وسیع تھا اور جن کے براہ راست تلامذہ یعنی خالص ذاتی شاگرد ہزاروں اور اُن ہزاروں میں سیکڑوں بڑے بڑے آسودہ اور اعلیٰ عہدوں اور مراتب پر فائز ہیں اور جن کا نام آج بھی یو این کے دفتری اور تاریخی حلقوں میں پاکستان کی ساکھ بناتا ہی رہتا ہے بگاڑتا نہیں ہے۔ ان حضرت کے مدفن کو پکا احاطہ تو کیا' پوری قبر تو کیا ایک کتبہ بھی نصیب نہیں ہوا۔ ایک سیدھا سادا تین سو ڈالر کا کتبہ۔ پندرہ سو روپے کا خرچ۔ پندرہ سو روپے میں یار لوگ ایک ٹی پارٹی اڑا دیتے ہیں۔

مگر یہاں سوال روپے کا نہیں' توجہ کا ہے' ایسی توجہ جو کلچری یعنی تہذیبی اقدار کے بغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ اس عظیم ملک میں جس کے ثقافتی ورثے پر اترا اترا کر ہم بڑی بڑی تہذیبوں سے آنکھیں لڑاتے ہیں' اپنے عمائد کی قدر دانی کی یہ مثال کم از کم شاندار بالکل نہیں۔ اب یہاں سے بات بڑھ جانے کا اندیشہ ہے' اس لیے مختصراً اتنا جان لیجیے کہ واپس آ کر میں لاہور گیا اور جناب فیض احمد فیض کی موجودگی میں بخاری صاحب کے ایک قدیم ساتھی اور یار غار صوفی تبسم کو اپنے بچارے بدنام رائٹرز گلڈ کی پیشکش کی کہ کتبہ گلڈ بنوا کر پہنچائے گا۔ لکھوانے کی زحمت آپ کیجیے کیونکہ اگر ہم لوگ خود لکھوا دیتے تو نہ جانے مرحوم کے "مداح اور احباب" ہم پر کیا مقدمہ کر دیتے۔ صوفی صاحب قبلہ نے بچشم نم اس کام کو اپنے ذمے لیا۔ مختلف ڈیزائنوں' مضمونوں' تحریروں پر بھی گفتگو ہوئی' بعد میں بعض کئی بار یاد دہانی بھی کی گئی۔ ذوالفقار علی بخاری صاحب سے بھی عرض کیا گیا مگر جب تک کا مجھے علم ہے' کتبہ تیار نہیں ہوا تھا۔ خود میں بھی آخر یہیں کا رہنے والا ہوں' میں بھی بھول گیا۔ اب بات چل نکلی ہے تو اپنے قصور کا اقرار سب سے پہلے کرنا چاہیے۔ سو میں مصر ہوں کہ میں قصوروار ہوں مگر میں اس پر بھی مصر ہوں کہ میں ہی اکیلا قصوروار نہیں' قصوروار پوری قوم ہے' پورا معاشرہ' سب کے سب انٹلکچوئل' سب کے سب ادیب' سب پاکستانی جن کے ایک عظیم شہری کی قبر پر ایک چھوٹا سا کتبہ بھی نہیں ہے۔

کاش کوئی آج بھی میری تردید کر دے اور کہہ دے کہ اب وہاں کوئی نشانی نصب کر دی گئی ہے' کوئی یادگار قائم ہو گئی ہے۔ کاش۔ کاش۔ کاش۔ پرسوں میں نے فیض صاحب سے یہ بات چھاپنے کی اجازت مانگی تھی اور اجازت دیتے ہوئے وہ آبدیدہ ہو گئے تھے۔ آغا اشرف شاید آخری آدمی تھے جنھیں وہ منہ زبانی یاد

www.taemeernews.com

رہ گیا تھا، یعنی جو وہاں رہنمائی کے بغیر پہنچ جاتے تھے۔ اب وہ بھی نہ رہے۔ ان کے ساتھ ہی شاید یواین سے ایشیائی عقیدت مندی کی روایت بھی اُٹھ گئی ہوگی۔

یہ بھی سنتے چلیے کہ میں بخاری صاحب سے زندگی بھر میں صرف تین بار ملا تھا۔ ایک بار آزادی سے پہلے دلّی میں ان کے سامنے ایک انٹرویو میں پیش ہوا۔ نوکری تھی پروگرام اسسٹنٹ کی۔ یاد پڑتا ہے کہ آج کے ایک اعلیٰ افسر ادر رآز مرادآبادی صاحب، اعجاز بٹالوی صاحب، ضیا جالندھری صاحب وغیرہ اس مقابلے میں کامیاب ہوئے تھے اور منتخب کر لیے گئے تھے ـــــ اور میں نہیں لیا گیا تھا۔

پھر ایک بار آزادی کے بعد کراچی میں ان سے نیاز حاصل ہوا۔ تفصیلی گفتگو کا موقع ملا تو میں نے اُنھی کے ہاتھوں اپنی ناکامی کا قصہ یاد دلایا۔

"مجھے یاد نہیں" انھوں نے فرمایا "لیکن اگر تم آج بھی اسی عہدے کے لیے انٹرویو دو تو میں تھیں نہ لوں بلکہ اب تو بالکل ہی نہ لوں۔ کیوں کیا تم پروگرام اسسٹنٹ ہونا پسند کرو گے؟"

"مگر جناب میں اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلے میں کامیاب ہو چکا ہوں"۔ میں ان کی بات نہیں سمجھا تھا۔

"تم نے اپنے اوپر ظلم کیا، بھئی مجبور ہو گئے ہو گے، تم کو سرکاری ملازمت کے چکر میں نہیں پھنسنا چاہیے۔ بُرا نہ ماننا میاں برخوردار اتنے ذہین نظر آتے ہو مگر، ہو بالکل احمق۔"

"پھر میں کیا کروں قبلہ؟"

"پڑھو، لکھو، گانزر دو۔ اپنی آگ چاروں طرف پھیلا دو، ورنہ ایک دن خود تم سرد ہو جاؤ گے۔"

تیسری بار وہ یواین اوسے کراچی آئے تو نہ جانے کیوں مجھے یاد فرمایا۔ دو غزلیں سنیں، دو بیت سُنے، پھر یکایک جیسے کچھ یاد آیا ہو۔

"نوکری ہی میں چل رہے ہو۔"

"جی ہاں۔ اور کیا کروں۔"

"اچھا تو جاؤ مر جاؤ۔"

بس میں انھیں اتنا ہی جانتا تھا۔

نہ جانے ہم کتنی دیر تک اس مزار تختی کے سامنے کھڑے رہے۔ پھر تھک کر بنچ پر بیٹھ گئے۔ آغا صاحب نے زیر لب کئی سورتیں پڑھیں، میں سنتا رہا اور گنگناتا رہا اور پھر یکبارگی زندگی نے ہم سب کو واپس کھینچ لیا۔ آغا صاحب اپنے گھر چلے گئے، میں نیویارک واپس آ گیا۔ شام ہو گئی تھی میں نے کیسے نیویارک میں گھومنا شروع کیا۔

جسے آپ ٹائم اسکوائر کے نام سے جانتے ہیں وہ گلی نمبر ۴۰ سے ۴۳ اور براڈوے سے سڑک نمبر ۵ یعنی ففتھ ایونیو کے درمیان کا علاقہ ہے' جہاں سیکڑوں سینما گھر' ریستوران اور چند تھیٹر ہیں۔ رات کو یہ حصہ دن کی طرح لگتا ہے۔ یہیں نیویارک ٹائمز کی عمارت بھی ہے جس سے یہ علاقہ منسوب ہے۔ یہ ایک روشن ترین اور نہایت خطرناک علاقہ ہے۔ منٹ بھر میں جھگڑا فساد' چاقو پستول کا استعمال ہونے لگتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے پٹڑیوں پر بیٹھے بوٹ پالش کرتے ہیں' ساتھ نیویارک بلکہ امریکہ کی سب سے بڑی لائبریری اور اس کا پارک ہے جس میں سے رات کو پولیس والے اونگھتے ہوئے بوڑھوں اور لڑکھڑاتے ہوئے شرابیوں کو ڈنڈے مار مار کر نکالتے رہتے ہیں۔ یہ پارک بہت چھوٹا سا ہے اس لیے چلتے چلتے تھک جانے والے غربا جو ریستورانوں میں نہ بیٹھ سکیں یہاں آرام لے لیتے ہیں لیکن شام کو شرابیوں' بیکاروں اور جرائم پیشہ حضرات کا ہجوم ہونے لگتا ہے تو پولیس بھی چوکنی ہو جاتی ہے۔ برابر کے فٹ پاتھ پر آٹھ ٹیلیفون بوتھ لگے ہوئے ہیں۔ سکے ڈالو اور دوسرے شہروں سے بھی بات کرلو بعض اوقات ان کے آگے لمبے لمبے کیو لگ جاتے ہیں۔ لڑکے بالے اپنی گرل فرینڈز کو فون کرتے ہیں۔ کاروباری جو باہر سے آئے ہوئے ہیں' اور ٹائم اسکوائر کی سیر کررہے ہیں اپنے گھروں یا منیجروں سے بات کرلیتے ہیں۔

میں بھی کئی بار کیو میں لگا اور ہمیشہ بیچ میں سے نکل آیا۔ ابھی میرا کوئی نہیں جسے فون کروں۔ امریکہ اجنبی ہے اور کراچی کے چالیس ڈالر لگتے ہیں۔

گلی نمبر ۴۲ سڑک نمبر چھ کے نکڑ پر اطالویوں کی ایک دکان ہے جس پر لکھا ہے KING OF PIZZA کنگ آف پیت سا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اٹلی میں ایک مرغن چپٹا گرم گرم پراٹھا ہوتا ہے جس کا نام پیت سا ہے یہاں نیویارک میں بھی اطالویوں کی بہت سی دکانیں ہیں جن میں بطور خاص پیت سا بنایا جاتا ہے۔ KING OF PIZZA کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ دکان بہت گندی ہے اور یہاں پیت سا بہت بڑا بڑا بنایا جاتا ہے' یعنی ہمارے تنوری پراٹھے سے کوئی تین گنا بڑا' اس کے پاؤ حصے سے کم خریدا نہیں جاتا اور اس پاؤ حصے کی قیمت ہے دو سینٹ۔ ایک پاؤ لیجیے اور ساتھ میں دس سینٹ کی ایک کافی یا اسی قیمت کی کوکا کولا یا پیپسی کولا کی بوتل کھڑے کھڑے کھائی جائیے۔ کاغذ سے ہاتھ پونچھیے کاغذ وہیں پھینک دیجیے اور مونچھوں پر تاؤ دے کر چند قدم [illegible] کی روشنیوں میں گم ہو جائیے۔

یہ جو زرق برق لباس میں ایک خاتون دیوار سے پیٹھ لگائے کھڑی ہیں اصولاً انھیں معلوم ہونا چاہیے چونکہ یہ جگہ تماشا گاہوں سے بھری پڑی ہے اس لیے ساتھ یہ تفریح کرنے والے یہیں ملنے کا وقت طے کرتے

www.taemeernews.com

ہیں اور پھر آگے چلتے ہیں۔ لیکن اگر لڑکی کسی بوائے فرینڈ کے انتظار میں ہے تو ٹہلے گی یا دُکان کے آگے شیشے کے پیچھے رکھی ہوئی چیزیں دیکھے گی جسے ونڈو شاپنگ کہتے ہیں اور اگر طوائف ہے تو ماہرین نے نشانی یہ بتائی ہے کہ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آج میں خالی ہوں۔

خیر ماہرین نے یہ بات بعد میں بتائی مجھے از خود بڑا ہنگا تجربہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ میں گھومتے گھومتے تھک کر خود ایک دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا کہ برابر میں یہ زرق برق شعلہ جوالہ نظر آئیں میں نے آنکھ بھر کر انھیں دیکھا اور پھر غافل ہو گیا' لیکن اب کے انھوں نے ٹوک دیا۔

"ہے مسٹر۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو۔" وہ بڑا مائیں۔

"کچھ نہیں میں تھک گیا ہوں۔"

"تو پھر کسی ریسٹوران میں جا بیٹھو' یا اپنے گھر جاؤ۔"

میں چپ رہا۔

"تم اجنبی ہو۔"

"جی ہاں" میں نے آہ بھری

"تو پھر چلو تمھیں نیویارک کی سیر کرا دوں"

"کیا خرچ ہوگا" میں نے واقعی بھولپن سے پوچھا۔

"پچاس ڈالر میرے اور باقی جو خرچ ہو"

آہا۔ تو یہ قصہ ہے۔" سوری" میں نے جلدی سے کہا۔ اور بھاگنے کی تیاری کی مگر انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میں ابھی تمھیں پولیس میں دے دوں گی۔ تم بدمعاش ہو تم مجھے چھیڑ رہے ہو۔" وہ زور زور سے بولنے لگیں میں گھبرانے لگا۔ یا اللہ اگر بات بڑھ گئی تو دنیا عورت کا یقین کرے گی' میری یونیسکو کی نوکری گھروالے اور سرکاری نوکری کے کاغذات میری آنکھوں کے آگے ناچنے لگے۔ اخباروں میں استہزائیہ کالم "احباب" کے طعنے چغلخوریاں' کانوں میں طرح طرح کی آوازیں آنے لگیں۔

"ہیے۔ وٹ آر یو ڈوئنگ" ایک ہاتف غیب کا پردہ پھاڑ کر چیخا۔ وہ ہاتف غیبی ایک موٹا تازہ امریکی پولیس سارجنٹ تھا۔ اس نے مجھے بھر میں زرق برق خاتون کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا۔ آس پاس کے لوگ ٹھٹک گئے

"دیکھو آفیسر میں اجنبی ہوں یہاں کھڑا تھا۔ انھوں نے یہ کہا' میں نے یہ کہا' میں ایک معزز پاکستانی

www.taemeernews.com

رائٹر ہوں اور یونیسکو۔"

"گو آن سر لوگو آن۔" پولیس والے نے مجھے سنا ہی نہیں اور خاتون کے چنگل سے مجھے چھڑا کر گویا ایک دھکا سا دیا۔ خاتون نے میرے بارے میں کچھ کہنے کی بجائے اس سے ہاتھا پائی شروع کر دی۔

"نہیں آج میں نے کچھ نہیں کیا میں تو صرف ٹہلنے آئی تھی کہ یہ حضرت مل گئے اور انھوں نے خود مجھ سے بات کی میں تو ان سے مذاق کر رہی تھی۔ پرسوں تو میں بیمار تھی۔ اس واقعے سے میرا کوئی تعلق نہ تھا۔ مجھے چرچ میں لے چلو میں قسم کھاؤں گی۔" وہ برابر اپنی بانہہ چھڑاتی رہی اور سارجنٹ انھیں تیز تیز نظروں سے دیکھتا رہا۔

"روزی" وہ زور سے بولا "پرسوں کے واقعے میں تمھارا نام لکھا ہوا ہے تم ضرور جیل جاؤگی مگر میں تم سے آخری بار کہتا ہوں کہ مزید تکلیف سے بچنے کے لیے میرا علاقہ چھوڑ دو ورنہ میں تمھیں نہیں چھوڑوں گا۔" پھر وہ میری طرف مڑا "تم آگے کیوں نہیں بڑھتے مسٹر۔ تم جاؤ اپنا کام کرو۔"

"میں تو اپنی صفائی دینے کے لیے ٹھیرا ہوا ہوں۔" میں نے آبیل مجھے مار والی بات کہی۔

"نہیں مسٹر مجھے تمھاری صفائی کی ضرورت نہیں اور اگر تمھیں بہت شوق ہے تو تھانے چلو واقعی تم اجنبی معلوم ہوتے ہو۔"

میں چپ چاپ آگے کھسک لیا۔

"روزی مائی ڈیر خدا کے لیے کسی اور علاقے میں کھڑی ہوا کرو، میں تمھیں اپنی زندگی میں تو ٹائم اسکوائر میں دیکھ نہیں سکتا" چلتے چلتے میں نے اُسے کہتے ہوئے سنا اور دیکھا کہ روزی نے اس کے ہاتھ کو زور سے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ایک لمحے کے لیے بٹوے میں سے ایک آئینہ نکال کر دیکھا اور ایک ٹیکسی روک کر مشرق کی طرف روانہ ہوگئی جہاں گرینچ ولیج واقع ہے۔

ایک پہلو یہ بھی تھا نیو یارک کی تصویر کا۔

www.taemeernews.com

جنگل، سمندر اور اونچائیاں

اب میں نیویارک کے جنگل کا ایک باقاعدہ جانور ہو گیا ہوں۔

مشکل یہ ہے کہ آپ نیویارک کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ اس کی اونچی اونچی عمارتیں، تھیٹر، امرا امارت، سیاست ان سب سے آپ کو لاتعداد امریکی فلموں، امریکی کتابوں اور چاچا جانے متعارف کرا رکھا ہے۔ میں کون سا نیویارک آپ کو دکھاؤں۔ شیشے اور لوہے کی عمارتوں کے ڈھیر کے ڈھیر۔ برق رفتار لفٹ۔ تھرکتی ہوئی روغنی اور مرغن نازنینیں۔

چلیے ایک نیویارک یہ دیکھیے۔ سامنے ایک عمارت کے آہنی دروازے کے سامنے سیڑھیوں پر یہ جو بوڑھا آدمی بیٹھا ہے اور جس کا چہرہ اس کی ٹوپی نے چھپا رکھا ہے ایک خالص امریکی ہے۔ اس قوم کا فرد جو آدھی دنیا کو قرض اور نقد امداد اور فوجی امداد اور ٹیکنیکل امداد اور فلمی اور قلمی امداد دیتی ہے جو دنیا کی امیر ترین قوم ہے۔ اٹھارہ کروڑ امریکی جن کے پاس صدہا ایٹم بم اور شاید سیکڑوں ہائیڈروجن بم ہیں اور جو چاند تک دوڑ لگا رہے ہیں، اپنی قوم کے اس بوڑھے کا سر اونچا اور کمر سیدھی نہیں کر سکتے۔

"اوہ۔ ہی از اے بم" (اوہ۔ یہ تو ایک بم ہے) وہ اس بوڑھے کے بارے میں کہتے ہیں۔ بم کو بم نہ سمجھ لیجیے گا۔ یہ اصطلاحی بم BUM والا ہے جس کے اصطلاحی معنی ہیں ناکارہ، نکھٹو، شرابی، آوارہ، نشے باز، مخبوط الحواس آدمی۔ یہاں ایسے تمام لوگ بم کہلاتے ہیں جو عملی زندگی میں صحت مندانہ حصہ نہ لے سکے ہوں۔

مگر آئیے اس سے بھی پوچھیے کہ وہ کون ہے اور ایسا کیوں ہے۔

"آں۔ میں ایک بیکار آدمی ہوں۔ کیونکہ میں بوڑھا ہوں اور صرف سرکاری پنشن پر جیتا ہوں۔ سرکاری پنشن کوئی تیس ڈالر ہفتہ ملتی ہے۔ کام کے قابل میں رہا نہیں۔ میرا لڑکا جنگ میں مارا گیا۔ نہ بھی مارا جاتا تو میری

مدد کیوں کرتا۔ یہاں کسی کی اولاد بڑھاپے میں اس کا ساتھ نہیں دیتی۔ اپاہج خانے میں زندگی گزارنی سخت مشکل ہے یوں بھی اپاہج خانے کافی نہیں ہیں۔ پھر میں کیا کروں۔ نہیں میں زیادہ شراب نہیں پیتا کبھی کبھی پی لیتا ہوں کبھی بہت زیادہ بھی پی لیتا ہوں۔ آہ مسٹر دور ہو جاؤ۔ کیا تم کوئی اخباری نمائندے ہو۔ میں انٹرویو دینے کے پچاس ڈالر لوں گا۔ لاؤ رقم نکالو۔ ورنہ چمپت ہو جاؤ۔ جاتا ہے کہ نہیں سالے ابھی ایک دھپ مار کر ہڈی پسلی ایک کر دوں گا ——— "

اس بوڑھے کو بے کاری اور ضعیفی کی پنشن ضرور ملتی ہے مگر وہ کافی نہیں وہ کرائے پر ایک کمرہ نہیں لے سکتا۔ باقاعدہ خوراک نہیں کھا سکتا۔ وہ سڑکوں پر اور پٹریوں پر اونچے اونچے مکانوں کی سیڑھیوں پر پڑا رہتا ہے کبھی پولیس ایک طرف سے ہٹا دیتی ہے کبھی دوسری طرف سے۔

یہ بوڑھا بھی نیو یارک ہے۔ یہ بوڑھا بھی امریکہ ہے۔ اس بوڑھے کو اس حالت میں رکھنے کا ذمے دار میں نہیں ہوں۔ کوئی ایک مخصوص امریکی فرد بھی نہیں ہے۔ ایک نقطۂ نظر سے کوئی بھی نہیں ہے یہ خود ان حالوں کو پہنچا ہے۔ کیونکہ انسان خود اپنی تقدیر بناتا بگاڑتا ہے۔ ایک اور نقطۂ نظر سے اس کا ذمے دار پورا امریکہ ہے پورا ملک ہے۔ پوری قوم ہے پورا عالم ہے اور اس عالم میں میں بھی شامل ہوں میں یونیسکو کا ایک وظیفہ یافتہ ایک غریب قوم کا معمولی سا آدمی۔

" ہاں جناب میں اس کی پوری ذمے داری لیتا ہوں۔ ایک عالمی شہری کی حیثیت سے یہ آدمی صرف راک فیلر صاحب اور فورڈ صاحب کی ذمے داری ہی نہیں بلکہ مجھ حقیر فقیر کی بھی ہے۔ آپ جو سزا تجویز کریں مجھے منظور ہے۔" میں نے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر گویا یونائیٹڈ نیشنز کا مزا لیا اور آگے بڑھ گیا۔ زیادہ بال کی کھال نہیں نکالتے ورنہ دورے پڑنے شروع ہو جاتے ہیں اور خاکسار کو مولانا محمد علی جوہر جیسا کوئی جوہر نہیں ملا جو بال کی کھال نکالنے پر کمر باندھ لے نہ مولانا حسرت موہانی کی طبیعت جو ایک طرفہ تماشا تھی۔

اور اس بوڑھے کے بڑھاپے کے سامنے یہ جوانی بھی ملاحظہ کیجیے۔ یہ تصویر میں نے بڑی احتیاط سے انتخاب کی ہے۔ یہ نہ عریاں ہے نہ فحش بلکہ صرف جوانی ہے بھرپور اور معصوم اور شاداب جوانی۔ یہ لڑکی بھی امریکی ہے اور نیو یارکن ہے۔ وہ بھی سیڑھیوں کے آگے غافل تقریباً ڈھلکنے والا ہے اور یہ عین سڑک کے بیچ اس طرح کھڑی ہے جیسے اب ایڑی مار کر زمین کا سینہ چاک کر دے گی۔

[illegible] سے نیویارک

[illegible] سے نیویارک

www.taemeernews.com

مگر آیئے باقاعدے قرینے سے شروع کریں۔ ویسٹ سائڈ مغربی سمت کی گودی سے ایک اسٹیمر لیں اور سب سے پہلے "مس لبرٹی" یعنی خاتون آزادی کی زیارت کریں، کہ روایت کے مطابق امریکہ وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں مس لبرٹی کا بت نصب ہے۔ یہ بت نیویارک کے مشرقی کونے سے تھوڑی دور آگے عین سمندر میں نصب ہے اور یہی امریکہ کی نصب العینی کہانی کا ایک درخشاں باب بھی ہے۔

مس لبرٹی سطح سمندر سے تین سو بیس فٹ اونچی ہیں اور اس کے خالق امریکی نہیں بلکہ ایک فرانسیسی مجسمہ ساز فریڈرک آگسٹی برتھولڈی تھے۔ یہ بت انیسویں صدی کے فرانسیسی حریت پسندوں کا تحفہ ہے جو انھوں نے امریکہ کی جنگ آزادی یعنی برطانوی سامراج سے چھٹکارا پانے کی خوشی میں بھیجا تھا۔ ویسے یہ جنگ آزادی ختم تو ہو گئی تھی اٹھارویں صدی میں، لیکن فرانس والے سو برس تک سوچتے ہی رہے کہ

تحفۂ انقلاب کیا بھیجیں

اور پھر ۱۸۸۶ء میں امریکہ کی تاریخ آزادی یعنی ۴ جولائی کو یہ تحفہ امریکی قوم کو پیش کر دیا گیا۔

مس لبرٹی کا اپنا قد ایک سو بارہ فٹ ہے۔ الٹے ہاتھ کی لمبائی ایک سو گیارہ فٹ، سر سوا ستر فٹ، سینہ ۳۵ فٹ اور سیدھے ہاتھ کی لمبائی (جس میں وہ مشعل لیے ہوئے ہیں) بیالیس فٹ ہے۔ موصوفہ کانسی کی بنی ہوئی ہیں، وجیہہ ہیں، سنجیدہ ہیں اور طرحدار بھی، مگر یہ نہ پوچھیے کہ ان کی تعمیر و تکمیر کن کن مراحل سے گزری۔ بہر حال آپ نہ بھی پوچھیں تو بات چل پڑی ہے اور چل کر رہے گی۔ آج یہ عظیم الشان بت سب زائرین اور عاشقان امریکہ کو رنگا رنگا سجا سجایا بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مگر وہ جو کہا ہے کہ

تا کو بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
جب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

تو یہ سہرا بھی یونھی نہیں بنا بلکہ پہلے تو ایک امریکی فرانسیسی یونین قائم ہوئی جس نے ڈھائی لاکھ ڈالر جمع کیے۔ اس وقت کے لحاظ سے ۱۸۸۱ء کے ڈھائی لاکھ ڈالر کام شروع کرنے کو بہت تھے جیسے بابائے اردو نے ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کا چارج علامہ شبلی سے صرف ایک بکس کی صورت میں لیا تھا۔

برتھولڈی نے مجسمے کے کئی حصے بنائے۔ ان حصوں کو جوڑنے اور سہارا دینے میں ہمارے مشہور دوست آئی فل صاحب بھی شریک ہوئے جنھوں نے پیرس کا آئی فل ٹاور بنایا تھا۔ بت کے کئی حصوں کی نمائشیں بھی ہوئیں۔ مثلاً داہنے ہاتھ کی نمائش ۱۸۷۶ء میں امریکی شہر فلیڈلفیا میں منعقد ہوئی۔ سر کی نمائش ۱۸۷۸ء میں بمقام پیرس کی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ سرخ فیتے نے بھی خوب خوب رنگ دکھائے۔ یہ جزیرہ جہاں اب مس صاحب

تمام فرانس میں پہلے بیڈلو جزیرہ کہلاتا تھا بی ڈلو۔ اب بات میں پھر بات نکلتی ہے۔ یہ بیڈلو صاحب ایک مہاجر تھے جو سترھویں صدی میں تشریف لائے تھے اور اس جزیرے پر قبضہ جما گئے تھے۔ جب ۱۶۷۳ء میں انھوں نے انتقال فرمایا تو ان کی بیوہ نے یہ پورے بارہ ایکڑ کا جزیرہ حکومت نیویارک کو اسّی ڈالر یعنی کوئی ساڑھے چار سو میں بیچ دیا۔ اس کا نام ۱۹۵۶ء تک بیڈلو جزیرہ ہی تھا۔ یہاں تک کہ امریکی کانگریس نے صدر آئزن ہاور کے ایما پر ایک قرارداد کے ذریعے اس کا نام بھی جزیرۂ آزادی رکھ دیا۔

ہمارے ناموں پر مت جا۔ نام تو بدلتے ہی رہتے ہیں کبھی قرارداد کے ذریعے اور کبھی اس کے بغیر بھی۔

ہاں تو بت تیار ہو گیا تب بھی اس کی تنصیب کے لیے امریکی کانگریس کی منظوری ضروری تھی۔ کانگریس فیاض بلکہ فراخ تک ہے گر ملکی زمین کے چپے چپے پر جان دیتی ہے اس کے استعمال کا حق دینے میں اس نے خوب سوچ بچار کیا اور کہیں جا کر ۱۸۸۶ء میں مجسمہ یہاں نصب ہوا۔ اب یہاں اس بت کے پاؤں تلے بارہ لاکھ ڈالر کی لاگت سے امریکہ آنے والے مہاجرین سے منسوب ایک میوزیم تیار ہو رہا ہے جس میں ابتدائی تارکین وطن کی یادگار چیزیں، نقشے اور تاریخی مواد جمع کیے جائیں گے۔ افسوس کہ مجھے متعلقہ کمیٹی میں شامل نہ کیا گیا ورنہ میں مشورہ دیتا کہ ایک ایسا عجائب گھر بناؤ جس میں بھانت بھانت کے مہاجرین جمع کرائے جائیں۔

یہاں ایما لازارس (EMALIZARUS) کی ایک نظم کندہ ہے آپ اس کا نثری ترجمہ (تھوڑا سا) سنیے:

یونانی روایت کے اُس جنّات جیسی ہیبت بت جو ملک ملک کو تاراج کر دیا کرتے تھے۔
یہاں ہمارے سمندر سے دھلتے ہوئے اور مدھم سورج کے سنہری دروازوں پر ایک طاقتور
خاتون کھڑی رہے گی جس کے ہاتھ میں مشعل ہو گی۔
مشعل جس کے شعلوں میں بجلیاں مقید ہوں گی اور اس کا نام ہو گا مہاجرین کی ماں
اور اس کے درخشاں ہاتھوں سے دنیا بھر کو خوش آمدید کا پیغام ملتا رہے گا۔
اس کی نرم آنکھوں میں شہروں کو ملانے والے پُل محسوس ہوں گے۔
اس کے خاموش ہونٹوں سے ایک سی صدا آ رہی ہے۔
قدیم زمین (یونان) تیرا روایتی شان و شکوہ تجھے مبارک
مجھے اپنے تھکے ماندے، افلاس زدہ دے دے۔
وہ انسان جو تھکے ماندے ہوں، آزادی کے سانس لینے کے لیے تڑپ رہے ہوں
وہ قسمت کے مارے انسان جو تیرے کناروں پر طوفان زدہ پڑے ہیں۔

www.taemeernews.com

انھیں ادھر بھیج دے ۔ میری طرف ۔ ان بے مکانوں کو ادھر بھیج ۔
میں ایک سنہرے دروازے پر اپنی مشعل اُٹھائے کھڑی ہوں

یہ ابتدائی امریکہ کی ایک موثر اور دلچسپ کہانی ہے، اس زمانے کی جب امریکہ بن رہا تھا، جب یورپ میں مذہبی دیوانگی اور احتساب اور غربت اور لامکانی کے شکار لاکھوں انسان کسی نئی دنیا میں پہنچنے کے لیے مضطرب تھے اس وقت امریکہ کے دروازے سنہرے بھی تھے اور سب کے لیے کھلے ہوئے تھے ۔ مگر آج ۔ آج کی کہانی بالکل دوسری ہے لیکن یہ بھی باقی آیندہ میں شمار فرمائیے۔ فی الحال تو جزیرہ آزادی سے واپس نیویارک میں تشریف لے آئیے ۔

یہ جو سفید سفید جھاگ ہیں، اس کشتی کی تیز رفتاری سے پیدا ہوئے ہیں جو ہمیں (بلکہ مجھے) جزیرۂ آزادی کی طرف لائی ہے ۔ وہ سامنے نیویارک اور اس کی عمارتوں کا وہ سلسلہ ہے جو اسکائی لائن کہلاتا ہے یعنی فلک بوس عمارتوں کا سلسلہ، حالانکہ فلک بہت اونچا ہے اور عمارتیں اونچی ہوتے ہوئے بھی بہت نیچی ہیں ۔ لیجئے اسی گھپلے میں اس شہر کی بلکہ دنیا کی سب سے اونچی عمارت کی سیر کریں ۔ آپ اس عمارت کا نام خوب جانتے ہیں، میں بھی خوب جانتا ہوں ۔ مگر یوں تو آپ نیویارک کا نام بھی خوب جانتے ہیں، اور نیویارک کو نہیں جانتے ۔ یہ عمارت ایک الگ نیویارک ہے ۔ ایک الگ دنیا ۔ ایک شہر ۔ سنا ہے یہاں پچاس ہزار آدمی کام کرتے ہیں ۔ ایک چھوٹے موٹے شہر کے برابر آبادی ۔ پچاس ہزار آدمی ۔

یہ ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ ہے ۔

ففتھ ایوے نیو یعنی سڑک نمبر پانچ پر گلی نمبر چونتیس میں داخل ہوں اور اوپر دیکھے بغیر چلیں تو کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا اس عمارت کے آگے سے ایسے ہی گزر جاتے ہیں جیسے کسی دوسری عمارت کے آگے سے نکل گئے ۔ لیکن اگر اس کے آگے ٹھیر کر اوپر دیکھو تو کھڑے ہو کر آدھی عمارت ہی نظر آئے گی، پوری عمارت دیکھنے کے لیے لیٹنا پڑے گا ۔ اور وہ بھی بالکل سیدھا ۔ مردے کی طرح لیٹ جائیے سیدھا کیجیے اور آنکھیں اوپر اٹھائیے تو پوری عمارت کا ایک منظر کھلے گا اور پھر آنکھیں دھندلا جائیں گی ۔

کیا آپ یقین کریں گے کہ میں نے اسے اسی طرح دیکھا ۔ راہگیر ٹھٹک گئے، دو چار آدمی ہنسے (دو چار لڑکیاں بھی ہنسیں) دو چار برا مانے، مگر کسی نے پوچھ گچھ نہیں کی، نہ مار پیٹ کی دھمکی دی ۔ میں چند ساعت لیٹا رہا اور پھر کھڑے ہو کر اطمینان سے کوٹ جھاڑا، پتلون جھاڑی ابھی نہیں، اور پھر یکبارگی دروازے میں گھس گیا ۔

"ایک ڈالر پچیس سینٹ، ٹکٹ سے استقبالیہ کی ایک خاتون نے دھمکی دی، اور جھٹ سے میں ٹکٹ لے کر

www.taemeernews.com

ایک قطار میں شامل ہو گیا جو ایک لفٹ کے آگے بن رہی تھی۔ یار لوگ اپنے عجائب بھی ٹکٹ لے کر دکھاتے ہیں۔

لفٹ بجلی کی طرح چلا۔ دروازے میں اوپر کی طرف منزلوں کے نمبر گزرتے جاتے ہیں۔ ایک دو تین چار پچاس ساٹھ۔ ساٹھ پر کانوں میں ہلکا سا دباؤ محسوس ہوا جیسے ہوائی جہاز پرواز کے لیے بلند ہو رہا ہو 'خواتین' نے مسکاریاں بھریں۔ دل میرا بھی ڈرا مگر نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔

لفٹ بجلی کی طرح تیز تھا مگر آپ جانیں خیال کی رفتار بجلی سے بھی تیز ہوتی ہے۔ میرے دل میں دو خیال ایک کے بعد ایک آئے۔ ایک تو یہ کہ اگر بجلی فیل ہو جائے تو اس لفٹ کا کیا ہو گا۔ ساٹھویں منزل سے جو یہ نیچے گرے گا تو زمین سے ٹکرانے تک میری کیا کیفیت ہو گی' کیا میں چیخیں مارنے لگوں گا یا چپ چاپ کوئی دعا پڑھوں گا' یا بہادرانہ کسی خاتون کا ہاتھ تھام لوں گا۔ اسی خیال کے نتیجے نمبر ۲ میں میں نے آس پاس والی کئی خواتین پر ایک گہری انتخابی نظر ڈالی کہ اگر لفٹ نیچے گرنے لگے تو کس کا ہاتھ تھاما جائے۔ میں نے دیکھا دو تو پہلے اپنے اپنے "اُن" کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کھڑی تھیں' ایک کی ناک بہت اونچی تھی اور قطعی معزز معلوم ہوتی تھیں۔ ان کی ناک لفٹ کے گرنے پر بھی اونچی کی اونچی رہے گی' اس لیے میری بہادری بیکار جائے گی۔ پھر ایک دم ایک خاتون چہرے مہرے سے بے یار و مددگار حقیر بیوہ یا یتیم دلپذیر قسم کی نظر آئیں۔ ان کی آنکھیں نرم تھیں' لباس سادہ اور شاندار تھا عمر خاصی پختہ تھی' مگر ایسی بھی نہ تھی۔ وہ مہربان اور جرأت پسند معلوم ہوتی تھیں چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر میں بے حواس نہ ہوا اور خود چیخیں مارنے نہ لگا تو یقیناً انھیں کو اپنی خدمات پیش کروں گا۔

دوسرا خیال بہت ذلیل تھا مگر یہی ادبی دیانت کا تقاضا ہے کہ اسے چھپایا نہ جائے۔ وہ یہ آیا کہ میرے مرنے کے بعد گلڈ والے میری یاد میں قاعدے کا جلسہ کریں گے۔ میری "زریں" خدمات پر کوئی کتاب و تاب نہ دہ بر چھاپیں گے یا یونہی ایک چھوٹی سی تقریب پر ٹرخا دیں گے۔ اور پھر میرا جانشین یعنی مرکزی سکریٹری کون ہو گا۔ مجھے اعتراف ہے کہ ساٹھویں منزل سے اکسٹھویں منزل تک مجھے اپنا کوئی معقول جانشین نظر نہ آیا۔ وہ خیال خاصی دیر چلا یعنی کوئی پانچ سات سیکنڈ یا شاید اس سے کم یا زیادہ' بہر حال کوئی ایک منزل چلا۔ اور پھر ایک مایوسی کی لہر پورے بدن میں دوڑا کر چلا گیا۔

"ابھی ہمارے ہاں اچھے کارکنوں کی بہت کمی ہے" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "اس لیے مناسب یہی ہے کہ یہ لفٹ سلامتی کے ساتھ اوپر پہنچ جائے اور نیچے بھی اتر آئے اور مجھے وطن لے جانے والے جہاز بھی سلامتی سے پہنچا دیں۔" مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنے آپ سے ایسی شرمناک باتیں کہیں۔ مگر کیا غرض کہ آپ سے کوئی دوسرا ایسی بات کہہ کر ہی نہیں دیتا۔

www.taemeernews.com

یہ لفٹ منزل نمبر اسّی پر رُکتا ہے۔ مجھے یہی یاد ہے یا شاید چھیاسی پر رکتا ہوگا۔ یہ ایک آراستہ پیراستہ برآمدہ ہے یہاں سے پھر قطار میں کھڑے ہوکر دوسرا لفٹ لینا پڑتا ہے۔ لفٹوں کا کچھ حساب ہی ایسا ہے۔ یہ میل تھی، اب پسنجر چلے گی پسنجر ٹھمک ٹھمک کر چلتی ہے اور سویں منزل پر پہنچا دیتی ہے جہاں ایک گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروشں ہے

یہ ریستوران، یہ کھلونوں، تحفوں اور کتابوں کی دکان، یہ شیشوں سے ڈھکے ہوئے برآمدے، یہ غسلخانے سطح زمین سے بارہ سو پچاس فٹ بلند ہیں۔ بارہ سو پچاس فٹ یعنی چار سو سترہ گز یعنی دو فرلانگ سے زیادہ، او بابا ہمارا قطب مینار کتنے گز اونچا تھا یاد پڑتا ہے کہ اسّی گز اکہلاتا تھا۔ اسّی گز کا مطلب ہے دو سو چالیس فٹ یا شاید دو سو چالیس گز تھا۔ سوکیا تھا یہ جگہ چار سو سترہ گز اونچی ہے۔ یہ ٹیلیفون بھی زمین سے چار سو سترہ گز اوپر لگا ہوا ہے۔

"ہلو۔ ہلو۔ آغا اشرف صاحب ہیں۔"

"میں بول رہا ہوں، کہیے عالی صاحب اس وقت کہاں کی اُڑان لے رہے ہیں"۔ بھئی واہ اس وقت اڑان کے استعمال نے کیا مزا دیا ہے۔

"ابھی میں تو ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کے ریسٹوران سے بات کر رہا ہوں بارہ سو پچاس فٹ سے۔ میں اس وقت آپ سے بات کرتے وقت تھر تھر کانپ رہا ہوں۔"

"خوب کانپیے" وہ بولے "اگر ہمت ہو تو چالیس ڈالر بھنا کر ریزگاری جمع کیجیے اور ٹیلیفون میں جمع کر کے کراچی سے بھی بات کر لیجیے۔ اس بات چیت میں اور بھی مزا آئے گا۔"

"یعنی یہاں سے ٹرنک کال بھی ہو جائے گی۔"

"بالکل ہوگی۔ ہر ٹیلیفون سے ہوسکتی ہے۔ ہاں تو ہمت کیجیے۔ اچھا تو میری طرف جھانک کر دیکھیے میں دسویں منزل پر بیٹھا ہوں۔ مگر میرا رُخ دریائے مشرق کی طرف ہے۔ آپ کو یو۔ این ٹیلیفون والے رُخ سے نظر نہیں آئے گی۔"

"ہاں ادھر سے نظر نہیں آتی۔"

"اچھا تو بات ختم کر کے برآمدے کی دوسری طرف آجائیے اور مجھے جُھک کر سلام کیجیے آج صبح سے آپ ملے بھی نہیں آپ پر ایک سلام برادرانہ قرض ہے۔"

میں نے دوسری طرف جاکر یو این دیکھی۔ ماچس کی ڈبیا تھی۔ وہ انتالیس منزلہ عمارت ایک : وانچ کی چیز معلوم

www.taemeernews.com

ہوئی اس میں آغا اشرف کیا نظر آئیں گے چیونٹی کی طرح رینگ رہے ہوں گے۔" ادھر یہ یو۔ این کی عمارت کیا لگو آ ہے جی!" میں سوچنے لگا جیسے ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ میرے والد مرحوم سے مجھی کو ترکے میں ملی ہے۔

اب اس بارہ سو پچاس فٹ سے اوپر بھی ۲۲۲ فٹ اونچا ٹیلیوژن کا ایک ٹرانسمیٹر اسٹیشن نصب ہے۔ اس کے گرد روشنی رات کو ہر وقت گھومتی رہتی ہے۔ فی الحال تو وہ ایک تکون لمبوتری سی چیز لگتا ہے اور برآمدے میں سے باہر جھانک کر اس کی بناوٹ دیکھی نہیں جا سکتی۔

میں برآمدے میں اکڑ اکڑ کر گھوما۔ چائے پر چائے پی۔ انڈے تلوا کر کھائے۔ منہ ہاتھ دھویا۔ ٹیلیفون کر ہی چکا تھا۔ ڈاک کے ٹکٹ خریدے۔ بلڈنگ کی تصویروں والے کارڈ خریدے، وہیں پوسٹ بکس بھی ہے، کھٹ کھٹ سب کارڈ اور لفافے ڈالے۔ دو چار عقیدتمندوں کو مختصر خطوط بھی تحریر فرمائے۔

"اس وقت میں تمہیں ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کی سب سے اونچی منزل سے خط بھیج رہا ہوں۔"

"میں ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کی سب سے اونچی منزل پر ہوں۔"

"یہ ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ ہے۔ اُف یا خدا۔ یہ بہت اونچی ہے۔"

"کیسی بلندی کیسی پستی۔"

"میں نے خط طرح طرح کے (یعنی بالکل بوگس) شروع کیے مگر بعد میں وطن پہنچ کر معلوم ہوا کہ سوائے ایک مکتوب الیہ کے باقی سب پر دھونس پڑ چکی تھی جنھوں نے دھونس نہیں مانی وہ ایک ایسے صاحب تھے جن کے کچھ دام مجھ پر کافی مدت سے واجب تھے۔

یہ ایک سو چار منزلہ عمارت ۱۹۳۱ء میں بنی۔ اس کا تخمینہ تھا پانچ کروڑ ڈالر مگر تکمیل کے زمانے میں امریکہ اقتصادی بحران کا شکار ہو گیا اور کل لاگت چار کروڑ دس لاکھ ڈالر کے قریب آئی۔ مگر پھر کیا ہوا۔

انیس سو چون میں ایک صاحب مسمی ہنری کراؤن نے اسے سوا پانچ کروڑ ڈالر میں خرید لیا اور یہ ترکیب کی کہ اس کی زمین پونے دو کروڑ ڈالر میں پروڈینشل انشورنش کمپنی کو بیچ دی اور دس لاکھ ڈالر سالانہ کرایہ عمارت کا مقرر کیا یعنی اگر انشورنس والے کہہ دیتے کہ میاں ہٹاؤ اپنی ایک سو چار منزلیں ہم تو اپنی زمین پر مانگے سوتے کا کھانا بنائیں گے۔ مگر یہ امریکہ ہے یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔

... اور سنیے سنا ہے میری واپسی کے بعد یعنی دسمبر ۱۹۶۱ء میں ایک کمپنی نے عمارت ساڑھے چھ کروڑ ... کے ... اسے کمپنی کے نام لکھ دی اور ایک سو دو برس کے لیے کرائے پر چڑھا دیا ہے سالانہ کرایہ مقرر ہوا ہے ... ڈالر ... ٹوسے فیٹ یعنی کرائے دار مل جل کر ادا کرتے ہیں۔

www.taemeernews.com

اس عمارت کا کرایہ ایک کروڑ ڈالر سالانہ ہے۔ ساڑھے چار کروڑ روپے سال۔ اللہ اکبر۔

اس کے مینار کی روشنیاں چار لیمپوں پر مشتمل ہیں۔ جن کی طاقت دو ملین یعنی دو کھرب موم بتیوں کے برابر ہے۔ یہ روشنیاں سات ساحلی شہروں میں اور سمندروں میں ستانوے میل دور تک نظر آتی ہیں۔ انھیں آدھی رات کے بعد بجھا دیتے ہیں، نہ جانے کیوں۔ یہ بھی سنا ہے کہ موسم بہار اور موسم سرما میں چند روز کے وقفوں سے روشنیاں بجھا دی جاتی ہیں تاکہ ہجرت کرنے والے پرندے ان کی تیز اور لمبی شعاعوں میں گرفتار ہو کر راستہ نہ بھول جائیں۔

پہلے خیال آیا کہ یار یہاں ہجرت کی بڑی عزت ہے مگر تحقیق و تجربہ بتاتا ہے کہ امریکہ میں ہجرت کے بھی رنگ ہوتے ہیں۔ سفید رنگ ہجرت تو گھر کی بات ہے، بھورا رنگ ادن ہوں۔ زرد رنگ نوں خاں اور کالا رنگ تو خدا کی پناہ۔ کالے مقامی کی زندگی عذاب ہے ہجرت کر کے تو کیسے آسکتا ہے۔

خیر یہ بقول کسے غیر ملکی سیاست پر تبصرہ نگاری ہے جس کے لیے ابھی یہ حقیر فقیر لوزوار دنیو یارک کوالی فائڈ یعنی قابل نہیں ہے۔

اب میں ایمپائر اسٹیٹ کی بلندیوں اور وہاں سے نظر آنے والی پستیوں پر فلسفہ طرازی نہیں کر سکتا کیونکہ بہت سے سفرنامہ نویس یہ کام نہایت خوبی سے کر چکے ہیں۔ مجھے تو صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ بلندی کے لیے ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ پر چڑھنا اور پستی کے لیے منوڑے میں رہنا کوئی شرط نہیں ہے۔

افسوس کہ یہ باب اُن کا ذکر کیے بغیر گزر گیا جن کے لیے علامہ مرحوم تک فرما گئے ہیں کہ

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

مگر اس میں قصور میرا نہیں بلکہ ان خواتین کا ہے جنھوں نے اس باب میں داخل ہونے کی کوشش ہی نہ کی کیمرہ خلاؤں کی تصویریں لینے لگے تو فلم اسی طرح خراب ہوتے ہیں۔

www.taemeernews.com

میری اقوام متحدہ اور کہانیاں

اجی لعنت ہے یونیسکو کے وظیفے پر۔ آج کل تو بندہ ایک اقوام متحدہ میں رہتا ہے، وہ آغا اشرف والی یعنی آپ لوگوں کی اقوام متحدہ نہیں جس کی عمارت گول گنبد جیسی سفید ہے اور جس کا انتالیس منزلہ سکریٹریٹ سڑک نمبر ا گلی نمبر ۴۴ کے موڑ پر واقع ہے بلکہ یہ اصلی بالکل فرسٹ کلاس اقوام متحدہ ہے جہاں اتحاد ہونہ ہوا قوام بےشمار ہیں اور اتحاد کی بات تو یہ ہے کہ خود آپ کی یعنی سرکاری اقوام متحدہ عرف یونائیٹڈ نیشنز میں کون سا اتحاد موجود ہے۔

ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

ہائے زمانے کی نیرنگی۔ یہ شعر مولانا حالی نے غالب کے مرثیے میں لکھا تھا اور مولانا حالی اسے دیارِ مغرب کے پس منظر میں استعمال کر رہے ہیں۔ مگر خیر مولانا حالی ہی نے کچھ اور بھی فرمایا تھا سو وہ ہے میرے بارے میں۔ پڑھ کر خوش ہو لیجیے وہ تھا۔

غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت

یہاں یوں پڑھیے:

حالیٔ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسمان سے کیا نسبت

ویسے مولانا غلطی کر گئے۔ آسمان بغیر خاک کے آسمان کیسے ہوتا۔ خاک تو بغیر آسمان کے خاک رہ سکتی ہے لیکن آسمان کے لیے خاک کا وجود نہایت ضروری ہے ورنہ اس امتیاز کا پتا ہی نہ چلنے پائے گا.....

افوہ پھر بقراطیت۔

www.taemeernews.com

یہ انٹرنیشنل ہاؤس ہے۔ میری حد تک دنیا بھر میں سب سے زیادہ دلچسپ رنگا رنگ اور زندہ مقام۔
اس کا پتا ہے نمبر ۵۰۰ ری ور سائڈ ڈرائیو (RIVER SIDE DRIVE) یہ ری ور سائڈ ڈرائیو ایک طرح نیویارک کی مغربی سرحد یعنی ایک طویل سڑک ہے جو دریائے ہڈسن کے ساتھ ساتھ کئی میل تک چلی گئی ہے۔ نیویارک کی بہت سی گلیاں بڑی بڑی سڑکوں سے گزرتی ہوئی اس پر ختم ہوتی ہیں — یا اس میں کھل جاتی ہیں۔ گلی نمبر ۱۲۲ سے متصل اور دریائے ہڈسن کے سامنے یہ انٹرنیشنل ہاؤس دنیا بھر سے ایک الگ دنیا ہے جسے راک فیلر فاؤنڈیشن کی مدد سے قائم کیا گیا تھا۔ یہ ایک طرح کا ہوسٹل ہے جس میں ملک کے سیکڑوں طالب علم اور طالبات نہایت سستے نرخ پر قیام اور طعام کا لطف اٹھاتے ہیں۔ امریکہ اور بطور خاص نیویارک کے نرخ دیکھتے ہوئے یہاں کا سستا پن مثالی ہے اور کچھ یہاں کی روایات بھی ہیں اس لیے داخلہ بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ دو دو تین تین برس پہلے سے نشستیں مخصوص ہوتی ہیں۔ طالب علم یا طالبہ کا نیویارک کی کسی نہایت مستند درس گاہ میں داخل رہنا نہایت ضروری ہے۔ اس کی درسگاہ سے باقاعدہ رپورٹ بھی آتی رہے اور رپورٹ اچھی آئے۔ بھیجنے والا ملک زور دار ہو تو سکینڈ کلاس لڑکے لڑکیاں بھی چل جاتے ہیں ورنہ فرسٹ کلاس ہونا شرط اول ہے مجھے مستقل کرایوں کی تفصیل معلوم نہیں، سالانہ یا ششماہی میقات کے حساب سے لیے جاتے ہیں۔ ہاں عارضی قیام کی شرح حیرت انگیز طور پر کم ہے

عام کمرہ	ساڑھے تین ڈالر فی روز
اسکالر کا کمرہ	پانچ ڈالر فی روز

عام کمرے زیادہ ہیں یعنی کئی سو ہیں۔ طویل طویل برآمدوں میں چھوٹے چھوٹے کمرے۔ کمرے میں ایک سخت مسہری جس پر نرم گدا اور دو کمبل۔ منہ دھونے کا برتن جس میں گرم اور ٹھنڈے پانی کے نل لگے ہوئے ہیں لکھنے پڑھنے کی نہایت عمدہ چھوٹی سی چمکدار میز کرسی۔ میز میں بہت سے خانے۔ کپڑوں کی الماری۔ ٹیلیفون ندارد۔ مگر ہر منزل یعنی برآمدے میں ایک ٹیلیفون ہے اور اس کا نظام کار عجیب ہے۔

ٹیلیفون تو ایک ڈبے میں رکھا ہوا ہے تاکہ آپ بات کریں تو آس پاس سے گزرنے والا سننے نہ پائے مگر اس تک پہنچنے کا قصہ بالکل دوسرا ہے۔

آپ کے کمرے میں ایک گھنٹی لگی ہوئی ہے اور گھنٹی کے نیچے ایک بٹن ہے۔ آپ کی کال باہر سے آتی ہے تو ٹیلیفون آپریٹر وہ گھنٹی بجا دے گی آپ فوراً بٹن دبائیے اس کا مطلب ہوگا حاضر جناب یعنی کمرے میں موجود ہوں۔ اب آپ باہر بھاگیے کیونکہ اب آپریٹر نے برآمدے والے ٹیلیفون کی گھنٹی بجانی شروع کردی ہے، جو ں کی

www.taemeernews.com

آپ نے وہاں پہنچ کر ٹیلیفون اٹھایا آپ کو اپنا نام یاد کر کے بتانا پڑے گا تاکہ وہ باہر والی کال کا سلسلہ آپ سے ملا دے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ بعض اوقات یار لوگ شرارت کی وجہ سے برآمدے والے ٹیلیفون کی گھنٹی سن کر ٹیلیفون اٹھا لیتے ہیں اور دوسرے کی کال سننا چاہتے ہیں حالانکہ مطلوبہ صاحب ابھی کمرے سے باہر بھی نہیں آتے۔ (کیونکہ کمرے سے کم از کم پتلون قمیض یا کرتا پاجامہ پہن کر برآمدے میں آنا پڑتا ہے)

ہاں اگر آپ کو خود فون کرنا ہو تو اس ٹیلیفون سے صرف ہاؤس کے اندر ہی اندر سلسلہ ملایا جاتا ہے۔ باہر بات کرنے کے لیے نیچے جائیے جہاں کئی پبلک ٹیلیفون لگے ہوئے ہیں۔

غسلخانے وغیرہ مشترک ہیں مگر وائی ایم سی اے جیسے نہیں بلکہ تعداد میں کافی اور "باپردہ" اور عمدہ۔ برآمدے میں نہیں ہر منزل پر ایک بہت آرام دہ نشست گاہ ہے۔ جہاں بیٹھ کر پڑھا جا سکتا ہے گپ بھی ہوتی ہے "تاش شطرنج سب کچھ چلتا ہے۔ یہ نشست گاہیں بہت روشن اور صاف ہیں۔ آپ کے کمرے میں صرف دو کرسیاں ہوتی ہیں اس لیے زیادہ ملنے والے یا ساتھی یا ساتھ مل کر پڑھنے والوں کے لیے وہاں جگہ نہیں ملتی۔ وہ کمی یہاں پوری ہو جاتی ہے۔

مگر یہ تو ہوا برآمدوں کا یعنی سونے کے کمروں والی منزلوں کا حال۔ اب نیچے یعنی پہلی منزل کی دنیا اصل دنیا ہے۔ ایک تو یہ زبردست نشست گاہ ہے جس میں ہمارے حساب نہایت بیش قیمت فوم ربر کے صوفے پڑے ہوئے ہیں۔ سو ڈیڑھ سو آدمی کھلے کھلے آرام سے بیٹھ سکتے ہیں۔ پورا کمرہ ٹھنڈا ہے (جاڑوں میں گرم) اس کے ساتھ ایک کتب خانہ ہے۔ کتب خانہ رات کے تین بجے تک کھلا اور روشن رہتا ہے جبکہ بڑی نشست گاہ رات کے بارہ بجے بند کر دی جاتی ہے۔

نشست گاہ کے نیچے ریستوران ہے جو صرف ہاؤس میں رہنے والوں یا ان کے مہمانوں کے لیے مخصوص ہے یہ بھی ٹھنڈا (اور گرم) ہے اور یہاں بہت سی اقسام کا کھانا خاصا سستا مل جاتا ہے۔ لفٹ ہر منزل سے یہاں پہنچ جاتے ہیں' لڑکے لڑکیاں صبح تیار ہو کر سیدھے اپنے اپنے لفٹ سے یہیں اترتے ہیں سخت بھیڑ ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ٹیلیویژن کے دو کمرے ہیں۔ ایک میں جو اکثریت کی مرضی ہو اس کے مطابق اسٹیشن لگائے جاتے ہیں۔ ایک میں مقبول عام کارٹون فلموں اور پروگراموں سے بیزار ننگ چڑھے خواص بیٹھ کر خصوصی پروگرام ملاحظہ فرماتے ہیں۔

اسی منزل سے نیچے دھوبی خانہ ہے یعنی ایک ہال جہاں کپڑے دھونے اور سکھانے کی خودکار مشینیں لگی ہوتی ہیں اور ساتھ ساتھ [illegible] استریاں بھی۔ مشینوں میں پیسے ڈالنے ہوتے ہیں۔ بیس سینٹ میں کپڑے دھونے

www.taemeernews.com

کی مشین آدھ گھنٹے چلی۔ آپ چھ سات قمیصیں، دو تین پتلونیں [illegible] سکتے ہیں یا پھر انھیں نکال کر یا سوکھنے دیجیے یا جلدی ہو تو دس سینٹ والی سوکھنے کی مشین میں ڈال دیجیے وہ گرم ہوا میں گھما گھما کر دس منٹ میں سب کچھ بلکہ آپ کا گلا بھی خشک کر دے گی' استری مفت ہے اور ساری ذمے داری آپ کی ہے۔

(بیا ہوا فقرے باز۔ تف ہے تم پر)

مگر اسکالر والے کمرے کی کیا بات ہے۔ شاید کل چار کمرے ہیں جو پانچویں اور چھٹی منزل پر ہیں۔ یہ معزز منزلیں کہلاتی ہیں کیونکہ زیادہ اوپر جانے سے باہر کا منظر بے مزا ہو جاتا ہے۔ خیر۔ ہر اسکالر کمرے کی کھڑکی باغ کی طرف کھلتی ہے اور اس میں سے دریائے ہڈسن بھی صاف نظر آتا ہے اور رات کو دریائے ہڈسن کے پار نیو جرزی کی روشنیاں۔ یہ کمرہ بالکل شاہانہ ہے غسلخانہ اور وہ بھی نیلے رنگ کے ٹب والا غسلخانہ اس میں موجود دو دو بستر' ایک عمدہ صوفہ سیٹ۔ قالین اور فل یعنی پورا ٹیلیفون جس کے ذریعے کال بھی باہر ہو سکتی ہے۔

اسکالر کمرے خصوصی مہمانوں کے لیے ہوتے ہیں یعنی بیرون نیویارک یا بیرون امریکہ سے خاص علمی شخصیات مثلاً پروفیسر وائس چانسلر قسم کے لوگ تشریف لائیں اور پہلے سے اطلاع ہو اور وہ کولمبیا یونیورسٹی جیسے ادارے کے مہمان ہوں تو اسکالر کمرہ انھیں دے دیا جاتا ہے مگر بیک وقت کوئی اسکالر پانچ دن سے زیادہ نہیں ٹھیر سکتا۔ ان کمروں میں صرف ایک خرابی یا خوبی ہے وہ یہ کہ یہ لڑکیوں کے حصے میں واقع ہیں اور آنے جانے والوں کو وہ لفٹ لینا پڑتا ہے جسے لڑکیاں استعمال کرتی ہیں۔

مجھے یہ کمرہ کیسے ملا — اس کی داستان الگ ہے۔ وہ تفصیلی طور پر سنانی مناسب بھی نہیں کیونکہ اس میں سفارش اور جھوٹ کا ذکر آئے گا۔ سفارش آغا اشرف مرحوم نے کی تھی' سو وہ اللہ کو پیارے ہوئے' میں ان کا سدا ممنون رہوں گا' انھوں نے بڑی دانوں سے فرما دیا تھا کہ یہ حضرت بڑے پہنچے ہوئے اسکالر ہیں اور اپنے ملک میں بہت بااثر بھی ہیں' اگر انھیں یہ کمرہ نہ ملا تو واپس جا کر امریکہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ جھوٹ میں نے بولا یعنی جب وہاں کے منتظم نے میری خصوصی آؤ بھگت کے دوران چند تحقیقی سوالات کیے تو میں علمی انداز میں اس طرح بولا جیسے ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور ڈاکٹر عبدالسلام اور پروفیسر حمید احمد خاں بولتے ہوں گے' اور سیاسی انداز میں ایسے بولا جیسے میرے پورے ملک کے دانشور اور طالب علم و طالبات اور عوام صرف میری واپسی کے منتظر بیٹھے ہیں کہ میں واپس پہنچ کر اپنے تاثرات بیان کروں اور وہ پاک امریکی تعلقات کے مستقبل کا فیصلہ کریں۔

"آپ ہمارے ملک کو سمجھتے نہیں ہمیں امداد کم دیتے ہیں اور ہندوستان سے دوستی بڑھا بڑھا کر ہمیں ناخوش کیے جاتے ہیں۔" میں نے کمرے کی چابیاں لے کر شکریہ بھی ادا نہیں کیا اور صدر منتظم کو گویا دھمکی دی کہ پاکستان تو

www.taemeernews.com

چھوٹے سے آرام دہ کمرے کی پروا نہیں کرتا۔

مدرِ منتظم کھسیانا ہو کر ہنسنے لگا "آپ سے ہم بہت کچھ سیکھیں گے" وہ بولا "ابھی آپ آرام کیجیے۔ یہاں لوگوں سے رابطہ پیدا کیجیے۔ شام کو آپ کی تعارفی پارٹی ہے ہمیں امید ہے آپ کا قیام خوشگوار ہوگا۔"

اور شام کو میری تعارفی پارٹی میں اس نے کوئی سو سوا سو بکا بکا منہ کھولے لڑکے لڑکیوں سے مجھے پاکستان کے مشہور دانشور ڈاکٹر عالی کہہ کر متعارف کرایا۔ اس کے پاس یونیسکو کے شعبۂ رابطہ واقع نیویارک یعنی آئی آئی ای نے میرے بارے میں جو کاغذات بھیجے تھے ان میں ایک جگہ وہی پرانی غلطی دہرا دی گئی تھی یعنی مجھے ڈاکٹر لکھ دیا گیا تھا۔

"میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ میں عالم فاضل بھی نہیں ہوں" میں نے اپنی تقریر میں دبی زبان سے سرکاری طور پر اس اطلاع کی تردید کر دی لیکن علم و فضل کے باب میں میرے انکسار کی وجہ سے سننے والوں نے اسے بھی انکسار ہی سمجھا۔ بہت سے لڑکے لڑکیاں اخلاقاً ہنس دیے اور مجھے بعد میں بتایا گیا کہ اہالیانِ ہاؤس پر میری ملنساری اور فروتنی کا بہت اچھا اثر ہوا تھا۔ مجھے اقرار ہے کہ میں نے بطورِ خاص اس اطلاع کی تردید نہیں کی۔ میں کیوں کرتا کیا میں نظام سقے سے بھی گیا گزرا تھا۔ کیا آپ نظام سقے کی کہانی سے واقف ہیں۔ شاید نہیں ہیں! اچھا ہی ہے۔

اب کہاں کا نیویارک اور کہاں کی سیاحت۔ پہلا ہفتہ تو تفصیلی اور انفرادی تعارف ہی میں گزر گیا۔ ایک ایرانی دوست (تھا وہ طالب علم) مذاقاً روز پوچھتا:

"آج دربارِ عالی کتنی دیر چلا؟"

ذرا تصور فرمائیے ہم اس وقت یعنی ۱۹۶۱ء میں چونتیس ختم پینتیسویں برس میں داخل ہو رہے ہیں۔ پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل اور آس پاس اٹھارہ انیس زیادہ سے زیادہ بیس اکیس برس کے لڑکے لڑکیوں کا ہجوم ایف ایس اسکالر روز کہاں ملتا تھا جو ہر بات میں ٹانگ اڑائے اور سارے دن ساری دنیا کو اپنے خرچ سے چائے پلاتا ہے مانا کہ میری آمدنی چھ سو ڈالر مہینہ تھی مگر میں اپنے ساتھ بھی کچھ جمع پونجی لایا تھا۔ سرکاری تنخواہ بھی ملتی تھی اور آغا شفیع وغیرہ سے قرض لینے کے امکانات نہایت روشن ہو گئے تھے۔ چند روز میں یہ نوبت آ گئی کہ مجموعی ملاقاتوں کی بجائے انفرادی گفتگو ہونے لگی اور وہ بھی کھسر پھسر کے انداز میں کبھی ریستوران میں اور کبھی ٹیلیویژن کے کمرے میں چھپے چھپے سے بیٹھے ہیں کبھی لڑکا — کبھی لڑکی اور

"نہیں ڈاکٹر عالی میری اصل الجھن محبت ہے۔"

"ہاں ڈاکٹر عالی میری اصل الجھن محبت نہیں والدین کی نا چاقی ہے۔"

"مجھے وہ فرانسیسی لڑکی پسند ہے مگر اسے میں پسند نہیں ہوں۔"

www.taemeernews.com

"مجھے وہ افریقی لڑکا ہی پسند ہے میں کسی اور سے شادی نہیں کرسکتی۔"

"مجھے وہ لڑکی چھیڑتی رہتی ہے۔ اُف میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔"

"مجھے یہ تمام ماحول ناپسند ہے' یہاں میرا دم گھٹتا ہے مگر کوئی اور سستی جگہ بھی تو نہیں ہے۔"

اے بھائی یونیسکو کے فیلو شپ یافتہ پاکستانی شاعر یہ کس چکر میں پھنسے ہوئے ہو۔ تم کتابوں' رسالوں چھاپے خانوں' اخباروں' خبر رساں ایجنسیوں اور کاپی رائٹ کے معاملات سیکھنے کی تنخواہ پاتے ہو یا مسائل پر گفتگو کرنے کی۔

اب میں سب دکھی پریشان اُلجھے ہوئے لڑکے لڑکیوں کا بہترین مشیر کہلاتا ہوں۔ وہ گھروں سے دور' پیسے سے تنگ' اپنے اپنے مسائل میں مبتلا ایک طرح میرے سائے میں آرام کرنے آتے ہیں۔ مجھے دنیا کے بہت سے ملکوں کے نوجوانوں سے تبادلۂ خیال کا موقع مل رہا ہے' اب یہ نہ پوچھیے کہ اس تبادلے میں کتنا کچھ مل جاتا ہے' یہ اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔ مجھے تو ہر انسان سے کچھ نہ کچھ ملتا رہتا ہے' سکھ نہ ملے تو دکھ' دوستی نہ ملے تو دشمنی' محبت نہ ملے تو نفرت۔ نفرت بھی نہ ملے تو حقارت۔ حقارت نہ ملے تو بیگانگی۔

سوچیے تو یہ سب کے سب بڑے بڑے خزانے ہیں۔ نہ سوچیے تو ....

یہاں کی ایک رسم عجیب ہے۔ اصول رہائش یہ ہے کہ لڑکے دائیں طرف کی منزلوں میں اور لڑکیاں بائیں طرف رہیں۔ بیچ کے سارے دروازے بند رہتے ہیں۔ لڑکا لڑکی ایک دوسرے کی منزل پر نہیں جا سکتے۔ ملاقات صرف نشست گاہ، کھانے کے کمرے میں، کتب خانے میں' ٹیلی ویژن کمرے میں یا دھوبی گھاٹ پر ہو سکتی ہے یا باہر جا کر ملیے۔

مگر ———

مگر جمعہ کو دو گھنٹے، ہفتے کو چار گھنٹے اور اتوار کو چھ گھنٹے کے لیے یہ حجابات اُٹھا دیے جاتے ہیں' لڑکے لڑکیاں اپنے دوستوں کو اپنے اپنے کمروں میں لے جا سکتے ہیں اور گھنٹوں ساتھ گزار سکتے ہیں۔

"اس کا فلسفہ یہ ہے" صدر منتظم سمجھاتے ہیں کہ "سارے ہفتے تو یہ لوگ ایک دوسرے سے ہنستے بولتے ہیں۔ پیار کی پینگیں بڑھاتے ہیں' اگر ہم چھٹیوں کے دنوں میں بھی ان پر پابندی لگائیں تو یہ زیادہ پیسے خرچ کر کے خطرات مول لے کر ہوٹلوں کلبوں اور نیو یارک سے باہر دوسرے مقامات پر جائیں گے۔ زیر بار بھی ہوں گے اور رسوا بھی۔ رہا معاملہ اخلاق کا تو جناب یہ مسئلہ خود اعتمادی کا ہے' جسے بُرا ہونا ہے وہ ہماری پابندیوں سے رک نہیں سکتا' نیو یارک ہوٹلوں اور موٹلوں سے بھرا پڑا ہے۔ ان کے بہت سے دوست شہر میں الگ الگ فلیٹوں میں رہتے ہیں۔ وہاں جا سکتے ہیں۔ نہیں مسٹر عالی جنسی بے راہ روی پر مصنوعی یا بندیاں لگا کر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ اس ہاؤس میں لڑکے لڑکی کے

www.taemeernews.com

باہمی ارتباط پر ہمارا تجزیہ اور تجربہ یہ ہے کہ لوگ باہمی تنہائیوں کا زیادہ تر وقت لڑنے بحث کرنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں گزارتے ہیں۔ آپ خود دیکھیں گے کہ ہر لڑکا بآسانی ہر لڑکی کو اپنے کمرے میں نہیں لے جا سکتا۔ کیونکہ اس طرح وہ لڑکی گویا اپنے آپ کو اس سے منسوب کر لیتی ہے جو وہ سوچ سمجھ کر ہی کرتی ہے۔"

یہ فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا مگر ان کی بات اس حد تک سچ نکلی کہ اس رعایت کے باوجود بہت سے بلکہ بیشتر لڑکے نشست گاہ اور ریستوران ہی میں جھک مارتے نظر آتے تھے۔ وہ طالبات آبرو باختہ نہیں تھیں نہ وہ جگہ قحبہ خانہ تھی۔

پھر بھی یہ طریق زندگی سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر کو میں ایشیائی ہوں۔ ہاں تو مجھے ان ونڈرفل نوجوانوں سے ملنے کا جو موقع ملا ہے اسے میں پوری طرح استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس صورت حال سے بہت خوش ہوں۔ اوہ...... موقع مل رہا ہے۔ اوہ میں کتنا مالدار ہوتا جاتا ہوں۔ یہ نوجوان لڑکے لڑکیاں اپنے اپنے قصے سناتے ہیں' اپنے گھروں کے اپنے دکھوں کے' اپنے رشتے داروں کے قصے سناتے ہیں۔ اپنے ملک کی سیاسیات سے باخبر کرتے ہیں۔ عالمی سیاست پر گفتگو کرتے ہیں۔ یہاں کوئی حفاظتی کونسل نہیں۔ کوئی جنرل اسمبلی نہیں' کوئی ڈپلومیٹک مسکراہٹ' جھوٹ فریب' دھوکے بازی' سودے بازی کچھ نہیں۔ ان کے اپنے اپنے ذاتی' تعلیمی' خاندانی اور روحانی مسائل ہیں۔ چھوٹی چھوٹی محبتیں ہیں' عداوتیں ہیں' رقابتیں ہیں' اور وہ سب کی سب اپنی سادگی اور خلوص کی وجہ سے مجھے بخش دیتے ہیں۔ میرے لیے یہ دنیا کے سب سے انمول تحفے ہیں۔ یادیں جن کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

برائیڈی BRIDE باہر سے آتی ہے وہ ہاؤس کی بے ضابطہ رکن ہے' یعنی ملنے جلنے آ سکتی ہے لیکن قیام نہیں کر سکتی کیونکہ وہ نرس ہے اور باقاعدہ طالبہ نہیں' اس کی عمر بھی خاصی ہے یعنی کوئی پچیس برس کی ہوگی جس کی وجہ سے وہ TEEN AGERS یعنی بیس برس سے کم عمر والوں میں خوشی کے ساتھ قبول نہیں کی جاتی۔ وہ بھدی بھی ہے' یعنی چھوٹے قد کی موٹی سی لڑکی ہے اور غریب بھی۔ لیکن وہ علی سے محبت کرتی ہے علی ایک افریقی ریاست کا گھنی گنی نوجوان ہے' کالا رنگ' چھوٹے سخت بال' مگر اس کے ہونٹ عام حبشیوں کی طرح موٹے اور سرخ نہیں۔ اس کے کالے رنگ میں بھی امریکی حبشیوں جیسی سرخی نہیں۔ وہ حبشیوں میں ایک خوبصورت حبشی ہے اور انٹرنیشنل ہاؤس کے قابل ترین لڑکوں میں شمار ہوتا ہے۔ برائیڈی اس پر مرتی ہے کیونکہ پچھلے سال جب وہ نیا نیا آیا تھا تو وہ اس پر مرتی تھی مگر اب وہ کوئنیہ یونیورسٹی میں کئی اعزاز لے چکا ہے' اور کئی سفید اور سیاہ لڑکیاں اس پر مرتی ہیں۔ اسے خاص طور پر ایک حبشی لڑکی گریس پسند ہے۔ مجھے گریس کا دوسرا یعنی خاندانی نام یاد نہیں رہا۔ وہاں خاندانی نام کوئی لیتا ہی نہیں ہے۔ سب ایک دوسرے کو امریکی طریقے سے یعنی پہلے نام سے پکارتے ہیں۔ ہاں مجھے جمیل

www.taemeernews.com

کہنے والا وہاں صرف ایک فرد تھا مگر وہ قصہ دو سرا ہے۔ سب لڑکے لڑکیاں مجھے احتراماً ڈاکٹر عالی یا مسٹر عالی کہتے تھے۔ راہ جوش صاحب:

محبوب کہیں آپ ہمارے ہیں بزرگ
ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یا رب

مگر ناچیز کو یہ دن روز دیکھنا پڑتا تھا اور اس حد تک کہ سارے عاشقانہ خیالات غائب غلا ہو چکے تھے اور مزاج میں سچ مچ ایک بزرگی اور انداز میں بزرگانہ شفقت آگئی تھی۔

برائی ڈی بہت دکھی لڑکی تھی۔ ایسی لڑکیاں امریکہ میں بہت ہیں جو آزاد مگر شریفانہ زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ اپنی پسند کا لڑکا انتخاب کرنے میں اتنا وقت گزار دیتی ہیں کہ اُن کی پسند کا لڑکا مل بھی جائے تو وہ انھیں پسند نہیں کرتا۔ یہ سخت المیہ ہوتا ہے کہ جس انجانے دولھا کے خواب وہ نو عمری سے دیکھیں وہ اس وقت ملے جب ان کی عمر ڈھلنے لگے اور جب وہ ملے تو وہ انھیں دلھن بنانے سے انکار کر دے۔

چنانچہ علی برائی ڈی کا پہلا محبوب دولھا نہیں ہے بلکہ اب برائی ڈی اس منزل میں ہے کہ اس کا کوئی بھی پسندیدہ لڑکا اس کا ہاتھ تھام سکتا ہے۔ ہاں مشکل یہ ہے کہ اب بھی وہ اپنی ہٹ کے معاملے پر اڑی ہوئی ہے۔

"برائی ڈی علی کو گریس تم سے زیادہ پسند ہے۔ وہ آج صبح کھل کر کہہ چکا ہے کہ میں تمھیں سب کچھ صاف صاف سمجھا دوں۔"

"مگر گریس بالکل کالی ہے بلبی بھی ہے۔" وہ چڑ جاتی ہے۔ وہ رونے والی ہے۔

"مگر خود علی بھی تو کالا ہے"

"آہ مسٹر عالی آپ پاکستانی ہو کر کالے رنگ کے خلاف ہیں کیا آپ بھی رنگ و نسل کی قید میں مبتلا ہیں۔" وہ بپھر جاتی ہے۔ بھولی برائی ڈی۔

"نہیں مائی ڈیر میں نے تمھاری بات کا جواب دیا ہے یعنی یہ کہ اس کے لیے گریس کے کالے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیسے تمھارے لیے علی کا کالا ہونا کوئی عیب نہیں۔ میں پیار سے سمجھاتا ہوں۔

"اوہ۔ آئی سی۔ آئی ایم سوری" وہ چپ ہو جاتی ہے۔

"بس اب تم یہاں آنا بند کر دو اور اسے بھولنے کی کوشش کرو۔" میں ایک نئی تلخ بقراطیت بتاتا ہوں۔

"اوہ شٹ اپ۔ مسٹر عالی شٹ اپ۔" وہ پھٹ پڑتی ہے۔ "آپ انٹرنیشنل ہاؤس کے مالک نہیں ہیں جو مجھے یہاں آنے سے روک رہے ہیں۔" وہ کھڑی ہو کر تقریباً چیخنے لگتی ہے۔ چند لڑکے لڑکیاں ہمیں گھور کر دیکھتے

www.taemeernews.com

ہیں۔ یہ نئے ہیں۔ یہ برائی ڈی کو نہیں جانتے۔ جو جانتے ہیں وہ مجھے مسکرا کر آنکھ مارتے ہیں اور لاپروا نظر آتے ہیں۔

میں برائی ڈی کو ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیتا ہوں۔ وہ مزاحمت نہیں کرتی بلکہ صوفے پر گر جاتی ہے، پھر وہ مجھے کھینچتی ہوئی ٹیلیویژن کے کمرے میں لے جاتی ہے، ایک ننھی منی لڑکی کو ڈانٹ کر بھگا دیتی ہے اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

"کیا اس نے پختہ طور پر کہہ دیا ہے کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کرے گا۔ کیا آپ نے اپنا اطمینان کر لیا ہے کہ وہ سچ کہتا ہے۔ سچ سچ بتاؤ مسٹر پروفیسر تم نے اتنا سفر کیا ہے، اتنی خاک چھانی ہے، تمھیں اس کی آنکھوں میں میرے لیے کیا نظر آتا ہے؟"

"خلا بالکل خلا" میں دل تھام کر کہتا ہوں۔

"گریس"

"نہیں گریس بھی نہیں۔ وہ گریس سے بھی شادی نہیں کرے گا، مجھے یقین ہے۔ مجھے بالکل یقین ہے۔ وہ سیاست میں حصہ لے گا، اس کے حوصلے بہت بلند ہیں اور اس کا ملک آزاد ہونے والا ہے اور وہاں گوری عورت کا شوہر کسی اعلیٰ درجے پر نہیں پہنچ سکتا۔"

"اوہ تو میں گریس کے آگے کمتر ثابت نہیں ہوں گی۔"

"نہیں۔"

"میں اس کے عزائم کی نذر ہو رہی ہوں، تمھیں یقین ہے نا۔"

"بالکل۔"

"تھینک یو مسٹر عابی، تھینک یو۔ تم کتنے شریف اور کتنے پیارے ہو۔" وہ میرے گلے لگ کر رونے پر آمادہ ہے مگر میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ وہ میرے گلے لگے بغیر روئے۔ میں اسے یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ علی گریس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

دوسرے دن برائی ڈی نیویارک سے چلی گئی۔ پتا نہیں کہاں چلی گئی۔ مگر اس نے دو سطریں میرے لیے چھوڑ دیں۔

"میں اس یقین پر جا رہی ہوں کہ علی گریس سے شادی نہیں کرے گا۔ میں اس کی اور تمھاری دونوں کی خبر رکھوں گی اور اگر اس نے گریس سے شادی کر لی تو میں عمر بھر صرف تم پر لعنت بھیجا کروں گی کیونکہ میں رہ جاؤں تو گریس کو شکست دے سکتی ہوں۔"

www.taemeernews.com

علی اب اپنے ملک کا سفیر ہو گیا ہے میں اس کے ملک کا نام نہیں بتا سکتا اور اس کا اصلی نام بھی نہیں بتا سکتا۔ میری ایک پیشین گوئی صحیح ہوئی لیکن اس نے گریس سے شادی کرلی ہے پھر بھی مجھے یقین ہے کہ برائی ڈی مجھ پر لعنت نہیں بھیج سکتی۔ کیونکہ برائی ڈی ایک بہت دکھی اور بہت شریف لڑکی تھی۔

پیگی اسمتھ کی کہانی

پیگی اسمتھ بالکل بیر بہوٹی کی طرح ہے۔ سرخ اور نرم و نازک اور ننھی منی گڑیا جیسی۔ اس کی ٹھوڑی میں گڑھا ہے اور گالوں میں بھی چھوٹے چھوٹے بہت پیارے گڑھے پڑتے ہیں۔ اس میں فرانسیسی خون ہے۔ ورنہ عام انگریز لڑکیاں ایسی طرحدار نہیں ہوتیں۔

پیگی رچرڈ پر مرتی ہے اور رچرڈ بھی پیگی پر مرتا تھا مگر اب وہ اس سے دور دور رہتا ہے۔ وہ انگریز ہے خوبرو شکیل بہت شائستہ، بھاری آواز باوقار لہجہ۔ وہ بین الاقوامی قانون میں ایم اے کے سال دوم کا امتحان دے کر نتیجے کا انتظار کر رہا ہے اور وطن جانے والا ہے۔

"میرے پیارے جاسوس پاکستانی" وہ میرے گلے میں جھولتی رہتی ہے، وہ میرے کپڑے دھونے کی انچارج ہے یعنی بغیر معاوضہ میرے کپڑے دھوتی ہے۔ استری کرتی ہے، میرے بیوی بچوں کے لیے پکچر کارڈ پسند کرتی ہے، میری ڈاک کی خبر رکھتی ہے۔ ایک طرح وہ میری بے تنخواہ سکریٹری ہے۔

"میرے پیارے جاسوس پاکستانی" وہ گلے میں جھولتے جھولتے رو پڑتی ہے۔ "مجھے رچرڈ پر جاسوسی کر کے دکھاؤ تو میں جانوں تمھیں میرا بھی خیال ہے یا نہیں۔ مائی انکل۔ ڈیر جاسوس انکل کیا تم سوچتے نہیں کہ مجھے بھی دولھا چاہیے۔

آپ خود خیال فرمائیے کہ میں انکل کے لقب سے کس قدر منغص ہوتا ہوں مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔ اس وقت میری عمر پینتیس برس کی تھی۔ میرا پیٹ آگے نکلا ہوا تھا۔ میرا چہرہ شگفتہ ضرور تھا مگر میں بہت دن سے شادی شدہ تھا، میرے پاسپورٹ میں اندراجات تھے، میرے گھر سے دو بچوں کے کچے کچے ہاتھوں سے لکھے ہوئے خط روز آتے تھے۔ کوئی بھی پتا پڑھ کر بتا سکتا تھا کہ بچوں کی تحریر ہے، میں اپنی اصلیت کیسے چھپا سکتا تھا یعنی اگر چھپانا چاہتا تب بھی کیسے چھپا سکتا تھا۔

چنانچہ میں نے رچرڈ پر جاسوسی کی۔ یہ جاسوسی رچرڈ سے ایک گہری ملاقات تھی۔

"پیگی۔ رچرڈ ایک رنڈی کے چکر میں پھنس گیا ہے" میں نے تحقیقات کا نتیجہ بتایا۔ اور وہ رنڈی اب حاملہ بھی ہے۔ رچرڈ کو اس سے شادی کرنی پڑے گی ورنہ وہ پھنس جائے گا۔"

www.taemeernews.com

یہ بات بالکل سچ تھی۔ رچرڈ بارایٹ لا۔ انگریز بہادر۔ میرے سابق آقا نے رات یہ بات مجھے خود رو رو کر بتائی تھی۔ وہ برانڈی سے زیادہ بلک بلک کر رو رہا تھا کیونکہ ہم دونوں دریائے ہڈسن کے کنارے بیٹھے تھے اور رات تھی اور آس پاس کوئی نہیں تھا۔ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہ امریکی رنڈی رچرڈ کے پیچھے پڑ گئی تھی اور اپنی زندگی بنانے کے لیے اس کی زندگی بگاڑنا چاہتی تھی اور.......

رچرڈ پیگی کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ وہ مجھے بیچ میں لے آتا ہے۔ واہ بھئی یونیسکو کے وظیفے مجھے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑ رہے ہیں۔

"مگر میں اب تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ تم پہلے اپنی عزت بچاؤ بس یہی فیصلہ سب سے اچھا فیصلہ ہے۔ کیوں انکل۔ میرا انکل یہی کہتا ہے۔"

"ہاں میں یہی کہتا ہوں۔"

اور رچرڈ یہی کرتا ہے تیسرے دن وہ شادی کر لیتا ہے اور پانچویں دن اپنی بیوی کو لے کر لندن چلا جاتا ہے اور پیگی اور میں ان دونوں کو ہوائی اڈے پر چھوڑنے جاتے ہیں۔ پیگی اور میں مل جل کر رچرڈ کو ایک سو تیس ڈالر قرض بھی دیتے ہیں جو رچرڈ واپس نہیں بھیجتا۔

۱۹۶۲ء میں جب میں دوبارہ امریکہ گیا تو لندن سے گزرا۔ وہاں میں نے پیگی اور رچرڈ کے ساتھ کھانا کھایا کیونکہ رچرڈ کی بیوی کو لندن کی خالی خولی "زندگی پسند نہیں آئی۔ اس نے بچے کا انتظار بھی نہ کیا بلکہ فوراً جا کر اسقاط کرایا۔ جیسے پھر میں رچرڈ سے طلاق لی اور واپس نیویارک بھاگ گئی۔ رچرڈ نے ایک مہینے بعد نیویارک آ کر پیگی سے شادی کر لی اور واپس لے گیا۔

"انکل تمہیں یہی اندازہ تھا نا؟" پیگی نے بڑے فخر سے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ وہ لندن کے ہوائی اڈے پر رچرڈ کے ساتھ مجھے چھوڑنے آئی تھی۔ اسے چلنے میں دقت ہو رہی تھی۔ کیونکہ اسے چار پانچ مہینے کا حمل تھا۔

"وہ اتنی زیادہ بات مت بڑھاؤ پیگی۔ مسٹر عالی عقلمند سہی مگر کوئی ولی اللہ نہیں ہیں۔"

"نہیں انھیں سب کچھ معلوم تھا۔ ان کو ساحرانہ قوتیں ملی ہوئی ہیں۔ کیوں انکل بولو نا۔ مجھے یقین تھا کہ تم کو میرے مستقبل کے متعلق سب کچھ علم ہے۔" پیگی ایک معصوم اور شریف لڑکی تھی۔ میں ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر بہت خوش تھا۔ میں پیگی کے بچہ کا اعتماد کبھی مجروح نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"خیر میں تم دونوں کو کیا تحقیق کہ میں کیا ہوں اور کیا نہیں ہوں مگر مسٹر ہربرٹ تم یقیناً ایک ڈیم فول ہو۔"

[illegible] نے میری [illegible] ایک نئے نشے [illegible] داماد کی طرح سمجھ لیا اور مسکرانے لگا۔

www.taemeernews.com

"اور یاد رکھنا کہ اگر تم نے اس بچی کا خیال نہ رکھا تو اس کا جادوگر انکل پھر کوئی اور تماشا دکھا سکتا ہے کراچی سے لندن تک صرف بارہ گھنٹے پرواز کرنی پڑتی ہے اور ٹیلیفون دس پونڈ سے بھی کم میں ہو جاتا ہے۔" میں مزید غرایا۔ بیگی اپنا عمل بھول کر پھر میرے گلے میں لٹکنے والی تھی لیکن میں نے اُسے درشتی سے روک دیا۔

"بس خبردار۔ اب تم لڑکیوں کی طرح رہنا ختم کرو اور ایک معزز خاتون کی زندگی اختیار کرو۔ تم ایک بیرسٹر کی بیوی ہو۔ خواہ وہ بیرسٹر رچرڈ ہی کیوں نہ ہو۔" میں نے بیگی کو بھی ایک تحکم کے ساتھ ڈانٹا۔ وہ چھوٹی سی گڑیا میرے بازو سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ میں نے اس کے سر پر شفقت سے تھپکی دی اور ہیٹ پہن کر اپنے جہاز کی طرف بڑھ گیا۔

چلتے وقت میں نے بیگی کے چہرے پر ایک فاتحانہ یقین اور رچرڈ کی آنکھوں میں استعجاب دیکھا۔ انگریز بہادر سائنسی ہوتے ہوئے بھی وہمی ہوتا ہے۔ شاید وہ مجھے کوئی نجومی یا مستقبل کے حالات کا علم رکھنے والا سمجھ رہا تھا۔ حالانکہ میری اصلیت سے کم از کم آپ سب اچھی طرح واقف ہیں۔

www.taemeernews.com

یہ نظر ہے طائرانہ

آئیے ذرا امریکہ پر ایک طائرانہ نظر ڈال لیجیے۔ طائرانہ نظر نہ میں نے ڈالی نہ آپ ڈال سکتے ہیں تاوقتیکہ آپ کسی امریکی فاؤنڈیشن کے وظیفہ خوار ہو کر یہ نہ گنگناتے پھریں۔

وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں پٹی پٹائی باتوں کے ساتھ کبھی کبھی اَن جانی یا نسبتاً کم معلوم باتیں بتانے کا اہل ہوں۔ اس لیے گھبرائیے نہیں میں آپ کو جانی بوجھی بھول بھلیوں میں نہیں گھماؤں گا بلکہ دو چار دلچسپ نکتے بھی بتاؤں گا۔

یہ سامنے والا نقشہ دیکھیے جس پر امریکہ کی اڑتالیس ریاستوں کی حدود دکھائی گئی ہیں۔ اصل میں اس وقت قانوناً امریکہ پچاس ریاستوں یا پچاس صوبوں پر مشتمل ہے مگر مین لینڈ یعنی مادرِ وطن یعنی یہ جغرافیائی اکائی صرف اڑتالیس ہی کی ہے۔ الاسکا کی ریاست سرحد پار ہے اور ریاست ہوائی تو ایک الگ جزیرہ ہے جو امریکہ کے مغربی ساحل سے دو ہزار میل دور بحر الکاہل میں واقع ہے۔ اب چند برس سے وہ بھی باضابطہ ایک ریاست قرار دے دیا گیا ہے۔

تو سامنے والا نقشہ دیکھیے بہت کم ملک ایسے ہیں جن میں صوبوں کی حدود اس باضابطہ طریقے سے مرتب کی گئی ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ریاستیں پہلے سے موجود نہیں تھیں بلکہ جیسے جیسے آبادی پھیلتی گئی اور ریاستیں وجود میں آتی گئیں۔ امریکی حاکم ان کی حد بندی قاعدے قرینے سے کرتے گئے۔ پہلے سفید آبادی صرف مشرقی ساحل یعنی بوسٹن نیویارک وغیرہ سے متصل علاقوں میں تھی اور جنوب تک چلی گئی تھی۔ ان مقامات پر نقشے میں رنگ گہرا کر دیا گیا ہے یہیں کے آبادکاروں نے برطانوی سامراج سے لڑائی لڑی تھی۔ انھی لوگوں نے پہلے پہل اس سرزمین کو آباد کیا اور انھی کی اولوالعزم اولادیں جنگلوں دریاؤں اور پہاڑوں کو روندتی ہوئی شمال جنوب اور

www.taemeernews.com

مغرب میں پھیل گئیں۔

خیر یہ سب بقول کسے تاریخی باتیں ہیں۔ فی الحال تو ان ریاستوں کے نام ملاحظہ کیجیے کئی نام تو سمجھ میں آتے ہیں مثلاً نیوہیمپ شائر، ورجینیا، نیویارک لیکن کئی نام انگریزی تو کیا کسی بھی یوروپی زبان کے نہیں لگتے۔ یہ نام اصل میں ریڈ انڈین قبائل کی زبانوں سے لیے گئے ہیں۔ سفید فام فاتحین نے مفتوحین پر اتنی مہربانی ضرور کی کہ ان کے آبائی وطن میں اپنے لیے تقسیم املاک کرتے وقت چند نام ان کی زبان سے لے لیے جو اب امریکی نام کہلاتے ہیں۔

اسے بھائی یہ بھی بہت ہے بادشاہ جو چاہے جسے چاہے بخش دیتا ہے۔ امریکی بادشاہ نے ملک لے لیا مگر دو چار نام چھوڑ دیئے یہی احسان کیا کم ہے۔ ہمارے سابق بادشاہ انگریز بہادر نے تو ہمارے شہروں کے نام تک بگاڑ کر رکھ دیے تھے۔ دلی کو ڈیلی کہتا تھا اور ہم سے بھی کہلواتا تھا بلکہ اب تک کہلواتا ہے۔

دو چار نام دیکھیے:

CONNECTICUT اس کا تلفظ کنکٹی کٹ نہیں بلکہ کنے ٹی کٹ ہے یعنی ایک ت کی آواز غائب ہے۔ یہ نام ریڈ انڈین ہے۔ اس کا مطلب ہے "لمبے دریا کے دہانے پر" بھئی کیا تماشہ ہے۔ اگر نام ہوتا "لمبے دریا کا دہانہ" تو بات سمجھ میں بھی آتی مگر یہ "دہانے پر" کیا بلا ہے بیہودہ تو ہے ہر زبان کے مزے الگ الگ ہیں۔ خود مرزا داغ فرما گئے تھے:

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

MASSACHUSETTS۔ میساچوسٹس۔ لاحول ولا قوۃ کتنا مشکل اور بیہودہ نام ہے اور لطف یہ کہ کینیڈی مرحوم کا وطن بوسٹن یہیں واقع ہے — اور ہارورڈ یونیورسٹی بھی اسی ریاست میں ہے اور چند بہترین صنعتیں اور مناظر بھی یہیں پائے جاتے ہیں اس کا نام آسان ہوتا تو کتنا اچھا تھا مگر نہیں ہے۔ اس کا نام تو میساچوسٹس ہی رہے گا۔ لیکن اس کے معنی سنیے: "عظیم فرزندان کوہستان" اب سوچیے اور سر دھنیے۔

MICHIGAN مشی گن — یہ بظاہر انگریزی معلوم ہوتا ہے مگر ہے یہ بھی ریڈ انڈین اور اس کے معنی ہیں "عظیم پانی"۔ ذرا نیرنگی زمانہ ملاحظہ کیجیے کہ جو لوگ ناموں تک کے معاملے میں بار بار عظیم عظمت بڑائی کے قائل تھے ان کی نسل ایسی مٹادی گئی جیسے کبھی کبھی کارپوریشن جوش میں آکرا پنے چیئرمین اور وائس چیئرمین کے گھر سے مچھروں اور مکھیوں کی صفائی کر دیتی ہے یہ عظمت زدہ قوم آج امریکہ کے پہاڑی علاقوں میں چند ہزار کی تعداد میں "محفوظ" کر دی گئی ہے۔ جہاں ریڈ انڈین رہتے ہیں وہ مقام RESERVATIONS کہلاتے ہیں۔

www.taemeernews.com

اے آنکھوں والو دیکھو اور عبرت پکڑو

خیر عبرت کا مقام الگ ہے جو پکڑے اس کا بھی بھلا، اور جو نہ پکڑے اس کا بھی بھلا، بات آگے بڑھانے کی بجائے ابھی ناموں ہی سے تفریح اٹھایئے۔

WISCONSIN وسکانسن۔ چھوٹا سا نام مگر معنی ملاحظہ فرمایئے:

"ایک دریا جس کے کناروں پر پرندوں کے گھونسلوں کے لیے سوراخ ہیں"۔

اس نو حرفی لفظ کے یہ اتنے لمبے معنی کیسے ہوئے اس کا ذمے دار وہ دریا ہے جس کے کناروں پر پرندوں نے گھونسلوں کے لیے سوراخ بنائے تھے یا شاید وہ پرندے ہیں یا ـــ یا ـــ

اور دیکھیے IDAHO یہ سیدھی سادی چیز ہے مطلب ہے

صباح الخیر۔ صبح کا سلام

ARAKANSAS۔ ارکانساس۔ اس کے معنی ہیں "نامعلوم"۔ معلوم ہوتا ہے یہ وہ قبیلہ تھا جو اپنا نام رکھنے ہی پر جھگڑتا رہا جیسے ہم اپنے نصب العین مقرر کرنے میں آج تک اختلاف کر رہے ہیں۔ اس قبیلے کا حشر تو آپ کے سامنے ہے کہ وہ "نامعلوم" ہی رہا۔ اپنا حشر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

OKLAHOMA۔ اوکلاہوما۔ نام مشکل مگر معنی آسان ہیں۔ مطلب ہے "سرخ لوگ" حالانکہ ریڈ انڈین سرخ نہیں گہرے بھورے ہوتے ہیں مگر ریڈ یعنی سرخ چونکہ ایک لفظ ہے اس لیے سرخ ہی چل گیا۔ بھلا سوچیے تو کہ اگر انھیں سرخ ہندی کی بجائے "گہرے بھورے ہندی" کہا اور لکھا جاتا تو "پبلک" کا کتنا وقت ضائع ہوتا۔

TEXAS۔ ٹیکساس۔ جی جناب یہ نام بھی گہرے بھورے ہندیوں کی زبان کا ہے۔ اس کا مطلب ہے ایک انداز، ایک اشارہ یا ایک سلام جس کے ذریعے یہ کہنا مقصود ہو کہ "میں دوست ہوں"۔ جیسے فوجی چوکی پر رات کو گزرتے وقت کوئی ٹوکتا ہے تو آپ کو فوراً آواز لگانی پڑتی ہے "FRIEND"

MINNESOTA معنی ہوئے بادلوں کے رنگ جیسا پانی۔ ہم ہوتے تو گدلا پانی کہتے۔ میلا پانی کہتے مگر معلوم ہوتا ہے کہ سرخ ہندیوں کے کچھ قبائل شاعرانہ مزاج رکھتے تھے۔ ہو سکتا ہے ان میں کوئی ابہام پسند دوا نویس ہو جو سیدھی بات ٹیڑھی کر کے بیان کرتا ہو گا اور افسروں اور پبلک کو ناخوش کرتا ہو گا۔ اچھا ہوا اس سے کو تجربہ مر گیا۔

UTAH یوٹا۔ اونچے رہنے والے لوگ۔ اگر مصنف تو پریشان نہ ہوتا تو سیدھا سادا ترجمہ

www.taemeernews.com

"عالی مقام" تھا۔ مگر بابا مجھے وہ عالی مقامی نہیں بھاتی جس کا فوری نتیجہ تنزل اور پھر فنا ہے۔ تا۔ میں ڈاکٹر اڈناہ نہیں کہلاؤں گا۔

MISSORRI۔ مسوری۔ "بڑی کیچڑ" یعنی بڑی کیچڑ والا۔ بس اب اس کے حسن و قبح پر مت جائیے صرف اس عظیم ملک کی عظیم ریاستوں کے معنی کا لطف اٹھائیے۔

DAKOTA۔ ڈکوٹا۔ یہ دو ہیں جنوبی اور شمالی۔ ڈکوٹا جہاز کے نام سے بھی آپ واقف ہیں وہ بھی اسی نام سے نکلا ہے۔ ڈکوٹا کے معنی بھی "نامعلوم" ہیں یعنی ڈکوٹا کا مطلب ہے "نامعلوم" یہ بھی ایک قبیلے کا نام تھا۔ ہائے فانیؔ کیا بے موقع یاد آئے ہیں :

وجود درد مسلّم علاج نامعلوم

نامعلوم کا تصور پورے سرخ ہندی قبائل پر چھایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ریاستیں یعنی علاقے ایک دوسرے سے خاصے دور بھی ہیں اور پہلے زمانے میں قبائل اتنی دور تاخت و تاراج کرتے بھی نہیں ہوں گے مگر "نامعلومیت" کا فلسفہ اس عجیب و غریب وسیع سرزمین پر اس طرح مسلط تھا کہ جہاں آبادی قائم ہوتی تھی "نام" میں ابھر آتا تھا۔ TENNESSEE ٹینیسی کے معنی بھی "نامعلوم" ہی ہیں۔

اچھا اب ناموں کا چکّر باقی آئندہ۔ اب آبادی کے گھپلے میں پھنس جائیے۔ آج ریاستہائے متحدہ امریکہ کی آبادی اٹھارہ یا انیس کروڑ ہے مگر صرف دو سو برس پہلے بلکہ پونے دو سو برس پہلے چالیس لاکھ تھی۔ یعنی وہ زمانہ جب امریکی جنگ آزادی ہوئی اور ریاستوں نے اپنا وفاق بنایا اور امریکی دستور جیسی حیرت انگیز دستاویز تیار ہوئی۔ اس وقت اس "ملک" کی آبادی (جس کا مطلب ہے سفید آبادی) بمبئی کی آبادی سے بھی کم تھی۔ اس کے بڑھنے کا ایک چھوٹا سا نقشہ مزہ دے گا۔

سنہ ۱۷۹۰ء   آبادی   چالیس لاکھ

سنہ ۱۸۳۰ء   آبادی   ستانوے لاکھ

سنہ ۱۸۵۰ء   آبادی   دو کروڑ تیس لاکھ

سنہ ۱۸۶۰ء   آبادی   پانچ کروڑ

(کل تیس برس میں دگنی ہوگئی)

سنہ ۱۹۱۰ء   آبادی   نو کروڑ

سنہ ۱۹۲۰ء   آبادی   تیرہ کروڑ

www.taemeernews.com

۱۹۵۰ء آبادی پندرہ کروڑ

۱۹۶۰ء آبادی اٹھارہ کروڑ

کیا سمجھے جناب۔ جیسے سمجھنے سے پہلے سمجھنے کے موضوع پر تین مصرعے سن لیجیے۔ یہ مرزا غالب کے متعلق کہے گئے تھے:

مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

امریکی آبادی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ملک اتنا بڑا ہے کہ ابھی موجودہ آبادی سے چار گنی زیادہ "بلکہ" اس میں آسانی کے ساتھ سما سکتی ہے۔ ہر سال ایک دو لاکھ "مہاجرین" اب بھی جاتے ہیں مگر عام طور پر ان کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ کالے مہاجرین کی کھپت وہاں بھی نہیں۔

www.taemeernews.com

واشنگٹن ڈی سی اور وائٹ ہاؤس

اب ہم نیویارک کے براڈوے کی چمکتی ہوئی روشنیوں اور تیز بھاگتی ہوئی تیز رفتار کاروں کے درمیان (محاورے ہیں) کھڑے ہو کر سوچتا ہوں کہ یہ جگہ پہلے کیا ہوگی اور اب کیا ہے تو کچھ بقراطی قسم کی باتیں ذہن میں آتی ہیں یعنی ترقی اور تعمیر اور اقتصادی منصوبہ بندی وغیرہ قسم کے خیالات جن سے آپ کو کوئی خاص دلچسپی نہیں معلوم ہوتی اس لیے سوچ بچار کے بجائے پھر سفر شروع کر دیجیے۔ نیویارک تو نیویارک ہے، یہاں آنا جانا، کھانا پینا، رونا دھونا، عشق عاشقی، سیر تفریح تو رہے گی ہی، ایک دم لگا رہے گا ہوائی اڈے سے جہاز میں بیٹھ کر امریکہ کے صدر مقام واشنگٹن ڈی سی چلیے تاکہ سیر ضابطے سے شروع کی جائے۔ اسے واشنگٹن ڈی سی اس لیے کہتے ہیں کہ ایک ریاست بھی واشنگٹن نام کی ہے۔ یہ صدر مقام والا واشنگٹن ایک ایسے علاقے میں ہے جسے ڈسٹرکٹ آف کولمبیا کہا جاتا ہے، اس لیے اسے بھی واشنگٹن ڈی سی کہا جاتا ہے۔ لیجیے میں واشنگٹن "شروع" کرنے سے پہلے آپ کو اس پورے شہر کا سب سے عمدہ ہوائی منظر دکھا دیتا ہوں۔ اس تصویر کے بیچ جو عمارت ہے وہ کیپیٹول کہلاتی ہے، جہاں امریکی سینٹ اور کانگریس کے دفاتر ہیں، اور یہ دوسری تصویر اس آدمی کی ہے جو امریکی تاریخ کی ایک عجیب و غریب شخصیت ہے یعنی ابراہام لنکن۔ یہ مجسمہ یادگار ابراہام لنکن واقع واشنگٹن میں نصب ہے مگر بات یہیں ختم نہیں ہوئی اس کی تاریخ تیرجان کرتی قائد اعظم کے مقبرے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ہم نے قائد اعظم کا مقبرہ بہت دیر میں شروع کیا مگر امریکی قوم نے تو لنکن کے مقبرے کے معاملے کو بحث مباحثے میں، نتے نتے پچیس برس لگا دیئے تھے۔

"یار و کم از کم اس معاملے میں تو پاکستان امریکہ سے آگے نکل گیا۔" میں خود اپنے آپ سے کہہ کر ہنس پڑا ہوں مگر میری بغلیں بجتے بجتے رو بھی دیتی ہیں۔

www.taemeernews.com

امریکی واشنگٹن کو امریکہ کا آئینہ کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ آئینہ وائینہ بالکل نہیں ہے بلکہ ایک چھوٹا سا گرم اور خوبصورت شہر ہے۔ آئینہ اس وقت ہوگا جب امریکہ میں امارت اور عیاشی اور فحاشی اور ڈکیتی اور جارحیت اور ظلم و تشدد کا وہ دور دورہ نہ تھا جو آج ہے کیونکہ اگر یہ کہا جائے کہ آج کا پورا امریکہ واشنگٹن ہی نظر آتا ہے تو میں نے خوب غور سے گھور گھور کر اس آئینے کو دیکھا بلکہ اس میں جھانک کر بھی دیکھا لیکن آج کا امریکہ کہیں نظر نہیں آیا۔ تھوڑا بہت ایک آدھ گوشے میں جھلکا ضرور مگر آئینے میں اور جھلک میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ واشنگٹن کی ایک اپنی شخصیت ہے۔

میں شیریٹن ہوٹل میں ٹھہرتا ہوں۔ آٹھ ڈالر روز سو کھلے یعنی اس رقم میں نہ چائے نہ کھانا۔ بس کمرہ اور کمرے میں ٹیلیویژن اور غسل خانہ۔ یہ نرخ تو نیویارک کے حساب سے بھی خاصا گراں ہے حالانکہ شہر نیویارک سے کوئی آٹھ گنا چھوٹا ہے۔ مگر صاحب صدر مقام ہے، دنیا کے امیر ترین طاقتور ترین ملک کا صدر مقام، یہاں کی مہنگائی صدر مقامی کا خراج ہے جو بہرحال ادا کرنا پڑتا ہے۔ گرمی کے ساتھ ساتھ ہوا میں جو شدید رطوبت ہے وہ مستزاد۔ رطوبت نے تنگ کر رکھا ہے۔ ایک چکر اور بھی ہے، اور وہ یہ کہ شہر کا خاصا حصہ دریائے پوٹومیک کی سطح سے نیچے کے علاقے یعنی نشیب میں واقع ہے۔ رہا دریا تو دریا بیچارہ بندھا بندھایا اس طرح بہتا ہے جیسے عالمی سیاست میں امریکہ کے حلقہ بگوش نہایت مستعدی سے اس کے اشاروں پر ناچتے رہتے ہیں۔ کیا ہے غالب کا وہ مصرع:

دریا کو بھی ساحل باندھا

غالب تو شعر ہی میں باندھا بوندھی کرتے رہے یہاں یار لوگوں نے دریا کو عملاً سرکس کے ہاتھی کی طرح سدھایا ہے۔ یہ واشنگٹن جو اب ایسا خوبصورت اور بنک سک سے درست نظر آتا ہے، اب سے سو دو سو برس پہلے کچھ بھی نہیں تھا یعنی تھا ہی نہیں۔ مارچ ۱۷۹۱ء کی ایک صبح چھ گھوڑ سوار دوربین لگائے ایک اونچے مقام سے تک رہے تھے۔ وہ جائزہ لے رہے تھے کیونکہ امریکہ یعنی تیرہ مشرقی ریاستوں پر مشتمل ایک ملک آزاد ہو چکا تھا اور اسے ایک صدر مقام کی ضرورت تھی۔

ان چھ آدمیوں میں ایک لمبا خوبرو اور عمر رسیدہ آدمی بھی شامل تھا۔ یہ شخص امریکہ کا پہلا صدر یعنی جارج واشنگٹن تھا۔ اس کے ساتھ ایک سینتیس سالہ فرانسیسی انجینئر میجر چارلس پیری لانفاں تھا جو امریکی فوجوں میں شامل ہو کر انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی لڑ چکا تھا۔ میجر لانفاں نے واشنگٹن شہر کا ایک زبردست منصوبہ تیار کیا۔ جیسے تیسے پھر ایک مدت رہ گیا اور کوئی تیس برس بعد پھر زور و شور سے چل پڑا۔

جب یہ لوگ اس دلدلی اور جنگلوں سے بھری ہوئی زمین کو دیکھ رہے ہوں گے انھیں کسی قدر اندازہ

www.taemeernews.com

تو ہوگا کہ یہاں ایک عمدہ سا شہر بن جائے گا مگر یہ خبر نہ تھی کہ

دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

انقلابی امریکیوں نے جنگ جیتنے کے بعد ہی دو فیصلے کر لیے تھے۔ ایک یہ کہ ایک نیا صدر مقام بنے گا جس کا نام واشنگٹن رکھا جائے گا اور دوسرا یہ کہ اس مقام کا انتخاب خود جنرل واشنگٹن کریں گے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ایک زندہ قوم اپنے محسنوں اور کارکنوں کو ان کی زندگی ہی میں کیسے کیسے بڑے انعام دیتی ہے یہاں قائد آباد نام کی صرف وہ آبادیاں ہیں جہاں جھگیاں، کھوکھے اور جھونپڑیاں یا چھوٹے چھوٹے مٹی کے مکانات خودرو طریقے سے ابھر آئے ہیں۔

ہاں تو جنرل واشنگٹن نے یہ مقام خود انتخاب کیا۔ اس انتخاب تک بڑے بڑے گھپلے ہوئے۔ ریاستوں میں خاصی رقابت چلی، کچھ ریاستیں چاہتی تھیں کہ صدر مقام ان کے علاقے میں بنایا جائے، ایسی ریاستیں بھی تھیں جو اپنے آپ پر مرکزی تسلط قائم ہو جانے سے ڈرتی تھیں اور صدر مقام کو کہیں دور رکھنا چاہتی تھیں۔ بہرحال جنرل صاحب نے بحث مباحثے اور سوچ بچار کے بعد ذرا مزے دار فیصلہ فرمایا یعنی یہ علاقہ انتخاب کیا جو ان کے اپنے علاقے سے بہت قریب تھا۔

ظاہر ہے کہ اس کی تعمیر میں کئی خرابیوں کی صورت مضمر تھی یا روگ نقشے کے مطابق سرکاری تعمیرات نہیں ہونے دیتے تھے۔ ذاتی زمینوں کے لمبے چوڑے کلیم داخل کر دیے تھے سڑکوں نالیوں چوکوں کی تعمیر میں رخنے ڈالتے تھے۔ لانفاں زوردار آدمی تھا، وہ اپنے نقشے کو زمین پر ابھرتا ہوا دیکھنے میں جی جان کی بازی لگائے ہوئے تھا۔ اس نے کئی سختیاں کیں، قانونی اعتراضات کی پروا نہ کی یہاں تک کہ ایک صاحب زمین سے بری طرح الجھ گیا اور مارا گیا۔ زمین والے صاحب نے ایک عمارت بنوائی تھی جو لانفاں کے نقشے میں مرتب کردہ منظر کو بگاڑ رہی تھی، وہ اپنے منظر کی خرابی برداشت نہیں کر سکا تھا چنانچہ اس نے ایک رات کسی سرکاری کارروائی کے بغیر وہ عمارت ڈھا دی ـــــ اور پھر خود ڈھے گیا یعنی اسے نوکری سے استعفا دینا پڑا اور مزید ۲۴ برس تک کسی نے اسے گھاس نہ ڈالی۔ یہاں تک کہ وہ ۱۸۲۵ء میں ایک گمنام آدمی کی موت مر گیا۔ مگر خدا کی قدرت کہ ۱۹۱۹ء میں یعنی پورے چوراسی برس بعد جب قوم کو اس کے خیال، منصوبے اور نقشے کی عظمت کا اندازہ ہوا تو یار لوگ اس کی قبر سے اس کی ہڈیاں نکال لائے اور انھیں بڑے اعزاز سے قومی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ جہاں امریکہ کے صدر اور دیگر بڑے بڑے لوگ دفن ہوتے ہیں۔

مگر واشنگٹن دیکھتے دیکھتے میں لانفاں کی ہڈیاں کیوں اکھاڑنے لگا۔ نہ جانے کیوں مجھے گمنام کارکنوں کی

www.taemeernews.com

یادوں میں مزا آتا ہے۔

یہ جو آپ کیپٹل کی عمارت دیکھتے ہیں یعنی امریکی مجلس قانون ساز کی گنبد والی عمارت ..... یہ اصل میں روما کی مجلس دستور ساز سے منسوب ہے جس کا نام کیپٹول تھا۔ اس کا سنگِ بنیاد خود جنرل جارج واشنگٹن نے ۱۷۹۳ء کے ستمبر میں رکھا۔ جب وہ سنگِ بنیاد رکھ رہا تھا تو اس نے ایک مذہبی لباس پہن رکھا تھا، چاروں طرف سلامی کی توپیں گرج رہی تھیں اور فوجی بینڈ قومی نغمے بجا رہا تھا۔

امریکیوں کے لیے وہ لمحہ بڑا مقدس مانا جاتا ہے کیونکہ ان کے معیار کے مطابق نہ صرف نئی دنیا میں بلکہ پوری دنیا میں جمہوریت کی بنیاد پڑ رہی تھی۔

یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان میں مغل بادشاہت دم توڑ رہی تھی، مرہٹوں کی تاخت و تاراج زوروں پر تھی اور ادھر ٹیپو سلطان کی شکل میں مسلم نشاۃ ثانیہ کے آثار اُبھر رہے تھے۔

اس وقت امریکی صدر مقام فلے ڈلفیا میں تھا۔ مرکزی حکومت کو واشنگٹن آتے آتے سات برس لگے یعنی وہ باضابطہ طور پر ۱۸۰۰ء میں واشنگٹن میں کام کرنے کے قابل ہوئی۔ مگر یہ بھی یاد رکھیے کہ اس وقت مرکزی حکومت کے کل عمال بشمول افسران کوئی ڈیڑھ سو کے قریب تھے۔

آج خود صدر امریکہ کو بھی یاد نہیں رہتا کہ مرکزی حکومت کے عمال تعداد میں کتنے ہیں۔

اور یہ جو وائٹ ہاؤس ہے ہم آپ جیسے بھوکے ایشیائیوں کا قبلہ نما۔ یہ بھی بہت تاخیر سے آہستہ آہستہ بنا ہے۔ اس کی تاریخ الگ ہے اور خاصی دلچسپ ہے۔ آج وائٹ ہاؤس میں برابر اضافے ہوتے رہتے ہیں بیگم کینیڈی کو اس کے چھوٹے ہونے کی شکایت تھی۔ بیرونی زائرین اسے کھلونا سمجھتے ہیں لیکن خود امریکہ کا تیسرا صدر جیفرسن جب ۱۸۰۱ء میں صدر منتخب ہو کر وائٹ ہاؤس میں داخل ہوا تو اس وقت وائٹ ہاؤس نا تمام تھا پھر بھی اسے یہ مکان اتنا بڑا معلوم ہوا کہ اس نے ایک تاریخی جملہ ارشاد فرما دیا جسے امریکی آج تک دہراتے ہیں۔ قولِ جیفرسن بابت وائٹ ہاؤس: "گھر کا یہ مکان جس میں دو شہنشاہ، ایک پوپ اور ایک لامہ رہ سکتے ہیں۔"

ہائے بیچارے جیفرسن ـــ اس نے نہ تو لاہور کا قلعہ دیکھا نہ آگرے کا نہ دلّی کا۔ اور کچھ نہیں تو ہمارا جے پور کا محل ہی دیکھ لیا ہوتا۔ شہنشاہوں کی تو بات ہی اور ہے۔

بے چارہ جیفرسن

آئیے تاریخ کی جھول بھلیوں سے ایک دم باہر کود جائیں اور سیدھے واشنگٹن میں گھوم لیں ورنہ بقول کسے

www.taemeernews.com

سیر کا لطف مارا جائے گا۔

مگر یہاں سیر کا لطف کہاں۔ چوتن فیصد آبادی تونیگرو حضرات کی ہے جو ہر وقت اپنے جنوبی بھائیوں کی جنگ آزادی میں کسی نہ کسی طرح شامل رہتے ہیں۔ باقی آبادی سرکاری ملازمین اور سفارت خانوں، اراکین مجالس قانون ساز پر مشتمل ہے، نہ وہ نیویارک جیسے شعلے نہ پھول، اگر ہوں گے بھی تو مجھ صرف مسافر کو کیا نظر آئینگے۔

اے بھائی اگر زندہ گھاس نہ ڈالیں تو مردوں کے حضور چل کیونکہ مردہ لوگ زندوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ملنسار ہوتے ہیں۔

سو میں یادگار ابراہام لنکن پہنچ جاتا ہوں یہاں اندر اونچے گنبد کی وجہ سے کچھ ٹھنڈک بھی ہے۔ تھوڑے بہت کبوتر میری طرح سر چھپائے بیٹھے ہیں مگر کوئی میرے پاس نہیں آتا۔ صرف لنکن مجھے قدرے شفقت سے دیکھتا ہے لیکن اس شفقت کا کیا کروں۔ وہ بہت اونچا ہے میں بہت چھوٹا ہوں۔ بڑے مُردوں کی شفقت بھی چھوٹے زندوں کے لئے نقصان دہ ہوسکتی ہے چنانچہ میں لنکن سے بے تکلف نہیں ہوتا۔ میں دودھ کا جلا ہوں چھاچھ پھونک پھونک کر پیوں گا۔ میں احتراماً سر جھکا لیتا ہوں اور ایک طرف جا کر ٹھنڈے پتھروں پر لیٹ جاتا ہوں جہاں گزرتا ہوا اکا دکا سیاح مجھے کوئی چور، گرہ کٹ سمجھ کر جلدی جلدی پاس سے گزر جاتا ہے۔

آج واشنگٹن میرے لیے ایک ویرانہ ہے۔\
آج واشنگٹن میرے لیے ایک گاؤں ہے۔\
آج واشنگٹن میرے لیے خلا ہے۔

میں واشنگٹن میں کسی کو نہیں جانتا۔ چند پتے میرے پاس ضرور ہیں مگر آج ہفتہ ہے کل اتوار ہے، دونوں دن دفاتر بند ہیں، پرسوں پیر کو دفاتر کھلیں گے تو میں لائبریری آف کانگریس جاؤں گا اور یونیسکو کی بقراطی شروع ہوگی لیکن آج تو میں بالکل اکیلا ہوں۔ امریکہ کے صدر مقام میں ایک پاکستانی شدید احساس بیچارگی میں مبتلا ہے اسے صدر ابراہام لنکن نے بھی گھاس نہیں ڈالی۔ وہ صدر ابراہام لنکن جس نے کالے غلاموں کی آزادی کے لیے امریکہ کو خانہ جنگی میں مبتلا کر دیا تھا۔ آج وہ ابراہام لنکن عروج کی اُن منزلوں پر پہنچ چکا ہے کہ مجھے دور سے دیکھ کر شفقت کے ساتھ مسکرا کر رہ جاتا ہے، نہ کسی غزل کی فرمائش کرتا ہے نہ دوہے کی۔ نہ ملک کا حال پوچھتا ہے نہ سیاست پر کوئی مشورہ مانگتا ہے۔

ہاں بھئی صدر ابراہام لنکن بہت بڑا آدمی ہو گیا ہے، بڑے آدمیوں سے کوئی کیا توقع کرسکتا ہے۔ یہ لوگ بہت مصروف ہوتے ہیں۔ اب میں اسے کیا یاد دلاؤں کہ جناب فلاں زمانے میں جب آپ فلاں مہم

www.taemeernews.com

چلا رہے تھے فلاں جنگ لڑ رہے تھے تو میں دل و جان سے آپ کے ساتھ تھا یعنی میں پیدا نہیں ہوا تھا مگر میری روح یعنی روحِ عصر آپ کے ساتھ تھی آپ پر اسے بھول جانا زیب نہیں دیتا۔

چھوڑ یار اس گندمی رنگ کی لڑکی کو دیکھو' یہ ضرور جنوبی امریکہ کی رہنے والی ہے اور اکیلی گھوم رہی ہے اس سے بات چیت کا ڈول ڈالو شاید دن اچھی طرح گزر جائے۔

"مادام وزیل میں واشنگٹن میں ایک پاکستانی اجنبی ہوں کیا آپ مجھے وائٹ ہاؤس کا راستہ بتا سکتی ہیں؟"

"آپ پنسلوے نیا اے وینو چلے جائیے:" وہ کم رخی سے بولی۔

"مگر میں پنسلوے نیا اے وینو کیسے جاؤں؟"

"ٹیکسی میں"

"مگر یہ بات تو میں ٹیکسی ڈرائیور سے بھی پوچھ سکتا تھا۔"

وہ ہنسنے لگی۔ "آہ مسٹر (اس نے مسٹر نہیں کہا) میں اکیلی نہیں ہوں' میرا شوہر وہ سامنے تصویریں لینے میں مصروف ہے ورنہ میں آپ کو خود وائٹ ہاؤس لے چلتی۔"

"پھر بھی مادام میں بالکل اکیلا ہوں اور ٹیکسی مہنگی ہوتی ہے۔ اور آپ کے شوہر ایک شریف کی مدد کرنا پسند کریں گے۔"

نمودار ہوا شوہر کا۔ "ہائی۔ اے تم کون ہو۔ پاکستانی۔ آہا۔ گڈ۔ کیا اکیلے ہو۔ آؤ ہمارے ساتھ چلو۔ ہم دو دن کے لیے واشنگٹن آئے ہیں' ہم لوگ نیو میکسیکو کے رہنے والے ہیں۔ میرا نام ڈیوڈ سمجھو۔ یہ للی ہے یہ پاناما کی ہے۔ میں امریکی ہوں۔ تمھارا نام؟"

یہ آدمی سچا امریکن تھا۔ اس کی موٹر کے پیچھے ایک کشتی بھی بندھی ہوئی تھی اور میں بھی اس میں بندھ گیا۔ گرم واشنگٹن میں ہم دو دن اس طرح گھومے کہ

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

اگر ایک سچ مچ کی جوئے شیر یعنی دودھ کی نہر یعنی دریائے پوٹومیک کا سہارا نہ ہوتا تو میں واشنگٹن چھوڑ چھاڑ کبھی کا بھاگ چکا ہوتا۔

دریائے پوٹومیک غریبوں سیاحوں اور بیکاروں کا سہارا ہے۔ اس دریا کے کنارے گدلی اور میلی مٹی نہیں ہے بلکہ دونوں طرف گھاس کے چوڑے چوڑے تختے چلے گئے ہیں جن پر خوشحال لوگ آرام کرسیاں لگا کر اور ہم جیسے غریب غربا ویسے ہی کر سستاتے ہیں کھاتے پیتے ہیں — اور سو بھی جاتے ہیں۔ یہ گھاس بہت گہری سبز

www.taemeernews.com

ہے۔ یہ کنارے بہت ٹھنڈے ہیں، یہ دریا نہایت شریف اور معقول دریا ہے لیکن لیکن اس سے صرف چند سو گز اوپر ہر وقت ایک سخت ہنگامہ بپا رہتا ہے۔ سامنے پینٹے گن یعنی امریکی فوجی ہیڈ کوارٹرز سے برابر ہیلی کاپٹر اڑتے ہوئے اس پر گزرتے ہیں۔ ہوائی اڈا بھی زیادہ دور نہیں، ہر ایک دو منٹ بعد فوجی اور سفری ہوائی جہاز اترتے چڑھتے نظر آتے ہیں ان کا شور پہلے پہل تو برا لگتا ہے پھر اس کی عادت ہو جاتی ہے۔

منسار پوٹومیک اور خشم ناک پینٹے گن۔ کاش ساری دنیا پوٹومیک کی طرح ہوتی۔ چپ چاپ، تر و تازہ دوست، با محبت مگر ابھی زندگی صرف پوٹومیک ہی نہیں ہے پیارے یہ جتنی پوٹومیک ہے اتنی ہی پینٹے گن بھی ہے۔ بلکہ آجکل تو پورے عالم کی زندگی پینٹے گن بنی ہوئی ہے۔

"للی تم اس امریکن کے چکر میں کیسے پھنس گئیں"۔

"یہ مجھ پر عاشق ہو گیا تھا اور میں بھی اسے پسند کرنے لگی تھی۔ پھر ہماری شادی ہو گئی"۔

"اوہ سو سمپل"۔ (اتنی آسان کہانی)

للی غمزدہ سی ہو گئی۔ امریکی ہم دونوں کو چھوڑ کر سامنے پوٹومیک کی تصویریں لینے میں مصروف تھا۔ اس کے پاس دو کیمرے تھے ایک عام کیمرہ اور ایک مووی کیمرہ۔ اسے تصویریں لینے کا شوق تھا اور وہ اپنے گھر جاکر دوستوں اور ہمسایوں کو پارٹی پر بلائے گا اور واشنگٹن ڈی سی، ملکی صدر مقام کی تصویریں دکھا کر دھونس جمائے گا۔ آخر ہر امریکن نے اپنے ملک کا صدر مقام کہاں دیکھا ہے۔ خود ہمارے ملک کی آدھی سے زیادہ آبادی نے کراچی لاہور اور ڈھاکا اور پنڈی کہاں دیکھے ہیں۔

"اوہ۔ سو سمپل"۔

"ہاں بس سمپل ہی سمجھو مائی ڈیئر اجنبی۔ فرض کرو میری کہانی پیچیدہ نکلی اور میں نے تمھیں بتا بھی دی تو تم کیا کرو گے"۔

"میں۔ میں کیا کروں گا"۔ میں ہکلا سا گیا مگر پھر میں نے سگریٹ سلگایا، ایک کش لگایا اور آرام سے اس بات کا جواب دے دیا:

"میں وہ داستان اردو زبان میں لکھ دوں گا، ایک ادیب اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہے"۔

"اوہ گویا تم لکھ سکتے ہو یعنی تم کہانی لکھ سکتے ہو"۔ للی مضطرب ہو گئی وہ الف لیلیٰ کے کردار کی طرح پراسرار نظر آنے لگی۔

"فرسٹ کلاس۔ میں فرسٹ کلاس لکھ سکتا ہوں"۔ مگر تمھیں اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا نہ بہتوں

www.taemeernews.com

کا بھلا ہو گا' بس وہ کہانی لکھ دی جائے گی۔"

"مگر مائی ڈیر رائیٹر کیا یہ بات کم ہے کہ دنیا کے کروڑوں انجانے کرداروں میں سے چند کی کہانیاں لکھ دی جائیں۔ مجھ جیسی لاکھوں کروڑوں لڑکیاں آئی ایم سوری عورتیں ایسی ہیں جن کی کہانی کوئی لکھتا ہی نہیں۔"

"آل رائٹ۔ تمھارے سامنے ایک مصنف بیٹھا ہے۔"

"مگر میری کہانی میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ کوئی ہنگامہ کوئی عجیب بات کچھ بھی نہیں ہے۔"

"مائی ڈیر میں خاص ادیب کب ہوں۔ میں کوئی ہمینگوے ہوں' کوئی موپساں ہوں' میں خود ایک سپاٹ فلیٹ' سوکھا سیدھا سادا آدمی ہوں۔ میری تحریر بھی یہ بھی سادی اور بوگس ہے اور میرے پڑھنے والے بھی سیدھے سادے لوگ ہیں۔ اور سچ پوچھو تو زندگی کی پیچیدگیوں میں سپاٹ پن ہی تو سب سے بڑا تنوع ہے۔ ہاں تو کیا ہے تمھاری کہانی؟"

اتنے میں فوٹوگرافر خاوند واپس تشریف لے آئے۔ وہ اچھا مزیدار ساتھی تھا۔ سپاٹ۔ بالکل فلیٹ خاصا کم عقل' تنومند' خوش باش اور دل والا آدمی۔ اس نے موٹر میں سے کھانے پینے کا سامان نکالا' انڈے مچھلی بھنی ہوئی مرغی ڈبل روٹی۔

"اوہ للی غضب ہو گیا' ہم بیئر لانی بھول گئے ہیں۔"

"اوہ ڈارلنگ غضب ہو گیا۔ اب کیا ہو گا دکانیں بھی بند ہوں گی آج ہفتہ ہے۔"

"مگر میں تو بیئر کے بغیر کھانا نہیں کھاؤں گا۔" وہ اٹھلانے لگا۔ "اچھا میں کسی ہوٹل سے لے کر آتا ہوں۔"

"مگر بھائی صاحب مجھے بیئر کی ضرورت نہیں۔" میں منمنایا' حالانکہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ یہ کچھ دیر اور غیر حاضر رہے۔

"اوہ نان سنس۔ تمھیں نہیں' مجھے تو ہے للی کو بھی ہے۔ کیوں للی۔ میں ابھی آیا۔"

وہ ایک گھنٹے میں آیا۔ میرا خیال ہے پہلے تو اسے جگہ تلاش کرنے میں دیر لگی پھر اس نے خریدتے خریدتے پینی شروع کر دی اور خاصی پی کر آیا کیونکہ اس کے قدم بالکل جمے ہوئے نہیں تھے۔

اس دوران میں اجنبی للی نے اجنبی پاکستانی کو ایک ان جانے مگر محکم انسانی رشتے کی بنا پر اپنی داستان سنا دی جو میں آپ کو نہیں سناؤں گا۔ صرف اتنی دھمکی دے دیتا ہوں کہ جیتا رہا تو وہ کہانی لکھوں گا ضرور کیونکہ وہ میری زندگی کے چند سب سے قیمتی تجربات میں شامل ہو گئی ہے۔ وہ ایک عجیب و غریب کہانی ہے اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ وہ للی نے صرف انسانی اعتبار پر مجھے بخش دی۔ میں نہ اس کا دوست تھا نہ

www.taemeernews.com

عزیز، نہ ہم ملک، نہ ہم مذہب، نہ کبھی دوبارہ اس سے ملنے کا امکان، نہ دکھ سکھ میں ساتھ ہونے کا موقع۔
انسان سب جگہ ایک جیسے ہوتے ہیں، اور عجیب غریب ہوتے ہیں۔ دنیا عجیب سادہ اور رنگین مقام ہے
مگر یہ تو واشنگٹن ہے۔
ادھر یہ تو واشنگٹن ہے۔ دنیا۔ دنیا کی چھوڑو یار، دنیا کا کھیلا تو ہمیں بھی بہت کچھ معلوم ہے مگر واشنگٹن کی بات کرو ــــ

صاحبو اور صاحبات مجھے معاف فرمایئے گا کبھی میں اختیاری لکھتا ہوں کبھی بے اختیار۔ جب بے اختیار لکھتا ہوں تبھی سچا لکھتا ہوں، تو یادداشتیں، کتابیں، تصویریں ایک طرف رکھی جاتی ہیں اور ماضی آنکھوں کے آگے جس طرح گزرتا ہے قلم کے ذریعے کاغذ پر منتقل ہوتا جاتا ہے، اس وقت قلم کو ادب اسٹائل اور مضمون کی محدودات کا خیال نہیں ہوتا جو منظر جو کردار زیادہ اُبھرا ہوا ہو اُس پر چھا جاتا ہے۔ آپ امریکہ کا حال سننا چاہتے ہیں مگر اس وقت پورے ملک، پوری پچاس ریاستوں، پورے واشنگٹن پر للّی چھا گئی ہے۔ میں اسے بار بار دھکے دے دے کر ہٹاتا ہوں وہ دور جا گرتی ہے۔ مگر پھر سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔ وہ سامنے وائٹ ہاؤس ہے، صدر امریکہ کی تاریخی قیامگاہ اور وہ کیپٹول جو بجائے خود تاریخ ہے اور وہ بلیر ہاؤس، اور وہ پینٹیگن، اور وہ چوک لیفیاٹ، جس کی تاریخ الگ ہے، اور للّی صرف ایک لڑکی ہے۔ اور لڑکی ہر ملک میں ہوتی ہے اور وائٹ ہاؤس ہر ملک میں نہیں ہوتا صرف واشنگٹن میں ہے، یہ سب میں جانتا ہوں اور جانتا ہوں کہ آپ وائٹ ہاؤس کا آنکھوں دیکھا حال سننا چاہتے ہیں مگر للّی ان سب عمارتوں، یادگاروں اور چوکوں پہ چھائی جاتی ہے۔ للّی جو زندہ ہے۔ جو ہر جگہ ہے جو بہت سادہ ہے اور گندمی رنگ کی ہے اور جو مجھے واشنگٹن کے بعد کبھی نہیں ملی۔

للّی میرے کاغذوں پر سے غائب ہو جاؤ ورنہ میں انھیں پھاڑ دوں گا" میں جھنجھلا جاتا ہوں۔

وائٹ ہاؤس سنہ ۱۸۰۰ء سے صدر امریکہ کا گھر اور دفتر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سخت تاریخی مقام ہے اور اب تو یہ دنیا کا اہم ترین گھر ہے کیونکہ یہاں وہ فرد واحد رہتا ہے جو تیسری عالمی جنگ شروع یا بند کرسکتا ہے۔ جس کے ایک اشارے پر ساتوں سمندروں اور چھ کے چھ براعظموں میں جنگ کے شعلے بھڑک سکتے ہیں۔ ہزاروں جٹ ہوائی جہاز، سیکڑوں دور مار میزائل آن واحد میں دوڑ سکتے ہیں۔ سیکڑوں ایٹم بم درجنوں ہائیڈروجن بم پھٹ سکتے ہیں جو معصوم بستے شہریوں اور لاکھوں اسپتالوں تک کے پرخچے اڑا سکتے ہیں اور اسی کا ایک اشارہ ہزاروں لاکھوں نئے اسکول اور ہسپتال بنوا سکتا ہے۔

نا بابا یہ چھوٹا سا سفید گھر بہت بڑا گھر ہے۔ یہ طاقت کا منبع ہے، قوت کا خزانہ۔ قوت اور طاقت کے معاملے میں بقراطی ٹھیک نہیں، فلسفہ بگھارنا بھی ٹھیک نہیں۔ اسکندر بادشاہ کی تلوار ایک طرف، اور ارسطو کی تمام کتابیں ایک طرف۔ یہ اور بات ہے کہ اسکندر کی تلوار اسکندر کے ساتھ دفن ہوگئی اور ارسطو اور افلاطون کی کتابیں آج تک "چالو" ہیں، مگر جب تک اسکندر کی تلوار اس کے ہاتھ میں ہے نہ کوئی فلسفہ چالو ہوسکتا ہے نہ کوئی کتاب، نہ غزل نہ نظم نہ افسانہ نہ دانشوری نہ صلح کے نعرے نہ امن کی خواہشیں۔

جبھی بزرگوں نے کہا ہے کہ بادشاہ وقت کے معاملے میں کچھ بولو ہی نہیں، جو وہ بولے اسی کی ہاں میں ہاں ملائے جاؤ، جب دوسرا بادشاہ آجائے تب بیشک پہلے بادشاہ کی تاریخ لکھوا سے اچھا کہو، برا کہو یعنی تجزیہ نگاری وغیرہ کرو ورنہ اگر اس کے سامنے بولے تو عین ممکن ہے کہ اس کے بعد بولنے کے لیے زندہ ہی نہ رہو۔

پس اے وائٹ ہاؤس میں صرف تیری تاریخ بیان کروں گا یعنی ماضی کی بات کروں گا، حال کا ذکر صرف اتنا کافی ہے کہ تو بہت پیارا ہے تیرے گھاس کے تختے بڑے اچھے ہیں تیرے کمرے بڑے مزین، بڑے سادہ اور تاریخی ہیں۔

یہ ایسٹ روم یعنی مشرقی کمرہ ہے سفید اور سنہرے کام سے آراستہ۔ بڑے بڑے شمعدان اب تک چھت میں آویزاں ہیں، یک نظر ہیرے سے لگتے ہیں مگر ہیں بلوریں۔ عمدہ ترشا ہوا بلور۔ بہت سارا بلور، اتنا عمدہ مال صرف لینن گراڈ کے اس عجائب گھر میں نظر آیا تھا جسے زار کا سرمائی محل کہا جاتا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ وہ شاہی مال تھا اور اب عوامی ہے۔ اور یہ مال ہمیشہ سے جمہوری ہے جمہور اور عوام کے معنی لغت میں ایک ہیں مگر سنا ہے کہ صدیوں کے اتار چڑھاؤ نے ان کے عملی استعمال میں فرق پیدا کر دیا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

اسی کمرے میں جارج واشنگٹن اور مارتھا واشنگٹن کی قد آدم تصاویر لگی ہوئی ہیں۔ جارج واشنگٹن خاصا شاندار لگتا ہے آخر کو جرنیل بھی تھا اور صدر بھی تھا اور تحریک آزادی کا ہیرو بھی تھا۔ مگر مارتھا واشنگٹن کچھ کم قابل داد نہیں جس نے واشنگٹن کو اتنا بڑا بننے دیا۔ اگر وہ اس کے آزمائشی زمانے میں اسے دھوبی کی دھلائی اور بچوں کی پڑھائی میں الجھائے رکھتی تو نہ جانے آج امریکہ کی تاریخ کیا ہوتی۔ یا شاید امریکہ کی تاریخ تو یہی ہوتی کیونکہ امریکی عوامی قومیں دوسرا واشنگٹن تلاش کر لیتیں مگر جارج واشنگٹن کی تاریخ یہ نہ ہوتی۔

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو ___

اور یہ سرکاری دعوتوں کا کمرہ ہے۔ کمرہ تو خیر ٹھیک ٹھاک ہے لیکن اس میں آتشدان بہت بڑا ہے۔ اب یہ کمرہ مرکزی حرارت سے گرم رہتا ہے مگر روایت پسندی نے آتشدان کو یونہی سلامت رکھا ہے۔ آخر امریکی جدت

www.taemeernews.com

ہوتے ہوئے بھی بنیادی طور پر برطانوی قوم کے ہم مزاج ہیں۔ اس طعام خانے میں صدر ابراہام لنکن کی تصویر آویزاں ہے۔ ابراہام لنکن جس کے بارے میں آپ سب کچھ جانتے ہیں مگر شاید یہ نہیں جانتے کہ وہ ابتدائی زندگی میں ایک نہایت معمولی آدمی تھا اور بقول کسے "ترقی کرتے کرتے صدر بن گیا"۔ بس خدارا آپ اتنا جان لیجیے کہ آزاد ملکوں میں بڑے یا اچھے کارکن لوگوں کا پیدائشی ہونا 'جاگیردار یا صنعتکار کا بیٹا' بھائی ہونا ضروری نہیں' یعنی ایسا ہونا نہیں چاہیے ورنہ ملک بہت دن آزاد نہیں رہتا اور رہتا بھی ہے تو گھسا پٹا' لنگڑا لولا رہتا ہے۔ اگر ابراہام لنکن چھوٹا پیدا ہوکر چھوٹا ہی رکھا جاتا تو امریکہ کے کالے لوگ اتنے آزاد کبھی نہ ہوتے جتنے آج ہیں کیونکہ اس نے خانہ جنگی مول لے کر غلامی کو قانونی طور پر ممنوع قرار دے دیا تھا۔

بہرحال بات ذرا مقام سے کھسک گئی' یعنی مجھ جیسوں کو باتیں سنانے میں بہت دن لگیں گے' ابھی جاگیرداری صنعت کاری اور پیدائشی بڑے آدمی یا بڑے آدمی کی بڑی اولاد کا فلسفہ اس سابق غلام ملک پر بہت دن چھایا رہے گا' سو یار چھایا رہنے دو' دیکھیں کونسا الیکشن لڑنا ہے' اور لڑنا بھی ہو تو یار لوگ ابراہام لنکن کی کہانی سنیں گے یا تمھاری ذات برادری' جیب اور اثرو رسوخ دیکھیں گے۔

صدر ابراہام لنکن آئی ایم سوری میں تمھارا قدیم عاشق ہوں مگر میں کیا کروں بے زر عشق ٹیں ٹیں ہوتا ہے اس لیے میں اگلے کمروں کا رُخ کرتا ہوں۔

اگلے کمرے بھی رنگوں کے نام پر ہیں۔ نیلا کمرہ۔ سرخ کمرہ۔ سبز کمرہ۔ ان ناموں کی غایت یہ ہے کہ جس کمرے میں جس رنگ کے پردے لگے ہوئے ہیں اس کا نام اسی رنگ پر رکھ دیا گیا ہے۔ اب مزا یہ ہے کہ مختلف رنگوں کے پردے کبھی ایک بار لگائے گئے ہوں گے۔ اس وقت سے کمروں کے نام پڑ گئے' اب ہمیشہ ان کمروں میں انھی رنگوں کے پردے لگائے جاتے ہیں۔

دیکھا آپ نے رنگ میں بھی کیا طاقت ہے' ایک بار جگہ پکڑ لے تو عمر بھر چپکا رہتا ہے۔ سبز کمرہ آج تک سبز کمرہ ہے' سرخ آج تک سُرخ۔ رنگ پورے وہائٹ ہاؤس پر چھایا ہوا ہے۔ اگر رنگ نے کہیں مات کھائی ہے تو گرگٹ کے معاملے میں۔ گرگٹ کے کتابی معنی تو ہیں چھپکلی نما جانور لیکن لغات جدید مرتبہ مسٹر جمیل الدین عالی اٹھا کر دیکھیے تو اصل معنی ملیں گے' فرماتے ہیں:

گرگٹ ۔۔ یعنی سرمایہ دار اور نیم سرمایہ دار ملکوں کی سیاست۔ پتا نہیں آئندہ کیا فرمائیں گے۔ کیونکہ گرگٹ کی طرح موصوف کی ڈکشنری بھی رنگ بدلتی رہتی ہے۔

واضح رہے کہ یہ وائٹ ہاؤس جو ہم آپ دیکھ رہے ہیں وہ منشئ کا وائٹ ہاؤس نہیں ہے بلکہ

www.taemeernews.com

پرانی بنیادوں اور نقشے پر تقریباً نئی عمارت ہے۔ کیونکہ انیسویں صدی میں ایک بار یہ شاید پورے کا پورا جل کر تباہ ہو گیا تھا۔ پھر مختلف صدر صاحبان نے اسے ٹھیک ٹھاک کیا کچھ اضافے کیے کچھ توڑ پھوڑ کی مگر آج کا وائٹ ہاؤس اصل میں صدر ٹرومین کا رہین منت ہے جنھوں نے کئی سال میں ساٹھ لاکھ ڈالر سے اس کی تعمیر نو کی۔ ساٹھ لاکھ ڈالر یعنی تین کروڑ روپے سے زیادہ کی صرف "تعمیر نو" مگر قوم بھی تو امریکہ ہے اتنی رقم وہ کسی بھی چھوٹے سے ملک یا جزیرے کی تعمیر نو یا تخریب نو پر اڑاتی رہتی ہے۔ اپنے ملک کے "ایوان اولیں" پر خرچ کر دینا کون سی بڑی بات ہے۔

اب یہ جو سرخ، نیلے، سبز کمرے ہیں ان سے طرح طرح کی یادگاریں وابستہ ہیں مگر وہ بنیادی طور پر امریکیوں کے لیے قومی وقار یا دلچسپی کے لیے ہیں۔ عالمی تاریخ سے ان کا تعلق کم ہے۔ عالمی تاریخ کے لحاظ سے زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی "یادگاریں" اہم ہیں مثلاً معاہدے والا کمرہ جہاں ۱۸۲۳ء میں امریکہ نے اسپین سے صلح نامے پر دستخط کیے (ویسے مجھے [illegible] کہ [illegible] اور اسپین کی پرانی لڑائی سے بھی کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔)

ایک اور کمرہ ہے گلاب والا مہمانوں کا کمرہ۔ ہم ہوتے تو اس کا نام گلابیا رکھتے۔ کیونکہ یہ کمرہ وی آئی پی خواتین یعنی وی آئی پی مہمان خواتین کے لیے مخصوص ہے۔ امریکی جمہوریت پسندیوں تو بالکل جمہوریت پسند ہیں مگر بادشاہوں، شاہزادوں اور شاہزادیوں کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے ہاں یہ چیز نہیں پائی جاتی۔ اب اس کمرے کو وہ بڑا تاریخی سمجھتے ہیں۔ کیوں سمجھتے ہیں اس لیے کہ یہاں مادر ملکہ الزبتھ اور ملکہ الزبتھ ثانی اور ہالینڈ کی دو ملکائیں یعنی ملکہ ولہلمینا اور ملکہ جولیانا فروکش رہ چکی ہیں اور یونان کی ملکہ فریڈریکا نے بھی یہاں قیام فرمایا ہے۔ یہاں ایک بڑا شیشہ ہے جسے گائیڈ بڑے طمطراق سے دکھاتا ہے۔

یہ شیشہ ملکہ الزبتھ دوم نے وائٹ ہاؤس کو ۱۹۵۱ء میں اس وقت پیش کیا تھا جب وہ شاہزادی تھیں۔ کیا تاریخ تھی وہ؟ ذرا ٹھہر جائیے۔ میں ابھی بتاتا ہوں۔

"اجی آگے چلیے صاحب ہمیں اس تاریخ سے کیا مطلب" میں دل ہی دل میں کہتا ہوں لیکن مجھے معلوم ہے کہ سامنے منہ کھولے حیرت و اشتیاق میں غرق کچھ سفید فام خواتین و حضرات وہ تاریخ جاننے کے لیے جان دے دینے پر آمادہ ہیں۔

سامنے کو ذرا روز گارڈن اور مغربی سمت والے برآمدے کے سامنے ہے ادھر آپ نہیں جا سکتے۔ [illegible] ایک بار ادھر جانے کا موقع ملا جب صدر کینیڈی نے یاد فرمایا تھا لیکن صرف ٹورسٹ کی حیثیت سے۔

[illegible] دور کا جلوا

www.taemeernews.com

ہاں یہ بات نہایت دلچسپ ہے کہ زائرین کو بڑے باغ اور برآمدوں میں خوب گھومنے پھرنے کی اجازت ہے۔

www.taemeernews.com

مناظر، کتابیں، کتابیں

ایک لمبے چوڑے میدان میں سیکڑوں چھوٹے چھوٹے لوہے کے کھمبے لگے ہوئے ہیں۔ میرے امریکی میزبان اپنی لمبی چوڑی کار ایک کھمبے کے ساتھ تقریباً چپکا کر لگا دیتے ہیں۔

"آپ کیا کھائیں گے اور کیا پئیں گے؟"

"جی نہیں میں تو اپنے ہوٹل جا کر کھاؤں گا" میں ایشیائی تکلف کے ساتھ جواب دیتا ہوں۔ حالانکہ اس گرمی میں کم از کم کوئی ٹھنڈا مشروب پینے کے لیے میں بھی بیتاب ہوں۔ پھر مجھے اس امر پر بھی حیرت ہے کہ یہ حضرت اس لق و دق جنگل قسم کے مقام پر یہ سوال کیوں کر پوچھ رہے ہیں۔ ادھر میں سمجھ گیا۔ یہاں بس آتی ہوگی، یہ مجھے یہاں اتار کر کسی ریستوران کا پتا بتائیں گے۔

"بس میں خود ہوٹل میں چلا جاؤں گا" میں نے اپنے جواب میں اضافہ کیا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ آج اچھی سیر رہی کل یا پرسوں پھر ملاقات ہوگی"۔

"اوہ نو مائی ڈیر تم جاتے کہاں ہو شام کتنی گرم ہے ہم کس قدر تھکے ہوئے ہیں" وہ بولے "کچھ کھا پی کر آگے چلیں گے"۔

میں چپ ہو جاتا ہوں مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

"میں تو چکن سینڈوچ اور آئس کریم لوں گی" میم صاحب چہک کر بولیں۔ "چاکلیٹ آئس کریم۔ اس سے کتنا ڈیل لائے۔"

"آپ بھی تو بولیے جناب" انھوں نے عجلت میں اصرار کیا۔ میں ڈر گیا۔ "بس یہی میں بھی کھاؤں گا۔" میں نے فوراً بات ٹالنے کو جواب دیا۔

www.taemeernews.com

" انھوں نے کھمبے کی طرف ہاتھ بڑھا کر ایک بٹن دبایا اور کار سے منہ نکال کر ہوا میں بولنے لگے۔

" یہ نمبر ۵۵ ہے۔ دو پلیٹ چکن سینڈوچز۔ دو چاکلیٹ آئس کریم ڈبل، بالکل ڈبل، ایک بڑے گوشت کا بھنا ہوا ٹکڑا اور دو ٹوسٹ اور ــــ اور اچھا دو کوکا کولا ــــ بالکل ٹھنڈے۔ کوئیک پلیز۔"

" ویری ویل سر" کھمبا غرغرایا مگر آواز صاف آرہی تھی" بس دو منٹ لگیں گے۔ کوکا کولا کے ساتھ برف کے ٹکڑے بھی درکار ہیں یا صرف ٹھنڈا کوکا کولا۔"

" بغیر برف کے "

" ویری ویل سر "

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

معلوم ہوا کہ یہ ڈرائیو ان ریستوران ہے یعنی تقریباً دو فرلانگ سامنے جو عمارت ہے اس میں ایک زبردست ریستوران واقع ہے۔ یہ لمبا چوڑا علاقہ بھی کھلا ریستوران ہے۔ ان کھمبوں پر کھانوں کی فہرست، فہرست کے ساتھ ساتھ قیمتیں لکھی ہوئی ہیں اور یہ بٹن دبا دو تو مائیکرو فون کام کرنے لگتا ہے۔ ہر کھمبے پر نیچے نمبر لکھا ہوا ہے۔ آپ اپنا نمبر دیکھ کر کھمبے یعنی مائیکرو فون کے ذریعے منیجر صاحب کو مطلوبہ اشیا بتا دیجیے۔ سامنے سے وہ صاحب جو ایک چھوٹی سی ٹرالی کار دوڑائے چلے آرہے ہیں آپ کا کھانا لا رہے ہیں۔ کھانا کاغذ میں ملفوف ہوتا ہے اور دام وہ کھانا لانے والے صاحب وصول کر کے چل دیتے ہیں۔ برتنوں کا جھنجھٹ ہی نہیں جنھیں آپ لے کر بھاگ جائیں ــــ کوکا کولا کی بھی بوتل نہیں بلکہ کاغذ کے گلاس میں ٹھنڈا مشروب سر بہ مہر ہے۔

اب میں نے غور سے نظر دوڑائی تو معلوم ہوا کہ جیسے جیسا بڑھتا جاتا ہے تو کاریں آآ کر کھمبوں سے بغلگیر ہو کر کھڑی ہوتی جاتی ہیں۔ ٹرالیاں ریستوران سے نکل نکل کر چاروں طرف بھاگ رہی ہیں۔

" یہ کیا سسٹم ہے" میں بے غیرت بن کر پوچھ ہی بیٹھا۔

کیوں نیچی رہ جیوز اور کی سوال نہ سمجھی۔" کیا آپ کے ہاں یہ سسٹم نہیں ہے۔ اوہ آئی ایم سوری۔ شاید نہیں ہو۔ بات یہ ہے کہ اگر آپ پکنک یا کھیل تماشے سے آرہے ہوں اور باقاعدہ کپڑوں میں نہ ہوں یا سستی یا تھکن کے سبب ریستوران کے اندر جا کر کھانے پینے کے موڈ میں نہ ہوں تو ایسے کھلے ریستوران بہت کام آتے ہیں۔ نہ کوئی آپ کو پوچھے نہ آپ کسی کو جانیں۔ کیا آپ کو یہ سسٹم پسند آیا؟"

" بہت " میں نے جلدی سے کہا کیونکہ میں نے دیکھا کہ سامنے والی کار میں جو خاتون تھیں وہ اپنے مرد کا تھی پر جھکی جارہی تھیں۔ ایک ٹکٹ میں دو دو مزے۔ بھئی واہ۔

www.taemeernews.com

"جی ہاں، مجھے یہ سسٹم بہت پسند آیا ہے" میں نے مزید تعریف کی اور خواتین و حضرات یہ سسٹم صرف انگلن ہی میں نہیں بلکہ تقریباً سارے امریکہ میں رائج ہے سینما بھی اسی طرح کے ہیں یہاں سامنے اسکرین ہے کھلے آسمان کے نیچے چھوٹے چھوٹے کھمبے لگے ہوئے ہیں، ان میں لمبے لمبے تاروں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے لاؤڈ اسپیکر بندھے ہوئے ہیں۔ میدان میں داخلے کا ٹکٹ دے کر سونتے میں کسی بھی کھمبے کے ساتھ کار لگا دیجیے تار کھینچ کر لاؤڈ اسپیکر کار میں ڈال لیجیے تماشا دیکھیے اور آواز سنیے اور ـــ اور ـــ

آنکھ والا تری قدرت کا تماشا دیکھے

ہمارے حسابوں یہ تن آسانیاں ہیں اور امریکی حسابوں یہ صرف آسانیاں ہیں۔ اس وقت بے اختیار حضرت جگرمرادآبادی کا ایک شعر یاد آگیا جو میں نے اپنے بالکل بچپن میں ایک تھیئٹر میں سنا تھا۔ پارسی کا تھیئٹر جو دلی میں جاڑے کے جاڑے آتا تھا۔

خطاؤں سے پہلے پشیمانیاں ہیں
محبت کی معصوم نادانیاں ہیں

کہاں وہ تھیئٹر جس کا انتظار سال سال بھر کیا جاتا تھا جس میں کنواریوں کا جانا منع تھا اور جس کی سیکنڈ کلاس گدیلے تختوں پر بنائی جاتی تھیں جو اسٹیڈیم کی نشستوں کی طرح نیچے سے اوپر چلے جاتے تھے اور جب "رش" پڑتا تھا تو ٹوٹ بھی جاتے تھے۔ کہاں وہ تھیئٹر اور کہاں یہ ڈرائیو ان مووی۔ یہ ڈرائیو ان ریستوراں جہاں آپ تماشا دیکھتے دیکھتے خود بھی کوئی پارٹ ادا کرسکتے ہیں جہاں آپ ـــ

آنکھ والا تری قدرت کا تماشا دیکھے

ایک اور تماشہ جمہوریت کا بھی ہے جو صبح شام واشنگٹن کی عمارت موسومہ کیپٹول میں کھیلا جاتا ہے۔ کیپٹول امریکی سیاست کا مرکز، امریکی سوسائٹی کی روح ہے، یہاں سینٹ اور کانگریس کے اجلاس ہوتے ہیں بلکہ جمتے رہتے ہیں۔ کانگریس میں ہر ریاست کے دو نمائندے ہیں اور سینٹ میں ایک ایک۔ اس نمائندگی میں آبادی کے تناسب کو دخل نہیں یعنی ایسا نہیں کہ بڑی آبادی والی ریاست سے زیادہ نمائندے آجائیں اور چھوٹی آبادی کی ریاست سے کم اور بڑی کثرت آبادی کی بنا پر گروپ بنا کر حکومت کریں۔

مگر جمہوریت تو ہے ہی کا نام ہے۔ اکثریت کی حکومت کا، کیسی اکثریت۔ انسانوں کی اکثریت یا کسی خاص نام سے موسوم کے وقت جمع شدہ نمائندوں کی کثرت یت۔

آپ یہ دستور داں اور قانون داں حضرات توجہ فرمائیں کیونکہ جمہوریت کا معاملہ ایسا نازک ہے کہ گویم مشکل

www.taemeernews.com

دگر نہ گویم شکل ہم نے تو انگریزوں سے انسانی آبادی کی اکثریت والا فارمولا سیکھا تھا۔ امریکہ میں اس فارمولے نے دوسری شکل اختیار کر لی ہے، بہر حال:

ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

ارے میاں سیدھا سادا اقبال کا مصرع کیوں نہیں پڑھتے سب سے بڑی بات تو صرف علامہ ہی فرما گئے ہیں:

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا

بہر حال کیپٹول کی سیاست چھوڑ کر اس کے کتب خانے میں داخل ہو جائیے کیونکہ بابائے اردو مرحوم کے بقول

سب سے اچھی دوست کتاب

اس کتب خانے کا نام ہے لائبریری آف کانگریس یعنی اصل میں یہ کتب خانہ امریکی کانگریس کا ہے اور اسی کے استعمال کے لیے قائم ہوا تھا لیکن اب دنیا بھر کے ریسرچ کرنے والے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ قدیم کتب خانہ ۱۸۹۷ء میں بنا تھا لیکن اب مجھ جیسے بقراطوں کو اس سفید پتھر کی ایرکنڈیشنڈ عمارت میں کام کرنے کی سہولتیں میسر ہیں جسے ۱۹۳۹ء میں بنا کر کتب خانے کے ساتھ ملحق کر دیا گیا ہے۔ اس کتب خانے کی داستان بھی عجیب ہے۔

پہلے اس کتب خانے میں تین ہزار کتابیں تھیں مگر یہ پچھلی صدی کی بات ہے وہ کتابیں انگریزوں کے حملے میں ضائع ہو گئیں پھر ۱۸۱۵ء میں کانگریس نے صدر جیفرسن کا کتب خانہ خرید لیا جس میں چھ ہزار کتابیں تھیں مگر ۱۸۵۱ء میں یہاں آگ لگ گئی اور تقریباً آدھی کتابیں پھر ضائع ہو گئیں پھر ــــ پھر ــــ

آج اس کتب خانے میں سوا کروڑ سے زیادہ کتابیں ہیں۔ کیا سنا آپ نے سوا کروڑ کتابیں اور رسالوں کو بھی شمار کیا جائے تو "فہرست مندرجات" چار کروڑ دس لاکھ تک جاتی ہے۔

چار کروڑ دس لاکھ "اشیائے علم" جن میں کتابوں کے علاوہ مخطوطات، ریکارڈ اور نقشے شامل ہیں۔ اور اس ضمن میں یہ واضح رہے کہ پورے ملک میں ساڑھے بارہ ہزار سے زیادہ کتب خانے ہیں جن میں سے دس ہزار خالص عوامی ہیں یعنی جہاں پڑھنے کے لیے کوئی فیس نہیں دینی پڑتی اور ان کے علاوہ صرف امریکی یونیورسٹیوں کے اپنے کتب خانے چودہ سو سے زیادہ ہیں۔

یاد رہے کہ لائبریری آف کانگریس میں زیادہ تر کتابیں مفت آئی ہیں یہاں اٹھارہ سو ستانوے میں ایک قانون بنا تھا جس کی رو سے ہر ناشر پر لازم ہے کہ وہ چند جلدیں اس کتب خانے میں بھیج کر کاپی رائٹ محفوظ کرالے۔ کاپی رائٹ سے ناشر کو تو یہ فائدہ ہے کہ اس کا حق تجارت محفوظ ہو جاتا ہے لیکن "قوم" کو یہ فائدہ ہے کہ ملک

www.taemeernews.com

بھر میں جو چیز چھپے یا جس کا ریکارڈ یا فلم بنے وہ مفت میں اس کتب خانے کی ملکیت یعنی قوم کی ملکیت ہو جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق امریکہ میں ہر سال تقریباً بارہ ہزار کتابیں چھپتی ہیں۔ آپ خود حساب لگا لیجیے کہ بارہ ہزار میں چند ہزار نہایت عمدہ اور مہنگی کتابیں بھی ہوتی ہوں گی۔ وہ سب اس کتب خانے میں مفت محفوظ ہوں گی۔ غیر ملکی کتابیں خرید لی جاتی ہیں لیکن پاکستان کا شعبہ دیکھ کر جو مایوسی ہوئی اس کا ذکر بھی کرنا تکلیف کا باعث ہے۔ یہ ر زندہ صحبت باقی۔

صاحبو اس حقیر فقیر نے پاکستان واپس آ کر اپنی "معلومات عالم" سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک کاپی رائٹ قانون کا مسودہ تیار کیا تھا جو صدر مملکت نے نافذ بھی فرما دیا تھا۔ اس پاکستانی قانون کو دنیا بھر کے ماہرین کاپی رائٹ نے دنیا کا جدید ترین اور بہترین کاپی رائٹ قانون قرار دیا اور بعد میں یہ فدوی اسے روبہ عمل لانے کو افسر بکار خاص مقرر کیا گیا لیکن نہ تو فدوی نہ فدوی کے جانشین اسے آج تک روبہ عمل لا سکے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستانی لائبریری آف کانگریس کا قیام آج بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہے۔

اے میاں کیوں دل چھوٹا کرتے ہو ہم مسکینوں نے آزادی کے بعد یہ قانون بنانے میں سو برس لیے تم نے اور کچھ نہ کیا تو جلدی قانون بنا تو لیا اب اس پر عمل بھی ہو جائے گا۔ کتب خانے کھیل نہیں ہوتے زبان کی طرح ہوتے ہیں۔ کیا ہے وہ:

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

یعنی اپنے پاکستان میں:

کتب خانہ بنتے ہی بنتے بنے گا

سین دوسرا

"کیوں بیٹا قیس اس وقت کونسا سبق پڑھ رہے ہو؟"

مولوی صاحب: ہے چہرہ سامنے کسی مست شباب کا
نظارہ کر رہا ہوں خدا کی کتاب کا"

"بیٹا یہ کس کی کتاب ہے، صحیح پڑھو بیٹے اب تو زلیخا کا سبق یاد کرو۔"

مولوی صاحب: زلیخا سے زیادہ عشق کا مجھ پر اثر چھیلا!

"زلیخا عاشق یوسف تھی اور قیس عاشق لیلیٰ"

www.taemeernews.com

"ہائیں مردود ۔ یہ کیا بکواس ہے"
مگر میں کیا کروں، لائبریری آف کانگریس میں یہ خاتون کیوں بیٹھی ہوئی ہیں جن کا چہرہ خدا کی کتاب ہے۔
مجھے بے اختیار ماسٹر رولی والے لیلیٰ مجنوں کے وہ مکالمے کیوں نہ یاد آئیں جو کبھی تیس پینتیس برس پہلے سنے تھے۔ یہ مکالمے آج سے پہلے مجھے کبھی یاد نہ آئے، پتا نہیں اب بھی ٹھیک یاد آئے ہیں یا تین قرنوں نے کہیں کہیں حذف ترمیم کی قینچی چلا دی ہے۔ بہرحال صاف بات یہ ہے کہ لائبریری آف کانگریس کی چار کروڑ "اشیائے علم" ایک طرف اور یہ کتابی چہرہ ایک طرف ـــ اجی لاحول ولا قوۃ وہ علم ہی کیا جو خوبصورتی سے دور لے جائے۔ حسن اور علم، علم اور حسن۔ کیوں بیٹا کیا پسند کرو گے۔ ظاہر ہے کہ میں حسن پسند کروں گا کیونکہ حصول علم کا منتہا بھی تو حسن ہے۔ اے لیجیے معاف کیجیے گا حسن پر پھر بچپن کی ایک غزل یاد آنے لگی: نہ معلوم کس کی ہے، کسی بوگس سے بزرگ شاعر کی ہے، ابھی جو یا بری اس وقت یہی یاد آئی ہے سو اس کا مصرع اوّل حاضر ہے:

حسن ہے سارا جہاں ذوق تماشا کی قسم

تو بھائی ساری بات ذوق تماشا کی ہے اگر ذوق نہ ہو تو لائبریری آف کانگریس کی سوا کروڑ کتابوں میں کچھ نہیں، اور اگر ذوق ہو تو اس سادے سے ڈیسک پر اوران سفید کاغذوں اوران ٹائپ رائٹروں کے ہجوم میں بھی:

آنکھ والا تری قدرت کا تماشا دیکھے

ایک حسن مجھے فلاڈلفیا کے "ایوان آزادی" میں بھی نظر آیا۔ "ایوان آزادی" شہر فلاڈلفیا میں ایک چھوٹی سی شاندار عمارت ہے جہاں ۴ رجولائی ۱۷۷۶ء کو تیرہ امریکی ریاستوں نے اعلان آزادی پر دستخط کیے تھے۔ اس وقت شہر واشنگٹن کا تصور بھی نہیں تھا کہ فلاڈلفیا ہی کو صدر مقام تصور کر لیا گیا تھا۔ اس لیے اس مقام کی تاریخی اہمیت شاید پوری امریکی سیاسی تاریخ میں سب سے زیادہ ہے۔ خاکسار بھی واشنگٹن سے چند گھنٹے کے لیے فلاڈلفیا گیا تھا اور صرف یہی مقام دیکھنے گیا تھا مگر مجھے اس بت کے نیچے (جو شاید جنرل واشنگٹن کا ہے) ایک چیز "نظر آئی۔ موسم گرم تھا صبح دوپہر میں بدلتی جاتی تھی اور ایک دم:

پھر موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی

اور میں سیاحوں کے قافلے سے ایک دم جدا ہو گیا۔ مجھے جنرل واشنگٹن ایک کیڑے مکوڑے کی طرح لگا، امریکی اعلان آزادی کا تصور ایک خالی خولی چیخ پکار سے زیادہ نہ رہا "ایوان آزادی" مٹی کے گھروندے جیسا بھی نہ لگا ... ساری کائنات صرف ایک ذات میں مرکوز ہو گئی جو اس بت کے نیچے پنسل سے اپنا نام لکھنے میں مصروف تھی ـــ پھر مجھے دیکھا تو شرمانے لگی

www.taemeernews.com

اور میں ذرا اور آگے بڑھا تو فرمایا:

سنبل مرا تازیانہ لانا

شمشاد اسے سولی پر چڑھانا

مگر شمشاد کی بجائے ایک ہٹے کٹے امریکن صاحب دوڑ کر آئے۔ اس کی باہوں میں باہیں ڈالیں اور کھٹ سے موٹر میں بٹھا کر "فرار" ہو گئے۔ میں بھی ٹیکسی میں دوڑا مگر وہ بندرگاہ کے علاقے میں پہنچ کر غائب ہو گئے۔ خدا انھیں خوش رکھے ان کے بہانے بندرگاہ بھی دیکھ لی۔

صاجو میں سخت شرمندہ ہوں کہ سیاحت کرتے کرتے طرح طرح کی زنجیروں میں پھنس جاتا ہوں مگر یہ بھی سیاحت ہی ہے۔ واشنگٹن کی لائبریری آف کانگریس اور فلاڈلفیا کا ایوان آزادی اپنی اپنی جگہ نہایت اہم سہی۔ میرے پاس ان کے بارے میں لاتعداد اعداد و شمار بھی موجود ہیں مگر صاجو یہ بھی سچ ہے کہ:

دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

آنکھ والا تری قدرت کا تماشا دیکھے

www.taemeernews.com

خوش حالی کی خوش خیالی

امریکی کانگریس کی تعطیلات ہیں۔
لائبریری میں مرمت کی وجہ سے الو بول رہا ہے۔
واشنگٹن سخت گرم مرطوب اور "خالی" ہو گیا ہے۔

نیویارک میں "پڑھائی" اگلے ہفتے کے بعد شروع ہوگی چنانچہ میں طالب علم سے فوراً ٹورسٹ بن جاتا ہوں۔ ٹورسٹ ہونا بھی ایک طرح کا پیشہ ہے یعنی کوئی آپ سے پوچھے آپ کہہ دیں میں ٹورسٹ ہوں تو وہ دوسرا سوال نہیں کرے گا۔ نہ جانے دوسرا سوال کیوں نہیں کرتا، ارے بھائی ٹورسٹ تو سیاح کو کہتے ہیں سیاحی کے لیے رقم چاہیے، تم کھاتے کماتے کہاں سے ہو، ذریعۂ آمدنی کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

مگر یہ واقعہ ہے کہ ٹورسٹ سے دوسرا سوال نہیں کیا جاتا، جیسے وطن عزیز میں سی ایس پی سے دوسرا سوال نہیں پوچھا جاتا بس یہ جاننا کافی ہے کہ وہ سی ایس پی ہے کیونکہ سی ایس پی ہوتے ہی وہ سب کچھ ہونے کا حقدار ہو جاتا ہے۔ وہ انجینئرنگ کے محکمے کا سربراہ بھی ہو سکتا ہے، ایٹمی توانائی کا ماہر، محکمۂ تعلیم کا نمبر اول افسر، محکمۂ جنگلات اور محکمۂ ریڈیو کا نمبر اول افسر، بس پہلے اسے صرف سی ایس پی ہونا چاہیے پھر ہر بڑا ہنر مند بے یار ہو جاتا ہے۔

(ملاحظہ فرمایا آپ نے احساس کمتری کہاں کہاں اور کیسے کیسے بولتا ہے۔ پہلے مجھے اس کا علم نہ تھا، یہ نفسیاتی انکشاف بھی ایک سی۔ ایس۔ پی بزرگ نے فرمایا اور مجھے حکم حاکم کے طور پر ماننا پڑا ہے میں نے ان سے وعدہ بھی کیا تھا کہ ان کا انکشاف اپنے پڑھنے والوں تک پہنچا دوں گا سو میں نے وہ وعدہ ایفا کر دیا۔ انھوں نے پوری سروس کی طرف سے وعدہ کیا تھا کہ میری مزید پٹائی نہیں کی جائے گی اور اپنے ملک میں زندہ رہنے کا حق دوبارہ عطا کر دیا جائے گا۔ سو اب وہ جانیں اور ان کی سروس غلطے ......)

www.taemeernews.com

تو اب پبلک انٹرنیشنل سی۔ ایس۔ پی المعروف بہ ٹورسٹ ہوں ہیں اس ہفتے جہاں چاہوں جاسکتا ہوں۔ جو چاہوں دیکھ سکتا ہوں، دقت صرف یہ ہے کہ؛

زرمی طلبد سخن دریں است

اس کا انتظام خدا تعالےٰ نے ایک ٹیلیویژن کمپنی کے ذریعے کرادیا۔ سچ ہے ایک در بند ہو جائے تو سو در کھل جاتے ہیں۔ یہاں ٹیلیویژن کمپنیاں اشتہارات پر زندہ ہیں' اشتہار بڑے بڑے سرمایہ دار اہل تجارت دیتے ہیں' اور مقابلہ ایسا شدید ہے کہ انھیں روز نت نئے پروگرام ایجاد کرنے پڑتے ہیں تاکہ پبلک ان کے چکر میں مبتلا رہے۔ روز لاکھوں ڈالر اس مقابلے میں پانی کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ اتفاق سے ایک کمپنی نے ایک خالص ایشیائی جنرل نالج کا مقابلہ ٹیلیویژن پر دکھایا۔ دس سوال کھٹا کھٹ کیے جائیں' جو فٹا فٹ صحیح جواب دیدے اور تین سے زیادہ صحیح جواب دے' اسے فی صحیح جواب سو ڈالر ملیں گے۔ سو ڈالر یعنی تقریباً پانچ سو روپے کیا سمجھے آپ پانچ سو روپے۔ شاید یقین نہ آئے۔ آنا بھی نہیں چاہیے' یہاں ساری عمر صحیح جوابات دیتے دیتے گزر جائے تب بھی پانچ سو روپے ماہوار آمدنی پکی نہیں ہوتی' کسی نہ کسی بات کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ وہاں پانچ سو روپے ایک صحیح جواب میں مل جاتے ہیں۔

اس حقیر پُر تقصیر نے دس میں سے سات جواب صحیح دیے۔ اصل میں آٹھ دیے تھے اور ایک کو وہ صحیح نہیں مانتے تھے اور چونکہ رقم ان کی تھی اور فیصلہ بھی ان کے اختیار میں تھا اور فدوی کا خرچ اس سلسلے میں ڈیڑھ ڈالر تھا یعنی کرایہ ٹیکسی اس لیے سات سو ڈالر بہت غنیمت لگے۔ کل تنخواہ چھ سو ڈالر مہینہ تھی۔ ایک دن میں بلکہ دس منٹ میں سات سو ڈالر کی کیا بات ہے' معلوم ہوا کہ لاٹری نکل آئی۔ چیک کی بجائے کیش یعنی نقد رقم وصول کی۔ کچھ ٹکٹ پیسے کے بنے رکھے تھے باقی اپنی رقم ڈالی اور:

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے

ساؤتھ ڈکوٹا ایک بگس ریاست ہے' کہیں کوئی خاص بات دیکھنے کی نہیں مگر امریکہ جانے والا ہر کھاتا پیتا ٹورسٹ بیک ہلز یعنی "کوہ سیاہ" ضرور دیکھنے جاتا ہے۔ اسے دیکھنے کی جلدی میں شکاگو جیسے مشہور شہر کو چھوڑ گیا' یہاں ایک یادگار چٹان ہے جس پر شوقین سنگتراشوں نے امریکہ کے چار صدروں کے چہرے تراش رکھے ہیں۔ یہ ہیں جورج واشنگٹن' ٹامس جیفرسن' تھیوڈور روزویلٹ اور ابراہام لنکن۔ ہر چہرہ اپنی جگہ ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے۔ مثلاً اگر آپ ہمت کر جائیں تو روزویلٹ کی مونچھوں پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ یہ سنگ تراش شوقین محب وطن تھے' انھیں کسی سرکاری محکمے نے اس کام پر مامور نہیں کیا تھا نہ انھوں نے کوئی چندے کی مہم چلائی بس من میں آئی اور

www.taemeernews.com

کام سے لگ گئے:

ایک پہلو یہ بھی ہے اس ملک کی تصویر کا

اس مقام کو دیکھ کر مصری فنکاروں کی یاد آتی ہے جنھوں نے ہزاروں سال پہلے وادئ نیل میں فراعین اور دیوی دیوتاؤں کے مجسمے تراشے تھے معلوم ہوا کہ انسان بت پرستی اور بت تراشی کی بھول بھلیوں سے آج بھی نہیں نکلا۔ پہلے بت پرستوں کو فرعون اور خیالی دیوی دیوتاؤں کی یادگار بنانے کا شوق تھا آج کا بت پرست جمہوریت کو اپنی دیوی مان کر اس کے اوتاروں کی تصویر بناتا ہے پھر غالب یاد آگئے۔ ایسے مواقع پر اردو ادب میں صرف غالب ہی کام آتے ہیں:

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا

واماندگئ شوق تراشے ہے پناہیں

نہ جانے اقبال کی منزل کب آئے گی۔ وہ منزل کب آئے گی جب ساری کائنات تراشیدم اور پرستیدم کے چکر سے نکل کر شکستم کا نعرہ لگائے گی۔ بائے اقبال:

تراشیدم ۔ پرستیدم ۔ شکستم

(تراشا ۔ پرستش کی ۔ اور توڑ دیا)

اور یہ آپ کیا دیکھ رہے ہیں۔ کارخانے اور موٹریں۔ موٹریں اور کارخانے۔ یہ انڈیانا کا ایک شہر ہے۔ ساؤتھ بنڈ۔ اس دورے میں میں انڈیانا سے ساؤتھ ڈکوٹا جاتے وقت گزرا تھا اور وسطی ریاستیں دیکھتا ہوا واپس آیا۔ ساؤتھ بنڈ میں پتا نہیں چلتا کہ یہاں اتنی ساری موٹریں بنتی ہوں گی جیسے پاکستان کے کسی سیٹھ کے گھر میں رہا جائے تو خیال بھی نہ آئے کہ یہاں روز لاکھوں آدمی بھوکے سوتے ہوں گے مگر ایسے سیاسی خیالات کا پرچار کہتے ہیں، اس لیے اس پہلو سے قطع نظر فرمائیے اور پھر انڈیانا کی کاروں کی بات کیجیے گا۔ گائیڈ نے نہ جانے فی منٹ کتنی کاریں تیار ہونے کا قصہ بتایا تھا وہ میں بھول گیا مختصر یہ کہ یہ کاروں کا مقام ہے پورے امریکہ میں ہر سال کوئی ۷۵ لاکھ کاریں تیار ہوتی ہیں اور عام امریکی ہر دو تین برس بعد گاڑی بدل لیتا ہے لیکن ——

"جناب آپ ہمارے گھر کی آرائش، ہماری شی سی کار، ہمارے ریفریجریٹر، ہمارے ٹیلیویژن سیٹ پر نہ جائیے۔ ہمارے باورچی خانے میں بجلی سے کام کرنے والی مشینوں سے مرعوب نہ ہوئیے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ ہمارے دن سخت مشقت اور راتیں سخت اضطراب میں گزرتی ہیں۔"

میرے حلق میں اس باورچی خانے کی بجلی والی مشین سے بنی ہوئی لذیذ مرغی آدھی پھنس کر رہ جاتی ہے۔

www.taemeernews.com

میرے مہربان خلیق شفیق نوجوان میزبان کی بیوی میاں کو آنکھیں جھپکا جھپکا کر دیکھنے لگتی ہے۔

"بھائی صاحب قصہ یہ ہے کہ رہن سہن کا یہ طرز تو جزو زندگی ہو چکا ہے یعنی کار کام پر جانے کے لیے ضروری، گھر کی آرائش عزت آبرو کے لیے ضروری بجلی کا سامان اس لیے ضروری کہ یہاں ذاتی نوکر صرف کروڑپتی ہی رکھ سکتے ہیں ٹیلیویژن بھی ایک سوشل ضرورت ہے لیکن ذرا یہ بھی غور کیجیے کہ ایک نوجوان آدمی اگر وراثت کے بغیر اپنے آپ گھر بنائے وہ اتنا روپیہ کہاں سے لا سکتا ہے؟"

او ہو ہو۔ بیوی چراغ پا ہونے والی ہے۔ یہ میاں تو بالکل وقتی غیر ملکی مہمان کے آگے سارا بھانڈا پھوڑنے پر مصر ہے مگر وہ بیٹھا بھی چار مارٹینی پی کر بالکل نیچرل یعنی غم خور کیفیت میں بیٹھا ہے۔

"ہم لوگ یہ سب چیزیں قسطوں پر خریدتے ہیں۔ یہاں پورے ملک میں قسطوں کا ریکٹ بہت چلتا ہے آپ کی حیثیت یکمشت پانچ ہزار ڈالر کی نہ ہو لیکن آپ بیس ہزار ڈالر کا مال لے سکتے ہیں، بس قسطیں دیے جائیے، عمر بھر قسطیں مع دہمیت دیے جائیے اور بقول کسے زندگی کے مزے اڑائیے مگر بھائی صاحب یہ مزے ہم سے پوچھیے۔ میری تنخواہ ہزار ڈالر ماہانہ کے قریب ہے جو ایک نہایت معقول تنخواہ ہے ٹیکس دے کر میں آرام سے کھا پی سکتا ہوں اور کچھ بچا بھی سکتا ہوں مگر میرا کمرہ ٹھنڈا ہونا ضروری ہے میرے گھر میں جدید ترین صوفہ اور قالین ضروری ہے، باہر ایک میری کار ایک بیگم صاحب کی کار اور۔ اور۔۔۔۔۔۔"

وہ چپ ہو جاتا ہے بیگم صاحب غصے کے مارے آپے سے باہر ہو چکی ہیں۔ اب وہ پٹنے والا ہے۔ وہ بات کاٹتی ہیں۔

"اصل میں یہی امریکی طرز زندگی ہے۔ ہمارا معیار رہائش دنیا بھر میں سب سے اونچا ہے نا۔ یہ تو آج کل ذرا پریشان ہیں اس لیے ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ ہر اوسط امریکی گھر قسطوں پر چلتا ہے۔ مسٹر ٹورسٹ آپ ان کا مطلب غلط نہ سمجھیے گا۔ ہر اوسط امریکی گھر قسطوں ہی پر چلتا ہے؟"

"ہائے میری جان ہی تو عذاب ہے؟" وہ کلیجہ پھاڑ کر چیختا ہے "ہم سب قسطوں پر زندہ ہیں، قسطیں اور سود۔ کیونکہ ہمارا معیار رہائش دنیا بھر میں سب سے زیادہ اونچا ہے اور اسی لیے ہمارا اعصابی نظام دنیا میں سب سے زیادہ خراب ہے، ہم ہر وقت ایک اضطراری تشنج کی سی کیفیت میں مبتلا رہتے ہیں۔ ہمیں بیماری دکھ اور برے وقت کا سخت خوف رہتا ہے اور ہر وقت رہتا ہے۔ اف وہ! میری تم اس طرح دیکھنا بند کر دو۔ شٹ اپ۔ میری بیٹھک پر" میں جو ایک غریب پاکستانی ہوں اس راز کو کیا سمجھوں۔ میرے لیے تو یہ آدمی نہایت امیرانہ ٹھاٹ دار زندگی گزار رہا ہے۔ اس کا بنگلہ پختہ کا ہے اس کا چھوٹا سا باغ ہرا بھرا ہے جس میں ان کے بچے کھیل رہے ہیں، اس

www.taemeernews.com

کی کار خاصی نئی ہے اس کا گھر خاصا آراستہ و پیراستہ ہے اور اس کی بیوی نہایت عمدہ لباس پہنے ہوئے ہے ہیں
کیسے مان لوں کہ یہ "باہر" کی شو ہے، یہ قسطوں کا تماشا ہے اور ہے بھی تو کیا بُرا ہے۔

"شٹ اَپ میری۔ شٹ اَپ مسٹر ٹورسٹ، جاؤ اپنے کمرے میں آرام کرتے چلے جاؤ ورنہ میں خود گھر سے
نکل جاؤں گا۔"

"مگر مسٹر ٹورسٹ ایک اوسط امریکی گھر قسطوں ہی پر چلتا ہے۔"

شٹ اپ

قسطیں

سود

موٹر۔ ٹیلی ویژن۔ قالین

شٹ اپ

شٹ اپ

آج امریکہ میں چھ کروڑ سے زیادہ موٹریں چل رہی ہیں حالانکہ وہاں کی کل آبادی تقریباً اُنیس کروڑ ہے۔
امریکی اس حقیقت پر پھولے نہیں سماتے اور ہم ترقی پذیر اقوام والے ان اعداد و شمار کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پڑھتے
ہیں۔ اوسطاً ہر تین آدمیوں پر ایک موٹر کار کا اوسط بھی کیا امارت ہے کیا شان ہے اور پھر میرے کان بجتے ہیں

شٹ اپ میری

شٹ اپ مسٹر

قسطیں اور سود

سود اور قسطیں

چھ کروڑ موٹریں

چھ کروڑ اضطراب

شٹ اَپ

مگر یہ بڑی زندہ اور طاقتور قوم ہے قسطیں اور سود دیے جاتی ہے اور جیے جاتی ہے۔

خیر یہ ذکر تو وسط مغرب کا تھا جو نسبتہً کم ماڈرن علاقہ ہے اور مشرقی ساحلوں جیسا ترقی یافتہ اور امیر نہیں۔
یہاں سڑکیں بھی نسبتہً کھردری اور پتلی پتلی ہیں۔ سڑکیں دیکھنی ہوں تو مشرق میں سفر کیجیے۔ واشنگٹن سے نیویارک

www.taemeernews.com

جائیے یا نیو یارک سے بوسٹن۔ یہ سڑکیں سرکاری نہیں اور ان پر مفت گاڑی نہیں چلائی جاتی بلکہ ہر سو میل پر سڑک استعمال کرنے کا کرایہ لیا جاتا ہے۔ انھیں ٹرن پائیک (TURN PIKE) کہتے ہیں۔ چوڑی مضبوط شیشے کی طرح صاف اور چکنی آنے جانے کی سڑک الگ الگ یعنی ون وے کا نظام ہے۔ ایک ایک سڑک پر آٹھ آٹھ گاڑیاں ساتھ ساتھ دوڑ سکتی ہیں۔ کچھ رستے یعنی دور کی منزلوں والے مقام ایسے ہیں جہاں سست رفتاری پر پیچھے والے گالیاں دیتے ہیں۔ ہارن بجاتے ہیں اور طرح طرح کی دھمکیاں دیتے ہیں' ان سڑکوں پر سست رفتاری کا مطلب ساٹھ میل فی گھنٹے سے اسی میل فی گھنٹہ بھی ہوتا ہے اور چالیس میل تو یقیناً گھوڑے کی رفتار ہے۔

مگر صاحب سڑکوں کے انتظام کی بھی کیا بات ہے' حادثہ کرنے والے تو خیر کہیں نہیں چوکتے۔ لیکن بنانے والوں نے انسانی امکان کے اندر اندر" حادثہ" ہر قسم" سے بچنے کا انتظام کر رکھا ہے' اب اگر آپ یا آپ سے ٹکرانے والا پی پلا کر ادر طے کر کے ہی چلے ہیں کہ ٹکر ہو گی تو دوسری بات ہے۔

ہوائی جہازوں کی کمپنیاں بھی" ہر قسم" کی ہیں۔ کچھ تو بڑی بڑی ہیں جیسے ایسٹرن ایر لائنز' ولیسٹرن ایر لائنز وغیرہ وغیرہ۔ ان کے بہت سارے جہاز ہیں۔ ہوائی اڈوں پر اپنے اپنے رن وے بھی ہیں اور اپنے بڑے بڑے دفتر ہوٹل' ریستوران۔ لیکن بعض ہوائی کمپنیاں ایسی بھی ہیں جن کا ایک ہی جہاز ہے۔ مثلاً اسمتھ اینڈ کمپنی۔ اس میں اسمتھ صاحب تو نظر آتے ہیں لیکن اینڈ کمپنی کا پتا نہیں چلتا کیونکہ اسمتھ صاحب ٹکٹ بھی خود ہی بیچتے ہیں اور جہاز بھی خود چلاتے ہیں۔ ان کا جہاز چار نشستوں کا ہے اور چھوٹی چھوٹی اڑانیں کر لیتا ہے' اس کے آنے جانے کا وقت مقرر نہیں۔ جب" سواریاں" پوری ہو جائیں فوراً چل پڑتا ہے' نہ ہوں تو گھنٹوں نہیں چلے گا۔ آپ اسمتھ صاحب سے مارپیٹ پر آمادہ ہو جائیں اور وہ آمادہ نہ ہوں تو جہاز اڑے گا اور اگر وہ بھی ہوں تو جہاز کھڑا رہے گا اور مار پیٹ ہوتی رہے گی۔

یہ الگ بات ہے کہ سرکار انھیں ضابطے سے ایک کمپنی نہیں مانتی نہ انھیں رجسٹر کرتی ہے مگر یہ جہاز ان کا ذاتی ہے۔ یہ اُسے اپنے" احباب" کو گھمانے پھرانے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں اور ہم جیسے" احباب" کی امریکہ میں کوئی کمی نہیں ہے۔

میں نے سُنا ہے کہ امریکہ میں چھپن ہوائی کمپنیاں اور دو ہزار تجارتی طیارے ہیں۔ اور ۳۵ ہوائی کنٹرول کے مرکز ہیں' میں مسٹر اسمتھ سے عرض کرتا ہوں جو مجھے ڈیڑھ گھنٹے سے انتظار کرا رہے ہیں۔

آپ نے غلط سُنا ہے۔ امریکہ میں ستاون ہوائی کمپنیاں ہیں اور دو ہزار ایک سو طیارے ہیں۔ آپ میری کمپنی اور میرے طیارے کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔"

www.taemeernews.com

"مگر آپ اڑاتے کیوں نہیں۔"

"بس ذرا دو مسافر اور آجائیں۔ آپ اطمینان رکھیے۔"

"مگر آپ نے تو کہا تھا کہ ــــ"

"بھئی کہہ دیا ہوگا۔"

"کیا آپ میرے دام واپس نہیں کر سکتے۔"

"کیا میں نے آپ کو کوئی باقاعدہ ٹکٹ دیا ہے۔ ٹکٹ دینے کا میری کمپنی میں کوئی ضابطہ نہیں ہے، نہ پیسے واپس دینے کا۔"

میں آٹھ ڈالر بچانے کی خاطر اونگھنے لگتا ہوں۔ پھر سو جاتا ہوں اور پھر مشین کی گڑگڑاہٹ سے آنکھ کھل جاتی ہے۔ کمپنی واقعی کام کر رہی ہے۔

www.taemeernews.com

موزلم ایکس مگروائی

آپ نے سنگ موسیٰ کو ترشا ہوا پالش کیا ہوا دیکھا ہے؟ ضرور دیکھا ہوگا۔ پرانی بڑی بڑی مسجدوں میں اور معبدوں میں سنگ مرمر کے ساتھ سنگ موسیٰ کی پٹیاں ضرور لگائی جاتی ہیں۔

لیکن میں نے امریکہ میں سنگ موسیٰ کی بے جان لمبی لمبی پٹیوں کی بجائے دستِ خداوندی سے ترشے ہوئے جاندار بت دیکھے ہیں، جاندار بولتے ہوئے مرد اور عورت جن میں سے بعض مردانہ اور نسوانی حسن کے بھرپور پیکر ہیں۔ انھیں سفید امریکی نیگرو کہتے ہیں۔

"جی میرا نام فہیمہ جونس ایکس ہے۔ میں موزلم ہوں" ایک نرم و نازک ترشا ہوا مجسمہ بولتا ہے۔ یہ ایک نائٹ کلب ہے جہاں سفید اقوام کم اور دیگر اقوام زیادہ نظر آتی ہیں۔ واشنگٹن میں اس کے صدر مقام ہونے کے باوجود اب تک ایسے ریستوران اور نائٹ کلب موجود ہیں جہاں قانوناً تو نہیں لیکن عملاً سفید اقوام کا داخلہ ممنوع ہے، خواہ آپ کسی ملک کے سفیر کبیر ہوں خواہ بادشاہ سلامت، اگر آپ کا رنگ مالک مکان کو پسند نہیں تو آپ کے لیے وہ جگہ جہنم سے بدتر کر دی جائے گی۔ چنانچہ میں احتیاط سے کام لیتے ہوئے ایک محفوظ مقام تفریح پر جاتا ہوں جہاں میں ایک ممتاز شخصیت کا مالک سمجھا جا رہا ہوں۔ میں امریکی اصطلاح میں براؤن یعنی بھورے رنگ کی ... میں سے ہوں نا۔

"کیا میں آپ کے ساتھ اس ناچ کی عزت حاصل کر سکتا ہوں" میں رمبا سن کر تڑپ رہا ہوں۔

"شکریہ مگر مجھے افسوس ہے۔ ہم مسلمان عورتیں اپنے شوہروں کے علاوہ کسی اور کے ساتھ نہیں ناچ سکتیں۔"

"ہائیں۔ کیا آپ مسلمان ہیں؟"

"جی ہاں میں نے ابھی آپ کو بتایا تھا۔"

www.taemeernews.com

افوہ وہ جو انھوں نے موزلم کہا تھا تو وہ لفظ مسلم تھا' میں رمبا کی گت بھول گیا۔

"آپ کس ملک کی رہنے والی ہیں" میں سمجھا یہ کسی افریقی ریاست کی ہوں گی۔

"میں امریکی ہوں۔ ہم لوگ بوسٹن کے رہنے والے ہیں اور یہاں ایک کانفرنس میں آئے ہیں۔"

"آپ نے اپنا نام کیا بتایا تھا ___ معاف کیجیے میں بھی مسلمان ہوں' مجھے آپ سے دلچسپی ہوتی جاتی ہے۔"

"کوئی بات نہیں ___ میرا نام فیٹیمہ ہے' فیٹیمہ جولس ایکس"۔

"آہاہا ___ ان کا نام فاطمہ ہے۔ فاطمہ جولس ایکس۔ اور ظاہر ہے کہ یہ شادی شدہ ہیں۔ ان کے شوہر کا عیسائی نام جولس ہے اور ایکس ان کے نو مسلم ہونے کی ایک نشانی ہے۔ افریکو امریکی نیگرو مسلمان یا تو اپنے عیسائی نام کے ساتھ کوئی اسلامی نام لگا لیتے ہیں یا خالص اسلامی نام رکھ لیتے ہیں یا اپنی عیسائی کنیت کو ختم کرکے پہلا نام عیسائی اور اس کے ساتھ دوسرا نام ایکس (x) رکھ لیتے ہیں اس گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کے خاندانی عیسائی نام ان کے آباؤ اجداد کے رکھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان گورے آقاؤں نے اپنی مرضی سے رکھ دیے تھے جنھیں برقرار رکھنا اعتراف غلامی کی نشانی ہے۔

اب ایک تنومند' خوبصورت جسم' سیاہ رنگ جوان ایک اور سیاہ فام شخص کے ساتھ آیا۔ مجھے میز پر بیٹھے کر دونوں جھجکے مگر پھر پوچھے بغیر بیٹھ گئے۔ ایک دم اس نے سیدھا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

"میرا نام ہے احمد جولس ایکس اور یہ میرے دوست باب پال ہیں میں مسلمان ہوں اور یہ عیسائی ___ آپ کی تعریف ___؟"

"یہ بھی ایک مسلمان ہیں" محترمہ فیٹیمہ عرف فاطمہ نے خوشی خوشی بیچ میں لقمہ دیا اور پھر میں نے اپنا مختصر تعارف کرایا۔

"آپ لوگ کون سی وھسکی پئیں گے" میں نے دریا دلی شروع کی' ایک تو میں سخت بور ہو رہا تھا دوسرے مجھے ان لوگوں سے دلچسپی بڑھتی جاتی تھی۔

"ہم امریکی مسلمان شراب نہیں پیتے۔ آپ خوشی سے پیجیے۔ ہم کوکا کولا پئیں گے۔" اس نے گویا میرے منہ پر طمانچہ مارا' یعنی باقی دنیا کے مسلمان پر شراب جائز ہے۔

"نہیں میں نے ایسے ہی پوچھا تھا" میں گھبرا گیا' مجھے سخت شرم آرہی تھی' لاحول ولا تو میں نے کیا حماقت کر ڈالی۔" میں تو خود کوئی ٹھنڈا مشروب پینا چاہتا ہوں۔"

"میں مارٹینی پیوں گا" عیسائی سیاہ فام بولے "تم مسلمان لوگوں میں زندگی سے مزا لینے کا کوئی مذاق باقی نہیں رہا ہے۔"

www.taemeernews.com

اگلے دو دن میں نے احمد جولنس ایکس اور فاطمہ کے ساتھ گزارے۔ احمد جولنس ایکس ایک پڑھا لکھا صاف ستھرا آدمی تھا، وہ موٹروں کے ایک کارخانے میں چھوٹے رتبے کا انجینئر تھا۔ فاطمہ نرس تھی ان کی شادی کو ایک برس گزرا تھا اور ابھی وہ بے اولاد تھے۔ احمد جولنس نے دنیا کا کوئی اور ملک نہیں دیکھا تھا۔ اس کے عقائد بھی ہمارے عقائد سے بڑی حد تک مختلف تھے مگر اسے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت کا بہت شوق تھا۔

"ہماری خواہش ہے کہ ہم ایک بار مکہ اور مدینہ دیکھ لیں صرف ایک بار۔"

"یعنی آپ لوگ حج کرنا چاہتے ہیں!"

"حج کیا ہوتا ہے۔ وہ جو سب مسلمان جمع ہوتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی ہرج نہیں۔ مگر اصل میں ہم مکہ اور مدینہ دیکھنا چاہتے ہیں۔"

امریکہ میں تقریباً سوا دو کروڑ سیاہ فام یعنی نیگرو آباد ہیں جن میں سے چند ہزار کو چھوڑ کر باقی سب سخت اقتصادی، حالی اور رنگ و نسل کے تعصب کا شکار ہیں۔ فدائے جمہوریت محافظ آزادی امریکہ کا پول اس وقت کھلتا ہے جب آپ نیگرو امریکیوں کے مسائل سمجھنے کی کوشش کریں ایک اندازے کے مطابق نیگرو امریکیوں میں اسلام کا نفوذ بھی اسی نسلی تعصب کا ردِ عمل ہے حالانکہ مسلمان نیگرو اس نقطۂ نظر کے خلاف ہیں۔

"ہمارا مسئلہ رنگ و نسل کا بھی ہے لیکن ہم صرف اس لیے مسلمان نہیں ہوئے کہ نیگرو قوم کی جنگ آزادی کو ایک نیا رُخ دیں۔ ہم اسلام کے فضائل جان کر مسلمان ہوئے ہیں۔" احمد جولنس بتاتا ہے "مثلاً اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے مختلف تحریکیں عیسائی نیگرو بھی چلا رہے ہیں اور ہم بھی اور ہماری تعداد ابھی لاکھوں تک بھی نہیں پہنچی جبکہ وہ دو کروڑ ہیں لیکن ان میں اور ہماری تحریکوں میں بنیادی اتفاق ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا فرق یہ ہے کہ وہ تحریکیں نیگرو کی روزمرہ زندگی سے تعلق نہیں رکھتیں جبکہ ہماری تحریک ایک اخلاقی اور تہذیبی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔"

مثلاً

"مثلاً ہم نیگرو مسلمان شراب نہیں پیتے' سور نہیں کھاتے' زنا کو نہ صرف اخلاقاً حرام سمجھتے ہیں' بلکہ عملاً بھی اس سے دور رہتے ہیں۔ ہم جھوٹ نہیں بولتے' ہمارے طبقے میں جرائم پیشہ ایک فی ہزار بھی نہیں ملیں گے جب کہ آپ کو نیگرو مسلمانوں میں ایسے ملیں گے جو پہلے جرائم پیشہ تھے اور جب سے مسلمان ہوئے ہیں انھیں امریکی سفید پوش بھی بہترین شہریوں میں شمار کرتی ہے۔ ہم باقاعدہ نماز پڑھتے ہیں' زکوٰۃ دیتے ہیں۔ ہماری عورتیں بیجا زیبائش و آرائش نہیں کرتیں' لباس میں شرم و حیا کا خیال رکھتی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے کام آتے ہیں' غریبوں' اپاہجوں' بیواؤں کی خدمت کرتے ہیں۔ یہ سب باتیں آپ کو عیسائی نیگرو حضرات میں ایک ضابطے کے طور پر نہیں ملیں

www.taemeernews.com

گی ان میں انفرادی طور پر اچھے اور بُرے لوگ موجود ہیں۔"

یا اللہ یہ میں امریکہ میں ہوں یا کسی خیالی مقام پر جہاں ایک مثالی سوسائٹی تعمیر ہو رہی ہے۔

"آپ کے عقائد کیا ہیں۔" آخر کو میں ہوں نا اس برصغیر کا مسلمان جو بہتر فرقوں کی بھول بھلیوں میں گھومنے کا عادی ہے۔

"عقائد۔ وہی جو آپ کے ہوں گے ہم مسلمان ہیں۔"

"کیسے مسلمان۔ ذرا تفصیل سے بتائیے۔ سنّی، شیعہ، وہابی، حنفی، شافعی، حنبلی اور......."

"اوہ مسٹر اتنی باتیں ہم نہیں سمجھتے۔ ہم نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں۔ ابھی مجھے مسلمان ہوئے بھی چند برس گزرے ہیں اور میں ملازمت بھی کرتا ہوں۔ میں اتنی باتیں کیسے جان سکتا ہوں۔" وہ گھبرا گئے۔

"بھئی آپ کے ایمان کے اجزا کیا ہیں۔" میں اس سوال کی تفصیل بتاتا ہوں۔ وہ سوچنے لگتے ہیں۔

"دیکھئے ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ اللہ ایک ہے اس کی کتاب قرآن ہے جو عربی میں ہے اور جس میں ہم نماز پڑھتے ہیں اور اللہ کے ایک عظیم رسول تھے محمد بن عبداللہ جن کے ذریعے قرآن دنیا تک پہنچا اور پھر الیف۔ ڈبلیو۔ ڈی۔ فارڈ کو خدا نے اپنا مظہر بنا کر امریکہ بھیجا اور جب وہ غائب ہو گئے تو خدا نے ایک پیغمبر اور بھیجا جس کا نام علی جاہ محمد ہے جو آجکل ہمارا رہنما ہے۔"

"اور خلافت اور امامت کے بارے میں آپ کے کیا عقائد ہیں۔"

"ہم یہ کچھ نہیں جانتے' ہمارے بزرگ کبھی کبھی ان مسائل پر بات چیت کرتے ہیں مگر ہمارے لیے نماز پڑھنا اور نیک کام کرنا اور اپنی آمدنی کا ایک حصہ اپنے مسلمان بھائیوں کی بہبود پر خرچ کرنا ہی کافی سمجھا جاتا ہے۔ کیوں مسٹر کیا اچھی زندگی گزارنے کے لیے بہت کچھ جاننا ضروری ہے یا حسبِ استطاعت نیک کام کرنا۔"

مسٹر اس بات کا جواب نہ دے سکے۔ آپ کا جی چاہے تو جواب سوچتے رہئیے۔

"مگر دیکھیے بھائی صاحب' مسلمان ہم بھی ہیں' ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ محمد رسول اللہ خدا کے آخری نبی ہیں۔ آپ لوگوں نے الیف۔ ڈبلیو۔ ڈی فارڈ کو مظہر خدا کیسے مان لیا اور عالی جاہ محمد صاحب (وہ علی جاہ محمد کہتے ہیں) نے پیغمبری کا دعویٰ کیسے کر دیا۔ ان کے پیغمبر ہونے کی کیا نشانی ہے۔"

"اوہ یہ سب تفصیل کی باتیں ہیں' آپ بوسٹن چل کر پیغمبر صاحب سے ملیے وہ بتا دیں گے ہم تو یہ جانتے ہیں کہ ان کے قول اور کردار میں وہ تاثیر ہے کہ ہمارا مذہب اس ظالم سرزمین میں لاکھوں پابندیوں کے باوجود روز بروز پھیلتا جاتا ہے۔"

www.taemeernews.com

"اچھا ایف۔ ڈبلیو۔ ڈی فارڈ صاحب کے متعلق تو کچھ بتائیے۔"

"وہ ایک نیک حبشی تھے اور نوبل ڈریو علی کے جانشین تھے۔ نوبل ڈریو علی شمالی کیرولائنا کے رہنے والے تھے۔ اور اس صدی کے شروع میں انھوں نے اسلام کا پرچار شروع کیا تھا۔ انھوں نے مقدس قرآن کے نام سے ایک پمفلٹ بھی لکھا تھا جس میں قرآن اور انجیل کے حوالوں سے بتایا تھا کہ عیسائیت صرف سفید قوموں کے لیے ہے اور اسلام صرف غیر سفید قوموں کے لیے۔ میں اسے نہیں مانتا۔ بہرحال یہ ایک عقیدہ ہے۔ ان نوبل ڈریو علی کے ایک جانشین۔ ایف ڈبلیو۔ ڈی فارڈ تھے جو کہتے تھے کہ وہ مکے سے آئے ہیں اور پہلی بار انھوں نے کھل کر تبلیغ کی اور ہزاروں حبشیوں کو مسلمان کر لیا۔ لیکن وہ شاید ۳۴۔ ۱۹۳۳ء میں غائب ہو گئے۔ کوئی کہتا ہے کہ انھیں سفید فام دہشت پسند جماعت کو کلکس کلان نے قتل کروا دیا۔ کوئی کہتا ہے کہ انھیں آسمان پر اٹھا لیا گیا۔ بہرحال ان کا پتا نہ چل سکا۔ پھر علی جاہا محمد نے ہماری قیادت سنبھال لی اور آج تک قیادت کر رہے ہیں۔ انھوں نے لاکھوں حبشیوں کو مسلمان کر لیا ہے اور ایک مضبوط اور پاک تنظیم کی بنیاد ڈال دی ہے۔ وہ ایک عمدہ اور باعمل مسلمان ہیں ان کے بچے جامع الازہر میں تعلیم پا رہے ہیں اور واپس آ کر ہمیں اسلامی دنیا سے اور زیادہ قریب کر دیں گے۔ یہ جو آپ حج کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے عالی جاہا محمد حج بھی کر آئے ہیں اور انھوں نے ہی عربی زبان میں نماز پڑھنے پر زور دیا ہے اور ہم نماز بھی کعبے کی طرف منہ کر کے پڑھتے ہیں۔ اب بھائی صاحب آپ یہ بتائیے کہ آپ لوگ ہماری برادری سے رابطہ قائم کیوں نہیں کرتے۔"

عالی صاحب کو برادری ہی کا پتا نہیں تھا تو رابطہ کیا قائم کرتے۔ بھائی صاحب جانی پہچانی مسلمان برادریوں سے کب رابطہ رکھتے ہیں بھئی واہ بھائی صاحب نے خوب سوال کیا۔

"اللہ آپ کے ایمان کو درست اور قائم رکھے۔" میں نے ایک مبہم مگر مخلصانہ جواب دیا۔ مجھے ان کے نئے پیغمبروں سے ڈر لگ رہا تھا مگر تاریخ بتاتی ہے کہ جب کوئی پسماندہ جماعت کوئی تحریک چلاتی ہے تو اُسے اپنے حاضر قائد کے بارے میں کوئی نہ کوئی مافوق الفطرت عقیدہ درکار ہوتا ہے۔ ورنہ پھر وہ انفرادی اقتدار پرستی اور سیاست کا شکار ہو جاتی ہے۔ بہرحال جب تک عالی جاہ محمد سے ملاقات نہ ہو صرف بھولے بھالے احمد جولنس ایکس کے خیالات سُن کر ان کے مذہب کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا درست نہیں۔ اس وقت تو صرف یہ جاننا کافی ہے کہ امریکہ میں حبشیوں کا ایک خاص طبقہ ہے جو خود کو مسلمان کہتا ہے اور چند اہم شعائرِ اسلامی پر پابندی سے عمل کرتا ہے۔

ذرا دیکھیں یہ عیسائی حبشی اس تحریک کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

www.taemeernews.com

"ارے جناب یہ خالص سیاسی اور تشدد پسند تحریک ہے" عیسائی لیڈر مسٹر پال فرماتے ہیں۔ "بات یہ ہے کہ سفید امریکیوں نے دو سو برس سے ہمیں سخت غیر انسانی حالات میں مبتلا کر رکھا ہے، اس سے گھبرا کر ہماری برادری میں طرح طرح کے ردعمل پیدا ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اب ایک نئے مذہب معاف کیجئے گا اس مذہب اسلام کا قصہ کھڑا ہوگیا ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ اسلام صرف کالے آدمیوں کا مذہب ہو سکتا ہے اور عیسائیت صرف سفید فاموں کا۔ کیا یہ ایک حیرت انگیز بات نہیں۔"

"ضرور۔ یہ عقیدہ تو ہمارے عقیدے کے بھی خلاف ہے مگر اس کی بنیاد کیا ہے۔"

"اس کی تہ میں سفید قوم سے شدید نفرت موجود ہے۔ انتہائی شدید نفرت جس کی یہ قوم سزاوار بھی ہے لیکن ہم پر اس کا ردعمل دوسرا ہوتا ہے، ہم صرف ضروری آزادیاں چاہتے ہیں، ہم اچھے اور وفادار امریکی ہیں۔ امریکہ کو اپنا ملک سمجھتے ہیں، عیسائیت کو اپنا مذہب سمجھتے ہیں۔ صرف اپنے لیے آزاد شہریوں کے سماجی حقوق چاہتے ہیں۔"

"کیا کوئی ایسا دن آسکتا ہے جب سفید امریکی آپ کو برابر کا درجہ دے دیں۔"

"شاید۔ ہمارے بہت سے رہنما سمجھتے ہیں کہ وہ دن آسکتا ہے گو وہ دن ابھی بہت دور ہے لیکن آ سکتا ہے، عالی جاہ محمد یہ نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں سیاہ فام امریکیوں کو امریکہ ہی میں ایک ریاست الگ بنانی پڑے گی جہاں وہ باعزت زندگی گزار سکیں۔ یہ ایک دوسری ناممکن بات ہے۔ ذرا سوچیے تو سہی کہ سوا دو کروڑ آدمی کیسے انتقال آبادی کر سکتے ہیں۔ وہ ریاست کہاں بنے گی کیسے بنے گی۔ لوگ اپنے کاروبار، جائدادیں اور آباد اجداد کی قبریں نشانیاں چھوڑ کر ایک الگ ریاست میں کیسے جا سکتے ہیں — اور پھر یہ کہ طاقتور سفید امریکہ اس مضبوط ملک میں ایک الگ ریاست کیسے بننے دیں گے!"

یہاں موصوف نے ایک تاریخی امکان کو جھٹلایا۔ مجھے ان کے عقائد سے تعلق نہیں مگر میں نے انھیں بتا دیا کہ اگر لوگ چاہیں تو الگ ریاست ضرور بن سکتی ہے بنتی رہی ہے۔ تاریخ خود براعظموں اور ملکوں کے نقشے مرتب کر کے رکھ دیتی ہے اور اس طرح کہ دیکھنے والے حیران ہوکر رہ جاتے ہیں۔

"مگر ہمیں الگ ریاست نہیں چاہیے۔ ہمیں اپنی امریکی ریاستوں میں اپنے سماجی حقوق درکار ہیں۔ ہم مساوات چاہتے ہیں۔"

میں ہنسا "مائی ڈیر برادر۔ رنگ و نسل کا تعصب قانون یا دستور بدل جانے سے کیسے مٹ سکتا ہے۔ قانون تو ایک تحریری چیز ہے کاغذ پر چند لکیریں۔ ہماری مملکت خداداد ہی کو دیکھ لیجیے۔ جہاں صوبائی تعصب کا دیو ہم سب کی گردنیں ناپے بیٹھا ہے، جبکہ ہمارے رنگ بھی ایک ہیں، مذہب بھی ایک اور قومی روایات بھی ایک۔"

www.taemeernews.com

"بہرحال ہمارا رویہ یہ ہے۔ قانون نے چند برس سے سب کو مساوی حق دے رکھا ہے مگر جنوبی ریاستیں بطورِ خاص اور شمالی امریکی عوام و خواص ابھی ہمیں منہ نہیں لگاتے۔ انھیں ہمارے رنگ سے بیر ہے، ہماری نسل سے بیر ہے، غضب خدا کا آپ دیکھیے کہ یہ سفید فام جمہوریت جمہوریت کے نعرے لگاتے نہیں تھکتے، مگر آج تک کوئی نیگرو گورنر نہیں ہو سکا۔ کوئی نیگرو سپریم کورٹ کا جج مقرر نہیں کیا گیا۔ کوئی نیگرو کیبنٹ میں نہیں لیا گیا، کوئی نیگرو صدر تو کیا نائب صدر کے لیے نامزد نہیں کیا گیا، کوئی نیگرو جنرل یا ایڈمرل نہیں بنایا گیا حالانکہ ہم لاکھوں کی تعداد میں بھرتی ہو کر قومی اور بین الاقوامی جنگوں میں اپنی جانیں گنوا بیٹھے ہیں۔ ہمارے لاکھوں نوجوان اور بزرگ اعلیٰ تعلیم یافتہ رہ چکے ہیں اور ہماری قومی خدمات کا ریکارڈ سفید فاموں سے کسی طرح کم نہیں —"

"پھر عالی جاہ محمد کیا غلط کہتے ہیں۔"

"نہیں وہ انتہا پسند ہیں، ان کا ہمارا ساتھ نہیں۔ آپ ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ سے ملیے وہ آپ کو مطمئن کر سکیں گے۔"

"میں ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ سے کیا ملوں وہ بڑے آدمی ہیں اور ایک مقدس جنگ میں مصروف ہیں۔ میں تو سفید فام امریکیوں سے مل کر اس مسئلے پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ جب یہ لوگ غیر ملکیوں سے اس معاملے پر بات کرتے ہیں تو بڑے معروضی اور شرمیلے انداز میں۔"

"نہیں مسٹر عالی یہ مسئلہ خالص رنگ و نسل کا مسئلہ نہیں، بلکہ اقتصادی اور تاریخی ہے، دو سو برس پہلے یہاں جنوبی ریاستوں میں کھیتی باڑی کے لیے افریقہ سے غلام لائے جاتے تھے کیونکہ وہ سستے پڑتے تھے۔ پھر مزید غلاموں کی درآمد بند ہو گئی اور شمالی امریکیوں نے غلامی کے خلاف اتنی آواز بلند کی کہ پورے ملک کو خانہ جنگی میں مبتلا ہونا پڑا۔ ۱۸۶۳ء میں صدر ابراہام لنکن نے ایک منشورِ آزادی جاری کیا جس کی رو سے تمام نیگرو غلام بزورِ قانون آزاد کر دیے گئے۔ لیکن ان کی اقتصادی حالت نہایت تباہ تھی اور تباہ رہی جنوبی ریاستوں کے عام امریکن آج تک اپنی شکست نہیں بھولے ہیں اور نیگرو قوم سے نفرت رکھتے ہیں اور اسے خانہ جنگی کا سبب قرار دیتے ہیں اور خانہ جنگی میں شکست سے جو ان پر مصائب آئے ان کا بھی اسی لیے وہ اپنی ریاستوں میں انھیں مساوی سماجی حقوق دینے پر دل سے آمادہ نہیں ہوتے۔ اب دیکھیے ہماری سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا ہے کہ مدرسوں میں نسلی تفریق ناجائز ہے، مگر ریاستیں اس پر خفا ہیں، کھلے طور پر قانون شکنی نہیں کر سکتیں، مگر وہاں کی آبادی دل سے اس فیصلے کے ساتھ نہیں ہے، بہ حال صورتِ حال پہلے سے بہتر ہے۔ اصلاحی انجمنیں کام کر رہی ہیں، وقت بدل رہا ہے۔ آہستہ آہستہ ...."

"آہستہ آہستہ کیا ہو جائے گا" میں پوچھتا ہوں" مولانا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتایئے کہ کیا آہستہ آہستہ اگر

www.taemeernews.com

سے رنگ ونسل کا امتیاز مٹ جائے گا" یعنی آپ کی آبادی کی کثیر مقدار حبشیوں میں شادیاں کرنے لگے گی ــــ"

شریف' اصلاح پسند' سفید امریکی گھبرا جاتا ہے "کاش ایسا ہو جائے یعنی یہ میری آرزو ہے مگر آپ سچ پوچھیں تو میں کہوں گا کہ مجھے وہ دن سامنے نظر نہیں آتا۔"

"پھر۔ اس مسئلے کا کیا حل ہے جناب ۔"

"بس یہ کہ اقتصادی طور پر نیگرو حضرات بہتر سے بہتر ہو جائیں تعلیم حاصل کریں' اوہام اور جرائم سے نجات حاصل کرلیں۔ عام امریکی معیار پر آجائیں پھر ـــ"

"پھر کیا کالے گورے کا فرق مٹ جائے گا۔ رنگ تو ویسے ہی رہیں گے جناب۔"

وہ بھی بدمزاج ہو گئے۔

"جناب آپ یہاں ایک سفید لڑکی کو کسی خاص سفید لڑکے سے شادی پر مجبور نہیں کر سکتے تو کالے لڑکے سے شادی پر مجبور کیسے کر سکتے ہیں۔ آپ ہمارا سسٹم نہیں سمجھتے۔ ہماری چند بنیادی آزادیاں ہیں وہ ہم کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتے۔"

میں ان کے نقطۂ نظر کو سمجھ لیتا ہوں۔ وہ ایک نیک نیت امریکی ہیں اور بات سچ کہہ رہے ہیں۔ ایک سفید امریکی باپ اپنی لڑکی یا لڑکے کو کسی خاص لڑکے یا لڑکی سے شادی پر مجبور نہیں کر سکتا تو بات آگے کیسے چل سکتی ہے' رنگ کا فرق کیسے مٹ سکتا ہے۔

شاید رنگ کی طرف امریکی رویئے میں تبدیلی آسکتی ہے۔

شاید۔

شاید۔

اور اس وقت تک نہ جانے کتنے سیاہ فام صرف سیاہ فام ہونے کی بنا پر انسانی حقوق سے محروم رہیں گے۔ ان حقوق سے جو انھیں ان کے پیدا کرنے والے نے تو عطا کیے ہیں مگر جن سے انھیں ان پر حاکم اکثریت نے صرف طاقت کی بنا پر محروم کر رکھا ہے۔

میں اس مسئلے کی طرف سے آنکھیں بند کرلیتا ہوں۔ میرے پاس اس مسئلے کا کوئی حل نہیں اور ابھی مجھے سفید امریکہ کی کافی سیر کرنی ہے۔

www.taemeernews.com

وہ کالی وہ گورا

وہ ایک کالی لڑکی ہے۔

میں ایک گورا لڑکا ہوں۔

میں اس کا وہ میری ہے۔

لیکن ——

ہم امریکن ہیں۔

یہ آج کے جمہوری آزاد اور ترقی یافتہ امریکہ کی سچی کہانی ہے۔ وہ امریکہ جو عالمی آزادی کے نام پر دنیا کے دور دراز ترین علاقوں میں اپنی فوجیں بھیج دیتا ہے۔ وہ امریکہ جس نے آدھی سے زیادہ دنیا کو فوجی، اقتصادی اور ٹیکنیکل امداد اور بے شمار قرضے دئیے ہیں۔

خود اپنا گریباں بھول گیا ہے

مسٹر ڈیوڈ ایک نوجوان امریکن ہیں اور جنوبی ریاست جارجیا کے رہنے والے ہیں۔ جہاں رنگ و نسل کی تفریق ایک اٹل سماجی حیثیت رکھتی ہے۔ انھیں ایک کلو بیگم سے عشق ہے اور کلو بیگم کو ان سے عشق ہے، امریکن اصول کے مطابق جب دو دل راضی تو کیا کرے گا قاضی۔

لیکن —— ہم امریکن ہیں۔

"کیوں ڈیوڈ صاحب یہ کیا بات ہے یعنی اس کا مطلب کیا ہے۔"

جناب ہر آدمی تو ڈیوک آف ونڈسر نہیں ہوتا جنھوں نے مسز سمپسن سے شادی کی خاطر تخت و تاج پر لات ماردی، میرے والدین سخت قدامت پسند ہیں اور صاحب جائداد ہیں، میں ان کی اکیلی اولاد بھی ہوں، ایک بہن تھی وہ بچپن میں مرگئی اور اب میں ہی تمام جائداد کا وارث رہ گیا ہوں، لیکن وہ کہتے ہیں کہ اگر تم نے اس کالی

www.taemeernews.com

لڑکی سے شادی کی تو ہم تمھیں ہر چیز سے محروم کر دیں گے۔ آپ کو معلوم ہے نا کہ ہمارے ہاں وصیت کے ذریعے اولاد کو محروم الارث کیا جا سکتا ہے۔ وصیت کرنے والا جائداد جس کے نام کر دے اسی کو جاتی ہے' اولاد محروم رہ جاتی ہے۔"

"جی ہاں مجھے معلوم ہے مگر ہمارے اسلامی قانون میں وصیت پر ایک تہائی سے زیادہ عمل نہیں ہو سکتا اور ساری جائداد شرعی وارثوں کو جاتی ہے۔" میں نے تبلیغ شروع کی۔

"اوہ — واقعی — کاش۔ میرے والدین مسلمان ہو جاتے کیونکہ میرے مسلمان ہونے سے تو کوئی فرق پڑے گا نہیں۔" وہ ایک دم بولے اور پھر شرما گئے۔

"نہیں آپ کو اور بہت سی نعمتیں ملیں گی بہت سے فوائد روحانی اور مادی بھی اور —" میں نے سوچا کہ بات بڑھا کر دیکھو مگر بڑھی نہیں۔

"ہاں خیر آپ کے مذہب کی خوبیوں میں کیا کلام ہے' مگر میں اس لڑکی کی بات کر رہا تھا۔ اب بتائیے کیا کروں کیا ساری جائداد چھوڑ دوں۔ وہ بھی چھوڑ سکتا ہوں مگر ..."

مگر کیا۔ اگر آپ جائداد چھوڑ دینے کا خطرہ مول لے سکتے ہیں تو پھر کیا رکاوٹ ہے۔"

"ارے صاحب سماج تسلیم نہیں کرے گا۔ ہماری زندگی عذاب ہو جائے گی۔"

"وہ کیسے"

"بس وہ آپ نہیں سمجھیں گے' جب تک آپ میرے صوبے جارجیا میں خود کافی دن رہ کر سب کچھ اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لیں یہ بات نہیں سمجھ سکتے۔"

"تو آپ جنوب چھوڑ کر شمال چلے آئیے' سنا ہے یہاں تو کوئی ترجیحی توانین نہیں ہیں۔"

"جی ہاں لکھے ہوئے توانین تو نہیں ہیں لیکن بن لکھے قانون ایسے شدید ہیں کہ زندگی عذاب ہو جائے۔ اوہ مائی ڈیر فرینڈ تم ایک مشرقی بقراط ہوتے ہوئے بھی میرا مسئلہ نہیں سمجھ سکتے۔ میں نقل مکانی کیوں کروں بجائے شمال کے کس شہر میں کیا نوکری ملے۔ میں کوئی ٹیکنیکل آدمی بھی نہیں ہوں بس معمولی پڑھا لکھا ہوں اور زمینداری کا کام خوب جانتا ہوں' اپنے گھر کی زمینداری تو دیکھتا ہوں اور بڑی اچھی آمدنی ہے خیر آمدنی کم ہو جانے کی پروا نہیں مگر میں زمینداری ہی کا کام کر سکتا ہوں اور شمال کے بڑے شہروں' نیویارک' بوسٹن میں میری کھپت نہیں ہوگی جہاں میں کالی آبادی میں گھل مل کر رہ سکتا' نتیجہ یہ کہ زرعی علاقوں میں جانا پڑے گا اور وہاں وہی جنوب والے حالات ہیں' اوہ مسٹر تم سمجھتے نہیں کہ میں کس عذاب میں گرفتار ہوں —"

www.taemeernews.com

مسٹر کیا سمجھیں یہ لونڈا تو پھر بھی گورا ہے، صرف کالی لڑکی کے چکر میں مبتلا ہو کر پریشان ہے، کوئی گوری لڑکی پسند آجائے گی تو اس کا سارا مسئلہ حل ہو جائے گا مگر

جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

اس کالی لڑکی کے دل کا اندازہ لگائیے جو اپنے محبوب سے بھی محروم ہے اور نسلی منافرت کا شکار بھی ہے جس کے ماں باپ اور دادا دادی اور پردادا اور پردادی اور اکڑ دادا اور اکڑ دادی صدیوں سے اپنے رنگ کی آگ میں جلتے رہے ہیں اور جس کی آئندہ نسلیں نہ جانے کب تک اسی رنگ کی آنچ پر تپتی رہیں گی۔

لیکن

ہم امریکن ہیں۔

اس دن میں نے خیال میں اس لڑکی سے باتیں کیں، اور اگلے سال میں نے جارجیا کے صدر مقام اٹلانٹا میں اس سے ملاقات بھی کی۔ مسٹر ڈیوڈ مقامی تعصبات کے آگے ہتھیار ڈال چکے تھے، انھوں نے مجھے شروع میں اس کا نام پتا لکھوا دیا تھا جو میرے کام آیا۔ میں مسٹر ڈیوڈ سے بھی ملا، وہ کنوارے تھے اور اپنے بقول آدھی جنگ جیت کر آدھی جنگ ہار گئے تھے یعنی اس لڑکی کو ترک کر دیا تھا اور کنوارے رہنے کا تہیہ کئے ہوئے تھے۔

(اس سال مسٹر ڈیوڈ کا خط آیا کہ وہ باقی جنگ بھی ہار گئے اور انھوں نے ایک سفید لڑکی سے شادی کر ہی لی۔ ان کی سفید بیگم خاصی خوبصورت ہیں مگر کلو بیگم سے زیادہ طرحدار نہیں۔)

کلو بیگم ایک شائستہ اور معقول خاتون تھیں جنوب کے نیگرو خاندانوں میں ایک اچھے اور تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ایک "کالے" اسکول کی معلمہ تھیں اور ایک چھوٹی سی کار کی مالک۔

"ہاں ڈیوڈ بھاگ گیا مگر اس کا کوئی قصور نہیں۔ میں نے اُسے معاف کر دیا ہے۔ مگر میں امریکہ کو کبھی معاف نہیں کروں گی"، انھوں نے بڑے صبر سے بتایا۔ مجھے اپنا ایک دوہا یاد آیا، شاید بے موقع تھا مگر یاد آ ہی گیا۔

کتنی ہیریں کتنے رانجھے اک دوجے سے دُور
کیوں کوئی پوچھے کیوں کوئی جانے کون ہے کیوں مجبور

یہ ایک انسانی کہانی ہے اس کو لاکھوں سے ضرب دیجئے۔ عشق و شق کی بات تو معمولی ہے آپ ذرا یہ منظر دیکھیے۔

کالا بچہ سفید بچے کے ساتھ کلاس میں نہیں بیٹھتا۔

کالا آدمی سفید آدمی کے ساتھ بس میں سوار نہیں ہوتا۔

کالا آدمی سفید آدمی والے ڈبے میں ریل کا سفر نہیں کرسکتا۔

www.taemeernews.com

کالا آدمی سفید ریسٹوران میں کھانا نہیں کھا سکتا۔
کالا آدمی سفید اسپتال میں علاج نہیں کرا سکتا
کالا آدمی سفید صنعتوں' اداروں' دفتروں میں نوکری نہیں کر سکتا
کالا آدمی
سفید آدمی
کالا آدمی
سفید آدمی
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
قانون کہتا ہے سب شہری برابر ہیں
شہری کہتے ہیں قانون کا کہنا سر آنکھوں پر لیکن پرنالہ یہیں گرے گا۔
"ہم آزاد غلام ہیں" کلّو بیگم دانت کچکچا کچکچا کر کہتی ہیں۔
لیکن ـــ
سفید ڈیوڈ کہتا ہے
"امریکہ دنیا بھر میں مساوات اور خوشحالی کے لیے کمربستہ ہے۔" امریکی لیڈر گلے پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے ہیں۔
"ہم آزاد غلام ہیں۔" کلّو بیگم چلا رہی ہیں۔
مگر مجھے سب سے زیادہ ایک ان جانے امریکن شاعر کا وہ مصرع پسند ہے جو ڈیوڈ نے سنایا ہے۔ وہی
لیکن ـــ

ہم امریکن ہیں۔

"ہم امریکن ہیں" میں پورا مسئلہ سمویا ہوا ہے' امریکہ کو اچھا کہیئے' برا کہیئے' کالوں کی تقریریں' سفید نرمل کی معذرتیں' اور تجزیے اور وعدے سنتے رہیئے' وہ سب الگ قصے ہیں' وہ یا تو گزری ہوئی کل کی باتیں ہیں' یا آنے والی کل کی۔ آج کی بات یہ ہے کہ نیگرو شہری تمام قانونی حقوق رکھتے ہوئے بھی آزاد غلام سمجھے جاتے ہیں۔ جنوب میں شدت اور ظلم کے ساتھ اور شمال میں ایک اندرونی تحقیر اور لاپرواہی کے ساتھ۔ مرکزی حکومت بین الاقوامی دباؤ کے تحت چند قانون بنانے پر مجبور ہوئی ہے' اور عدالت عالیہ نے بھی نسلی تعصب کے خلاف فیصلے دے دیئے ہیں مگر

www.taemeernews.com

اب بھی ہم امریکن ہیں۔

اب آپ بتائیے کیا آپ ہالی ووڈ کے رنگ و آہنگ اور براڈوے کی روشنیوں سے اسی طرح متاثر رہ سکتے ہیں۔ اگر آپ نیگرو ہوتے تو آپ پر کیا گزرتی .... میری زبان پر تو بیساختہ ایک مصرع آتا ہے:

سفید جنت سیاہ دوزخ

نہ جانے دوسرا مصرع کب لگے گا ــــ

www.taemeernews.com

پورٹوریکو کے قزّاق

نیویارک میں انڈرگراؤنڈ یعنی زیرزمین گاڑیوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں جو اور کہیں نظر نہیں آئیں۔ ایک ہوتی ہے لبنجر جو ہر اسٹیشن پر ٹھیرتی ہے اور ایک میل ہوتی ہے جو تقریباً تیس اسٹیشن کے بعد ٹھیرتی ہے تیس سٹیشن یعنی تیس گلیوں یا سڑکوں کے موڑ۔

اس رات میں بیالیس نمبر گلی سے میل میں بیٹھا۔ مجھے میل کے اسٹیشن زبانی یاد ہیں میں انٹرنیشنل ہاؤس میں رہتا ہوں جو گلی نمبر ۱۲۵ سے ذرا آگے دریائے ہڈسن کے کنارے واقع ہے۔ گلی نمبر ۱۲۵ کے اسٹیشن کا نمبر بھی ۱۲۵ ہے اس سے پہلے میل نمبر ۱۱۶ پر ٹھیرتی ہے جو کولمبیا اسٹیشن بھی کہلاتا ہے کیونکہ اس کے سامنے مشہور کولمبیا یونیورسٹی ہے۔ "طالب علموں کو خاص رعایت" کی وجہ سے میل کو یہاں ٹھیرنا پڑتا ہے ورنہ باقی راستے وہ چوکڑیاں بھرتی ہوئی جاتی ہے۔

بیالیسویں گلی کے اسٹیشن پر خلافِ معمول کوئی رونق نہ تھی۔ گھڑی دیکھی تو رات کے گیارہ بجے تھے۔ نیویارک کو دیکھتے ہوئے یہ وقت کچھ ایسا خراب بھی نہ تھا۔ ادھر یاد آیا آج ہفتہ ہے، سارا شہر سیر و تفریح کے لئے نکلا ہے یہ ٹرین تو واپس جارہی ہے ابھی اس میں کون بیٹھے گا۔ آپ واپس کا مطلب سمجھے۔ مطلب یہ ہے کہ بڑے نمبر کی گلیاں اور علاقے UPTOWN کہلاتے ہیں وسطی MIDTOWN اور بحرِ اوقیانوس کے کنارے والے DOWNTOWN۔ مقامات تفریح یعنی کلب سینما تھیٹر زیادہ تر براڈوے کے وسطی حصے اور ٹائم اسکوائر اور ساحل سمندر پر ہیں گویا لوگ تفریح کرنے MIDTOWN اور DOWN TOWN ہی آئیں گے۔ لاحول ولا قوۃ، یہ ڈاؤن ٹاؤن، مڈ ٹاؤن، اپ ٹاؤن کیا بکواس ہے بہرحال چونکہ یہ الفاظ خالص امریکی ایجاد ہیں اور ابھی ہمیں آپ کو امریکی گیہوں امریکی اسلحہ امریکی فلموں اور امریکی دل و دماغ کی ضرورت ستاتی رہتی ہے اس لئے ہنسی خوشی یہ لفظ بھی سیکھ لیجئے بلکہ استعمال کیجئے بندہ تو خوب دھڑلے سے استعمال کرتا تھا بلکہ اگر

www.taemeernews.com

مذاق نہ اُڑے تو اب بھی تیار ہے مگر مشکل یہ ہے کہ بندہ جس طبقے میں گھومتا پھرتا ہے یعنی متوسط اور عوامی طبقہ وہاں اُس کا مذاق اڑتا ہے اور جو پاکستانی طبقہ امریکی الفاظ و محاورات گاتا بولتا ناچتا ہے، اس میں بندہ پر نہیں مار سکتا ـــــ

ویسے ایک بار میں نے یہ نسخہ اعلیٰ طبقے میں آزمایا اور خاصا مقبول ہوتا جا رہا تھا کہ ایک دم ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔

ہوا یہ کہ ایک بار اعلیٰ طبقے کے ایک رکن نے مجھے ایک ہوٹل میں انگریزی میں فرانس کے بارے میں بات چیت کرتے ہوئے سن لیا اور اپنا ہی جیسا سمجھ کر ایک شام کلفٹن پر ایک "پارٹی" میں بلا لیا۔ وہ پارٹی "سخت" "زوردار" تھی۔ میں ذرا دیر میں پہنچا۔ انگریزی میں جلدی سے معذرت کی اور گپ لڑانے لگا۔ اتنے میں وہ بزرگ بطور خاص پھر متوجہ ہوئے۔

"ہیے ویر ور یو" (تم کہاں تھے) انھوں نے پوچھا

"اوہ آئی ہیڈ گون مڈ ٹاؤن" (میں ذرا مڈ ٹاؤن گیا تھا)

" فار وٹ" (کس لیے) انھوں نے کچھ زیادہ ہی پوچھ لیا۔

" انجمن ترقی اُردو"

" وہاٹ" وہ ایک دم چیخ اُٹھے

" انجمن ترقی اُردو" میں نے دُہرایا۔

" وٹ ہیو یو ٹو ڈو ود اُرڈو" (اُردو سے تمھارا کیا تعلق ہے)

اب میں گھبرایا۔ مگر جی کڑا کر کے جما رہا۔

" جناب میں اس کا اعزازی معتمد ہوں۔"

" موٗ تمد" انھوں نے اُردو میں پوچھا " موتامد کیا ہے۔"

" سکریٹری یعنی آنریری سیکریٹری۔"

" اوہ نان سنس۔ یو آر این ارڈو فیلو"۔ (اوہ تم اُردو والے ہو) یہ کہہ کر وہ ایک طرف مُڑ گئے اور ان کے مڑتے ہی چند نہایت قبول صورت اور مجلسی خواتین جو پہلے کسی قدر اشتیاق سے میری گفتگو سن رہی تھیں گویا بادلوں کی طرح چھٹ گئیں۔ جاتے جاتے انھوں نے آپس میں کھسر پھسر بھی کی۔ ایک نے اس طرح دیکھا گویا کوئی خونی بدمعاش گھس آیا ہے۔ اب پتا نہیں کیا ہونے والا ہے۔

www.taemeernews.com

میں خفیف ہوا کھڑا رہا۔ پھر اپنی قیمتی ٹائی کھول کوٹ ۔ ۔ ۔ ۔ بیٹھے پر ڈالا اور ڈاؤن ٹاؤن روانہ ہو گیا۔ ہاں مجھے اتنا یاد ہے کہ میری یہ حرکت دیکھ کر ہلکی ہلکی چیخیں بھی نکلی تھیں۔

ہاں تو اس رات میل سے اپ ٹاؤن جا رہا تھا۔ نمبر ۹۶ تک میں اپنے طویل کمپارٹمنٹ میں اکیلا تھا۔ ریل نہ جانے کس رفتار سے چل رہی تھی شاید اسی میل فی گھنٹہ۔ امریکی زیر زمین ' ولایتی زیر زمین کی طرح گدّے دار آرام دہ نہیں ہوتی بلکہ کمبخت صرف لکڑی کی بنچیں سی ہیں جن پر زیادہ دیر بیٹھو تو کولھے سخت ہو جاتے ہیں اور ریل تیز ہو تو پھدک پھدک کر آدمی کا حال مزید خراب ہو جاتا ہے۔ یہ کمپارٹمنٹ تو بالکل خالی تھا اس لئے اور بھی اُچھل رہا تھا۔

نمبر ۹۷ پر دروازہ حسب معمول بجلی کی تیزی سے کھل کر بند ہو گیا اور میرے سامنے چھوٹے چھوٹے نو عمر بچوں اور نوجوانوں کا ایک ہجوم سا پھیل گیا۔ وہ کوئی بارہ سے اٹھارہ کی عمر تک کے لڑکے تھے ' رنگ گندمی ' بال کالے آنکھیں کالی اور گہری گہری۔ پھولدار آدھی آستینوں کی میلی میلی قمیصیں اور موٹے کپڑوں کی چست پتلونیں۔ دو چار کے گلوں پر کاؤ بوائے والے رومال بھی بندھے ہوئے تھے ' وہ زور زور سے بول رہے تھے لیکن ریل ایک دم چل پڑی اور میری سمجھ میں ان کا لہجہ یوں بھی نہیں آ رہا تھا اس لیے میں نے ایک بار انھیں دیکھنے کے بعد کوئی توجہ بھی نہ دی۔ ریل پھر تیزی سے چل پڑی۔ میں نے اپنی کتاب پڑھنی شروع کر دی۔ کتاب اتفاقاً یونائیٹڈ نیشنز کی تھی۔

چند لمحے بعد ڈبے میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ ایسی چیخ پکار کے بعد ایک دم خاموشی خود ایک چیخ بن جاتی ہے۔ میں چونک گیا اور ادھر اُدھر دیکھا میں نے دیکھا کہ دو چار بچے تو بیٹھے ہیں باقی سب کھڑے میری طرف دیکھ رہے ہیں اور اگلے دو کھسر پھسر کر رہے ہیں۔

میں انھیں دیکھ کر مسکرایا۔ مگر وہ نہیں مسکرائے۔

یکایک وہ آگے بڑھے ' دو میرے دائیں ہاتھ کو اور دو میرے بائیں ہاتھ کو ' اوپر کی زنجیریں پکڑ کر یعنی سہارے سے کھڑے ہو گئے۔ باقی تقریباً سب ایک دم سامنے آ گئے میں نے غور کیا تو ان میں دو لڑکیاں بھی تھیں جن کے بال کٹے ہوئے تھے۔

" آوت وو یور منی " یکایک ایک نے آگے بڑھ کر بچے فلمی غنڈوں کی طرح اپنا ہاتھ پھیلایا (اس نے کہا تھا ' پیسے نکالو۔)

میں نے محسوس کیا کہ اس کا لہجہ امریکی نہیں ہے ' وہ ٹی کی جگہ تی بول رہا ہے۔

اس نے ایک لمحے بعد پھر یہی بات دہرائی اور ایک دم ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ کٹ سے آواز ہوئی میں نے دیکھا کہ ایک پتلا مگر لمبا اور نوکیلا چاقو ہوا میں لہرا رہا ہے۔

www.taemeernews.com

"اوہو۔ مارے گئے۔" میں نے جی میں سوچا۔ "یہ تو مشہور زمانہ آوارہ بچوں کی ٹولی ہے۔ یہ تو بہت سارے ہیں۔ لو یار اب تمھارا بیڑا ہوا۔"

ذرا سوچئے کہ آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے۔ اب میری سنیے!

میں بالکل چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ایک ہاتھ سے میں نے اپنے کوٹ کا بٹن کھول دیا تاکہ دونوں دامن اِدھر اُدھر ہو جائیں اور میری توند انھیں نظر آ جائے اس وقت میری توند ایک بہت ہی صحت مند آدمی کی طرح ابھری ہوئی تھی۔

توند کا داؤں بیکار گیا۔ وہ لڑکا اور آگے بڑھ آیا

"کوئیک مسٹر۔ آوٹ ود یور منی" (جلدی کرو مسٹر پیسے نکالو) مسٹر نے اوپر دیکھا کہ ریل کی زنجیر کھینچنے کا چانس دیکھیں۔ مگر دائیں بائیں کھڑے ہوئے پہرے داروں نے ایک دم نرغے میں لے لیا۔

"آل رائٹ" مسٹر گھبرا گئے۔ اور لڑکے مطمئن ہو گئے۔

میں نے ایک جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دو ڈالر تھے۔ دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا پانچ ڈالر کا ایک نوٹ نکلا۔ باقی پیسے پتلون کی پشت والی جیب کے بٹوے میں تھے میں نے بیچے ٹیک اگالی اور ڈالر ان کی طرف بڑھا دیے۔

"اینڈ دس واچ" (اور یہ گھڑی) انھوں نے عین گھڑی کے اوپر چاقو کی نوک سے دستک دی۔ یہ چوٹ میرے لیے سخت خطرناک تھی کیونکہ میری گھڑی رولیکس تھی خاصی مہنگی اور اکلوتی۔ اس کی زنجیر بھی رولڈ گولڈ کی تھی۔

"ڈو یو نو انگلش" (کیا تم انگریزی جانتے ہو) میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"یس وائی ناٹ" (ہاں کیوں نہیں) اور پھر وہ سب قہقہے مارنے لگے۔

"میں اقوام متحدہ میں ایک اہم ایشیائی مندوب ہوں کل ہی امریکہ آیا ہوں اور مجھے امریکنوں کے خلاف ایک تقریر کرنی ہے جس کا موضوع ہے غیر امریکیوں پر امریکیوں کے مظالم" میں نے بمشکل اپنی بات پوری کی مگر داؤ کاری پڑا تھا۔ لڑکے جلدی جلدی کھسر پھسر کرنے لگے۔

"اگر تم لوگوں نے مجھے لوٹ لیا تو میں صاف صاف اقوام متحدہ سے کہہ دوں گا کہ امریکہ دوسری اقوام کو مارنے پیٹنے میں حق بجانب ہے خاص طور پر اطالیوں کو۔"

"تو ہم اطالوی نہیں ہیں" وہ مل کر چیخے۔

"پھر آپ لوگ کون ہیں۔"

"ہم پورٹوریکو کے ہیں" انھوں نے بڑے شوق سے جواب دیا۔

"آہ پورٹوریکو۔ میرا محبوب جزیرہ۔ آہ اس کے بچے ایسے خراب کیسے ہو گئے" میں نے آہیں بھرنی شروع

www.taemeernews.com

کردیں۔ دو بچوں کو سخت غصہ آیا مگر ایک صاحب بڑے شوق سے میری طرف دیکھنے لگے۔

"کیا تم پورتوریکو گئے ہو" انھوں نے ڈاکہ زنی بھول کر بڑے پیار سے پوچھا۔

"آہ میں تو وہاں سے کئی بار گزرا ہوں" حالانکہ میں پورٹوریکو ایک بار بھی نہیں گیا "اسپنی تہذیب کا سب سے زیادہ شاندار مرکز میں پورٹوریکو ہی کو سمجھتا ہوں۔"

"کیا تم اسپین بھی گئے ہو" ایک اور صاحب کو اپنے آبا و اجداد یاد آنے لگے۔

"اسپین۔ اہا نیا۔ آہ وہ تو میرا سب سے محبوب ملک ہے۔ بارسلونا میں آج تک کنواریاں میرے ایشیائی گیتوں کی تال پر رقص کرتی ہیں۔"

بڑے لڑکے ایک دم اس طلسمی ماحول سے جھرجھری لے کر چیخنے۔

"یور واچ سینور۔ یور واچ۔ کوئیک اور آئی ول کل یو (اپنی گھڑی فوراً اتار دو ورنہ میں تمھیں قتل کردوں گا) وہ چاقو والا لڑکا چلّایا اور اس نے میری کلائی کو جھٹکا دے کر گھڑی کھینچنی چاہی۔

"نو۔ نو۔ نو" باقی تین چار بچے چیخے! انھوں نے آپس میں اپنی زبان میں تیز تیز گفتگو شروع کی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ میری سفارش کر رہے تھے میں گھڑی میں سیکنڈ گن رہا تھا۔ یہ کم بخت میل ٹرین گدھے کی طرح چل رہی ہے۔ پانچ سات منٹ میں کولمبیا اسٹیشن آجانا چاہیے۔ مگر ابھی شاید دو ہی منٹ گزرے تھے۔

یکایک بڑا لڑکا الگ ہٹ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"اچھا تم ثابت کرو کہ تم پورٹوریکو گئے ہو۔ تم ہم سے مذاق کر کے ان بچوں کو بہکا رہے ہو۔"

"میں اور پورٹوریکو نہیں گیا" میں تو ساری دنیا گھوم چکا ہوں" میں جھوٹی ہنسی ہنسا۔ "مجھ سے تم پیرس کی کہانی سن لو، لندن کی کہانی، بغداد کی کہانی۔"

"نو۔ نو تم بات مت ٹالو۔ ہمیں پورٹوریکو کی بات بتاؤ۔" بڑا لڑکا ہوشیار تھا اس نے پکڑ لیا۔ مگر ایک چھوٹے میاں پھدکنے لگے۔

"بگداد۔ بگداد۔ کیا وہ شہر ہے یا لڑکی ہے۔ میں نے ایک کتاب میں اس کا ذکر پڑھا ہے۔ پلیز مسٹر کیا بگداد میں حریم ہوتا ہے جس میں سونے چاندی کے پلنگ اور فوارے ہوتے ہیں یا بگداد سونے چاندی کے کپڑے پہنتی ہے۔ اوہ مجھے اچھی طرح یاد نہیں......"

ظاہر ہے کہ اس بچے نے انگریزی میں الف لیلہ کا کوئی قصہ پڑھا تھا مجھے اس پر بڑا پیار آیا مگر سامنے وہ چاقو زن سرغنہ کھڑا تھا اس لئے میں نے رومانوی بغداد کو چھوڑ کر پورٹوریکو کا ذکر ہی مناسب سمجھا۔ میں نے اپنے

www.taemeernews.com

حافظے پر زور دیا اور طوطے کی طرح بولنے لگا۔

"پورٹوریکو امریکی دولت مشترکہ میں شامل کہلاتا ہے لیکن اصل میں امریکی استبداد کے بوجھ سے دبا ہوا ایک خوبصورت جزیرہ ہے جس کے شمال میں بحراوقیانوس اور جنوب میں بحر کریبی آن ہے' اور جو جزائر ویسٹ انڈیز کے بالکل مشرقی کونے پر واقع ہے۔ یہ جزیرہ نیویارک سے سولہ میل دور ہے۔ اس کی لمبائی ایک سو پانچ میل چوڑائی پینتیس میل' اور آبادی تقریباً پچیس لاکھ ہے۔ اس کا صدر مقام سان جان ہے اور تم لوگوں کی اکثریت رومن کیتھولک عقیدے کی ہے' آہ کیا خوبصورت جزیرہ ہے۔"

"اور ـــ"

اب میرا حافظہ جواب دینے لگا۔

"پورٹوریکو بہت خوبصورت جزیرہ ہے' لوگ بڑے متواضع اور خوش اخلاق ہیں۔"

"اور ـــ اور ـــ" سوائے چاقوزن کے تقریباً سب بیتاب نظر آتے تھے۔ صرف چاقوزن گھڑی کے لئے بدستور بیتاب نظر آتا تھا۔

"کہاں تک بیان کروں"۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ سوئی کمبخت رینگتی ہوئی لگ رہی تھی "اور لوگ ہسپانوی نسل کے ہیں، نہایت شریف' وضعدار' خوب گاتے بجاتے اور ناچتے ہیں وہاں میرا ایک دوست ہے امبر تو۔ گریٹ سنگر"

"امبر تو !" انھوں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا۔ نام یقیناً اسپینی تھا مگر اس نام کا کوئی آدمی کم از کم مشہور موسیقار یقیناً نہیں تھا۔ "یہی تو امریکیوں کا ظلم ہے"۔ میں نے جلدی سے کہا "کہ تم لوگوں تک امبر تو کے ریکارڈ بھی نہیں پہنچنے دیتے کیونکہ وہ سوشلسٹ کہلاتا ہے حالانکہ وہ ایک پکا اور سچا رومن کیتھولک عیسائی ہے"۔

"اوہ یہ امریکی ـــ" تقریباً سب مل کر چیخے۔ میرا تیر بالکل نشانے پر لگا تھا۔

"اب دیکھو وہاں سے ہر سال کوئی چالیس ہزار پورٹوریکن ہجرت کر کے نیویارک وغیرہ کیوں آتے ہیں اور یہاں نہ انھیں اچھا گھر ملتا ہے نہ عمدہ پیشے ملتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ ظاہری اور کتابی خوشحالی کے علاوہ وہاں تم لوگوں کے بزرگوں پر شریفانہ اور آزاد کاروبار کے راستے بند ہیں' یہ سب امریکی سیاست ہے۔"

"یس یس ویری رائٹ" سب مل کر چیخے۔ میں نے جیب سے سگریٹ نکالی اور کسی کو پیش کیے بغیر سلگا کر ڈبیا واپس جیب میں رکھ لی۔

درستانی ـــ سب بچے مجمع لگا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ دو لڑکیاں گھس پل کر آگے بڑھ آئیں میں نے ایک بچے

www.taemeernews.com

گود سے کھینچ کر اپنے زانو پر بٹھا لیا۔ وہ میری کلائی پر گھڑی کو گھمانے لگا۔ میں نے احتیاطاً اپنا پہنچا پیچھے موڑ لیا تاکہ اگر یہ جنڈ کا بھی ہے تو گھڑی باہر نہ نکلنے پائے ـــ ویسے

میں مسکراتا رہا۔ چاقوزن کی بیتابی کم ہونے لگی تھی مگر ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

"بھئی میرے پاس پورٹوریکو کی کہانیاں بہت ہیں۔ کبھی تم لوگ فرصت سے آؤ تو سنو" میں نے اطمینان سے کہا۔

"تم کہاں رہتے ہو؟" ایک لڑکی مضطرب ہو کر چلائی۔ "میں اپنی ممی کو لے کر آؤں گی۔ میرے باپ تو مر چکے ہیں مگر وہ پورٹوریکو کی کہانیاں خوب سناتے تھے۔"

"شٹ اپ" چاقوباز زور سے غرّایا۔

کوئی ہرج نہیں۔ آخر یہ بھی میری بچی کی طرح ہے" میں نے ہمت کر کے چاقوباز کو ڈانٹا۔ باقی بچے بھی اس کی طرف اچنبھے سے دیکھنے لگے۔ وہ بچی میرے اور قریب آگئی۔

"کیا تمھاری کوئی لڑکی بھی ہے۔"

"ہے۔ تمھارے ہی برابر ہے۔ شاید ذرا چھوٹی ہو۔"

"وہ انگریزی بولتی ہے۔"

"خوب"

"اسپینی نہیں بولتی۔"

"ابھی نہیں مگر اسے اسپینی زبان بہت پسند ہے" میں نے اپنی جان بچانے کے لیے اپنی بچی کے لئے بھی جھوٹ بول دیا ـــ شاید آپ نہ بولتے۔

اچانک ریل کی رفتار مدھم ہو گئی۔ چاقوزن گھبرا گیا۔

وہ ایک دم پھر لپکا اور چاقو بالکل میری آنکھوں کے سامنے کر دیا۔

"ہے مسٹر" وہ چیخا "اگر تم ذرا بھی بولے تو میں یہ چاقو تمھارے حلق میں اتار دوں گا پھر بھاگوں گا۔"

میں گھبرا گیا۔ سخت گھبرا گیا۔ لیکن جی کڑا کر کے مسکرانے لگا۔ میں نے باقی بچوں کو ملتجی نظروں سے دیکھا بچے چیخنے لگے۔ نہ معلوم وہ کیا چیخے مگر وہ اس سے میری سفارش کر رہے تھے اُسے جھڑک رہے تھے۔ پھر وہ چاقوباز ہٹ گیا۔ ریل پلیٹ فارم کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگی۔ پلیٹ فارم تقریباً اکیلا تھا۔ دور کونے پر ایک لمبا سا نوجوان طالب علم ایک چھوٹے قد کی طالبہ کو گلے لگائے کھڑا تھا۔ ڈبہ زن سے اس کے آگے سے گزر گیا اور ٹھہر گیا۔

"پلیز دونٹ شارٹ مِتھ" وہ بچی میرے قریب آ کر غمزدہ لہجے میں بولی "یو آر لے فرینڈ اینڈ دی آر

www.taemeernews.com

بید چلد رن ۔ (بچے) نہیں مسٹر تم ایک اچھے دوست ہو ہم بُرے بچے ہیں۔

یہ کہکر وہ واپس بھاگی۔ دروازہ کھلتے کھلتے بچے اس کے سامنے گھیرا سا ڈال کر کھڑے ہوگئے تھے۔ انھوں نے گدگدیلت فارم پر کودنا شروع کردیا اور کودتے ہی ادھر سڑک کی طرف بھاگے۔ چاقو باز آخر تک چاقو ہاتھ میں لیے کبھی مجھے کبھی انھیں دیکھتا رہا میں چپ چاپ آنکھیں کھولے اس پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔

" آل رائٹ " اس نے بھاگنے کی تیاری کی۔ "تم سخت جھوٹے ہو" اس نے میری طرف دیکھ کر زور سے زمین پر تھوکا (یہ سخت توہین کی علامت ہے) اور ہرن کی طرح زقند لگا کر بھاگ گیا۔

میرے کھڑے ہوتے ہوتے دروازے بند ہوگئے اور ریل چل دی۔

اگلے یعنی اپنے اسٹیشن پر میں نے ایک موٹے سے پولیس والے کو پکڑ کر اپنی رام کہانی سنائی۔ وہ غور سے سن رہا جب اسے معلوم ہوا کہ میرا نقصان صرف سات ڈالر کا ہوا ہے تو وہ خوب ہنسا۔

" تم شکر کرو مسٹر کہ تمھاری جان بچ گئی۔ شکر کرو کہ وہ پورٹوریکن تھے اگر امریکی ہوتے تو تم ان کی حب الوطنی سے کیا فائدہ اٹھاتے۔ اس شہر کے بچوں میں جرائم کی شدید بہتات ہے، روز قتل ہوتے ہیں۔ چوری، ڈاکہ زنی، آتش زنی تو معمولی بات ہے ہم لوگ اس مسئلے سے بُری طرح دوچار ہیں۔"

" مگر ایسا کیوں ہے "

" اوہ مائی ڈیئر سر! یہ معاملہ نفسیاتی الجھنوں تک پہنچے گا۔ اُن کے باپ بیکار یا شرابی یا بدقماش ہیں یا مر مرا گئے ہیں۔ مائیں کام کرتی ہیں۔ شراب پیتی ہیں۔ بداطواری میں مبتلا ہیں ـــــ بچے آوارہ پھرتے ہیں اور جرائم پیشہ ہوجاتے ہیں۔ جی ہاں یہ ہماری سوسائٹی کی بہت بڑی لعنت ہے ـــــ" اس نے آہ بھری۔

" مگر آپ اتنی امیر قوم، آج ہمیں کتابیں اور ہتھیار اور گیہوں اور ڈالر بھیجتے ہیں۔ اپنے بچوں کی تربیت نہیں کرسکتے۔ میں نے لترا ہی شروع کی۔

" جناب یہ سوال میرے لیے بیکار ہے، میں پولیس کا آدمی ہوں، آپ یہ سوال پڑھے لکھے امریکیوں اور حکمرانوں سے کیجئے۔ فی الحال تو آپ شکر کیجیے کہ آپ بچ گئے۔ آپ کی گھڑی بچ گئی اور ـــــ "

اور میرے سات ڈالر" میں نے نہایت بیہودہ سوال کیا۔

"اوہ مائی گاڈ" وہ تنگ آگیا۔ یکایک اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک پرزہ نکالا۔ اپنی آنکھوں کے آگے کیا اور میرے آگے زمین پر پھینک دیا۔ وہ دس ڈالر کا نوٹ تھا۔

" یہ ہے تمھارے سات ڈالر اور تین ڈالر جرمانے کے جو پوری امریکی قوم تمھیں پیش کرتی ہے۔" اس نے کہا

www.taemeernews.com

جھک کر کہا اور تیز تیز برابر سے گزرنے لگا۔

"ٹھیرو مسٹر آفیسر" میں نے شدید غصے میں کہا۔ لیکن اس کا تن و توش دیکھ کر بول نہ سکا۔ میں نے جوتا اس نوٹ پر رکھ کر اسے بُری طرح مسل دیا اور خود آگے بڑھ گیا۔

"ہے —" وہ رُکا

"کیا بات ہے۔" میں بھی رکا۔

"کیا تم کبھی یو۔ ٹو دیکھ گئے ہو۔"

"کیا تمھارے بیشتر لیڈر اور کانگریس کے ممبر اور وزرا پاکستان میں رہتے ہیں۔"

"شاید نہیں۔"

"جب تم لوگ اتنی دور بیٹھ کر ہمارے بارے میں فیصلے کرسکتے ہو تو میں کتاب کے زور پر ایک چھوٹے سے جزیرے کے بارے میں بات کیوں نہیں کرسکتا۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔" اس کا رویہ مصالحانہ تھا۔

"خدا حافظ" میرا رویہ بھی مصالحانہ تھا۔

چلتے چلتے میں نے مُڑ کر دیکھا تو وہ جھک کر اپنا نوٹ اٹھا رہا تھا۔

واقعہ تو میں بھول گیا مگر وہ بچی کئی ہفتے مجھے یاد آتی رہی۔

www.taemeernews.com

یہ ماجرا کیا ہے

امریکہ میں ایک سوال نے مجھے بار بار پریشان کیا۔ ایک مصرعے میں وہ سوال آپ بھی سن لیجیے۔

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

یا اللہ یہ اتنا بڑا ملک جس کا رقبہ پونے چار لاکھ مربع میل ہے، جس کی آبادی انیس کروڑ ہے، جس کے معدنی ذخائر اور زرعی وسائل بیشمار ہیں، جس میں قوم قوم کے اور بھانت بھانت کے آدمی آکر بستے رہتے ہیں، وہ اتنے دنوں سے برابر کیوں ترقی کیے جاتا ہے۔

آج کی امریکی خارجہ پالیسی کا جھگڑا الگ ہے۔ آج کا امریکہ جو جنگ بازوں، سرمایہ داروں اور جنوبی فرقوں کے بوجھ تلے دب کر ساری دنیا کو پریشان کر رہا ہے، وہ قصہ الگ ہے لیکن یہی امریکہ اب سے پچیس تیس برس پہلے دنیا کا امیر ترین ملک بن چکا تھا اور ایک مضبوط مرکزی حکومت اس کے داخلی اور خارجی معاملات کی ضامن ہو چکی تھی یہ سب کچھ کیسے ہوا۔

اس سوال کے بہت سے جواب ملتے رہتے ہیں لیکن ایک جواب ایک پاکستانی بھائی مسٹر احمد حیات نے بھی دیا جو بالتصویر پیش کیا جاتا ہے۔ احمد حیات ۳۰ برس تک امریکہ میں رہے ہیں اور اب بھی وہیں ہیں۔ دس بارہ برس وطن عزیز میں بھی گزار گئے ہیں۔ پڑھے لکھے بقراط نہیں مگر تجربہ کار جہاندیدہ آدمی ہیں۔

ان کی باتیں پورے ایشیائی پس منظر میں ملاحظہ کی جائیں تو اور بھی لطف آئے گا۔

اب اہل اختیار اور سرمایہ داروں کو مزید خفگی ہو تو گردن احمد حیات کی کاٹی جائے۔ میری گردن اس مضمون کے دوران میں چھیل چھلا کر تقریباً لٹکنے لگی ہے اور اب بھی ہر وقت دھڑکا لگا ہے کہ نہ جانے کس دن:

پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہو گی

www.taemeernews.com

میں نے بہت سوچا کہ احمد حیات کی باتیں دبا جاؤں کیونکہ میں لاکھ انکار کروں "وہ" ان سب کو مجھ سے منسوب کر کے میرا مزید پڑا کرا دیں گے لیکن آج کل ایک صاحب بڑے زوروں میں جا رہے ہیں۔ بات بات پر اُڑنگا لگاتے ہیں ان صاحب کو شاید آپ اچھی طرح نہیں جانتے میں تو بالکل نہیں جانتا تھا نام بچپن سے سنا تھا مگر پیرِ پاس پھٹکنے نہ دیا تھا کیونکہ ان کی کہانیاں بھی بہت سن رکھی تھیں لیکن ان حضرت نے اب فدوی کو خاصا گھیر لیا ہے امید ہے کہ ان کے قبضے سے جلد نکل جاؤں گا۔ مگر جب تک نہ نکلا ان کا داؤں چل ہی جاتا ہے۔

ان کا نام ہے مسٹر ضمیر۔ ضمیر صاحب جنھیں پرانے بقراط پیار سے صرف ضمیر کہتے تھے۔

ان کا اصرار ہے کہ یار ایسی بھی کیا بزدلی۔ اگر اللہ کو رزاق مانتے ہو تو کم از کم اتنا ہی کرو کہ جو کچھ دیکھا اور سنا اُسے سچ سچ بیان کر دو۔ زیادہ سے زیادہ اپنی رائے نہ دو آخر خود کو ادیب کہلوانے پر کیوں مصر ہو۔

میں ٹالتے ٹالتے تھک گیا۔ رزاق تو میں بھی اللہ تعالیٰ ہی کو مانتا ہوں لیکن "وہ" دو چار بھائی بند جو چھوٹے بہت دنیاوی اختیارات لیے دائیں بائیں بکھرے پڑے ہیں انھوں نے خدائی اختیارات میں بڑی سرگرمی سے حصّہ لینے کی کوششیں شروع کر دی ہیں خاص طور پر مجھ جیسے بے سہارا انسانوں کا رزق بند کرنے کھولنے اور کم و بیش کرنے کی بھی بات یہ ہے کہ ان سے بھی ڈر لگنے لگا ہے اور اگر یہ شرک ہے تو اس کا ذمہ دار اکیلا میں نہیں بلکہ خود "وہ" ہیں اور آپ بھی ـــــ بہرحال

ہر چہ آید بر ســـــر اولادِ آدم بگذرد

احمد حیات صاحب یہ تصویریں دکھاتے ہیں آپ بھی ملاحظہ فرمایئے افسوس کہ یہ پری جمال نازنینوں کی نہیں بلکہ بڈھے ٹھڈے امریکنوں کی ہیں خیر ایک آدھ بار یہ ظلم بھی سہہ لیجیے۔

یہ صاحب ہیں بنجمن فرینکلن۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں ایک شہسوار امریکی گزرے ہیں امریکہ کا بچہ بچہ ان سے واقف ہے بلکہ کروڑوں غیر امریکی بھی یہ نام جانتے ہیں لیکن کروڑوں اُن کی اصلیت سے واقف نہیں۔

بنجمن فرینکلن نے کبھی باقاعدہ تعلیم نہیں پائی مگر

(۱) وہ واحد امریکی ہیں جن کے دستخط چار اہم کاغذات پر ثبت ہیں یعنی امریکہ کا اعلان آزادی اور فرانس سے امریکہ کا پہلا معاہدہ اور انگلستان سے معاہدۂ امن اور ریاستہائے متحدہ کا آئین۔

(۲) وہ امریکہ کے پہلے گشتی شفاخانے کے بانی تھے۔

(۳) وہ آگ سے تحفّظ کا بیمہ کرانے والی پہلی کمپنی کے بانی تھے۔

(۴) وہ مشہور پنسلوانیا یونیورسٹی کے بانی تھے

www.taemeernews.com

(۵) وہ امریکی نظام ڈاک کے مصلح تھے۔
(۶) وہ دنیا کے پہلے آدمی تھے جس نے بارش میں تار لگا کر پتنگ اُڑائی اور آسمانی بجلی کو زمین میں اُتار دینے کا طریقہ ایجاد کیا۔
(۷) انھوں نے اسٹو اور دوربینی عینک ایجاد کی۔
(۸) ان کی تصنیف "غریب رچرڈ کی جنتری" امریکہ کی مقبول ترین کتاب تھی۔
احمد حیات پوچھتے ہیں۔

"یہ بتاؤ کہ ایسے شخص کو زندہ کیسے رہنے دیا؟ آج کے ایشیائی حساب سے مار مار کر سالے کا بھُس بھر دینا چاہیے تھا کہ بیٹھا ایک کے بعد دوسرا کام ہی کیے جاتا ہے اور شہرت کمائے جاتا ہے۔ سالا کسی اچھے گھر کا بھی نہیں ہے"
میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ آپ سوچیے۔

دوسری تصویر۔

یہ حضرت ہیں ابراہام لنکن۔ لوگ انھیں ایک عظیم امریکی صدر کے نام سے جانتے ہیں لیکن احمد حیات ان کی اصلیت بھی کھول دینے پہ تلے ہوئے ہیں۔

"او بھائی صاحب یہ شخص ایک بڑھئی کا بیٹا تھا۔ بڑھئی کا بیٹا ذرا ملاحظہ فرماؤ۔ بھلا اُسے کیا حق تھا کہ پڑھ لکھ کر کانگریس اور سینٹ میں جائے اور تقریریں کرے اور الیکشن بازی کرے اور صدر ہو جائے اور غلاموں کو آزادی کا پروانہ دے دے۔"

"کچھ نہیں۔ پتا نہیں یہ کیسی قوم ہے کہ بڑھئی کے بیٹے کو اتنی لفٹ دے دیتی ہے۔

"اجی آپ اس کے زمانے میں غلام ہوتے تو غصّے کے مارے آزاد ہونے سے انکار کر دیتے۔"

"بالکل۔ وہ جی بڑھئی کا بیٹا اور ہمیں آزاد کرے۔"

"اب دیکھیے اس میں ابراہام لنکن کے ساتھ ساتھ امریکی قوم کا بھی قصور ہے نا۔"

"پکا قصور ہے بھائی جی پکا۔ ہم ہوتے تو پہلی ہی منزل پر اس کی ٹانگ گھسیٹ لیتے اور کوئی ابراہام لنکن کا نام ہی نہ جاننے پاتا۔ یار یہ امریکی لوگ عجیب قوم تھے۔"

تیسری تصویر:

"تو جناب یہ جج صاحب تھے۔ جان مارشل۔ ان صاحب نے ۱۸۰۱ء میں سپریم کورٹ کی ججی جو سنبھالی تو دستور ہی اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ دھڑا دھڑ انتظامیہ کے خلاف فیصلے دینے شروع کر دیے۔ ایک رولنگ

www.taemeernews.com

یہ دی کہ سپریم کورٹ جو ہے وہ دستور کا مطلب اخذ کرنے یعنی دستور کی تشریح کرنے اور نافذ کرنے کا حق رکھتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ انتظامیہ اور کانگریس دونوں ایک طرح بے بس ہو کر رہ گئے۔ بھلا سوچیے تو کیسا غضب تھا بس اس کے بعد آج تک امریکی سپریم کورٹ نے انتظامیہ اور کانگریس پر سواری گانٹھ رکھی ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔"

چوتھی تصویر۔

"اور لو جناب اس کالے بھجنگ بوکر۔ ٹی۔ واشنگٹن کا حلیہ ملاحظہ کرو۔ سالا قوم کا حبشی۔ پیدائشی غلام تھا۔ بچپن سے کوئلوں کی کانوں میں کام کرتا تھا۔ جاہل مطلق۔ اس شخص نے گنتی اس طرح سیکھی کہ کھانے کا ٹمک پیپوں میں آتا تھا اُن پر نمبر لکھے ہوئے ہوتے تھے، بس وہ یاد کر لیا کرتا تھا اور آپ کو معلوم ہے اس نے کیا کیا؟"

"نہیں" میں سہم جاتا ہوں۔

"اس کالے نے ریاست الاباما میں اساتذہ کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا اور پھر جگہ جگہ تعلیمی ادارے قائم کیے اور پھر ملک بھر میں تقریریں کرتا پھرا۔"

"خوب زوردار آدمی تھا۔"

"اجی پھر وہی بات۔ آدمی اپنے آپ آگے کیسے بڑھ سکتا ہے' یہ تو پوری قوم کا مقدر ہے کہ ایک کالے غلام کو آسمان پر چڑھا دیا۔"

"بجا۔ بے شک" میں مزید سہم جاتا ہوں

پانچویں تصویر:

"یہ ایک بے وقوف آدمی ہے اس کا نام تھا اینڈریو کارنیگی۔ اسکاٹ لینڈ سے بھاگ کر امریکہ آیا اور ایسے داؤ چلے کہ فولادی کارخانوں، ریلوے کمپنی اور جہازی کمپنیوں کا کاروبار پھیلا دیا اور کروڑپتی بن گیا۔"

"اس میں بے وقوفی کی کیا بات ہے؟"

"جی سنتے جاؤ۔ بے وقوفی کی بات تو ظاہر ہے"

"کتنے دن سے امریکہ میں ہو۔؟"

"کئی ہفتے ہو گئے۔"

"کارنیگی فاؤنڈیشن کا نام نہیں سنا!"

"ہاں ہاں۔ اچھا تو وہ اس نے قائم کی تھی۔"

www.taemeernews.com

"جی ہاں اسی نے یہ حماقت کی کہ جگہ جگہ بڑے بڑے کتب خانے قائم کر دیئے' یہ بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرادیں اور علمی اور تحقیقی کام شروع کرادیئے بھئی ہی کچھ کرنا تھا تو روپیہ کمانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"ہاں جی میری سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ —"

"ابھی اور تو اوران حضرت نے ۱۹۱۰ء میں ایک زبردست ادارہ قائم کیا۔ کارنیگی وقف برائے بین الاقوامی امن۔ کروڑوں روپے اس بات پر خرچ کر دیئے کہ قوموں کے درمیان اختلافات باہمی تصفیئے سے طے ہونے چاہئیں بھئی تو اپنا دھندا کر۔ بال بچوں کے لیے رقم چھوڑ کر جا۔ تجھے بین الاقوامی امن کی کیا فکر ہے' جن قوموں کو امن کی ضرورت پڑے گی وہ خود دیکھ بھال کر لیں گی۔ تو کیا چیز ہے۔"

"ہاں جی کسی کو کیا پڑی کہ —"

"بس اس ملک امریکہ میں ایسے ہی ایسے خرد ماغ لوگ بہت پیدا ہوتے رہتے ہیں اور اپنا روپیہ یوں حرام میں گنواتے ہیں اور قوم ایسی ہے کہ ان کی بڑی بڑی یادیں قائم کرنے لگتی ہے۔"

"ہی ہی ہی" میں گھگھیانے لگتا ہوں۔

چھٹی تصویر:

یہ بھی ایک احمق ازلی تھے۔ یہ تھے ہنری فورڈ موٹروں والے۔

"ہاں میں خوب جانتا ہوں۔ بڑا کروڑ پتی تھا۔ ابھی ۱۹۴۷ء میں تو مرا ہے۔"

"معلوم ہے اس نے کیا کیا۔ یہ بھی پہلے معمولی آدمی تھا۔ موٹروں کا کارخانہ بنایا۔ لاکھوں کروڑوں موٹریں بنائیں اور پھر اپنی دو تہائی جائداد اور رقم فورڈ فاؤنڈیشن میں لگادی یعنی ایک خیراتی ادارہ بنا گیا کہ لو بھئی امریکیو اور غیر امریکیو کو مزے سے پڑھو لکھو' ریسرچ کرو اور مفت کی اڑاؤ۔"

"ہاں یار کمال ہے' کروڑوں روپے گنوا دیئے۔ شاید ٹیکس سے بچنے کے لیے کیا ہو۔"

"ابجی ٹیکس تو زندگی میں لگے گا اس نے تو عمروں عمروں کے لیے وقف بنادیا۔ اب لاکھوں مفت خورے اس کی رقم کھا رہے ہیں۔ پوچھو جس کے پلّے پیسہ نہیں اسے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے آپ بیمار ہوں اور رقم دیئے بغیر علاج کرانا چاہیں — ہی ہی ہی۔"

"ہی ہی ہی" میں بھی ہنستا ہوں۔

ساتویں تصویر:

"ذرا انھیں دیکھنا۔ یہ حضرت بڑے مردِ معقول لگتے ہیں مگر بالکل بہرے تھے۔"

www.taemeernews.com

"بالکل بہرے ۔ اور یہ تھے کیا۔"

"یہ تھے جناب موجد تامس آلوا ایڈیسن۔ اماں ایڈیسن کا نام نہیں جانتے"۔

"ہاں ہاں جانتا ہوں۔ یہ وہ ہے جس نے بجلی کا قمقمہ اور گراموفون اور متحرک سنیما کی ایجاد کی اور بہت سی دوسری ایجادیں کی ہیں۔"

"اجی سیکڑوں ایجادیں ہیں اس کی ۔ مگر یہ بہرا کیوں تھا۔ کیا بہرہ ہونا ہمارے معاشرے میں مسخرے پن کی نشانی نہیں ہے۔"

"یہی ہے" میں سر ہلاتا ہوں۔

"پھر اس نے ایجادیں کیوں کیں"۔

میں لاجواب ہو جاتا ہوں۔

بس یہ ہے امریکی قوم۔ بھئی ایک بہرہ آدمی' ایجادیں کیے جا رہا ہے۔ اور تم جیب بیٹھے ہو بلکہ اس کی تعریف کرتے ہو اُسے بڑی بڑی رقمیں دیتے ہو کہ اور کام کر۔ کیا کوئی چوکس کانوں والا آدمی امریکہ میں نہیں کہ اس سے ایجادیں کراؤ۔"

"بس عجیب قوم ہے" میں مسکراتا ہوں۔

"بس دیکھ لیجیے۔ اور معلوم ہے کہ یہ سالا بالکل گمنام خاندان کا آدمی تھا اور کسی معقول صوبے کا آدمی بھی نہیں تھا' نہ اُس کے رشتے دار گورنمنٹ میں تھے نہ کوئی بڑا آدمی اس کے بزرگوں کا یا اس کا دوست تھا۔"

"کمال ہے صاحب کمال ہے عجیب آدمی تھا۔"

"پھر وہی آدمی کی بات۔ ارے صاحب آدمی تو آپ کے ہاں بھی بہت سے بڑے مزے کے ہوں گے' اصل بات قوم کی ہے۔"

"صحیح ہے برادر بزرگ بالکل سچ ہے۔" میرا سر جھک جاتا ہے

آٹھویں تصویر:

"اور یہ دو دیوانے بھائی جن پر امریکیوں نے لاکھوں ڈالر خرچ کر دیے' دیکھتے ہو کیسے بیوقوف لگتے ہیں۔"

"لگتے تو ہیں"

"یہ رائٹ برادران ہیں جنھوں نے ہوائی جہاز کی ایجاد کی تھی ایک دلبر دوسرا آرویل معلوم ہے کہ یہ کس صوبے کے تھے یعنی کس ریاست کے۔"

www.taemeernews.com

"یہ نہیں معلوم" میں احمد حیات کی معلومات پر ششدر رہوں۔

"اجی یہ شمالی کیرولینا کے تھے۔ یوں سمجھیے جیسے بلوچستان یا اندرون نرمینر کے ہوں پسماندہ، غریب"

"پھر بھی جہاز اُڑا گئے۔"

"بس جہاز اُڑا گئے۔ پہلے تو انھوں نے بغیر مشین کا جہاز اُڑایا یعنی گلائیڈر۔ پھر مشین لگا دی اور اُڑ گئے اور پھر ایک اڑان میں اُن کا بیڑا بھی ہو گیا۔ اچھا اور یہ تھے کون۔"

"کون تھے۔"

"اجی یہ دکاندار تھے۔ ان کی دکان بائیسکلوں کی تھی۔ اوہو۔ ہو۔ ہا ہا ہا۔ قہ قہ" وہ بے اختیار ہنسے۔

قہ قہ قہ " میں بھی بے اختیار ہنسا۔

"لیجیے جناب سُن لیا آپ نے جن رائٹ برادران کو دنیا ہوائی جہاز کا موجد سمجھتی ہے وہ اصل میں بائیسکل والے تھے۔"

"یہ بھی امریکن قوم کی خصوصیت تھی کہ ایسے لوگوں کو اتنا بڑا کام کرنے دیا۔"

"وہی تو ہے میاں۔ ان میں نہ خاندانی روایات ہیں نہ شریف اور رذیل میں فرق سے نہ افسروں کی چلتی ہے کہ ......" وہ آہ بھرتے ہیں میں بھی آہ بھرتا ہوں۔

نویں تصویر :

"اور اس بڑھیا کو دیکھو۔ بھلا بتاؤ کون ہے؟"

"اجی ایک بیکار سی بڑھیا ہے۔"

"میاں یہ ہیلن کیلر ہے۔ مس ہیلن کیلر۔"

"وہ ہو یہ ہے۔ اس کا نام میں نے بچپن میں پڑھا تھا"

"یہ بڑھیا ڈیڑھ برس کی عمر میں اندھی اور بہری ہو گئی اور بات چیت بھی نہیں کر سکتی۔"

"پھر اس نے کیا کیا جو آپ تصویر لیے بیٹھے ہیں۔"

"اس نے۔ اس نے پڑھا لکھا۔ یہ گریجویٹ ہوئی اور بڑے اعزازات حاصل کیے اس نے سماجی اور رفاہی کام کیے اس نے دنیا بھر کے دورے کیے اور لوگوں کو سبق دیئے کہ یہ کرو وہ کرو۔"

"بڑے غضب کی بڑھیا ہے۔"

"وہی تو اس کے بیان کے گئے کیا تھے رے بال اندھے گونگے بہرے نہیں ہوتے۔"

www.taemeernews.com

"بہت ہوتے ہیں۔ او کے آئی۔ یم۔ سوری۔"

"بس یہ امریکہ ہے نہ یہاں خاندانی روایات ہیں نہ کوئی پردیسی جرج ہے' نہ کھکیڑ ہے۔ کوئی آدمی نظر آیا اور سب لے دوڑے۔ جاؤ اب میں زیادہ تصویریں نہیں دکھاتا' یہاں تو سیکڑوں ایسی تصویریں بکھری ہوئی ہیں"۔

لاحول ولا قوۃ اس سے تو ہم غریب اور جاہل ہی بھلے' ہمارے ایشیا میں کوئی بردی جرج کوئی ضابطہ تو ہے میں کوئی بھی ایجاد لیے گھوم رہا ہوں مگر رات کی رات میں شہرت اور دولت نہیں مل سکتی۔ پہلے کسی صنعت کار کے پاس جاؤں گا۔ وہ دیکھے گا' پرکھے گا کہ وہ ایجاد اس کی "انڈسٹری" کے لیے نقصان دہ تو نہیں ہے۔ پسند آئی تو کہے گا میاں نوکر ہو جاؤ۔ حق نہیں دے دو۔ ساڑھے پانچسو روپے مہینہ آرام سے لو اور ہمارے لیے ایجادیں کیے جاؤ۔ مجھے بھی چین اور اسے بھی آرام' اور اگر میرے سر میں خناس ہے تو سرکاری دفتروں کے چکر کاٹوں گا سیکشن افسر، ڈپٹی سکریٹری، جوائنٹ سکریٹری اور سکریٹری تو خیر کہاں ملتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایجاد اپنے وقت پر ہی ہوگی' ایک دم سے نہیں ہوگی۔

"ہاں یہ بات ہوئی بھئی آرام سے چلو۔ پولی پولی کھاؤ اور یہ بھی سوچو کہ تم کون ہو' کس گروپ کے ہو"۔

گروپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی مگر احمد حیات کی باتیں بڑی حقیقت پسندانہ ہیں' وہ کہتے ہیں:

"فرض کیجیے آپ ایشیائی بردی جرج یعنی ضابطے یا افلاس کے چکر میں ابھی سائنسی ایجادات پر توجہ نہیں فرماتے اور آپ ایک پاکٹ بُک ہیں اور قومی یک جہتی پر کام کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے سیکڑوں ہزاروں مشرقی پاکستانیوں کے دل موہ لیے ہیں' آپ ان کے دکھ درد میں بہت دن سے شریک ہیں مگر ایک دم قومی یک جہتی کے کاروبار سے متعلق حضرات کا گروپ بدل جاتا ہے اور فرض کیجیے ان میں ایک صاحب ایسے آگئے جنھیں آپ کی ناک پسند نہیں' دوسرے آپ سے اس بات پر خفا ہیں کہ ۱۹۴۳ء میں فلاں محفل میں آپ کی غزل ان کی غزل سے ذرا بہتر مان لی گئی تھی' تیسرے کا رنگ آپ سے ہلکا' چوتھے کا کھلتا ہوا ہے' پانچویں صاحب آپ سے زیادہ تنخواہ پاتے ہیں' اور چھٹے ان پانچوں کے گروپ میں شامل ہی نہیں' اب آپ قومی یک جہتی کا کام ہی نہیں بلکہ خیال تک چھوڑ دیجیے کہ وہ گروپ آپ کے ساتھ نہیں' نہ صرف یہ کہ اب آپ آگے کام نہیں کر سکتے بلکہ اب تک جو کچھ آپ نے کیا وہ غلط ہے' فراڈ ہے' اور آپ قابل سزا ہیں۔ گروپ بہت مہربان ہوا تو آپ کو صرف زندہ چھوڑ دے گا اور اگر آپ نے اس کی لکھی ہوئی اور چھپی ہوئی تقریروں کا حوالہ دیا (تقریریں ہوتی ہی اچھی ہیں) اور ایک آزاد شہری کی حیثیت کا مطالبہ کیا تو وہ آپ کا بھس بھر دے گا' پھر آپ گھر میں گھس کر بھی بیٹھ جائیں تب بھی وہ آپ کے دروازے پر تیغا لگا دے گا اور بس چلا تو آپ کے اور آپ کے

Prof. SHARIF RUDAULVI
COLLECTION

www.taemeernews.com

بس بھائی احمد حیات بس کرو، امریکہ کی ایسی تیسی۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ میں ہر میدان چھوڑ کر بھاگ رہا ہوں مجھے چھپ جانے دو۔ مجھے معاف کر دو، میں یہ نظم اپنے بچوں پر ممنوع قرار دے رہا ہوں اور تجویز پیش کرتا ہوں کہ اسے پچاس برس کے لیے پورے ایشیا میں بین یعنی بند کر دیا جائے۔ ہائے کیا بے وقت، بے موسم نظم لکھ گئے تھے علامہ مرحوم:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

معلوم نہیں میرے بچے اور سب ایشیائی بچے میری بات مانیں گے یا نہیں مانیں گے، مگر میں نے یہ نظم بھلا دی ہے، میں اسے مکمل طور پر بھول رہا ہوں۔

اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں
اے اللہ میں تجھ سے تیری امان چاہتا ہوں

اے دوستو، بزرگو، افسرو! میں نے اللہ کی امان مانگ لی ہے، اب تم بھی مجھے معاف کر دو — یا کم از کم مجھے بھول جاؤ۔ ابھی نہ جانے کتنا سفر حیات باقی ہے۔

www.taemeernews.com

گریٹ عظمتیں اور میں

"جب ایک آدمی عوام کا اعتماد حاصل کرلے تو اسے چاہیے کہ خود کو عوام کی ملکیت سمجھے۔"

یہ مقولہ مشہور مدبر، تاریخ داں، فلاسفر اور صدر امریکہ ٹامس جیفرسن کا ہے۔ ٹامس جیفرسن جو انیسویں صدی کے اوائل میں امریکہ کا صدر بھی رہا اور دنیا میں پہلی حزب اختلاف کا بانی بھی۔

اب ذرا اس قول کی غیر معقولیت پر غور فرمائیے، ایک تو آدمی محنت کرے، روپیہ خرچ کرے، پارٹیاں بنائے، طرح طرح کی مخالفتیں برداشت کرے۔ تب کہیں جا کر عوام کا اعتماد حاصل کرے اور جیفرسن صاحب کہتے ہیں جب وہ ایسا کرلے تو خود کو عوام کی ملکیت سمجھنے لگے یعنی عوام کا غلام ہو جائے۔ بھئی کیا خوب۔ جبھی تو انیسویں صدی بھولے بادشاہوں کی صدی کہلاتی ہے۔

اور سنیئے ایک عظیم امریکی مصنف کا قول بھی ملاحظہ کیجیے۔ ان حضرت کو آپ جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں ان کی دو چار کتابوں پر جو فلمیں بنی ہیں وہ ضرور دیکھی ہوں گی مثلاً فیر ویل ٹو آرمز، یا فار ہوم دا بیل ٹالز، یا دی سن آلسو رائزز۔ ان میں سے ایک میں تو اپنی انگرڈ برگ مین نے کام کیا تھا اور ایک میں میری اور آپ کی محبوبہ ایوا گارڈنر بھی تھی۔ ان حضرت کا نام تھا ارنسٹ ہیمنگوے۔ انھیں ۱۹۵۴ء میں ادب کا نوبل انعام بھی ملا تھا۔ بڑے خوش مذاق، ہمہ اپنے امیر کبیر آدمی تھے اور جب یں امریکہ میں تھا تو اپنی شکاری بندوق سے خودکشی کرکے مر گئے۔ کسی کو اپنے مرنے کی وجہ بتا کر بھی نہیں گئے۔ فرماتے ہیں:-

"اہل قلم تنہائی کی زندگی گزارتے ہیں یعنی اصل میں ان کے ہم خیال بہت کم ہوتے ہیں۔ ان کی تنظیمیں ان کے احساس تنہائی کو کسی حد تک کم کردیتی ہیں مگر یقین نہیں کہ یہ ادارے ان کی تحریروں کو بہتر بنا سکیں۔"

www.taemeernews.com

یہاں حال یہ ہے کہ میاں جمیل الدین عالیؔ رائٹرز گلڈ کے سائے تلے سب چھوٹے بڑے ادیبوں کو جمع کرنے کے چکر میں مبتلا ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُن کی آن بان بڑا ادب ڈھیروں پیدا ہونے لگے۔ میاں عالیؔ کی بات تو چھوڑیئے کہ کچھ لکھنے لکھانے کا شوق تھا یا ہے یہاں تو ہر وہ آدمی جو ذرا اچھے عہدے پر گیا اور ہاتھ میں طاقت آئی ادب اور آرٹ اور موسیقی اور جملہ فنونِ لطیفہ کا مالک و مختار بن بیٹھا ہے بجائے فن کی خدمت یا دوسرے الفاظ میں سرپرستی کرنے کے وہ جملہ اہلِ فن پر حاکمیت کے دعوے کرنے لگتا ہے اور جو اس سے نظری اختلاف بھی کرے اسے پھانسی لگوا دینے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اور میاں سچ یہ ہے کہ ایسے ماحول میں اس سے اختلاف بھی کون کرسکتا ہے۔

اب آپ امریکیوں کے مقولوں میں مبتلا ہو گئے ہیں تو ایک مقولہ ایک نیگرو (یعنی حبشی خاتون) کا بھی سنتے چلیئے۔ ہے تو ہمارے ماحول کے لیے بیکار مگر

شاید کہ ترے دل میں اُتر جائے کوئی بات

یہ خاتون امریکہ کی سب سے بڑی مغنیہ سمجھی جاتی ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں پاکستان بھی آئی تھیں اور ۱۹۵۸ء میں انھیں صدر آئزن ہاور نے اقوامِ متحدہ میں امریکہ کا مندوب بھی مقرر کیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ حبشیوں کو پھسلانے کی ایک معمولی سی چال تھی۔ اس زمانے میں حبشی احتجاجات کا زور تھا اور میری اینڈرسن نے تو بے پناہ مقبولیت حاصل کی تھی۔ صدر صاحب نے سوچا چلو دنیا دکھاوے کو ایک تماشا یہ بھی کر چلو۔

میری اینڈرسن کو بامِ شہرت تک پہنچنے میں بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں۔ سفید امریکی نقاد اور موسیقی کی انجمنوں پر کنٹرول رکھنے والے انھیں آگے بڑھنے نہیں دیتے تھے۔ ان کا کالا رنگ ان کے لیے سب سے بڑی دیوار تھی مگر ـــــ اب خود انھیں کا قول سنیے:

"ایسے لوگ بہت ہوتے ہیں جو حق کے مطابق کام کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ کون سی بات حق ہے لیکن اس کے باوجود وہ پہلا قدم اٹھانے میں جھجکتے ہیں اور منتظر رہتے ہیں کہ کوئی دوسرا پہل کرے۔

عین ممکن ہے کہ وہ بھی آپ کے منتظر بیٹھے ہوں! اور جب کوئی بااثر آدمی کسی بڑے عزم کے ساتھ فراخدلی کے رستے پر چل پڑتا ہے تو لوگ کثرت سے اس کی پیروی کرنے لگتے ہیں"۔

آپ نے دیکھی میری اینڈرسن کوئی بہت بڑی نہیں صرف ایک مغنیہ ایک گلوکارہ ہیں لیکن بات کیسی بقراطی کی کرب ناک ہیں؟ ایسی نہیں تو اس سے ذرا کم بقراطی ہم بھی جھاڑ سکتے ہیں لیکن ہم میں اور امریکہ میں ذرا سا فرق یہ ہے

www.taemeernews.com

کہ وہاں بات کہنے کے لیے بڑے عہدے یا بڑی آمدنی کی شرط نہیں ہے۔ یہاں نہ صرف عہدے اور آمدنی کی شرط ہے بلکہ اور شرطیں بھی ہیں مثلاً آپ کس صوبے کے آدمی ہیں، کس شہر کے ہیں، کس برادری کے ہیں، کس گوت کے ہیں..."

سو جناب صدر ٹامس جیفرسن سے لے کر میرین اینڈرسن تک سب امریکی بقراطوں کو سلام۔ بہنیں بھائی لوگو تمھاری بات تمھارے ساتھ، ہماری ہمارے ساتھ۔ تم اپنے گھر میں خوش ہم اپنے گھر میں خوش۔ آؤ ہمیں اپنا ملک ذرا جلدی جلدی دکھاؤ کہ ہم مغربی ساحل سے ہوتے ہوئے براہ جاپان اپنے وطن پاکستان جانا چاہتے ہیں۔

یہ نیویارک میں بندر روڈ کراچی کا جوتشی دیکھیے۔ فرق یہ ہے کہ اپنا جوتشی پٹڑی پر دری بچھا کر بیٹھتا ہے اور امریکی جوتشی پٹڑی پر ایک ڈبا اور ڈبے کے پیچھے کرسی لگا کر بیٹھا جاتا ہے۔ وہ ستاروں کی چالوں کے چکر میں نہیں پڑتا۔ ستاروں کی چالوں میں ناخواندہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔ عام امریکی چونکہ پڑھنا جانتے ہیں اس لیے ستاروں پر کتابیں پڑھ لیں گے اور جوتشی جی کا کام چوپٹ ہو جائے گا۔ اس لئے امریکی جوتشی نے پڑھے لکھے امریکیوں کے مزاج کے مطابق اپنا کاروبار تحریر سے کردار اور کردار سے قسمت پڑھنے کی مہارت سے چمکایا ہے۔ یہ نیویارک ہی کی ایک پٹڑی ہے جہاں ان جوتشی جی کی دکان بھی خالی نہیں رہتی۔ یہ سامنے دیکھیے وہ آپ کو آپ کی محبت، دولت، مذہب، احباب، بیماری، شخصیت وغیرہ سب کے بارے میں آپ کی تحریر پڑھ کر بتا سکتے ہیں۔

سچ ہے سائنٹفک ملک کا جوتشی بھی سائنٹفک ہونا چاہیے۔

اور یہ رات کو ٹائم اسکوائر کا ایک کونا ہے۔ ٹائم اسکوائر جو نمبر ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶ گلیوں اور پانچویں چھٹی سڑک اور براڈوے کے درمیان ایک جگمگاتا ہوا علاقہ ہے۔ اس سامنے والی تصویر میں آپ سینما در سینما دیکھتے چلیے یہ چاروں طرف پھیلے ہوئے تقریباً سبھی تھرڈ کلاس ہیں۔ ۸۰ سینٹ کا ٹکٹ یعنی اپنے حسابوں ۸۰ پیسے کا ٹکٹ لیجیے اور سارے دن بلکہ پوری رات تک بیٹھے رہیے کیونکہ یہاں قاعدہ یہ ہے کہ ایک بار ٹکٹ لے کر اندر چلے جائیے تو جب تک آپ باہر نہ آئیں کوئی آپ کو چیک نہیں کر سکتا۔ ہر سینما میں دو فلم دکھائے جاتے ہیں جب دوسرا فلم ختم ہو جائے تو پہلا پھر چلنے لگتا ہے۔ خود میں اپنی بے بسی کا انتقام لینے کے لئے ایک بار شام کے چھ بجے سے رات کے دو بجے تک ایک ہی سینما میں بیٹھا رہا۔ کھانا بھی وہیں کھایا، چائے بھی وہیں پی، پھر رات گئے بھوک لگی تو "سپر" بھی وہیں کھا لیا۔ یہاں تک کہ سو گیا۔ بس سونا غضب ہے سینما کے "دادا" تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ٹارچ لائٹ لے کر چکر لگاتے ہیں، جسے سوتا پائیں کان پکڑ کر نکال دیتے ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ سینما ایئرکنڈیشنڈ ہوتے ہیں اور گرمیوں میں نیویارک سخت حبس میں مبتلا رہتا ہے۔ غریب غربا اور عام طور پر حبشی مزدور جو ایئرکنڈیشنڈ ریسٹورانوں میں نہیں بیٹھ سکتے ۸۰ سینٹ کا ٹکٹ لے کر سینما میں بیٹھ

www.taemeernews.com

جاتے ہیں تفریح بھی ہوجاتی ہے اور ذرا آرام بھی مل جاتا ہے بس یہ بات "داداؤں" کو ناپسند ہے کیونکہ کوئی سوگیا تو باہر جانے کا نام ہی نہ لے گا اور دوسرے بحث والے جو وقت بے وقت اندر آتے رہتے ہیں احتجاج کریں گے۔

ایک طرف اسی ٹائم اسکوائر میں نیویارک پبلک لائبریری کی عمارت بھی واقع ہے یعنی وہ گلی نمبر ۴۲ اور سڑک نمبر ۵ پر واقع ہے اس لائبریری کے آگے ایک بہت چھوٹا سا پارک ہے۔ تھکے ماندے امریکی یہاں بھی بیٹھتے ہیں لیکن زیادہ تر بیٹھنے والے وہ لوگ ہیں جو اپنے جوتوں پر پالش کراتے ہیں۔ یہ حبشی لڑکا ایک سفید آدمی کے جوتے پر پالش کررہا ہے اب اُسے پندرہ سینٹ ملیں گے اور اگر سفید امریکی مہربان ہوا تو انعام کے دس سینٹ الگ دے گا۔ یہاں نرخ یعنی ریٹ کوئی خاص نہیں مگر میں نے کئی بار کے تجربے سے معلوم کیا کہ سفید بچہ چھوٹتے ہی ۲۵ سینٹ مانگے گا اور حبشی یا پورٹوری کن پندرہ سینٹ۔ ہائے مزدوری کے نرخ میں بھی سفید اور کالے کا فرق ہے۔ سو تو ہے۔ بلکہ سفید لڑکے تو بعض اوقات ہم جیسے گندمی رنگ کے جوتے والوں سے بدمزاجی بھی کر بیٹھتے ہیں ان کے پاس چاقو واقو بھی ہوتے ہیں زبان تیز اور رنگ کا احساس۔ کوئی کوئی تو پالش کرنے ہی سے انکار کردے گا لیکن عام طور پر وہ جلدی جلدی پالش کریں گے اور پھر ایک دم جھم کر کہیں گے:

"کوارٹر پلیز۔ سبے مسٹر۔ کوارٹر"

آپ نے کوارٹر یعنی پچیس سینٹ کا سکہ طوعاً وکرہاً دیا اور چلنے لگے مگر وہ پھر روک لیں گے۔

"نو ٹپ۔ وائی ناٹ۔ کم آن۔ گیو می ٹپ"۔

آپ پانچ سینٹ دینا چاہیں گے تو وہ منہ بنائے گا شاید واپس سڑک پر پھینک دے۔ دس سینٹ دیں گے تب بھی منہ بنائے گا مگر جیب میں ضرور رکھ لے گا۔

اور اسی ٹائم اسکوائر پر شام کو آپ یہ منظر بھی دیکھ سکتے ہیں کہ

آملے ہیں سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک

یہ جگہ گریٹ وائٹ وے بھی کہلاتی ہے اس کے بائیں ہاتھ کو شیرے ٹن آسٹر ہے اور دائیں ہاتھ کو روشن دکانیں ریستوران اور ناچ گھر۔ نہ معلوم یہ خاتون ان صاحب کے انتظار میں تھیں یا یہ صاحب ان خاتون کے منتظر تھے۔ بہرحال نتیجہ آپ کے سامنے۔ یہ اس قران السعدین کی سب سے پہلی منزل ہے جسے کیمرے کی آنکھ نے محفوظ کرلیا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پولیس والا سامنے کھڑا ہے مگر یہاں کسی کو کوئی گھاس ڈالتا ہی نہیں۔

www.taemeernews.com

"مگر جناب نہ تو ٹائمز اسکوائر پورا نیویارک ہے نہ صرف نیویارک پورا امریکہ ہے" ایک امریکی چیختا ہے
"اور نہ صرف امریکہ پوری دنیا ہے" جواباً عرض ہے۔

چنانچہ اب باقی نیویارک میں سے آپ کو صرف گرینچ ولیج یعنی موضع گرینچ کی سیر کرائی جائے گی جو دنیا بھر میں سب سے الگ اور ایک عجیب و غریب خطۂ زمین ہے اور جہاں دنیا بھر کے بچے اور بھولے آرٹسٹ شاعر نجومی، چور، اچکے، ڈاکو، شرفا، ادیب، پروفیسر بیک وقت ایک عجیب و غریب زندگی گزارتے ہیں۔

اس کا تلفظ ہے گری نچ۔ گو انگریزی میں لکھا اس طرح جاتا ہے GREEN WITCH ظاہر ہے کہ سیدھا تلفظ کیا جائے تو گرین وچ پڑھا جائے گا مگر خبردار ایسا کیا تو آپ جاہل سمجھے جائیں گے۔ ان اعتراضات کے لیے تو صرف ہماری زبان رہ گئی ہے کہ صاحب دیکھیے س۔ ص اور ث کی آواز ایک ہی ہے لیکن حروف تین ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بھائی یہ معاملہ انگریزی کا ہے اور وہاں بھی اس وقت نیویارک کے ایک مقام کا ذکر ہو رہا ہے، نیویارک جس کے کناروں سے ڈالر بھرے جہاز تمھارے فاقہ زدہ ملک کی طرف روانہ ہوتے ہیں!!

ہاں تو گرینچ ولیج چلیے۔ ٹائمز اسکوائر سے گرانڈ سینٹرل اسٹیشن پر آ جائیے جو خود ایک زیر زمین اسٹیشن ہے اور نہ جانے کتنا لمبا چوڑا ہے۔ خیر یہ ایک اسٹیشن ایک الگ کہانی ہے۔ فی الحال تو یہ جاننا کافی ہے کہ یہاں سے لمبے لمبے بھر نہ جانے کہاں کہاں کے لیے دور دراز اور خود نیویارک کے لیے مختلف مقامات کے لیے زیر زمین گاڑیاں چلتی ہیں اگر آپ مسافروں کے شور و غوغا سے ڈرتے ہیں تو ذرا اور نیچے اتر جائیے ایک پرسکون کشادہ ہال موجود ہے جہاں عام طور پر وہ مسافر آرام فرماتے ہیں جنھیں کہیں جانا نہیں ہوتا بلکہ جو سفر حیات سے تھک گئے ہیں اکتا گئے ہیں، بور ہو گئے ہیں اور جنھیں آرام دہ گھر یا سکون کا بیت میسر نہیں کہ اپنے آخری اوقات آرام سے گزار دیں معلوم ہوتا ہے امریکہ صرف نوجوانوں کا ملک ہے، بوڑھوں، بیکاروں، اپاہجوں کا کوئی ٹھکانا کہیں معلوم نہیں ہوتا۔ مگر خیر یہ بھی ایک الگ کہانی ہے جو چھاپ کر میری زبانی نہ سنی جائے۔

وہ دیکھیے گڑگڑاہٹ کی آواز آئی۔ بلد بھاگیے۔ ٹن سے مشین میں سکہ ڈال کر ٹوکن لیجیے اور ٹن سے ٹوکن دروازے میں لگی ہوئی مشین میں ڈال دیجیے۔ دروازہ کھل گیا سامنے ریل کھڑی ہے چونکہ یہ سینٹرل اسٹیشن ہے اس لیے یہاں تقریباً ایک منٹ ٹھیر جاتی ہے ورنہ پندرہ سکنڈ کا قیام اس کے لیے بہت ہے۔ بس اب شرمانے اور تکلف کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان خاتون یا ان خواتین کا لحاظ بالکل نہ کیجیے جو آپ سے پہلے اندر گھس جانے کے لیے تلی بیٹھی ہیں۔ ٹرام، ریل، ہوائی جہاز کے معاملے میں صنف کا فرق نہیں چلتا۔ ورنہ آپ کی عمر کھڑے کھڑے سفر کرتے گزر جائے گی۔ بس ایک دم جی کڑا کر کے آگے بڑھیے۔ ریل پیل میں دل و جان سے شریک ہو جائیے۔ دو ہاتھ

www.taemeernews.com

چاروں جیبوں پر رکھے رہیے۔ آنکھیں بھی چاروں طرف گھماتے رہیے تاکہ اگر برابر والا جیب کترا ہو تو آپ کو بھی جیب کترا سمجھے۔

اگر آپ کو یہ ریل گاڑی مل گئی تو پانچ منٹ میں گرینج ولیج کے قریب پہنچا دے گی ورنہ ؎

"یہاں کسی کو کسی کا پتا نہیں ملتا"

www.taemeernews.com

سیاہ بستی

یہ ہارلم ہے۔ ہالینڈ کا گل و گلاب والا ہارلم نہیں بلکہ دنیا کے امیر ترین طاقتور ترین ملک کے سب سے بڑے شہر نیویارک کا ایک خاصا بڑا علاقہ جہاں لاکھوں آدمی بستے ہیں جس کے عین وسط میں مشہور کولمبیا یونیورسٹی واقع ہے۔ مجھے ہارلم سے روز گزرنا پڑتا ہے۔ میں انٹرنیشنل ہاؤس نمبر ۵۰۰ ریورسائیڈ ڈرائیو میں رہتا ہوں۔ ریورسائیڈ ڈرائیو اس لمبی سڑک کو کہتے ہیں جو دریائے ہڈسن کے ساتھ ساتھ کئی میل چلی گئی ہے۔ انٹرنیشنل ہاؤس گلی نمبر ۱۲۵ کے سامنے بھی ہے اور اس کا پتا اس گلی سے بھی منسوب ہو سکتا تھا۔ مگر اس طرح "ہاؤس" کی بے عزتی ہو جاتی کیونکہ اگر آپ نیویارک میں کسی کو گلی نمبر ۲ سے گلی نمبر ۵ تک کسی گلی کا پتا دے دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کالے اور گھٹیا علاقے میں رہتے ہیں، آپ یقیناً یا تو کوئی مفلس طالب علم، دانشور، مزدور ہیں یا نووارد ہیں یعنی کسی نہ کسی طرح پچھڑے آدمی ہیں۔ چنانچہ اگر آپ اس علاقے میں کسی گلی کے نکڑ پر رہتے ہیں جس کے سامنے سے ریورسائڈ ڈرائیو گزرتی ہے تو آپ ملنے والوں کو ریورسائیڈ ڈرائیو کا پتا دیں گے جس کی شہرت خاصی اچھی ہے بلکہ نکڑ والے مکان داروں نے تو مکانوں کے نمبر بھی ڈرائیو کے نام سے لے رکھے ہیں۔ کرایہ معقول ملتا ہے عزت بنی رہتی ہے۔

میرا ریلوے اسٹیشن گلی نمبر ۱۲۵ والا ہے، مگر یہ اسٹیشن زیر زمین نہیں بلکہ ایک پل پر ہے۔ انٹرنیشنل ہاؤس کے بالکل سامنے تو دریائے ہڈسن ہے اور دائیں ہاتھ کو یہ پل والا زیر زمین یا بالائے پل اسٹیشن ہے چنانچہ میں لمبی مسافت کے لیے ادھر ہی سے جاتا ہوں۔ یہ پل بالکل ہارلم کا نقشہ ہے، دن کو بیکار لمبی لمبی بنچوں پر بیٹھے سو رہے ہیں رات کو لڑکھڑا رہے ہیں، لڑ رہے ہیں، گالیاں دے رہے ہیں، غنیمت ہے کہ ریل جلد جلد آتی ہے اور مسافروں

www.taemeernews.com

کو کے کر دو منٹ میں پیچ مچ زیر زمین ہو جاتی ہے۔

جب میرے پاس وقت ہو تو میں ہارلم میں گھومتا ہوں۔ ہارلم جو ایک سفید جنت میں سیاہ جہنم کی طرح ہے۔ یہاں زیادہ تر مکان خاصے پرانے بے رنگ اور مرمت طلب ہیں۔ سڑکوں پر گندگی اور رہنے والوں کے چہروں پر آشفتگی ہے۔

یہ سب اس لیے کہ یہاں کے رہنے والے زیادہ تر نیگرو اور دیگر غریب کلاس کے یعنی اطالوی اور پورٹوریکن ہیں جیٹ پٹے کے وقت آپ گلی ۱۲۰ یا ۱۲۱ میں آہستہ آہستہ خرام فرمایئے۔

"ہے مسٹر۔ وانٹ گڈ ٹائم" (کوئی تفریح چاہیے!)

"یس"

"نو پروسٹی ٹیوشن" (رنڈی بازی نہیں ہوگی)

"پھر کیا ہوگا"

"گڈ ٹائم۔ اونلی گڈ ٹائم" (تفریح۔ صرف تفریح)

"کس قسم کی"

"گڈ ینگ گرل۔ ون ڈالر فار اے لانگ کس" (عمدہ اور جوان لڑکی ایک ڈالر میں ایک طویل بوسہ)

"بس"

"یس۔ ون اِف شی لائکس یو شی کین بی یور فرینڈ" (ہاں۔ پھر اگر وہ تمھیں پسند کرے تو وہ تمھاری دوست بن سکتی ہے۔)

"اچھا چلو"

"ففٹی سینٹ ایڈوانس پلیز" (پچاس سینٹ یعنی نصف ڈالر ایڈوانس)

میں سوچنے لگا۔ پھر مجھے ایک ترکیب سوجھی

"ایک ڈالر میں دیتا ہوں پیار تم کرو"

"وات۔ وائی"

"بس یہی بات ہے میں صرف دیکھوں گا"

[illegible] وہ تھوڑا سا گھبرایا۔

وہ نازنین سامنے والے فلیٹ کے نیچے ہی کھڑی تھی۔ یہ حضرت اس کے دلال تھے یا عاشق تھے؛ نہ جانے

www.taemeernews.com

کیا تھے، مگر اس سے ناراض معلوم ہوتے تھے اپنی جگہ سے دور نہیں جاتے تھے۔ یوں بھی ایک ڈالر میں ان کا کیا کمیشن ہوگا پچیس یا تیس سینٹ۔ گاہک بھی چلتے چلاتے ملتا ہوگا جیسے میں مل گیا۔

جب انھوں نے میری تجویز بتائی تو وہ بہت خفا نظر آئی، اس نے جلتی ہوئی سگریٹ میری طرف پھینکی اور چھپاکے سے اوپر چڑھ گئی۔

وہ نازنین گندمی رنگ کی تھی۔ اطالوی تھی یا پورٹوریکن ——"

"یو مسٹر۔ یو آر اے فول" انھوں نے مجھ پر رحم کھایا" تم نے اپنے پچاس سینٹ ضائع کیے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ نشہ وشہ کرتے ہو یا نہیں؟"

"کیسا نشہ، شراب وغیرہ۔ اس کے لیے تمھاری کیا ضرورت ہے۔"

"نہیں شراب نہیں۔ شراب تو بالکل بوگس چیز ہے، میں تمھیں فرسٹ کلاس نشہ صرف دو ڈالر میں مہیا کرتا ہوں۔ ایک انجکشن لگواؤ اور تماشا دیکھو۔"

مجھے اس کا تجربہ پہلے سے تھا مگر ان حضرت سے دلچسپی ہوگئی تھی۔ ان کے کپڑے میلے تھے مگر آدمی خوبصورت اور چرب زبان تھے۔ معلوم ہوتا تھا نووارد ہیں۔

"تم میرے ساتھ کھانا کھاؤ اور یہ ساری باتیں بتاؤ تو میں تمھیں پانچ ڈالر دوں۔"

"پانچ ڈالر۔ اوہ کیا تم جاسوس ہو یا کوئی مصنف۔"

"مصنف"

"میں نام وغیرہ نہیں بتاؤں گا۔"

"نہیں بتانا۔"

"بات یہ ہے کہ ہم لوگ ابھی تک اس ملک میں جمے نہیں۔ امریکی ہم سے سارے تھرڈ کلاس کام کراتے ہیں۔ یہ جو تم ستر ستر منزل کی عمارتیں دیکھتے ہو، ان کی کھڑکیاں صاف کرنا، شیشے لگانا، باہر سے سفیدی یا رنگ کرانا۔ یہ سب کام ہم لوگ کرتے ہیں، بہت دقت طلب کام ہے۔ ذرا غور کرو کہ پچھترویں منزل سے دو رسیاں ڈال کر ایک کھٹولا بندھا اور اس میں بیٹھے جو بہترویں منزل پر کوچیاں پھیر رہے ہیں۔ نیچے نظر جاتی ہوگی تو کیا حال ہوتا ہوگا اور مزدوری بہت کم۔"

"تم کتنا کما لیتے ہو۔"

"میں تو اس طرح کماتا ہی نہیں۔ ایک بار جھولے میں بیٹھا تھا، نیچے نظر ڈالتے ہی بے ہوش ہوگیا۔ دو تین گھنٹے بیہوش اسی میں لٹکا رہا۔ جب دوسرے ساتھی جمع ہوگئے اور مجھے نہ پایا تو اوپر آکر مجھے کھینچا، نا بابا یہ کام میں

www.taemeernews.com

نہیں کر سکتا۔ میں ذرا نازک مزاج ہوں۔"

"اچھا تو پھر تم اس دھندے میں آگئے۔"

"پھر کیا کرتا۔ مگر معاف کرنا، میں اس دھندے کو بہت برا سمجھتا ہوں۔ اچھی نوکری مل جائے تو چھوڑ بھی دوں۔ خطرے بھی تو ہیں اس میں۔" آہ بھرتے ہیں اور پھر داستان شروع کر دیتے ہیں۔

"یہی حال ہماری لڑکیوں کا ہے۔ امریکی لڑکی کو کم از کم نوے ڈالر فی ہفتہ ملتے ہیں۔ ٹائپسٹ ہو یا کلرک جو کم سے کم نوے ڈالر فی ہفتہ ملے گا اور ہماری لڑکی کو کام بھی نہیں ملے گا، ملے گا تو صفائی کا، چوکیداری کا، بچوں کی رکھوالی کا۔"

"کیوں وہ ٹائپسٹ کیوں نہیں ہو جاتیں۔"

"عام طور پر امریکی ادارے ہماری لڑکیوں کو ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سکھاتے ہی نہیں۔ قانوناً انکار نہیں کرتے، جیسے قانوناً کالے اور سفید برابر ہیں مگر عملاً برابر نہیں ہیں، اسی طرح دیگر سہولتوں کا حال ہے کہ کھلی سب کے لیے ہیں۔ مگر کسی نہ کسی بہانے سے ہماری قوم کی ہمت شکنی جاری ہے۔ اوہ سر یہ لوگ ہیں کچھ اور نظر کچھ اور آتے ہیں۔ ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ چند رفاہِ عام کے اور خیراتی ادارے ہیں جو کبھی تفریق روا نہیں رکھتے ہمارے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کرتے رہتے ہیں اور بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے اور ہمارے مسائل بہت زیادہ ہیں۔"

"اس لیے تمھاری لڑکیاں ایک ڈالر میں بوسہ دیتی ہیں۔"

"آہ۔ مجھے معاف کر دو۔" اب ہم دوستوں کی طرح باتیں کر رہے ہیں گاہک اور دلال کی حیثیت سے نہیں۔

"بس یہ ایک مرض ہے جو عام ہو گیا ہے۔ جب اقتصادی بدحالی آتی ہے تو خواہ وہ چلی بھی جائے لوگوں کی عادتیں خراب ہو جاتی ہیں۔ ایک ڈالر کا تو بہانہ ہے اصل قصہ وہی لمبی دوستی کا ہے یعنی آپ کسی کو پیار کرتے ہیں فوراً بھاگ تو نہیں جاتے کچھ بات چیت بھی کرتے ہیں نا بس پھر بات آگے چل پڑتی ہے۔ آئی۔ ایم سوری مسٹر۔"

"اور یہ نشے کا کیا چکر ہے۔"

"یہ بھی سفید امریکیوں کی تجارت ہے ہم تو صرف دلال ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہاں تقریباً سبھی کالے گورے پریشان رہتے ہیں، کھاتے پیتے لوگ بھی پریشان رہتے ہیں۔ ان کے اعصاب ہر وقت تنے رہتے ہیں۔ کچھ لوگ جب بد خواب ہو کر کمزور ہو جاتے ہیں تو پھر خرابی کی طرف جلد چل پڑتے ہیں۔ امیر کبیر لوگ تو داشتائیں رکھ لیتے ہیں یا سیر و سیاحت کرتے ہیں۔ باقی لوگوں کو کسی نہ کسی تفریح کی ضرورت ہوتی ہے جو تھوڑی دیر تو سب کچھ

www.taemeernews.com

بھلا دے۔ ان کے لئے ہیروئن آتی ہے۔ ہیروئن یہ چیز یہاں یوں بھی قانوناً ممنوع ہے اس لیے یورپ اور مشرق وسطےٰ سے ناجائز طور پر لائی جاتی ہے اس کے بڑے بڑے ریکٹ ہیں۔ بڑی مہنگی چیز ہے مگر اس میں خوب ملاوٹ بھی کی جاتی ہے۔ دو ڈالر کا ایک انجکشن بہت معمولی سا مزا دیتا ہے مگر اس کا خاص مزا ہوتا ہے، اس میں عیب یہ ہے کہ اگر کوئی دو چار مرتبہ باقاعدگی سے انجکشن لگوائے تو پھر عادی ہو جاتا ہے اور اگر وقت مقررہ پر انجکشن نہ لے تو مچھلی کی طرح تڑپنے لگتا ہے بس اس طرح مالک لوگ اپنے بڑے بڑے گروہ جمع کر لیتے ہیں اور کاروبار بھی مضبوط رہتا ہے اسی لیے شروع شروع میں خالص مال کے انجکشن دیئے جاتے ہیں کہ نیا پنچھی اچھی طرح پھنس جائے، جو لڑکے بالے اس چکر میں آ گئے "انھیں پہلے مفت کا مزا لگایا جاتا ہے پھر ان سے انجکشن بکواؤ، چوری کراؤ، قتل کراؤ، وہ سب کام کریں گے۔ جو عورتیں اس میں مبتلا ہوئیں ان کا حال اور بھی خراب ہوتا ہے"

" اور اس کی اصلاح کوئی نہیں کرتا۔"

" اجی اصلاح بھی ہوتی رہتی ہے مگر کیسے ہو سکتی ہے۔"

اب ایک نیگرو "بدمعاش" بھی میرے دوست بن گئے ہیں یہ حضرت ہارلم کی ایک نامی گرامی شخصیت ہیں دو بار جیل ہو آئے ہیں۔ لیکن اب ان کا کاروبار بڑھا ہوا ہے قابل وکیلوں کی خدمات بھی حاصل ہیں اور سارا کام صدر دفتر میں صرف حکم سے چلاتے ہیں، کارندے دوسرے ہوتے ہیں وہ پکڑ لیے جائیں انھیں آنچ نہیں آتی۔ ان سے میں کیسے ٹکرا گیا یہ ان کا راز ہے جس کے افشا کی مجھے اجازت نہیں۔

" ارے صاحب میں ایک گروہ بند غنڈا بدمعاش ہوں اور اب غنڈا ہی مروں گا مگر آپ یقین کیجیے کہ میری تین چوتھائی آمدنی نیگرو قوم کی بہبود پر خرچ ہوتی ہے اور میرے اشارے پر ایک جرم بھی نیگرو علاقے یا نیگرو کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ صرف سارے سفید فاموں کو شکار بناتا ہوں۔ اچھا اب ان ڈیوڈ صاحب کے ساتھ جا کر ہارلم کے چند مکانات ضرور دیکھ آیئے۔"

ڈیوڈ صاحب ایک بالکل جاہل اور فرمانبردار غنڈے ہیں، وہ مجھے لے کر دسیوں مکانوں میں بے دھڑک گھس جاتے تھے کیونکہ انھیں جاننے والے بہت تھے اور صاف ظاہر تھا کہ غنڈا گردی کے ساتھ ساتھ وہ امداد غریباں کا کام بھی کرتے ہیں۔

یہ بیشتر ایک ایک کمرے کے فلیٹ تھے جن میں آٹھ آٹھ آدمیوں کا خاندان رہتا تھا۔ پاکستانی اعتبار سے بھی ایک چھوٹے سے کمرے میں آٹھ آدمیوں کا کھانا اور سونا ذرا عیب دار بات ہے، لیکن امریکی اعتبارات سے تو یہ غیر انسانی زندگی ہے، خاص طور پر نیو یارک میں جہاں پارک ایونیو جیسے علاقے ہیں، جہاں ایک ایک گھر میں

www.taemeernews.com

بیس کمروں کا ہے اور رہنے والے صرف دو یا تین اور کبھی کبھی صرف ایک۔

آٹھ آدمیوں میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں۔ بچے دن کو اسکول گئے، عورتیں اور مرد بھی کام پر گئے مگر رات کو سونے کا انتظام یہ ہوتا ہے کہ یار لوگ کمبل بچھا بچھا کر برابر لیٹ جاتے ہیں۔

ہاں جناب یہ امریکہ ہے بلکہ نیویارک ہے۔

یہ گھر سخت گندے اور بدبودار ہیں۔ فرنیچر بہت ہوا تو ایک کھانے کی میز کیونکہ نیگرو نیگرو ہوتے ہوئے بھی امریکی ہے اور فرش پر بیٹھ کر کھانا نہیں کھا سکتا۔ حالانکہ بسا اوقات اس طرح بھی کھانا ہی پڑتا ہے۔

اس افراتفری کے نتیجے میں یہ چھ سات لاکھ آدمی ہر وقت ایک ہیجان میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان کو گمراہ کرنے والے گروہ بھی پیدا ہو گئے ہیں جو جنگ حقوق اور اصلاح معاشرہ کے نام پر اپنی ہی قوم کے پیسے کھا جاتے ہیں، ان کے لیڈروں میں ہر وقت لڑائی ٹھنی رہتی ہے، اس لئے آج تک نیویارک شہر کے نیگرو ایک جھنڈے تلے جمع نہیں ہونے پائے، عورتیں بدمزاج، مرد تندخو ہو چکے ہیں، بات بات پر چاقو نکال لینا معمولی بات ہے اور ظاہر ہے کہ جب چاقو بار بار نکلے گا تو کبھی کبھی چل بھی جائے گا اور کبھی کبھی چلتے چلتے بار بار بھی اور پھر ہر وقت چلنے لگے گا۔

"ہائے ہارلم کی تباہی مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔" ایک نہایت بڈھے پولش امریکن نے وعظ فرمایا "آج سے صرف چالیس پچاس برس پہلے یہ شہر کا ایک فیشن ایبل علاقہ تھا۔ آپ پرانے مشاہیر کے پتے پڑھیے تو بہت سے لوگ ہارلم میں ملیں گے مگر رفتہ رفتہ یہاں کالے لوگ بسنے شروع ہو گئے اور جب کالے لوگ بسنے لگے تو سفید آبادی بھاگنے لگی اور جب کالے لوگ کسی آبادی میں آتے ہیں تو بھوک ظلم اور جرائم ساتھ لاتے ہیں۔ نو مسٹر تم ان لوگوں کی فطرت نہیں سمجھ سکتے۔"

مسٹر چپ بیٹھے ہیں کیونکہ مسٹر کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ انسانی فطرت سے رنگ کا کیا تعلق ہے، ان بزرگ امریکن کے حساب سے تو کالے کی فطرت خراب اور سفید کی فطرت اچھی ہوتی ہے، اقتصادی حالات اور تعلیم و تربیت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

"جی ان کی اقتصادی حالت لاکھ سدھر جائے یہ ایسے ہی رہیں گے" بزرگ امریکن منہ بند کر دیتے ہیں۔

تو یہ ہارلم ہے۔ جرائم پیشہ، خطرناک ہارلم۔ یہاں کالا ابراڈوے بھی ہے جہاں بڑے بڑے روشن نائٹ کلب ہیں مگر عام طور پر سفید ناچنے والیاں ادھر نہیں آتیں "حسن سیاہ رنگ" ہی سے کام چل جاتا ہے یا اطالوی جرمن اور دیگر یورپین جانتے آتے ہیں نیگرو بھائی خوب جم کر شراب پیتے ہیں اور پھر جم کر لڑتے ہیں۔ سفید فام ان

www.taemeernews.com

مقامات میں گھس آئیں تو کھل کر انھیں نہیں روکتے لیکن فحش گیتوں نسلی طعنوں اور اشاروں سے ان کی زندگی حرام کر دیتے ہیں یہاں زیادہ تر پولیس والے بھی کالے ہی لگائے جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے اپنے کو اپنا سا جھے۔

آج بھی ہارلم میں رات کو نو دس بجے کے بعد اکیلے گھومنا بڑی جوانمردی کی بات ہے' میں کئی بار گھوما مگر اکیلا نہیں بلکہ دو چار دوستوں کے ساتھ جو اکثر نیگرو ہوتے تھے مگر نیگرو ہونا خطرے سے بچ جانے کی ضمانت نہیں۔ جب جرم کی آندھی چل پڑتی ہے تو رنگ وروغن نہیں دیکھتی۔

رات کے ہنگاموں کے بعد دن کو کام کے ساتھ ساتھ اجتماعات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے' عام طور پر کالے جلوس ہارلم سے نکلتے ہیں اور شام اسکوائر کے قریب جا کر ختم ہوتے ہیں' اگر جلوس پیدل ہے تو ہارلم ہی میں شور مچا کر رہ جاتا ہے اور گاڑیوں کا ہے تو یو۔این تک پہنچ جائے گا۔ مگر چونکہ نیگرو مسئلہ مقامی یعنی ملکی ہے' اس لئے یہ جلوس یو۔این والوں کو پریشان نہیں کرتے گھوم پھر کر آجاتے ہیں اور اگر جنرل اسمبلی ہو رہی ہے تو خود پولیس ان جلوسوں کو یو۔این تک نہیں جانے دے گی۔

تو یہ ہارلم ہے۔ سفید امیر شہر میں غریب سیاہ بستی۔ لاکھوں حبشیوں کا گھر جو پیدائشی امریکی ہیں اور اس بات کے حقدار ہیں کہ انھیں اچھے روزگار۔ اچھے مکان اور غیر امتیازی سلوک سے نوازا جائے۔ مگر یہ سیدھی سادی بات بڑی پرانی پٹی ہوئی اور رمانی ہوئی بات ہے اسے کون مانتا ہے' اُدھر ہی نہیں اِدھر بھی کون مانتا ہے۔ یہ لوگ بروکلین کا پل بنا سکتے ہیں' ایمپائر اسٹیٹ کا پل بنا سکتے ہیں' ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ بنا سکتے ہیں' زمین دوز کلب' سوئمنگ پول بنا سکتے ہیں مگر سیاہ فاموں کو اپنے مکان خود بنانے پڑیں گے۔

"مسٹر عابدی آپ اس غریب سیاہ فام کنبے کو دیکھ رہے ہیں یہ لوگ اپنے حالات تو درست نہیں کر سکتے مگر فیڈرل ٹیکس ضرور دیتے ہیں کیونکہ ان کی آمدنی بہرحال ٹیکس کے قابل ہے۔" ایک نیگرو بقراط نے تقریر جھاڑی۔ وہ سخت باتونی تھے اور میں ان سے گھبراتا تھا۔

"جی ہاں' جی ہاں" میں نے ایسے کہا جیسے تنگ آ چکا ہوں۔

"ذرا ٹھہرئیے آج میں اپنی بات بہت مختصر کر رہا ہوں۔"

"فرمائیے"

"میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ خاندان بھی ٹیکس دیتا ہے۔"

"جی"

"اور جناب آپ کے ملک کو جو مختلف قسم کی امریکی امداد ملتی ہے اس میں سے کچھ حصہ اس خاندان

www.taemeernews.com

کے نیکس کا بھی تو ہوگا:"

"ضرور ہوگا" میں گھبرانے لگا۔

"بس میں یہی عرض کرنا چاہتا تھا"

"یعنی"

"مطلب آپ خود سمجھ لیجیے۔"

مگر اتنے دن ہونے کو آئے ہیں ان کا مطلب نہیں سمجھ سکا ہوں۔!!!

"یار یہ لڑکی بالکل لڑکا لگتی ہے"۔

ہم نیویارک شہر کے ایک محلے گرینچ ولیج یعنی موضع گرینچ میں کھڑے ہیں، سامنے کیفے ذگار رو سے ایک بانکی ترچھی چھوٹے چھوٹے بالوں والی حسینہ نکل کر ہمیں کھلے کھلے اشارے کر رہی ہے، اس کے ہونٹوں پر سرخی کی موٹی تہہ جمی ہوئی ہے، آنکھوں میں کاجل اور

چال چلے متوالی

"مگر یار وہ یہ لڑکی لڑکا کیوں لگتی ہے"۔

ایک تو میں نووارد وارد دوسرے میرے ساتھی ایک اور پاکستانی پرسوں پہلی بار امریکہ تشریف لائے ہیں۔ وہ بالکل بوکھلائے ہوئے ہیں بار بار اس پیکر جمال کی اصلیت جاننا چاہتے ہیں۔

"ہے اسٹرینجرز کم آن اِن، ہیولے ڈرنک اینڈ گومی اے ڈرنک (اے اجنبیو آؤ پیو اور مجھے بھی پلاؤ)

آخر کو وہ حسینہ ہمیں مبہوت دیکھ کر آواز لگاتی ہے اور ہمارے قلبے ایک دم مسمار ہو جاتے ہیں ہمیں امید تھی کہ

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک

والا معاملہ ہوگا مگر وہ آواز سخت دلخراش بھاری اور بھونڈی نکلی۔

وہ لڑکی سچ مچ لڑکا تھی یا تھا پتا نہیں اہلِ نحو یہاں کیا لکھیں گے اور اہلِ زبان کیا فرمائیں گے، بندہ تو اب صرف ایک خالی جھولی والا اردو وال ہے، زبان اور محاورے کے آخری گجرے اللہ بخشے چچا سائل مرحوم کی تہہ میں ہی دبی پڑی رہ گئی تھی۔

"واٹ از یور نیم (تمہارا نام کیا ہے) میں دل کڑا کر کے آگے بڑھتا ہوں۔

"[illegible]"

"[illegible] ...... وہ تو مشہور ایکٹرس ہے۔"

www.taemeernews.com

"اور میں اس کا باپ بلکہ اس کی اماں ہوں۔ آؤ بیٹھو کچھ پلاؤ مجھ سے بات کرنا مذاق نہیں میں بڑی مہنگی چیز ہوں"

"فگارو" گرینچ ولیج کا شاید سب سے مشہور ریستوران ہے اور سب سے بڑا بھی۔ بڑے کا مطلب یہ کہ اوپر کوئی ڈیڑھ سو آدمیوں کی کرسیاں ہیں اور زیر زمین بھی کوئی سو کے قریب تماشبین بیٹھ سکتے ہیں۔

گرینچ گاؤں نیویارک سے دور کوئی گاؤں نہیں قصبہ نہیں بلکہ خالص نیویارک کا ایک حصہ ہے' نیویارک یونیورسٹی خاص اسی علاقے میں واقع ہے، جہاں چھبیس ہزار طالبات وطالبان علم پڑھتے ہیں۔ یہ علاقہ شہر کے دقیانوسی کونے پر ہے چھوٹے چھوٹے نیچے نیچے مکان بہت چھوٹی پیچیدہ پراسرار اور گندی گلیاں اور ان میں ایک عجیب غریب ہنگامہ۔ بیار ہتا ہے' دن بھر کے تھکے ہوئے مشینی زندگی اور اونچی اونچی عمارتوں سے گھبرائے ہوئے امریکی ایک دوسری دنیا دیکھنے اِدھر چلے آتے ہیں اور سیاحوں کے لیے تو گرینچ ولیج ایک کمپلسری یعنی لازمی مضمون ہے۔

"بھئی ایوا گارڈنر ہمیں پورا علاقہ دکھانے کے کیا دام ہوں گے۔"

"آئیں' کیا میں ٹورسٹ گائیڈ ہوں' شٹ اَپ۔"

"اوہ سوری"

"میں تو ایک BELOVED (محبوب یا محبوبہ) ہوں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔"

"اچھا لاؤ دس ڈالر دو تو میں تھوڑی دور ساتھ چلوں۔"

"دس ڈالر بہت ہیں۔"

"دے دو یار دے دو' پانچ میں دوں گا پانچ تم۔" گھبرائے ہوئے نو وارد پاکستانی بھائی نے اصرار کیا۔ بات یہ تھی کہ ابھی ان کا زرمبادلہ ذرا محفوظ تھا' انھیں آئے دو ہی دن ہوئے تھے اور بندہ چل چلاؤ کے عالم میں تھا۔

"پانچ ڈالر ایوا گارڈنر۔ ہم غریب ایشیائی ہیں۔" میں جما رہا۔

"او گو آن۔ شٹ اَپ۔ گٹ آؤٹ" وہ مخلوق واپس فگارو میں گھس گئی اور اس کے پیچھے ہم بھی جا کر الگ بیٹھ گئے اور پھر

ان آنکھوں نے کیا کیا تماشا نہ دیکھا

لڑکے لڑکیاں اور لڑکیاں لڑکے بنے ہوئے ہیں، مرد عورتیں' عورتیں مرد۔ لباس اور آدابِ خرق کے مشرقی معیار تو خیر یہاں چل ہی نہیں سکتے۔ سوٹ پہننے' ٹائی لگانے والا صاف اجنبی اور باہر والا یا ٹورسٹ سمجھا جاتا ہے۔ کافی جو نیویارک میں زیادہ سے زیادہ ۲۵ سینٹ کی ملے یہاں ایک ڈالر کی ملتی ہے اور وہ بھی

ٹھنڈی بے ذائقہ۔ کھانا ہم نے کھایا نہیں شراب عام طور پر امیر امرا ہی پیتے ہیں اصل میں تو لوگ یہاں کے "ماحول" کا مزا لینے آتے ہیں۔

یہ الگ بات ہے کہ میں اس ماحول کو نہیں سمجھ سکا مہذب اور امیر مغرب کے لیے یقیناً خراب رنگدار کپڑوں لمبے لمبے جوں دار بالوں میلی کچیلی داڑھیوں میں کوئی بات ہوگی۔ یہاں اس ملک کے رہنے والے ہیں جہاں اسی فیصد آدمی مجبوراً بدحالی پریشانی اور آشفتگی میں مبتلا رہتے ہیں جو ہمارے لیے روزمرہ کی زندگی ہے وہ ان کے لئے نئی بات ہے اور تفریح ہے۔

لیکن یہ ماحول صرف غریبی سے تعمیر نہیں ہوا۔ صرف غریبی دیکھیے تو ہہ ر ے ڈ ایریا اور دیگر علاقے کافی ہیں۔ یہاں تو جملہ اخلاقی اور مروجہ اقدار کے خلاف ایک عملی بغاوت کا مظاہرہ ہوتا ہے جس سے ماحول بنتا ہے۔

مثلاً ذکا رو چھوڑ کر آگے چلیے گلی میں ایک طرف زیر زمین ریستوراں ہے۔ ٹوٹی پھوٹی بے پالش کی میزیں اور ان کے گرد کرسیاں بھی نہیں بلکہ بنچیں پڑی ہوئی ہیں سخت کھردری بنچیں جن پر اچھے اچھے کھاتے پیتے امریکی خواتین و حضرات قیمتی لباسوں میں براجمان خود کو سخت انٹلکچوئل محسوس کر رہے ہیں۔ سامنے ایک ڈیلو ڈالا گارڈن نمبر ۲ قسم کے صاحب نہایت بھونڈی اور تیز آواز میں گٹار بجا بجا کر گا رہے ہیں:

وہ آئی اور چلی گئی

وہ کیوں آئی

کیا کر کے گئی

کس وقت آئی

کس روز گئی

کیا مجھ کو پتا

کیا تم کو غرض

بس یہ سن لو بس یہ جانو

وہ آئی اور چلی گئی

ٹانانا۔ ٹانٹے ٹی ٹی

وہ آئی اور چلی گئی

www.taemeernews.com

لاحول ولا قوۃ، مگر انٹلیکچوئل خواتین حضرات ان پر مٹے جا رہے ہیں۔ ونس مور کے نعرے لگتے ہیں۔ ان حضرت کو سرخ شراب کی ایک بوتل بھی پیش کر دی جاتی ہے اور یہ ایک گھونٹ میں آدھی پی جاتے ہیں۔ یہ بگ تقریباً تاریک ہے۔ بجلی ضرور ہوگی مگر اندر

تب میں لکھوں
اور لوگ سنیں
میں کیا لکھوں
کیا لوگ سنیں

چیرز۔ مکرر۔ مکرر۔ سبحان اللہ۔ اسے سبحان اللہ۔

ایک نو عمر لڑکی تڑپ کر اٹھتی ہے اور شاعر اعظم کی گردن میں لٹک جاتی ہے۔ وہ اُسے پیار سے ایک طرف دھکا دے دیتے ہیں۔ اپنے دو فٹ لمبے بال جھٹکے سے سنوارتے ہیں۔ اسٹیج سے نیچے اتر کر ایک صاحب کا ہیٹ اٹھا کر الٹا کر دیتے ہیں۔ اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھومنے لگتے ہیں۔ اندھیرے میں صاف نظر نہیں آتا مگر وہ کسی میز سے خالی ہاتھ نہیں گزرتے۔ لوگ برابر نوٹ ڈال رہے ہیں۔ پانچ کا نہیں ایک ڈالر کا نوٹ تو ضرور ہوتا ہوگا۔ ایک ڈالر کی دگا دو تو کم از کم دس چالیس ڈالر ہمارے سامنے پڑے ہیں۔ میں جی ہی جی میں حساب لگاتا ہوں۔ دو سو روپے۔ اس نظم کے دو سو روپے بھی کیا فرق ہے۔ آخر یہ امریکہ ہے۔ ہماری میز پر بجلی کی روشنی نہیں بلکہ ہر میز پر ایک ایک دو دو موم بتیاں رکھی ہوئی ہیں۔ اعلیٰ انٹلیکچوئل بتیاں نہیں بھی نہیں جلاتے اور جب مرد عورت ساتھ ہوں تو عام طور پر جلاتے ہی نہیں۔

اب وہ صاحب بڑبڑائے۔

"خواتین و حضرات آپ نے گیت سن کر جس پسندیدگی کا اظہار کیا ہے اس کے لیے آپ کا بالکل ممنون نہیں ہوں۔ قہقہہ ——— " یہ ہنسنے کی بات نہیں۔ میں کوئی مسخرہ نہیں بلکہ ایک عظیم موسیقار اور عظیم شاعر ہوں۔ اگر آپ مجھے بڑا درجہ پر نہیں دیکھتے تو یہ میرا نہیں بلکہ آپ کا اور ہمارے دور کے لوگوں کا قصور ہے۔ اب میری ایک عظیم نظم سنیے جو میں نے صبح پیشاب کرتے وقت کہی ہے اور یہ نظم میں اپنے ہاتھ سے سناؤں گا۔

کلام الملوک ملوک الکلام

جب آپ موتتے ہیں شیکسپیر
اور آپ موتتے ہیں گوئٹے بے

www.taemeernews.com

ہاں گرُنٹے ہے
میں اک پنجہ پھیلاتا ہوں
تو شیکسپیر
ڈر ڈر کے پُھدکنے لگتا ہے

ہاں شیکسپیر
ڈر ڈر کے پُھدکنے لگتا ہے
مری ایڑی زور سے پڑ جائے
تو گرُنٹے گگھیا جاتا ہے

مری ایڑی تازہ برف سے زیادہ نرم سہی
پر گرُنٹے گگھیا جاتا ہے
مرا پنجہ سوکھے مرتے ہوئے چوہے جیسا
پر شیکسپیر
ڈر ڈر کے پُھدکنے لگتا ہے

اے سننے والو خود سوچو
میں لکھوں بھی تو کیا لکھوں
میں کس کے مقابلے پر آؤں
کوئی میرا مقابل پیدا ہو

فاضل زرمبادلہ والے پاکستانی جب شیکسپیر کی طرح پھدکنے لگے۔ یا رب حماقت سہی مگر ملک کی عزت کا سوال ہے۔ میں پانچ ڈالر دوں گا مگر بدقسمتی سے میں گرُنٹے کی طرح گگھیانے لگا۔ میں نے کہا "بھائی تمہاری قیمت کون پوچھ رہا ہے۔ تم انھیں آنے تو دو۔" جب وہ سامنے آئے تو میں نے پچاس سینٹ کا سکہ یعنی آدھا ڈالر ٹوپی میں ڈال دیا۔ انھوں نے بُرا سا منہ بنا کر دیکھا۔ ٹوپی میں ہاتھ ڈال کر سکہ نکالا اور زور سے دیوار پر دے مارا۔ لڑکیوں نے سسکاریاں بھریں۔ ہم ذرا پریشان ہو گئے۔ زرمبادلہ والے ایک دم گھبرا کر پانچ ڈالر والے نوٹ ہوا میں لہرانے لگے۔ مگر ہم چپ چاپ بیٹھے رہے۔ شاعر اعظم ایک ساعت مجھے گھورتے رہے اور پھر ایک دم پاؤں پٹختے ہوئے اسٹیج سے

www.taemeernews.com

"یہاں میری بے عزتی کی گئی ہے۔ میں اب اس کیفے میں کبھی نہیں آؤں گا۔"

"یہاں میری بھی بے عزتی کی جا رہی ہے پورے ایشیا کی بے عزتی کی جا رہی ہے۔ اب اس کیفے میں کوئی ایشیائی نہیں آئے گا۔" میں نے کھڑے ہو کر چیخنا شروع کر دیا اور اپنا کوٹ اتار کر میز پر زور سے پٹخ دیا۔

سب لوگ متوجہ ہو گئے۔

"تمھاری کیا بے عزتی ہوئی" شاعر اعظم نرم پڑے۔

"میں ایشیا کا ایک عظیم شاعر ہوں اور مجھے اب تک کسی نے نہیں پوچھا بلکہ الٹے تم مجھ سے پیسے مانگنے آ گئے۔ تم ہو کیا۔ کیا آپ لوگ مجھے سننے پر تیار ہیں۔ آپ کو پتا چل جائے گا۔"

"ضرور ضرور۔ ایشین پوئٹری از گریٹ۔ کم آن مسٹر پوئٹ کم آن۔" سارا مجمع چیخنے لگا۔ شاعر اعظم پہلے تو سٹ پٹائے۔ پھر ایک مجسمۂ اخلاق بن گئے۔

"آہ میرے دوست معاف کرنا میں تمھیں نہیں پہچانتا تھا کیا تم پابلو نرودا ہو۔"

"نہیں وہ تو لاطینی امریکہ کا شاعر ہے اور ایک تھرڈ کلاس شاعر ہے۔" میں غرایا۔ میں نے دیکھا کہ مجمع مجھے زیادہ تکریم کے ساتھ دیکھنے لگا یعنی زیادہ بیوقوف سمجھنے لگا۔

"پھر تم کون ہو۔ آہ تم یقیناً رابندرناتھ ٹیگور ہو اور داڑھی منڈا کر آئے ہو۔"

"میرا نام میرا کلام ہے۔" میں نے فاتحانہ نعرہ لگایا۔ "لاؤ مائیکروفون ادھر لاؤ۔"

"نہیں تم اسٹیج پر آ جاؤ۔"

وہ اسٹیج کیا تھا کاٹھ کا ایک چبوترہ تھا جس پر ایک چھوٹا پیانو اور ایک ڈھول رکھا تھا میں اسٹیج پر چڑھ گیا۔

"میں اپنی زبان میں سناؤں گا اور یہ صاحب ترجمہ کرتے جائیں گے۔" میں نے فاضل زرمبادلہ والے ساتھی کو بھی گھسیٹ لیا۔ جو تھر تھر کانپ رہے تھے۔

آدھے گھنٹے تک میں نے بہک بہک کر غالب کی غزلیں اقبال کی نظمیں اور اپنے دوہے گائے ترجمان نے بڑا بیڑا کیا۔

"He says" وہ ہر ترجمے سے پہلے کہتے تھے۔ سب سے پہلے غالب کی غزل گائی اس کا ترجمہ ان کی زبانی سنیے:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

www.taemeernews.com

HE SAYS THE EARTH IS A CHILDRENS PLAYGROUND BEFORE ME AND BEFORE ME THERE IS A DRAMA IN THE MORNING AND IN THE NIGHT.

اب ملاحظہ فرمائیے کہ طبیعت جو آئی تو انھوں نے دُنیا کا ترجمہ EARTH کر ڈالا۔ میں نے ٹوکا تو بڑے زوروں کی UNIVERSE تیسرے تیسرے ہوٹنگ ہونے لگی۔

سٹ ڈاؤن یو ٹرانسلیٹر سٹ ڈاؤن۔ لٹ ہم سنگ" (ترجمان بیٹھ جائیے اور اسے گانے دیجیے)

مجمع چیخنے لگا۔ ترجمان صاحب پسینہ پونچھتے ہوئے بیٹھ گئے۔ انھوں نے پہلی بار اس قسم کا ترنم سنا تھا۔ میں ترنم کرتا تھا تو MORE MORE کا شور بلند ہوتا تھا۔ جب میں نے دو بیت شروع کئے تو درمیان بعد ڈھول والا تال دینے لگا۔ لوگ پہلے تو سر ہلاتے رہے اور پھر ایک دم میز پر راستے سے ہٹا ہٹا کر ناچنے لگے۔

شکر صد شکر ٹھکانے لگی محنت میری

مجھے اس وقت اُترنے دیا گیا جب میں بالکل تھک گیا تھا۔ اُترتے اُترتے مجھے ایک دم محسوس ہوا جیسے کسی بندے نے جھپٹا مارا ہو۔ ایک خاصی معقول خاتون اپنے گلابی ہیٹ سمیت میری گردن میں ہاتھ ڈال کر لٹک گئیں اور کلمات پُر شوق اُن کی زبان سے ادا ہونے لگے۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ پاؤں بوجھ سے لڑکھڑا گئے۔ میں نے بمشکل انھیں کھینچ کھانچ کر جدا کیا۔

"او آئی شیل گو ود یو" (نہیں نہیں میں تمھارے ساتھ چلوں گی) وہ چلانے لگیں۔

شوہر صاحب نے فوراً ہی ہیٹ دوبارہ سنبھالا۔ اور کیفے کا چکر لگانے لگے۔ اس بار پہلے سے زیادہ ڈالر کی بارش ہوئی۔ کم سے کم ڈیڑھ سو ڈالر جمع ہوئے ہوں گے۔ میں ابھی سانس ہی لے رہا تھا کہ وہ سامنے آکر بیٹھ گئے۔ انھوں نے ہیٹ میرے سامنے رکھ دیا۔

"ہاف از یورز" (آدھا حصہ تمھارا ہے)

"تھینکس" میں نے کہا "مجھے اپنے کمال کی داد مل گئی۔ یہی میں کافی ہے۔"

"لیکن آج شب تم ایک گھنٹے کے لیے میرے مہمان ہو۔" انھوں نے بکمال عنایت فرمایا اور اٹھ کر باہر نکل گئے۔

سامنے والے مکان کی تیسری منزل پر ایک چھوٹا سا کمرہ جس میں چھ جنگ بجو سکیں کوئی بجا اس کے نزدیک

www.taemeernews.com

سے بھرا ہوا تھا۔ دھواں ایک بھوسے بادل کی طرح غلاف بن کر چھا گیا تھا۔ کمرے میں ہلکی سرخ روشنی تھی اور ایک طرف ایک چھوٹی سی میز پر چھ سات گلاس اور اس کے برابر ایک خاصا بڑا ڈھول جیسا ڈرم رکھا ہوا تھا جس میں بیر یا کوئی اور شراب بھری ہوئی تھی۔ لڑکے لڑکیاں بار بار مجمع چیرتے پھاڑتے ادھر آتے، گلاس ڈھول میں ڈال کر چھلکتا ہوا باہر نکالتے، غٹ غٹ پیتے اور منہ پونچھے بغیر یا آستین سے صاف کرتے ہوئے واپس مجمع میں مل جاتے۔ بیچ میں ایک صاحب ایک اسٹول پر بیٹھے گٹار بجا رہے تھے۔ اُن کے پاؤں میں ایک طرف ایک لڑکی بیٹھی تھی اور ایک اوندھی لیٹی ہوئی تھی۔ وہ بہت دبلی پتلی، مدقوق قسم کی لڑکی تھی اور اس نے ایک دھاری دار جرسی پہن رکھی تھی۔ گٹار کی آواز تیز ہوتی تو لڑکیاں لذت بھرے قہقہے مارتیں۔ ایک نوجوان معصوم چہرے پر سرخ داڑھی بڑھائے مسلسل رو رہے تھے۔ پیچھے کی ٹولی والی چند لڑکیاں برابر تھرک رہی تھیں اور ان کے آگے کھڑے ہوئے لڑکے رہ رہ کر پیچھے مڑتے اور ان کے ہونٹ چوم لیتے۔

"یہ بیٹنک ہیں۔ ہم سب بیٹنک ہیں"۔ شاہ اعظم نے انکشاف فرمایا۔ میرے پاکستانی دوست جو پہلے بہت پریشان تھے اور اب بہت محظوظ ہو رہے تھے، انھوں نے سوالات کرنے شروع کر دیئے جن کا شاہ اعظم نے بڑی حقارت سے جواب دیا۔

"جی ہاں ہم بیٹنک ہیں۔ ہم روایات کے خلاف ہیں۔ ہم جنگ کے خلاف ہیں۔ ہم مذہب کو نہیں مانتے حکومت کو نہیں مانتے۔ والدین کو نہیں مانتے، ملکیت، قومیت، بین الاقوامیت کو نہیں مانتے، بس اپنی ذات کو مانتے ہیں اور اُسے جاننا چاہتے ہیں۔ ہمیں موت کا ڈر نہیں۔ زندگی کی خواہش نہیں مگر جب تک زندہ ہیں آزاد اور بے غل و غش جینا چاہتے ہیں۔ یہ سب لڑکیاں ہم سب کی محبوبائیں ہیں اور یہ سب لڑکے ان سب لڑکیوں کے محبوب ہیں۔ کوئی کسی کا نہیں، اور سب سب کے ہیں۔ بس یہ ہمارا فلسفہ ہے۔ یہ ہماری زندگی ہے اور ہم صرف اس کمرے ہی میں نہیں بلکہ سیکڑوں کمروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر ملک ہر شہر میں ہر قریے میں ہیں۔ کیوں کیا آپ کے ہاں بیٹنک نہیں ہوتے؟"

"نہیں ہمارے ہاں تو ابھی نہیں ......" میرے دوست جواب دینے لگے۔

"تو آپ سخت بیکار اور غیر مہذب لوگ ہیں گٹ آؤٹ" شاہ اعظم بگڑنے لگے تھے میں نے تھام دیا۔

"کیوں نہیں ہوتے۔ ہمارے ہاں تو تقریباً سبھی بیٹنک ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم آپ لوگوں جیسا لباس نہیں پہنتے اور کھل کر ایسی باتیں نہیں کرتے۔"

"ارے یہ تم کیا کہہ رہے ہو" میرے ساتھی حیران ہوئے۔ "میں جاری رہا" ہمارے دیہات تو ...

www.taemeernews.com

ابھی بہت پیچھے ہیں۔ مگر شہروں تک سب ٹھیک ہے۔ فرق یہ ہے کہ ہم لوگ تم لوگوں سے ذرا زیادہ وضعدار ہیں۔ جو کچھ کرتے ہیں اس کے ساتھ اخلاق، کردار، روایات، شرافت، مذہب کسی نہ کسی قسم کے دُم چھلے لگا کر کرتے ہیں، دوسرے ملکوں کے معاملے میں محتاط ہیں۔ ہمارے الفاظ بھی گھن گرج والے اور اصول وصول کردار وردار قسم کے نعروں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں اور ہم جرائم بھی تمھاری طرح جمع ہو کر نہیں کرتے۔ بس سیاسی تماشے ذرا کھل کر کرتے ہیں کیونکہ تماشے چھپ کر نہیں ہو سکتے باقی سب باتیں کرتے ہیں اور زیادہ تر چھپ کر کرتے ہیں۔"

"آہ تم لوگ ابھی تک پسماندہ ہو" شاعر آہ بھرتے ہیں۔ تمھارے دیہات کی حالت نہ جانے کب سدھرے گی۔ خیر شہروں ہی میں تحریک چل جائے تو اچھا ہے۔ یہاں بھی ہماری تحریک شہروں ہی میں زیادہ چلتی ہے۔"

"ماشاء اللہ کیوں نہیں" میں نے داد دی۔ آپ اپنا کام کیے جائیے۔ ہم لوگ آپ کی مثال سامنے رکھ کر اپنے ملکوں میں دل و جان سے کام کریں گے۔"

"زندہ باد"

"زندہ باد"

یکایک ایک دل دوز نسوانی چیخ بلند ہوئی اور پھر ایک دلخراش مردانی آواز آئی۔ ایک اضطراری کیفیت میں میں نے جیسے مجمع چیر دیا۔ گردن آگے بڑھی تو دیکھتا ہوں کہ موسیقار صاحب کے بازوؤں میں لپٹی ہوئی خاتون نے اُن کی پنڈلی میں دانت گاڑ رکھے ہیں۔ وہ صاحب بلبلا بلبلا کر اُن کی کمر پر گٹار مار رہے ہیں۔ دو تین لمحوں میں ایک طوفان بپا ہو گیا۔ روتے ہوئے سرخ داڑھی والے نے پوری طاقت سے ایک گھونسا صاحب گٹار کی آنکھ میں مارا۔ جواباً صاحب گٹار کے ایک ساتھی نے گٹار چھین کر اس کے سر پر پھوڑ دیا اور پھر... بجلی کی سی سرعت سے نیچے بھاگتے بھاگتے ہم نے دیکھا کہ شاعر اعظم کی قمیص تار تار ہو چکی تھی اور وہ زمین پر اس طرح لیٹے ہوئے تھے کہ لڑنے والے بار بار ان پر سے گزرتے جاتے تھے۔ گلاسوں کے چھناکے ایک دو بار سنائی دیئے پھر سب آوازیں لڑکیوں کی بے تحاشا چیخوں اور مردوں کی بے محابا گالیوں میں دب گئیں میرے ساتھی کا ایک جوتا [illegible] رہ گیا مگر وہ نیچے بھاگتے ہوئے اُتر ہی آئے۔

چند لمحے بعد جب ہم سامنے والی پٹری پر کھڑے اپنے کوٹ اور ٹائیاں ٹھیک کر رہے تھے تو دو پولیس والے دور دور سے سیٹیاں بجاتے آئے اور چند منٹ کے بعد پولیس کے جوان کالے کالے ڈنڈے ہاتھ میں لیے اوپر چڑھ رہے تھے۔

سبحان اللہ کیا عمدہ تحریک ہے۔ ہم نے کہا اور آگے چل دیے۔

www.taemeernews.com

اب یوں سمجھیے کہ گرینچ ولیج کے سب کیفے ایک سے ہیں، تاریک، میلے، بدبودار اور بقول کسے رومانٹک۔ کوئی اطالوی طرز کا ہے کوئی ہسپانوی کوئی فرانسیسی مگر سب میں وہی عالم اضطراب اور ہنگامی ہے۔

اس بستی میں بیک وقت چور، اچکے، ڈاکو، دانشور، فنکار، طالب علم، بدنیت، نفیس اور چیچھڑے کاروبار والے لوگ رہتے ہیں۔ رات کو بھی اور خاص طور پر دن کو گلیوں میں مصور لوگ اور خواتین اپنی تصویریں لیے بیٹھے ہیں بلکہ بہت سے تو بنا رہے ہیں آپ چاہیں تو خود بھی ماڈل بن سکتے ہیں۔ ماہر فنکار آدھ گھنٹے میں آپ کی ایک تاثراتی تصویر بنا دے گا جو یقیناً آپ جیسی نہیں لگے گی۔ بہرحال پسند اپنی اپنی والی بات ہے۔ ولیج میں چھوٹے چھوٹے جرائم اس قدر ہوتے ہیں کہ پولس کو اطلاع بھی نہیں دی جا سکتی۔ جیب کٹ جانا، مار پیٹ، کسی کا کوٹ اتروا لینا، گھڑی چھین لینا یہ بہت معمولی بات ہے۔ ہاں جب کسی شریف خاتون کا اغوا ہو یا کسی کا قتل یا کوئی باقاعدہ بڑا ڈاکہ پڑے تو اسے ایک قابل ذکر اور قابل تفتیش جرم مانا جاتا ہے اور پولس والے دوڑ بھاگ شروع کرتے ہیں۔ ویسے پولس والے یہاں برابر گھومتے ہوئے ملیں گے کیونکہ امریکہ کے بڑے بڑے مجرمین بھی اس علاقے میں مصور یا موسیقار یا دکاندار بن کر پناہ لینے آتے ہیں۔ گلیاں در گلیاں چھوٹے چھوٹے مکان تنگ تنگ ماحول، ہمسایوں کی مزاجی یکسانیت، یہ سب عناصر مل کر مجرمین کے لئے ایک سازگار ماحول پیدا کر دیتے ہیں — اور پولس والوں کی تفتیش کے لیے بھی ....

تو یہ نیویارک کا ایک علاقہ ہے۔ خاص نیویارک کا۔ امریکہ کا ایک حصہ ہے۔ آزاد امیر جمہوری امریکہ کا ایک مشہور علاقہ۔ اس سب کو ختم اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ یہاں انفرادی آزادی ہے اور یہ لوگ اسے نہیں مانتے کہ

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

کیا پتا یہ لوگ سچ ہی کہتے ہوں۔

مجھے گرینچ ولیج کچھ پیرس کے موماخت کی طرح لگا۔ موماخت جسے انگریزی والے موما رت یا مونٹ مارٹر بھی کہتے ہیں۔ موماخت جو پیرس میں پگال سے آگے ایک پہاڑی ہے اور جہاں فنکاروں اور مصوروں کے جھمگٹے لگے رہتے ہیں مگر وہاں اتنا جرم نہیں ہوتا۔ آخر کو یہ بڑا ملک ہے بڑے ملک کی بڑی باتیں۔ ہاں کمال یہ ہے کہ یہ مقام اس وقت زیادہ آباد ہوا جب ۱۸۲۲ء میں نیویارک زرد بخار کی زد میں آیا۔ یہ وبا اس شدت سے پھیلی تھی کہ لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے جو زیادہ دور نہیں جا سکتے تھے وہ اس گاؤں میں آ پہنچے۔ اس وقت گرینچ شہر سے باہر سمجھا جاتا تھا اور اب تو کنال اسٹریٹ سے چودہ نمبر گلی تک پھیلا ہوا ہے۔ بہ حال

www.taemeernews.com

پہلے لوگ زرد بخار سے بھاگ کر یہاں آئے تھے اب لوگ یہاں سے مختلف قسم کے بخار لے کر باہر جاتے ہیں۔

"یادرکھو ایک فنکار ہو کر ایسے عاشقانہ اور رومانٹک علاقے کے متعلق ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں" پاکستانی بھائی نے طعنہ دیا۔

میں شرمندہ ہوجاتا ہوں کیونکہ انٹلیکچوئل ازم کا تقاضا بھی یہی ہے لیکن میں سوچتا ہوں کہ یہ آزادی فنکاری، دانشوری، بے راہروی، اسے جو کچھ کہو اگر سب ایک طرف رکھ دی جائے اور دوسری طرف چند ہزار یا چند سو یا صرف چند، ہزار لے۔ جان انسانوں یا خاندانوں کے لیے روٹی کپڑے اور سر چھپانے کا امکان تو میں کیا پسند کروں گا۔

میری چھوڑیے آپ بتائیے کہ آپ کیا پسند کریں گے۔

www.taemeernews.com

اِٹس اے ونڈر فل ٹاؤن

"بھائی جان آپ یہاں کیسے پہنچ گئے آپ کے ملک کو تو امریکہ ملک مانتا ہی نہیں" میں ایک خوش پوش چینی سے اُلجھ گیا ہوں جو زیرِ زمین ریل میں میرے پلّے پڑ گئے ہیں۔

"مگر میں تو خود امریکی ہوں۔"

"امــــریکی"

"خالص امریکی۔ پیدائشی امریکی بلکہ نیویارکی۔"

"آپ کا نام"

"وانگ چو"

وانگ چو صاحب ایک ریستوران کے مالک ہیں اور خاصے امیر کبیر آدمی ہیں۔

ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

چائنا ٹاؤن میں لے جاتے ہیں۔ جی ہاں نیویارک شہر کے ایک بڑے آباد کونے پر یعنی کینال اسٹریٹ مشرقی براڈوے بواری اسٹریٹ میں گھرا ہوا ایک خالص چائنا ٹاؤن بھی ہے جہاں زیادہ تر چینی رہتے ہیں اور کاروبار تو تقریباً سارے کا سارا چینیوں کے ہاتھ میں ہے۔

"ہم لوگ تیس ہزار سے زیادہ ہیں اور مدتوں سے یہاں رہتے ہیں۔ آپ فرانسسکو نہیں گئے۔ وہاں بھی چائنا ٹاؤن ہے۔" وہ فرماتے ہیں۔

"میں صرف چائنا ٹاؤن دیکھنے سان فرانسسکو جاؤں گا۔" میں نے انھیں یقین دلایا مگر میں دیکھ سکتا تھا کہ انھیں یقین نہیں آیا۔

www.taemeernews.com

اس دن وانگ چو صاحب نے تو ایک چینی ریستوران میں چینی چائے پلاکر ٹرخادیا مگر
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

بھلا چین کا مزا امریکہ میں آئے اس سے بڑھ کر کیا سیاحت ہو سکتی ہے۔ لے میاں تم کس چکر میں مبتلا ہو' چین چین ہے' یہ نیویارک والا چین تو جاپانی چین لگتا ہے یعنی عورتیں چینیوں کی سی ہیں' زبان بھی چینی ہے' کھانا پینا بھی چینی مگر وہ روح چین کہاں جس نے دس بارہ برس میں ستر کروڑ انسانوں کی کایا پلٹ کر رکھ دی ہے۔
بہرحال جو تماشا نظر آئے اُسے دیکھنا ضرور چاہیے۔ نیویارک میں صرف چینی ہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی نسل مکمل طور پر محفوظ کر رکھی ہے۔ یونانی، اطالوی، جرمن، پورٹوریکن سب کے سب ہجرت کر کے آتے ہیں مگر جلد ہی آپس میں اور مقامی آبادی میں گھل مل جاتے ہیں لیکن چینی امریکی بن کر بھی چینی ہی رہتے ہیں۔ یہ بات دوسری طرح یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ ایشیائی مہاجر کو یہاں مقامی بن کر بھی ایشیائی ہی رکھا جاتا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

امریکی چینی کنفیوشس اور تاؤ کے ماننے والے ہیں عیسائی چینی ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا' اپنی رسوم روایات کے سخت پابند ہیں' ریستورانوں میں چینی آرٹ' چینی تصاویر اور چینی رسم الخط ملے گا۔ ایک چھوٹا سا چینی تھیئٹر بھی ہے اور کم از کم ایک اخبار میں نے چینی زبان میں خود دیکھا ہے' یوں چینیوں کا کاروبار پورے شہر میں پھیلا ہوا ہے' ایک اندازے کے مطابق کوئی ساڑھے چار ہزار ریستوران چینیوں کی ملکیت ہیں اور چینی کوئی پانچ ہزار لانڈریاں بھی چلاتے ہیں' دو تین دکانیں جوتے کی بھی دیکھیں لیکن کسی چینی کو کسی بڑی عمارت کسی مل کسی کارخانے کسی بڑے اخبار کا مالک نہ سنا۔ نہ یہ سنا کہ کوئی چینی امریکن کبھی کانگریس یا سینٹ کا رکن یا صوبائی سینٹ کا رکن یا شہر کا حافظ جیب اللہ بھی ہوا ہو کیونکہ یہاں سفید رنگ کی مارچپ چاپ سہی مگر بڑی زوردار ہے اور

گراں خواب چینی گراں خواب ہیں

چین کے ذکر پر قدامت کا خیال آتا ہے اور قدامت کے خیال سے عجائب خانوں کا خیال آتا ہے۔ عجائب خانے جو بڑی قوموں کے لیے وقار کا ایک مسئلہ بنے رہتے ہیں۔ خواہ ملک میں پچاس لاکھ آدمی بیکار ہوں لیکن عجائب خانے دوسرے ملکوں سے ضرور مقابلہ کریں اور ایسے مقابلوں پر اربوں ڈالر خرچ ہوتے رہتے ہیں۔
اکیلے نیویارک میں سیکڑوں بڑے چھوٹے عجائب گھر ہیں جو زیادہ تر پرائیوٹ یعنی غیر سرکاری ہیں میٹروپولیٹن عجائب گھر سب سے بڑا عجائب گھر سمجھا جاتا ہے جہاں کوئی چھ ہزار آدمی روز سیر کرنے آتے ہیں۔ ایک بڑی تعداد محققین کی لائبریری میں کام کرتی رہتی ہے۔ چند کمروں میں ہر وقت مختلف فنون پر لیکچر ہوتے ہیں اور اس کی کوئی فیس داخلہ

www.taemeernews.com

نہیں مل جاتی۔ ایک بڑا سا کمرہ بطور خاص جاذب توجہ رہتا ہے کیونکہ یہاں مسلسل بہت سے یورپین ملکوں کے پرانے فلم دکھائے جاتے ہیں جن سے آرٹ کے شائقین پرانے کارناموں کا مکمل مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ہزاروں فوٹوگراف ایک الگ ہال میں جمع ہیں۔ مصوری کے نادر نمونے سنگتراشی کے شاہکار ہیں اور آپ جانیے جو کچھ ادھ عجائب خانوں میں ہوتا ہے۔

اور اس عجائب خانے کے سامنے کوئی کوئی لولا لنگڑا اپاہج حسرت سے کھڑے ہو کر آنے جانے والوں کو دیکھتا ہے کہ یارو بے جان چیزوں کو دیکھتے ہو۔ زندہ مسائل سے کیوں آنکھیں چرا رکھی ہیں۔

بائیں بائیں امریکی عجائب گھروں پر ہنسنے سے پہلے ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال لیجئے گا۔ امریکہ میں تو لنگڑے لولے اپاہج بہت کم محتاج امداد نظر آئیں گے۔ آپ اپنے ملک کے گریبان میں منہ ڈالیں تو نہ جانے کیا کیا نظر آئیگا۔

چھوڑیار زندوں کی باتیں۔ زندوں کی باتیں یوں بھی زندہ قومیں کرتی ہیں۔ تم کو تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ عجائب گھر کا موضوع ہاتھ آ گیا۔ کیسا صاف بے ضرر اور ہائی کلاس موضوع ہے۔ ہائی سوسائٹی میں بھی بے دریغ پسند کیا جاتا ہے۔ جتنا بولو گے زیادہ پڑھے لکھے سمجھے جاؤ گے۔

لیس۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ نیویارک میں بڑے ونڈرفل عجائب گھر ہیں۔ فرک FRICK میوزیم ہے، جہاں ریمبراں جیسے عظیم مصوروں کی تصاویر ملتی ہیں۔ اور گگنہائم میوزیم جہاں تاثراتی آرٹ کے مخصوص اور منفرد مرقعے جمع ہیں۔ یہ مرقعے دنیا کے کسی دوسرے عجائب گھر میں نہیں مل سکتے۔ لاکھوں ڈالر کے صرف سے خریدے گئے ہیں اور خود نیویارک سینٹرل لائبریری میں ایسی ایسی تصاویر آویزاں ہیں کہ صف نظر!!

اس لائبریری کی بات آگئی تو یہ جان لیجئے کہ امریکن اس کے بارے میں کیا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اس میں دنیا کی تقریباً ہر زبان کی ہر کتاب کا ایک ایک نسخہ موجود ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ میں نے لائبریرین صاحب کی گردن دبائی۔

"مجھے غزلیں، دوہے، گیت دیکھنی ہے۔"

"غزلیں دوہے گیت" وہ ہکلائے "کس زبان کی کتاب ہے۔؟"

"اردو"

"اردو کیا ہے۔"

"زبان۔ یہ ہماری زبان ہے پیارے۔"

"اوہ۔ آئی سی۔ کس مصنف کی ہے۔"

www.taemeernews.com

"ملک الشعراء، دبیر الملک، سعدیِ دوراں، حافظِ دوراں، رومیِ دوراں، عرفیِ دوراں، غالبِ پاکستان مسٹر جمیل الدین عالی آف کراچی"۔ تین خواتین و حضرات نے بیس منٹ چھان بین کر کے اعلان کیا کہ نہ اس نام کی کوئی کتاب ہے نہ اس نام کا کوئی مصنف ہے۔

"اردو نام کی کوئی زبان بھی ہے۔" میں نے بیتابی سے پوچھا

"ہوگی" وہ بھنّا گئے۔

ظاہر ہے کہ اس عظیم تجربے کے بعد آپ فوراً باہر نکل آئیں گے یعنی ففتھ ایونیو پر اور بائیں ہاتھ کو بیالیس نمبر کی گلی میں کھڑے ہو کر کسی سفید فام لڑکے سے جوتا پالش کرانے لگیں گے کیونکہ ایک قول کے مطابق سفید ہاتھ سے جوتا پالش ہونے سے دل کی جلا بھی ہو جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے:

جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے

بائی دی وے اس نیویارک کے گھنے جنگل میں ایک کھلا ہوا تختہ گل بھی ہے جسے سنٹرل پارک کہتے ہیں، یہ نیویارک کا "واحد بڑا باغ" ہے۔ اس شیشے اور لوہے کے جنگل میں یہ جگہ کبھی کبھی ایک مفرح قلب شربت کا مزا دیتی ہے بشرطیکہ شربت رات کو نہ پیا جائے۔

سنٹرل پارک چونکہ اس گھنے جنگل میں اکیلا پارک ہے، اس لیے سارے شہر کی توجہ اسے آراستہ کرنے پر صرف ہوتی ہے۔ اس میں روز شام کو بینڈ بجتا ہے۔ برفیلا اسکیٹنگ رنگ ہے، چڑیا گھر ہے، ویسے یہاں اسکیٹنگ رنگ اور چڑیا گھر میں کوئی خاص فرق نہیں رہتا ــــ اور ہزاروں قسم کے پھول، درخت اور انسان پائے جاتے ہیں۔

یوں یہ پارک کئی میل پھیلا ہوا ہے ففتھ ایونیو سے ادھر تک کئی سو ایکڑ زمین سرسبز کر دی گئی ہے۔ ہمارا قونصل خانہ گلی نمبر ۶۴ سٹرک نمبر ۵ پر واقع ہے بس اس کے بالکل سامنے سنٹرل پارک ہے اور نہ جانے کہاں تک چلا جاتا ہے۔ اس کے بیچ میں ایک شاہراہ بھی ہے جو ری ورسائڈ کو ففتھ ایونیو سے ملاتی ہے لیکن یہاں دیکھنے کی چیز ملک ملک کی قحبائیں ہیں یہ الگ بات ہے کہ نیویارک پولیس ان کے پیچھے ہر وقت لگی رہتی ہے ــــ فلمی گیت سچ کہتا ہے۔

دو دلوں کو یہ دنیا
ملنے ہی نہیں دیتی

بڑے بوڑھے کہتے ہیں گر بیچ و بیچ چلے جانا مگر رات کو سنٹرل پارک سے مت گزرنا۔ ڈاکہ زنی غنڈہ گردی جیب تراشی کے علاوہ جو سب سے بڑا خطرہ ایک اجنبی کو پیش آسکتا ہے اور آتا رہتا ہے وہ یہ کہ وہ نوعمر غنڈوں کے متصادم گروہوں کا تماشا دیکھنے لگے اور اسی میں مارا جائے۔ قصہ یہ ہے کہ آوارہ بچوں کے علاقے بنے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ

www.taemeernews.com

دوسرے علاقے میں جرائم نہیں کرسکتا ورنہ جھگڑا ہوجاتا ہے۔ اب جھگڑا کہاں ہو سو وہ تاریک اور کم آباد پلوں کے نیچے، گھاٹ پر اور زیادہ تر سنٹرل پارک کے کسی حصے میں ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ کسی حصے میں بھی ہوسکتا ہے۔ نابابانا۔

جس کی بہار یہ ہو اب اُس کی خزاں نہ پوچھ

تو پھر آپ کہاں جائیں کیا کریں۔ ارے آپ کو نیویارک میں کاہے کی پریشانی اور کچھ نہ کیجیے تو نیویارک ٹائمز کی عمارت دیکھیے جس کے نام پر ٹائمز اسکوائر کا نام رکھا گیا ہے۔ اس عمارت پر چاروں طرف رات کے وقت بجلی کے الفاظ گھومتے رہتے ہیں جن میں تازہ ترین خبریں ہوتی ہیں یعنی یہ روشن حروف آپ کو دنیا بھر کی خبریں پڑھوا رہے ہیں۔ واہ کیا بات ہے لیکن ایک فقرہ کوئی دو منٹ میں بنتا ہے اور اتنی ہمت کس مائی کے لال میں ہے آدھ پون گھنٹے سر اونچا کیے آنکھیں گاڑے خبریں پڑھے جائے بس یہ بھی امریکن کا ایک تماشا ہے اور بس۔ ہاں الیکشن کے زمانے میں ان جگمگاتی ہوئی خبروں سے آنکھیں نہیں ہٹتیں۔

مگر نیویارک ٹائمز اخبار زوردار ہے ایک غیر امریکی کا قول مشہور ہے کہ میں نیویارک میں صرف اس لیے رہتا ہوں کہ روز صبح نیویارک ٹائمز پڑھ لیا کروں۔

بھئی واہ کیسا کیسا قدردان پڑا ہوا ہے۔

نیویارک ٹائمز ۱۸۵۱ء سے چھپ رہا ہے اور چھپے جاتا ہے کئی حکومتوں سے لڑا کئی حکومتیں اس سے لڑیں مگر یہ برابر چھپتا رہا۔

یا الٰہی وہ لوگ کیسے تھے

اس اخبار کے بہت سے دعوے ہیں، ایک یہ کہ اس نے بیسویں صدی میں سائنسی دنیا کا سب سے بڑا "اسکوپ" مارا۔ "اسکوپ" خصوصی خبر کو کہتے ہیں جو صرف ایک اخبار معلوم کرے اور چھاپ دے۔ ۱۹۱۵ء میں آئن اسٹائن کا نظریہ اضافیت سب سے پہلے اس اخبار نے خود آئن اسٹائن سے اڑایا۔ آئن اسٹائن اس وقت زیورک میں تھے اور نیویارک ٹائمز کے نمائندے نے انھیں وہاں جا لیا تھا۔

نیویارک ٹائمز کا مقولہ ہے "ہر خبر جو چھپنے کے قابل ہو۔"

پتا نہیں پاکستانی اخبار نویس اس مقولے کے بارے میں کیا فرمائیں گے!!!

اس اخبار کو چند اہم ترین خبروں کی اشاعت میں اولیت بھی حاصل ہے۔ اس نے سب سے پہلے ٹائٹینک ڈوبنے کی خبر چھاپی۔ معاہدہ ورسائی اور یو این کے قیام کی خبریں بھی سب سے پہلے اس نے معلوم کیں اور چھاپیں۔

یا امریکہ کا سب سے کثیرالاشاعت تو نہیں مگر سب سے زیادہ محترم اخبار ہے۔

فرمائیے آپ کثیرالاشاعت ہونا پسند کریں گے یا محترم۔ ایک میں زر کا زیاں ہے دوسرے میں وقار کا۔ مگر وقار کا معاملہ آج کل چھپر پر رکھ دیا ہے۔

اچھا بھائی صاحب اب طبیعت ادھر نہیں آتی نیویارک میں کچھ اور سہی مگر

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اے میاں

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ

وہ بوسٹن دیکھا جہاں امریکی قوم نے انگریزوں کے خلاف علم آزادی بلند کیا تھا۔ ذرا وہ ہارورڈ یونیورسٹی دکھا جس کے بقراط مشہور ہیں۔

اور وہ گرینڈ کینین والی پہاڑیاں اور وہ ٹیکساس کی لمبی لمبی شمشاد قد نازنینیں اور وہ سان فرانسسکو عہد خلیجیاں' شہر خوباں۔

سچ بات یہ ہے کہ میں نیویارک کو چھوڑ دوں مگر نیویارک مجھے نہیں چھوڑتا لیکن "حالات" سے مجبور ہوں اس لیے اب

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ

گڈ بائی نیویارک گڈ بائی

یہ انتالیسویں منزل پر ایک ریستوراں ہے جس کے گرد تمام تر شیشے لگے ہوئے ہیں۔ شام کو کسی "کھڑکی" کے کنارے بیٹھ جائیے تو سامنے اونچی اونچی اور نیچی نیچی روشنیاں کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہیں۔

یہ انتالیسویں منزل والا ریستوران پانچویں سڑک پر شاندار بلڈنگ میں بنا ہوا ہے اور ٹاپ آف دی سکس TOP OF THE SIXES کہلاتا ہے۔ کیونکہ اس عمارت کا سرکاری نمبر چھ سو چھیاسٹھ ہے۔ یہاں بیئر دو ڈالر کی ملتی ہے کافی ڈیڑھ ڈالر کی اور چائے ایک ڈالر کی' اور شرط یہ ہے کہ کھڑکی یعنی شیشے کے ساتھ بیٹھنے والے ایک وقت میں آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں بیٹھیں گے کیونکہ اور بہت سے مشتاقان دید انتظار میں کھڑے رہتے ہیں۔

ٹاپ آف دی سکس میں شام کو تھوڑا سا وقت گزارنا خاصی فیشن ایبل اور انٹلکچول بات سمجھی جاتی ہے' اس سے ہم جیسے حسرت ... کے مارے ہم انٹلکچول ہونے کا سرٹیفکیٹ لینے ادھر چلے آتے ہیں۔ اب دیکھیے نا

www.taemeernews.com

ہیں آپ کو شان بلڈنگ کی اٹھانویں منزل والے ریستوران کا آنکھوں دیکھا حال سنا رہا ہوں ویسے آپ میری مجبوریوں پر بھی نظر کریں تو مجھے معاف کر دیں گے۔ بات یہ ہے کہ اپنے ملک میں تو انٹلکچوئل بن جانا آسان ہے نہیں۔ آدمی یا تو اعلیٰ افسر ہو یا خوب کھاتا پیتا ہو یا کسی بڑے انٹلکچوئل کا عزیز ہو یا کسی بیرونی ملک نے اسے انٹلکچوئل مان رکھا ہو۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ

چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

اب قسمت سے امریکہ آ پہنچے ہیں تو کسی نہ کسی قسم کی سند انٹلکچوئلزم لیتے چلیں کہیں نہ کہیں کسی محفل کسی مجلس کسی لیکچر میں کام آ ہی جائے گی!!

کسی نے بتایا تھا کہ اس ریستوران میں دو چار بڑے بڑے ادیب اور فنکار یعنی ایکٹر اور ایکٹریس بھی آتے ہیں۔ مشہور ادیب تو کوئی نظر نہ پڑا ہاں ایک ایکٹریس یعنی ہمارے خوابوں کی

شوخ مثالِ نگہِ حور

ضرور دکھائی دی سو وہ ایک ہجوم رقیباں میں گھری ہوئی تھی یہ تھیں مادام لورین بکال جو کبھی ہمفری بوگارٹ کی بیوی رہ چکی تھی ہم ان کے پرانے مداح تھے مگر انھیں دیکھ کر سوچا کہ کاش انھیں دیکھا نہ ہوتا نہ وہ پردہ سیمیں والی رنگت نہ ادا۔

کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ ایسی کیوں نکلی

شکر ہے کہ پھر چچا غالب نے سہارا دیا۔ ایک دم گلا پھاڑ کر فرمایا کہ :

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

کاش کوئی اس شعر کا مطلب امریکی اور روسی خلا بازوں کو بھی سمجھا دے۔ یہ بیٹھے نہ جانے کیا سمجھ کر کس کس شوق و اشتیاق سے چاند کی طرف دوڑے جاتے ہیں۔ جب وہاں پہنچیں گے تو نہ جانے کیا خاک دھول دیکھیں گے۔

مادام لورین بکال گڈ بائی۔ بس مادام!

میرا حصہ دور کا جلوہ

اب میں منہ پھیر کر سامنے نیویارک کی جگمگاتی ہوئی روشنیاں دیکھنے لگا ہوں۔ نہ جانے یہ جگمگاتی ہوئی کیوں کہلاتی ہیں پتلی پتلی اونچی اونچی عمارتوں میں گھروں اور دفتروں کی روشنیاں بس یہ ایک فیشن ہے یا کسی کسی دفتر میں ضرورت سے روشنی کی جاتی ہے۔ یار لوگ بیکار چڑھا چڑھا کر ان کا ذکر کرتے ہیں۔

www.taemeernews.com

"نو مائی ڈیئر یہ روشنیاں وہ شنیاں بذات خود کوئی شئے نہیں سب کچھ تمھارے اندر کے اندھیروں اجالوں کا منظر ہے۔ تم اکیلے ہو' تمھارے دل میں اندھیرے سما گئے ہیں۔ تم غمزدہ ہو تم کو جگمگاہٹ کیسے نظر آئے گی۔"

اور شاید یہی کیفیت ان خاتون کی بھی ہے۔ جو سامنے والے شیشے کے ساتھ تقریباً چپکی بیٹھی ہیں۔ وہ مسلسل نیچے دیکھے جاتی ہیں حالانکہ نیچے خواہ کتنی ہی روشنی ہو نسبتاً اندھیرا معلوم ہوتا ہے۔

تو یہ خاتون اندھیروں کی تلاش میں ہیں۔ تم اجالوں کے چکر میں ہو' یہ اندھیروں کے چکر میں۔

آج صبح میں نیویارک کا ایک آخری چکر لگاتا ہوں' اس کے اندھیروں اجالوں سب سے گھبرا گیا ہوں مجھے شام آگے جانا ہے اور میں ایک آخری۔ بلکہ آخری گھونٹ ایک دم پی لینا چاہتا ہوں۔

نیو یارک ۔ نیو یارک

اِٹس اے ونڈر فُل ٹاؤن

یہ کالوں' گوروں' امیروں' غریبوں' مجرموں اور اچھے آدمیوں کا شہر جو اپنے طور پر ایک الگ دنیا ہے' میرے لئے ایک دلچسپ تجربے سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔

یہ وال اسٹریٹ کی سٹہ مارکیٹ ہے جہاں کروڑپتی امریکی عام دلالوں کے ساتھ مجذوبوں کی طرح عیش کرتے اور دیوانہ وار دوڑتے بھاگتے ہیں۔ وال اسٹریٹ جو دنیا کے مالی نظام کا مرکز ہے' میرے لئے ایک بے معنی خالی خولی ہنگامے کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہ سامنے والا کروڑپتی نہ جانے کتنوں کا افسر کتنوں کی پہلی اور کتنوں کی آخری امید ہو گا۔ مگر میرے لیے ایک سو اسی پونڈ وزنی گوشت اور ہڈیوں کے ڈھیر کے سوا کچھ بھی نہیں۔

یہ سامنے ایک بلند شیشے کی عمارت ہے جس کے شیشوں میں سامنے والی عمارت کی پرچھائیاں پڑ رہی ہیں شیشہ و فولاد جس نے انسانوں کے دلوں کو سخت تر کر دیا ہے۔ صناعی اور فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ کروڑوں ڈالر کی مالیت میرے لیے ایک بے جان دیوار سے زیادہ نہیں۔ میرا جی چاہا کہ اس کی طرف منہ کر کے زور سے تھوک دوں۔ مگر پھر راہگیروں کا خیال آ گیا۔

(کیوں میاں یہ جذبہ اس لیے تو پیدا نہیں ہوا کہ یہ عمارت تمھاری ملکیت نہیں ہے۔)

اور یہ وہی پنا پرانا ٹائمز سکوائر' ایک دیوار ہے یہ قد آدم لائف میگزین کا چیختا چنگھاڑتا اشتہار ہماری ملکوں پر رات کو اشتہار بازی کی یہ وبا یہیں سے آئی ہے۔ آپ روز ملاحظہ فرماتے ہیں آج اصل بھی دیکھ لیجیے۔ جھوٹی روشنی جھوٹی زندگی۔

بس یہ زندگی کا نشان نظر آیا۔ نشان نہیں نشانات۔ چھ نوجوان شہری لڑکیاں ایک نو وارد کاؤبوائے

www.taemeernews.com

کو دیکھ کر ہنس رہی ہیں مگر کاؤبوائے کولھوں پر ہاتھ رکھے جما ہوا کھڑا ہے۔ کراچی اور نیویارک میں فرق اتنا ہے کہ کراچی میں جیالے منچلے جوان ماں بہنوں کو چھیڑتے ہیں اور نیویارک میں مائیں بہنیں اجنبی نوجوانوں کو چھیڑتی ہیں۔

اور جناب یہ بھی نیویارک ہے۔ "دو" والدین "اپنے بچوں کو گاڑیوں میں بٹھائے سنٹرل پارک کی سیر کر رہے ہیں" اس ظالم شہر کے عجیب عجیب ہنگاموں میں نہ جانے ایک اتنی پیاری ننھی نسل کیسے پروان چڑھتی ہوگی مگر یہی زندگی کی طاقت ہے کہ نیویارک کو بھی فتح کر رکھا ہے۔

اور یہ تماشا دیکھئے دریا کے ایک طرف ایک عمارت میں آگ لگی ہوئی ہے اور پانی بجھانے کا انتظام دوسرے کنارے سے کیا جا رہا ہے دریا بیچ میں چپ چاپ بہے جاتا ہے بڑا کٹھور ہے کہ سامنے آگ لگ رہی ہے انسان جل رہے ہیں مگر اس کی موجیں تڑپ کر شعلوں کے منہ پر طمانچے نہیں مارتیں۔

"مگر پیارے دریا تو بے جان ہے۔"

تم اپنی بات کیوں نہیں کرتے کیا تمھیں اپنے آس پاس لگی ہوئی آگ نظر نہیں آتی۔ دریا تو پھر بھی سطحی چیز ہے تم تو بڑی بڑی بلندیاں چھونے والے انٹلکچوئل ہو۔

اول ہوں نیویارک دیکھو نیویارک۔ یہ آگ اور پانی کا قصہ تو بہت پرانا ہے۔ جب اپنے دریا آگ نہیں بجھاتے تو مدد ہمیشہ دوسرے کناروں سے آتی ہے۔

www.taemeernews.com

نویلا ، نرالا شکاگو

تو یہ شکاگو ہے!

پہلی نظر میں شکاگو چھوٹا سا نیویارک معلوم ہوتا ہے

وہی گھٹ گھٹ وہی دھڑ دھڑ وہی ہنگامہ آرائی

یہ وہ شہر ہے جس کے نقاب گرد پٹی ہیں جس کے جرائم پیشہ ساری دنیا میں مشہور ہیں جس کے بارے میں امریکہ کے قدما اور شرفا کہتے ہیں کہ بھی افریقہ چلے جائیں گے مگر شکاگو نہیں جائیں گے۔

اے بھائی شاعر یہ جگہ تمھارے گھومنے کی نہیں۔ ادھر پیسہ، شراب، جوئے بازی، صنعت کاری، تجارت، سب چلتا ہے نہیں چلتی تو شاعری نہیں چلتی۔ یہاں ایک شاعرہ مس منرو گزری ہیں سو وہ بھی کیا تھیں، کوئی اُن کا نام بھی نہیں جانتا، ایک کارل سینڈبرگ تھا سو اسے بھی کوئی نہیں مانتا!!

شاید تمھارے ملک میں۔ ایشیائی مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے۔

واہ بھئی ناصح تو بھی کتنا بھولا آدمی ہے، نہ جانے کس ایشیا کا ذکر کر رہا ہے۔ ایشیا اب پہلا سا ایشیا کہاں، اب تو ایشیا میں شاعری یا فلم انڈسٹری میں چلتی ہے یا "ان" کی پالیٹکس میں۔

ہائیں بھائی ایشیائی یہ کیا کہہ رہے ہو، فلم انڈسٹری کی بات تو سمجھ میں آتی ہے مگر "ان" کا شاعری سے کیا تعلق ہے۔ شاید سرپرستی کرتے ہوں گے۔

ہاں بھائی ناصح نام تو ابھی تک سرپرستی کا ہے کیونکہ پرانے درباروں کی روایت تازہ ہے اور سرپرستی کا لفظ یوں بھی محترم اور مقدس ہے لیکن اصل میں آج کل جملہ علوم و فنون افسر قسم کے لوگوں کے محتاج ہوئے بیٹھے ہیں۔ تم بڑے آرٹسٹ ہو سکتے ہو مگر جب تک آرٹس کونسل کی زبردست سرپرستی حاصل نہ ہو تمھاری پبلسٹی کیسے ہوگی۔

www.taemeernews.com

اور آرٹس کونسل کا قاعدہ ہے کہ وہ صرف "اُن" کی زیر سرپرستی چلتی ہے، یعنی بڑے آرٹسٹ کو بڑے آدمی کی خوشنودی حاصل کرنی ضروری ہے، خالی خولی آرٹ سے کام نہیں چل سکتا اور تم جانو آرٹ "ان" کے لئے ہے "وہ" تو آرٹ کے لیے نہیں یعنی آرٹسٹ کو "ان" کے پاس جانا چاہیئے کیونکہ اُن کے پاس تو سبھی جاتے ہیں۔ آرٹسٹ کے پاس تو دو چار ترقی پسند قسم کے لڑکے لڑکیاں آجائیں تو آجائیں، اور وہ بھی اس آرٹسٹ کے پاس آئیں گے جس کے پاس اچھا سا اسٹوڈیو ہو اور جو فرنچ یا اطالوی فیشن کا کوٹ پہنتا اور مفلر لگاتا ہو اور ایسے ہی کسی فیشن کی داڑھی رکھتا ہو۔

اوہو میاں شاعر تم تو لیے چل پڑے، شاعر کی بات بتاؤ نا۔

اوہ سوری ہاں شاعر کا بھی قصہ یہی ہے۔ شاعر کے لیے ضروری ہے کہ بیورو کریسی اور امرا میں اس کے قدیم شاگرد، مداح اور یار دوست ہوں اور اگر وہ اچھا شاعر بھی ہو تو بس پھر اس پر کوئی آنچ نہیں آسکتی بلکہ وہ عظیم تر شاعر بھی کہلا سکتا ہے، خواہ اس کے خیالات وہی ہوں جو اس شاعر کے ہوں جو بار بار انھی خیالات کی وجہ سے جیل بھیجا جاتا ہو بلکہ جیل میں رکھا جاتا ہو اور جب آزاد کردیا جائے تو رزق کے تمام دروازے اس پر بند کردیے جائیں۔

مگر یہاں مغرب میں تو زیادہ تر گروپ بازی چلتی ہے، گروپ بازی ہمارے ہاں بھی چلتی ہے مگر وہ تو معمولی بات ہے، گروپ بہت کرے گا تو کسی کو دو قسم کے ادبی حلقوں میں بنا بگاڑ دے گا، سوا انھیں کون پوچھتا ہے، ادبی حلقے کسی کو کیا دے دیتے ہیں۔ اچھی نوکری، پنشن، باہر کے دورے اور سرکار دربار میں رسائی تو حکام کے ذریعے ملتی ہے نا۔

اچھا!

بھئی یار ناصح تو بالکل بودم ہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو کسی دن خود آکر دیکھ لے۔

مگر بھئی شاعر اس میں برائی کیا ہے، آخر افسر لوگ بیچارے چاہتے کیا ہیں، بس تعریف و عریف ہی کرتے ہونگے۔

ہاں یہ تو سچ ہے بس کبھی کبھی وہ اپنی تعریف بھی کرا لیتے ہیں مثلاً تم شاعر ہو، تم نے نظم لکھی انھوں نے تعریف کی مگر پھر ایک نظم اپنی بھی پڑھ دی یا تنقید فرما دی اور کہا کہ ان کے قول نے غالب یا ارسطو کی قبر پر لات مار دی ہے۔ اب تم کیا کروگے؟ ایک صورت تو یہ ہے کہ چپ ہو جاؤ مگر اس کا وہ برا مان جائیں گے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تردید کرو اس کا وہ اور بھی برا مان جائیں گے۔ تیسری صورت یہ کہ تائید کرو۔ چلو روٹی پانی کا دھندا سب کے ساتھ لگا ہوا ہے کردی تعریف۔ مگر اس میں خطرہ یہ ہے کہ تعریف ان کی مرضی کے مطابق نہایت تفصیلی اور موثر اور شدید نہ ہوئی تو وہ تمھیں ایک کند ذہن غبی جاہل قرار دے کر تمھارا حقہ پانی بند کرانے کا تہیہ کرلیں گے۔

www.taemeernews.com

افوہ۔ تو بھی ان کی صحبت سے بچو۔

کیسے بچو۔ ہائے بھولے بودم ناصح بچو تو ر ہو کہاں کھاؤ کہاں سے' بس یہی ہو سکتا ہے کہ دیو جانس کلبی بن کر کسی پہاڑ کی گپھا میں زندگی گزار دو' نہ کوئی تمھاری سنے نہ تم کسی کی سنو۔

تمھارا مطلب قناعت سے ہے نا۔

ہاں۔

تو بھائی پھر قناعت ہی کرو۔ قناعت تو بہت بڑی شے ہے۔

ہائے پیارے ناصح تو بڑی احمقانہ باتیں کر رہا ہے' ابے یار اگر قناعت ممکن ہوتی تو میں یہ اتنا لمبا سفر کیوں کرتا اور اس سے بھی لمبا سفرنامہ کیوں لکھتا — سنا ہے وہ شعر؛

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

تو شکاگو میں بھی شاعر کی گنجائش نہیں' کیونکہ یہاں آلات یعنی مشینوں کا عمل دخل بہت ہے اور

احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

امریکی دعویٰ:

شکاگو دنیا کے بڑے شہروں میں سب سے کم عمر ہے۔ بھئی واہ

جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

شکاگو زرعی دنیا کا مرکز ہے۔

سبحان اللہ ذرا یہ اونچے اونچے اسکائی اسکریپر ملاحظہ کیجیے اور زرعی دنیا کا تصور فرمایئے۔

مگر یہ سچ ہے شکاگو کے آس پاس امریکہ کا زرخیز ترین زرعی علاقہ پھیلا ہوا ہے۔ خدا جانے اس زراعت میں کیسے بیج بوئے جاتے ہیں کہ یہ دیو قامت عمارتیں پھوٹ پڑتی ہیں۔

شکاگو ہر وقت جاگتا رہتا ہے اور غل مچاتا رہتا ہے۔ میں نے نیویارک تک کو کبھی کبھی سویا ہوا پایا مگر شکاگو ابھی ہنگامہ روز میں مبتلا ہے۔ ابھی یہ خموشیٔ شب کی منزل میں داخل نہیں ہوا۔

اس کی چند سڑکیں بیس بیس میل لمبی ہیں اور اس طرح کہ بالکل سیدھی چلی گئی ہیں۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس نوعیت جاتی ہیں جیسے ایک بڑے میدان میں کوئی دریا بہے جائے' صاف اور سیدھا دریا۔

شکاگو [illegible] میں پیدا ہوا۔ اس وقت اس کی آبادی دو سو تھی یعنی تین سو سے ایک سو کم اور آج اس کی آبادی چالیس لاکھ سے اوپر ہے۔ اصل میں اس کے اصل آبادکاروں کی تعداد تھی ایک سو تاسی اور انھوں نے

www.taemeernews.com

اس کا نام رکھا تھا CHECAGOU شی کاگو۔ شی کاگو ایک قریبی دریا کا مقامی نام تھا یعنی ریڈ انڈین ملفظ والا نام جس کے معنی ہیں بڑا اور طاقتور۔

ممکن ہے کہ ان ایک سو ستاسی آبادکاروں کے ذہنوں میں مستقبل کا ایک دھندلا سا تصور ہو کیونکہ جب سے یہ شہر بنا پھیلتا گیا 'بڑا ہوتا گیا' اور طاقت پکڑتا گیا۔ اب طاقت کے فلسفیانہ اور ثقافتی معنی چھوڑیے۔ ان باتوں کا یہ زمانہ نہیں ہے۔ طاقت کے معنی ہیں مادی طاقت 'دولت' ثروت' اثر' اقتدار۔

شکاگو امریکہ کا دوسرا بڑا شہر ہے اور امریکیوں کے بقول دنیا کا نواں بڑا شہر ہے۔

"نو منبر" جاپانی ادب سے جھک کر کہتے ہیں۔ وہ زمانہ گیا جب یہ نواں بڑا شہر تھا کیونکہ اُس وقت پہلا بڑا شہر لندن تھا۔ اب دنیا کا سب سے بڑا شہر ٹوکیو ہے 'اس لئے شکاگو کا نمبر بھی نوت گھٹ کر دس ہوگیا ہے۔"

یہ بھی ٹھیک ہوگا بلکہ یہی ٹھیک ہے کہ شکاگو دنیا کا دس نمبر شہر ہے۔ علاوہ دیگر بےشمار جرائم کے جو اس شہر میں ہر وقت ہوتے ہیں 'جدید دُنیا کا شاید سب سے بڑا جرم بھی یہیں سے شروع ہوا تھا یعنی ۱۹۴۲ء میں سائنسدانوں نے اسی شہر کی تجربہ گاہوں میں ایٹمی طاقت پر قبضہ پایا تھا۔

اے شاعر بھائی کیا ایٹمی طاقت پر قبضہ پانا جرم ہے۔

آئی ایم سوری ناصح بھائی۔ مگر اب تک تو ایٹمی طاقت انسانیت پر ہلاکت ہی لائی۔ اگر یہاں ایٹمی طاقت پر قبضہ حاصل نہ کیا گیا ہوتا تو ۱۹۴۵ء میں ہیروشیما اور ناگاساکی کے لاکھوں معصوم شہری بچے بوڑھے اور عورتیں آن کی آن میں لقمۂ اجل نہ بنتے۔

مگر شاعر بھائی ـــ ایٹمی طاقت محافظ انسانیت بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

ہاں ناصح بھائی یہ بھی سچ ہے 'مگر نہ جانے ایسا کب ہوگا۔ شاید ہوگا لیکن

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

کیوں شاعر بھائی تم نے شکاگو کو دس نمبر تو کہہ دیا۔ یہ سچ بھی ہے لیکن تم اس کے عظیم تعلیمی اداروں کو نہیں دیکھتے۔ اس کے تحقیقاتی مراکز کا معائنہ نہیں فرماتے۔ اس کے ثقافتی عروج پر نظر نہیں کرتے' اس کی بڑھتی ہوئی خوشحالی کا خیال نہیں کرتے ـــ اے بھائی

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ

اے بھائی یہ سوا سو سالہ شہر آج پورے مشرق و مغرب کے لئے ایک محیّرالعقول مرکز علم بنا ہوا ہے۔ اس ایک شہر میں پانچ یونیورسٹیاں ہیں۔ بارہ کالج ہیں۔ بارہ مذہبی مدارس ہیں۔ سات قانونی مدرسے ہیں۔ چھ طبی کالج

www.taemeernews.com

ہیں تین مدرسے دندان سازی کے ہیں اور بیسیوں دبستان موسیقی اور دوسرے فنون کے ہیں۔ پانچ سو تجارتی تربیت و تعلیم کے مدارس ہیں۔ کل ملا کر نو دس لاکھ تو طالب علم ہیں اس شہر میں۔ چار سو عام اسکول ہیں اور پچاس ہائی اسکول اور یہ بھی دیکھو کہ کوئی اٹھارہ ہزار یونیورسٹی کے طالب علم جو دن کو کام کرتے ہیں انھیں بھی شبینہ تعلیم دینے کا باقاعدہ انتظام ہے اور پورے امریکہ میں یہ خصوصیت بھی شکاگو کو حاصل ہے کہ پہلی بار شبینہ کلاسیں کھولنے کا انتظام اسی شہر میں کیا گیا۔

اور شاعر بھائی اس اکیلے شہر میں سو ہسپتال ہیں جہاں ایک وقت میں تیس ہزار بیماروں کے لئے بستر موجود ہیں۔ ذرا سوچو کہ علاج کے ساتھ ساتھ ڈاکٹروں اور نرسوں کی تربیت کے لئے یہ کتنی بڑی آسانی ہے کبھی بیمار پڑے ہو شاعر بھائی۔ وہ دل کی بیماری تو الگ ہے کبھی ٹی بی، دمہ، فالج، گٹھیا، نمونیہ ہوا ہے تمھیں؟

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

آئی ایم سوری - میں بہت شرمندہ ہوں۔ بس قصہ یہ ہے کہ:

اب طبیعت ادھر نہیں آتی۔

: سچ بھائی ہم لوگ آئیڈیلسٹ کہلاتے ہیں کسی جگہ اچھائی کے ساتھ برائی بھی ہو تو اچھائی آنکھ سے اوجھل ہو جاتی ہے اور برائی سمندر بن کر ٹھاٹھیں مارنے لگتی ہے۔ آئی ایم سوری۔ اوہ مائی ڈیر شکاگو تو جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ ساتھ طالبان علم کی پناہ گاہ بھی ہے۔ تیری میونسپل لائبریری ہی میں تیس لاکھ کتابیں موجود ہیں۔ جہاں کتاب کی یہ قدر ہو وہاں کا جرم بھی برداشت کیا جاسکتا ہے مگر یہ کیا!

ٹھائیں۔ ٹھائیں — دوڑو — بھاگو"

وہی آواز جرائم۔ جرم کی آواز بڑی خوفناک ہے اور بڑی طاقتور ہے۔ ہزاروں پیاری نظموں ہزاروں گیتوں ہزاروں سنگیتوں پر ایک دم چھا جاتی ہے۔ اب یہ ٹھائیں ٹھائیں سنوں یا ان یونیورسٹیوں کی ہلکی نرم رسیلی [illegible] سے محظوظ ہوں۔

مگر سچ بھائی کیا تم نے نہیں سنا کہ سقراط بہت قابل آدمی تھا۔

کیوں نہیں شاعر بھائی ضرور سنا ہے۔

[illegible] آدمی تھا وہ عالم، فاضل۔ قابل اور خاصی مدت تک درس و تدریس کرتا رہا۔ اس کے پاس [illegible] جمع ہو گیا تھا۔

[illegible] شاعر بھائی اس کی کیا بات ہے۔

www.taemeernews.com

اور اسے زہر کے ایک چھوٹے سے پیالے نے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔
ہاں اُسے زہر پلا دیا گیا تھا۔
تو ناصح بھائی زہر کا پیالہ بڑا کہ سقراط کا علم، جو زہر کا اثر زائل نہیں کر سکا۔
شاعر بھائی یہ بات اور ہے اور وہ بات ــــ

نہیں ناصح بھائی بات یہی ہے۔ یہ اپنا لارڈ برٹرینڈ رسل کتنا عظیم یعنی اصلی تے وڈا آدمی ہے لیکن اگر شکاگو کا کوئی جیالا جوان اس کے سر پر ایک گھونسا مار دے تو برٹرینڈ رسل کا پتڑا ہو جائے گا نا۔

وہ دیکھو نا شاعر بھائی وہ بات اور ہے۔

بس یہی بات ہے ناصح بھائی۔ ایک چھوٹا سا جرم ایک بڑی سے بڑی بڑائی کا پتڑا کر دیتا ہے ــــ یہ ساری یونیورسٹیاں، ساری کتابیں، ساری تجربہ گاہیں، ساری اونچی اونچی عمارتیں اور ساری تحوریاں مل جل کر ان چند جرائم کا پتڑا کیوں نہیں کر دیتیں۔

آہ بھولے شاعر بھائی جرم کی نفسیات الگ ہے، ترقی کی نفسیات الگ۔ اے بھولے بادشاہ جدید اقتصادی زندگی میں جرم ایک بنیادی شیطان کی طرح سرایت کر گیا ہے۔

تو میرے بزرگ امریکی ناصح جب تک اس شیطان سے میرا پیچھا نہ چھڑا دو گے میں تمھاری کتابیں کیونکر سکون سے پڑھ سکوں گا۔

اے لو یہ تان سین کے دربار میں چلتے ہیں۔ جرم اور امارت کی نفسیات ان کے طالب علم پڑھیں یہاں تو سیلانی جوگی جدھر پہنچے نظر بھر کر چاروں طرف دیکھا جو سمجھ میں آیا سمجھا جو سمجھ میں نہ آیا اُسے چھوڑ دیا اور آگے بڑھ گئے۔ یہ تو نہ جانے کیا مرض لاحق ہوا ہے کہ اپنے حکام خوش انتظام جگہ بے جگہ یاد آجاتے ہیں۔ ورنہ ہم درویشوں کو ان علاقوں سے کیا کام۔ مدت ہوئی ایک شعر عرض کیا تھا۔ سو وہ اپنا رہنمائے حیات ہے باقی سب بکواس ہے شعر کیا تھا۔ ہاں یہ تھا شاید پسند آئے۔

ایک اسی امید پہ ہیں سب دشمن دوست قبول
کیا جانے اس سادہ روی میں کون کہاں مل جائے

سو اس بار اس سادہ روی میں یہ مسز پامیلا جانسن مل گئیں اور ایسے کہ ایک ریستوران سے وہ جاتی تھیں کہ ہم نکلے

اجنبی جان کر ٹھٹک گئیں۔ پہلے سر سے پاؤں تک اس طرح جانچا۔ گویا ہمیں شکاگو کے مذبح میں لے

www.taemeernews.com

جاکر بیچ دیں گی۔ پھر ایک دم آنکھیں شیریں ہوگئیں اور ایک شہد ملی آواز آئی۔

"آپ کہاں پڑھتے ہیں؟"

"ہم لکھتے ہیں"

"کہاں؟"

"ہر جگہ۔ فارسی ملاحظہ ہو،

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست"

"ترجمہ:"

ہم بغلیں جھانکنے لگے اور پھر مسز پامیلا سے دوستی ہوگئی۔ ان میں صرف ایک عیب تھا جو ہماری اہل خانہ کے لئے خوبی تھی۔ یعنی مسز جانسن کی عمر ۵ برس کی تھی۔ وہ ہمیں اپنی کار میں شہر سے تقریباً باہر گرانٹ پارک لے گئیں جو ایک امریکی صدر جنرل گرانٹ کے نام سے منسوب ہے۔ پارک کا نام سن کر ہمیں اپنا نیو یارک والا انٹرنیشنل ہاؤس یاد آیا جس کے سامنے اسی جنرل گرانٹ کا مقبرہ ہے۔ شروع شروع میں جب ہم پتا بتاتے تھے تو بڑی بے تکلفی سے ٹیکسی ڈرائیور پر پالش جماتے تھے۔

"ارے بھئی ریورسائیڈ ڈرائیو کا کونا۔ جہاں جنرل گرانٹ کا مقبرہ ہے۔"

اور ٹیکسی ڈرائیور ہماری واقفیت پر سر ہلا ہلا کر تعجب کرتا تھا۔ کم از کم ہمیں ایسا ہی محسوس ہوتا تھا۔

تو یہ گرانٹ پارک ہے۔ اصولاً اس کا نام گرینڈ پارک ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ پارک وارک کم ہے گرینڈ زیادہ ہے۔ یہ تو تختۂ موسیقی ہے یعنی وہ مقام جہاں یہ عظیم الشان طاق بنا ہوا ہے۔ اکیلا یہ تختہ ہی کئی ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ کوئی دس پندرہ ہزار تو کرسیاں سما جاتی ہیں اور ارد گرد ہزاروں سامعین کھڑے بیٹھے اور نیم دراز پڑے الگ رہتے ہیں۔ سامنے آرکسٹرا بڑی بڑی دلنشیں دھنیں بجاتا ہے کرسیاں یا تو لوگ ساتھ لاتے ہیں یا بس سے کچھ سیٹ یعنی نصف ڈالر میں کرائے پر لے لیتے ہیں یا پھر آگے کی نشستیں زیادہ قیمت پر مل جاتی ہیں۔ پتا نہیں ان نشستوں کا مستقل انتظام ہے یا عارضی طور پر لگائی جاتی ہیں۔ کیونکہ ہم مسز پامیلا جانسن کے ساتھ ذرا دیر سے پہنچے ہیں۔

یہ شکاگو کا ایک رخ ہے۔ اور خاصا حسین رخ ہے۔

[illegible] یہ ترنم کرتے ہوئے فوارے کتنے قیمتی ہیں۔ ان کے ساتھ موسیقی بجنے کی ضرورت [illegible] موسیقی ہے جو ان فواروں سے پھوٹتا ہے۔ کتنا دلچسپ تضاد ہے اس مقام

www.taemeernews.com

کا نام ہے بکنگھم فاؤنٹین۔ یہ ایک رومانی مقام ہے۔ نسبتہً خوش نما۔ سیدھا سادہ اور پاکیزہ اور عین اس کے داہنے ہاتھ کو شکاگو کی طویل ترین عمارت یعنی پروڈنیشل بلڈنگ کھڑی ہے جس کی بنیاد جس کی غایت اور جس کا مقصد کاروبار ہے۔ کاروبار اور فوارے۔ فوارے اور کاروبار۔

کیا بات ہے کیا بات ہے کیا بات ہے واللہ

کاروبار کے ذکر پر ذرا مارکیٹ بھی دیکھتے چلئے۔ یعنی وہ علاقہ جس کے بل پر شکاگو آج کا شکاگو بنا بیٹھا ہے۔ پورے شہر میں بارہ ہزار تو چول سیل کی دکانیں ہیں اور وہ اتنی امیر کہ ان کا کاروبار پورے امریکہ کے کاروبار کا ساتواں حصہ بنتا ہے۔ ذرا پورے امریکہ کا اندازہ کیجئے مگر ہم اور آپ بولٹن مارکیٹ اور مال روڈ پر بیٹھ کر کیا اندازہ کر سکتے ہیں۔ بس اعداد و شمار ہی کو غنیمت جانئے کہیں دہرائیے تو مفت میں لقراطان بیہ جائیں گے۔

اعداد و شمار کے چکر میں یہ نہ بھولئے کہ شکاگو کی مرچنڈائز مارکیٹ دنیا بھر میں نمبر دو عمارت ہے اونچائی میں نہیں بلکہ پھیلاؤ میں یعنی وسعت میں۔ یہاں چار ہزار سے زیادہ صنعت کاروں کے شو روم ہیں جن میں سوا لاکھ کے قریب اشیاء دکھائی جاتی ہیں۔ اور ان اشیاء میں چینی کے ظروف سے لے کر نمونے کے مکان تک شامل ہیں اس بتیس ہزار آبادی کی عمارت میں ایک ہزار صنعت کاروں، تاجروں، درآمد کرنے والوں، برآمد کرنے والوں، خوردہ فروشوں، چھوٹی صنعت والوں سبھی قسم کے کاروباریوں کا کاروبار چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔

ناطقہ سربگریباں کہ اسے کیا کہیئے

اسے تو مل گیا، مل گیا، مل گیا۔ وہ اظہار مل گیا اور ایسا اظہار انگریزی، لاطینی، جرمن، فرانسیسی، ہسپانوی عربی فارسی زبان میں کوئی نہیں جو اس عمارت کا حال اس اختصار سے بیان کر دے شکر ہے کہ یہ میدان اردو زبان ہی نے مارا۔

یہ ہے عمر عیار کی زنبیل

اور سنیے اس شہر کا نرالا پن یہ بھی ہے کہ یہ نادیدہ گاہکوں کو مال بھیجنے کی سب سے بڑی امریکی منڈی ہے کل امریکہ میں اندازاً چھ ارب ڈالر کا مال بذریعہ ڈاک خریدا جاتا ہے یعنی آپ کمپنیوں کی اشتہاری کتابیں دیکھ دیکھ کر اپنی مرضی کا مال چن لیجئے اور تحریری فروخت نرمیت۔ اس چھ ارب ڈالر میں ترانوے فیصد مال شکاگو سے جاتا ہے۔ اس کی ایک تاریخی اہمیت بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ امریکہ میں سب سے پہلے اس شہر نے مال بذریعہ ڈاک بھیجنے کی

۱ روایت ڈالی تھی۔

مزید سنیے۔ امریکی قول ہے کہ اناج کے معاملے میں دنیا بھر کے آدھے مال کی خرید و فروخت شکاگو مارکیٹ میں

www.taemeernews.com

سے ملتی ہوتی ہے۔ گندم کے پاکستانی کاروباری توجہ فرمائیں۔

تو یہ شکاگو ہے جو اٹھارہ سو تینتیس میں ایک سو تاسی آدمیوں نے "شروع" کیا تھا اور جہاں ۱۸۷۱ء میں ایک خوفناک آگ لگی تھی۔ اس آگ کی خیالی تصویریں سیکڑوں مصوروں نے بنائی ہیں مگر اندازہ کیجئے کہ شعلوں کی لپٹیں سرا سو میل دور مشی گن تک دکھائی دیتی تھیں یہاں یہ وہی شکاگو ہے جو اپنی آگ میں بھسم ہو کر دوبارہ اس طرح "پیدا ہوا" کہ اس کا قد و قامت روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے۔ مسز جانسن فرماتی ہیں کہ اب شکاگو کی تعمیر اس طرح کی جارہی ہے کہ چند برس میں اسی لاکھ کی آبادی سما سکے۔ اللہ اکبر۔

اے میاں ناصح بھائی تم مجھے مسز جانسن کے جنگل میں چھوڑ کر کہاں غائب ہوگئے۔ نا بھائی مجھ سے یہ شہر نہیں چلتا۔ یونیورسٹی۔ میوزک سب بجا مگر!

اس میں وہ سوزِ غم نہیں
مجھ کو تو خانہ ساز دے

یہ خاتون تو مجھ پر اعداد و شمار کا بوجھ لادے جاتی ہیں۔ انھوں نے نہ جانے مجھے کیا سمجھ لیا ہے! ابھی کہا شکاگو امریکہ کا واحد شہر ہے جہاں کئی نیگرو کروڑپتی ہیں۔ پھر کہا یہاں چالیس ہزار کمرے صرف ہوٹلوں میں ہیں۔ یہاں اتنے کی درآمد ہوتی ہے اتنے کی برآمد ہوتی ہے۔ اجی ہے ٹھیک ہے۔ نا میاں انھیں رخصت کراؤ اور تم تشریف لاؤ کہ یہ ذرا سی تنقید کا بھی برا مان جاتی ہیں ان کا مزاج خشک اور فلسفیانہ ہے جبکہ

مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے

اب تم نہیں آتے تو میں اس شہر سے بھاگتا ہوں۔ ایسے امیر شہر میں ایک فقیر تنہا یا ان محترم خاتون کی معیت میں کیسے رہ سکتا ہے۔

www.taemeernews.com

ہیروئن کی مادام

یہ سامنے والا گھنٹہ شکاگو کی واشنگٹن اور اسٹیٹ اسٹریٹ کے نکڑ پر ہے جس کے نیچے ٹریفک کا خودکار سگنل لگا ہوا ہے۔ اس وقت یہ گھنٹہ دن کے سوا دو بجا رہا ہے یعنی وہ وقت جب لوگ لنچ سے واپس آتے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں مرد اور عورتیں بقول خود ایک ناشتے Quick - Bite کے بعد آ رہے ہیں اور چند لمحوں میں کام پر لگ جائیں گے۔ کام اور پھر آرام اور پھر آرام اور کام۔

مگر آپ کو اس ہجوم میں وہ خاتون نظر نہیں آئیں گی جو مجھے نظر آئیں۔ بات یہ ہے کہ کچھ لوگوں کو ہجوم ہی ہجوم نظر آتے ہیں اور کچھ کو فرد ہی فرد۔ میری ایک آنکھ ہجوم کو دیکھتی ہے کیونکہ میں بھی ہجوم میں شامل ہوں یعنی:

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

مگر میری آنکھ فرد کو بھی دیکھ لیتی ہے کیونکہ میں فرد بھی ہوں۔ اپنی جگہ ایک مکمل یا نامکمل اکائی۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال

اس لئے میں نے اس مادام کو دیکھ لیا اور ٹھٹک گیا یا ممکن ہے کہ میں پہلے ٹھٹک گیا ہوں اور بعد میں مادام کو دیکھا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے مادام ٹھٹک گئی ہوں اور پھر میں نے انھیں دیکھا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم دونوں ایک دم ٹھٹک گئے ہوں اور ایک دم ایک دوسرے کو دیکھا ہو۔

مادام خوش شکل تھیں اور جوان تھیں۔ بالکل نوجوان نہیں تھیں ورنہ میری کیا مجال تھی کہ میں خوش شکل جیسا معمولی لقب استعمال کرتا۔ ان کا چہرہ تھکا ہوا تھا۔ ان کی آنکھیں اندر دھنسی جا رہی تھیں، وہ سخت نڈھال اور مضطرب معلوم ہو رہی تھیں۔ میری کیفیت یہ تھی کہ میں بوسٹن جانے کے لئے نشست مخصوص کرانے کے چکر میں گھنٹے بھر گھوم چکا تھا، سخت تھکا ہوا تھا۔ کسی ریستوراں میں کھڑے ہونے کی جگہ نہ تھی بیٹھ کر کھانے کا پروگرام نہیں تھا، کیونکہ بیٹھنے

www.taemeernews.com

والے ریستوران میں کھانے کی قیمت کھٹے کھانے سے تین چار گنی ہوتی ہے۔

انسانوں کے اتنے بڑے ہجوم میں دو بھٹکے ہوئے انسانوں کا ایک ہی جگہ ٹکرا جانا عجیب اتفاق ہے۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور تاریخی بقراطیت میں مبتلا ہونے ہی والا تھا کہ مادام کے پیارے پیارے منہ سے ایک کرخت آواز نکلی اور میرے سارے قلعے ایک دم دھڑام سے آگرے۔

"ہے، وہ تقریباً چلائیں۔ "یو وانٹ کمپنی" (کیوں جناب ساتھی چاہیئے)

آو مادام۔ تو آپ طوائف ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں کہا اور سر جھکا کر آگے بڑھ گیا مگر انھوں نے بے تحاشا لپک کر میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ہے مسٹر میں سخت تھکی ہوئی ہوں مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ مجھے کسی کی بھی سخت ضرورت ہے۔ پلیز۔ پلیز۔ مسٹر پلیز۔ میرا ہاتھ تھام لو اور مجھ سے دو باتیں کر لو۔"

یکایک میرے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے ابھرے۔ طوائف کے تو یہ آثار نہیں ہوتے۔ مادام کوئی جاسوس ہیں یا چار سو بیس ہیں یا کسی اور قسم کی فراڈ ہیں۔ آخر یہ کیا قصہ ہے ―

اب مادام نے بالکل سامنے آکر آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"پلیز مسٹر اسٹرینجر (اجنبی) پلیز ― "

ایک دم میرے اندر سے سو برس سے دبا ہوا مغل چھلانگ مار کر باہر کو پڑا اور میرے سر پر دھم سے ایک گھونسا مارا۔ "ابے ننگ اسلاف" جیسے اس نے کہا "اب تو عورت کے معاملے میں سوچنے بھی لگا۔"

"حاضر سائیں حاضر" میں نے گویا ایک زور کی آواز لگائی۔ دل نے دماغ پر تڑ سے ایک ٹھوکر ماری اور میں سراپا اخلاق بن کر مادام کے سامنے جھک گیا۔

"مائی پلیژر مادام۔ لیٹس گو۔"

مادام نے نہایت بیباکی سے میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال دیا اور میں ٹرکا گو کی اسٹیٹ اسٹریٹ پر یوں فاتحانہ چلنے لگا جیسے چنگیز خان وسط ایشیا فتح کر کے گھر آیا ہو۔

مگر ابھی ہم دس قدم ہی چلے تھے کہ مادام نے تقریباً سارا بوجھ مجھ پر ڈال دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اور بھی نڈھال ہو گئی تھیں۔

کیا بات ہے مادام" میں پھر گھبرایا۔ اب میں سمجھا یہ کوئی دل جلی بیمار عورت میرے پلے پڑ گئی ہے اللہ خیر کرے۔ "کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں"

www.taemeernews.com

"ضرور، ضرور، تم فوراً میری مدد کرسکتے ہو" مادام سرگوشیوں میں چیخنے لگیں۔ سامنے سے ایک نیگرو پولیس والا ہمیں دیکھ کر تقریباً قریب آیا اور مادام مجھے گھسیٹتی ہوئی چلنے لگیں، ان میں ایک دم توانائی آگئی، میں بھی گھبرا کر بار بار پولیس والے کو دیکھنے لگا مگر مادام ایک دم برابر والے اسٹور میں گھس گئیں۔

"ہم یہاں کیوں آئے ہیں" میں بے بس سا ہو گیا تھا۔ ابھی تو میں نے گھٹیا کھانے کی تلاش میں تین چار ڈالر بچائے ہیں۔ اب یہ عورت شاپنگ کا چکر ڈالنے والی ہے۔ بھائی چنگیز خانصاحب آپ واپس تشریف لے جائیے تم مغلوں کے زمانے میں فارن ایکسچینج کا مسئلہ نہیں تھا نا!

مگر مادام پر سخت ہذیانی کیفیت طاری تھی وہ مجھے پھر تو میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گویا مجھے تولتی رہیں پھر فر فر بولنے لگیں۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"مسٹر ایم جے۔ اے۔ احمد" میں نے ڈر کے مارے اپنا اسکول والا نام بتا دیا۔

"آہ تو تم عرب ہو۔ عرب بڑے بہادر اور فیاض ہوتے ہیں۔" مادام جیکس مگران کا چہرہ زرد ہوتا جا رہا تھا۔

"نہیں میں پاکستانی ہوں" میں نے سختی سے تردید کی۔ مگر میں بہادری اور فیاضی کی اجارہ داری عربوں کو کیسے دے دیتا" اور پاکستانی عربوں سے زیادہ بہادر اور فیاض ہوتے ہیں" میں نے نہلے پر دہلا لگایا اور اپنا سینہ پھلا لیا حالانکہ سینہ پھلانے میں مجھے کافی تکلیف ہوئی۔

"آہ یقیناً" مادام تعاون کے موڈ میں تھیں "یقیناً پاکستانی عربوں سے زیادہ بہادر اور فیاض ہوتے ہیں اور ان کو بھی مانتے ہیں۔ تم لوگ مسلم ہوتے ہو؟"

"نہیں ہمارے ہاں سبھی مسلم نہیں ہوتے بلکہ ہندو اور عیسائی بھی خاصی تعداد میں ہوتے ہیں، ہم لوگ اپنی اقلیت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ پاکستان کی کل آبادی......" میں نے پاکستان پر لیکچر شروع ہی کیا تھا مگر مادام نے بولنے نہ دیا۔

"اچھا تو پیارے پاکستانی دوست خدا کے واسطے تم مجھے دس ڈالر دے دو، قرض دے دو یا ویسے ہی دے دو۔ یا میں تمہارے ساتھ جتنی دیر چاہو رہوں گی مگر ابھی نہیں ابھی تو مجھے صرف دس ڈالر دے دو اور ابھی دے دو پلیز۔ فار گاڈ سیک۔"

اب میرے اندر حضرت بقراط اور حضرت چنگیز خاں میں پھر جنگ ہونے لگی۔ بقراط صاحب ماف کے خطرات تدابحث کا مشورہ دے رہے تھے اور خطرات سے آگاہ کر رہے تھے مگر چنگیز خاں خنجر لے کر لڑنے کا ... گر جہ

www.taemeernews.com

بڑھنے لگے اور بقراط صاحب پسپا ہونے لگے۔

"مادام آپ کو کوئی تکلیف ہے؟" میں نے جی کڑا کر کے پوچھا مگر ساتھ ہی قمیص کی جیب میں ہاتھ بھی ڈال لیا۔ "بات یہ ہے کہ میں پردیسی ہوں اور بہت سفر کرنا ہے اگر......"

"اچھا تو اس وقت صرف پانچ ڈالر ہی دے دو مگر ابھی دے دو۔ اسی وقت دے دو۔ تمھیں اپنے پیلے مَن کی قسم ہے ابھی دے دو۔ میں صرف آدھ گھنٹے میں جہاں کہو آجاؤں گی۔"

یہاں میں دس ڈالر دینے پر تیار تھا، میں عام طور پر سفری چیک اپنے ہوٹل کے منیجر کے پاس رکھتا ہوں، باہر نکلتے وقت تھوڑے سے ڈالر لے کر نکلتا ہوں اور وہ بھی اس طرح کہ ایک ایک ڈالر کے نوٹ آسان جیب میں، دس ڈالر کے قمیص کی جیب میں جس پر ایک چھوٹا سا پن لگا لیتا ہوں اور پانچ پانچ ڈالر کے دو تین نوٹ کوٹ کی جیب میں۔ بڑا رکھتا ہی نہیں تاکہ اگر کوئی ہاتھ صاف کرے تو کسی نہ کسی جیب میں ہوٹل تک واپسی کا مال باقی رہ جائے۔

میں نے فوراً دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک نوٹ نکال کر مادام کے حوالے کر دیا۔

"میں ساتھ والے ریستوران میں ساڑھے تین بجے تک رہوں گا۔"

"تھینک یو ڈیئر ررررر ــــ" مادام نے پوری طرح سانس بھی نہ لیا اور تیر کی طرح باہر بھاگ گئیں۔ ان کے جانے کے بعد میں نے کوٹ کی جیب سے باقی نوٹ نکال کر دیکھے، پانچ پانچ ڈالر کے تھے۔ مجھے اطمینان ہوا کہ مادام کو پانچ ڈالر ہی دیے ہیں کیونکہ امریکی نوٹ سب ایک سائز کے ہوتے ہیں، ایک سے لے کر سو تک سب کا ایک سائز، صرف ہندسے کے فرق سے قیمت کا پتا چلتا ہے۔ اس چکر میں بندہ ایک بار ایک ڈالر کی جگہ دس دس کے چار نوٹ گنوا بیٹھا تھا، اس لیے ایک فطری احتیاط سی ہو گئی ہے۔

مجھے یقین تھا کہ مادام واپس نہیں آئیں گی مگر میں بھوکا بھی تھا اور ایک طرح کا تجسس بھی تھا اس لیے برابر والے ریستوران میں داخل ہو گیا۔ بہت سے لوگ کھانا کھا کر جا چکے تھے۔ کھڑے ہونے کی جگہ کافی تھی۔ پانچ ڈالر ضائع کر کے میری ہمت بڑھ گئی تھی اس لیے میں نے برابر والے حصے میں بیٹھ کر آرام سے کھانا کھانے کا فیصلہ کیا اور ایک بڑی تیجی مینو کو ایک عمدہ اور مہنگے پنچ کا آرڈر دے کر ایک میز پر قبضہ جما لیا۔ بقراط صاحب نے دور سے دو تین مرتبہ مجھ کو دیکھا مگر میں نے شپ سے چنگیز خانی خنجر نکال کر انھیں بھگا دیا۔

سوا تین بجے وہ ہر ایک دم آدھمکیں۔ ان کا چہرہ ایک صاف پلیٹ کی طرح چمک رہا تھا۔

"ڈونٹ کتنی بھوکی ہوں۔ میرا زیادہ انتظار تو نہیں کرنا پڑا۔ مائی ڈیئر مسٹر ایم۔ جے کیا نام ہے تمہارا۔"

ب۔ کھانا جی کی ہیں گی۔ میں نے سوچا

www.taemeernews.com

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

مگر انھوں نے صرف چیز کے بسکٹ اور کافی پر اکتفا کیا۔

"تمھیں تو بھوک لگ رہی تھی۔"

"ہاں بہت۔ بس یہی میرا کھانا ہے۔ اچھا ایک کافی اور پی لوں گی۔"

"تمھارا نام کیا ہے۔" میں نے بے تکلفی سے اپنا حق جتانا شروع کیا۔ آخر میرے چھ ڈالر خرچ ہو چکے تھے۔

"آہ میرا نام کچھ بھی سمجھ لو میری۔ ماریا۔ اپنا جو نام تمھیں پسند ہو۔"

"کیا تم طوائف ہو" میری بیباکی اور بڑھ گئی۔

"ہاں۔ اچھا ایک سگریٹ پلاؤ۔"

"سگریٹ ختم ہو گئے ہیں"

"اچھا تو تیس سینٹ نکالو۔" انھوں نے سامنے والی مشین میں تیس سینٹ ڈالے اور کمسٹ سے کیمل سگریٹ کا پیکٹ نکال لائیں۔ میں نے دیکھا کہ سگریٹ کے ایک کش سے ان کے چہرے پر تازگی آ گئی۔ انھوں نے ملجے بجھے آنکھیں بند کر لیں۔

"اب کیا پروگرام ہے" انھوں نے آنکھیں بند کیے کیے پوچھا

"میں تو سینما دیکھوں گا۔" میں نے سرد مہری سے جواب دیا۔

"سینما۔" وہ چونک پڑیں۔ "اوہ نو۔ میں سینما نہیں دیکھ سکتی۔ میں بہت مصروف ہوں۔" پھر وہ مجھے ملتجی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ "سینما کیوں جاتے ہو ڈیر ایم اے جے او۔ آئیم سوری مسٹر ایم جے اے تمھارا ہوٹل کہاں ہے۔"

"وہ بہت دور ہے مادام۔ آپ نے مجھے غلط سمجھا ہے۔" میں اور بھی روکھا ہو گیا۔ نہ جانے کیوں مگر ایسا بھی ہوتا ہے۔

"اچھا تو چلو سینما چلیں۔ مگر بس جلدی چلو۔" انھوں نے اپنے آپ سینما کی دعوت قبول کر لی۔ میں نے حساب لگایا دو ڈھائی ڈالر اور خرچ ہو جائیں گے۔

سینما میں مادام شاید سو گئیں کیونکہ پہلے چند منٹ کے بعد انھوں نے کوئی بات نہیں کی۔ میں دوبارہ لابی میں سگریٹ پینے گیا تو انھوں نے ٹوکا بھی نہیں شاید انھیں خبر ہی نہ ہوئی۔ سینما میں دو فلمیں دکھائی گئیں مگر دوسری ختم ہونے سے ذرا پہلے وہ جاگ گئی تھیں۔

www.taemeernews.com

"چلو یہ بہت بور ہے اب باہر چلو" انھوں نے کھسر پھسر کی

"ابھی ختم ہونے والی ہے"

"باقی میں بتا دوں گی چلو جلدی چلو پھر بجنے والے ہیں شاید۔ گھڑی دیکھنا۔"

"اوں ہوں۔ تم چلی جاؤ" میں غرّایا۔ پھر میں ڈرا کہ یہ بہرحال سفید فام عورت ہے بُرا مان جائے گی۔ مگر وہ بُرا نہیں مانیں۔

"اچھا جیسی تمھاری مرضی" بیچاری بے بس ہو کر رہ گئیں۔ میں اُٹھ گیا۔

"آؤ چائے پئیں" میں نے تجویز پیش کی۔

"اچھا" انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھڑی دیکھی۔ میں نے دیکھا تو ان کا چہرہ دوبارہ زرد ہوتا جا رہا تھا۔ چائے پر ان کا اضطراب بڑھنے لگا۔ میں چائے ٹھنڈی کرکے آرام آرام سے پیتا رہا۔ انھوں نے گرم گرم چائے حلق میں انڈیل لی۔

"اب کیا پروگرام ہے۔ تمھارا ہوٹل کون سا ہے"؟

"میں تو نیو پارک میں رہتا ہوں۔ اب جہاز سے سیدھا واپس چلا جاؤں گا" میں نے کنی کاٹی۔

"تم واپس چلے جاؤ گے۔ میرا وقت یوں ضائع کرکے بھاگ رہے ہو" وہ تن کر کھڑی ہو گئیں "تم آسانی سے نہیں جا سکتے"۔

"شاید میں پولیس کی مدد سے جا سکوں" میں نے اپنے سفلے پن کا مظاہرہ کر ہی دیا۔ وہ یکدم سرد پڑ گئیں۔

"گڈ بائی مادام۔ آئی۔ ایم۔ سوری۔"

"گڈ بائی لو زادہ"

"گڈ بائی" میں نے دوبارہ کہا اور چل پڑا۔

"ایک منٹ" میں ٹھہر گیا۔

"کیا تم مجھے دس ڈالر اور نہیں دے سکتے"

"کیوں"؟

"بس۔ تم مجھے دس ڈالر اور دے دو۔"

"پاکستان کے نام پہ"

"کس کے نام پہ بھی۔ اپنے باپ کے نام پہ۔ اوہ مائی گاڈ میں کتنی پریشان ہو گئی ہوں۔" وہ پھوٹ پھوٹ

www.taemeernews.com

کر رونے لگیں۔ آس پاس چلتے ہوئے لوگ کن انکھیوں سے دیکھنے لگے۔ میں حیران پریشان۔ ایک بڑی بی دوسری پٹری پر کھڑی کوئی پمفلٹ بانٹ رہی تھیں، وہ تیر کی طرح سڑک پار کرکے آئیں اور ایک دم برس پڑیں۔

"ہے" وہ چیخیں۔ "تم کیوں اس خاتون کو ستا رہے ہو؟"

"میں تو کچھ بھی نہیں کہہ رہا۔" میں سٹ پٹا گیا یا الٰہی خیر۔

"پھر یہ کیوں رو رہی ہے؟ میں خود دیکھ رہی تھی تم لوگ اس سینما سے نکل کر اس ریستوران میں گئے اور باہر نکل کر لڑ پڑے تمھیں شرم نہیں آتی۔ تم پورٹوری کن ہو یا اسپینی یا اطالوی۔ اُف تم لوگ بڑے ذلیل ہوتے ہو۔ اور یہ امریکی لڑکیاں تمھارے چکر میں پھنس جاتی ہیں بے وقوف امریکی لڑکیاں" انھوں نے مجھے نفرت سے اور مادام کو ہمدردی سے دیکھا۔

"آؤ گھر چلیں" یہ کہہ کر مادام نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور آگے بڑھ گئیں۔ میں بچوں کی طرح ان کے ساتھ ہولیا۔

"ڈیئر ایم سجے۔ لے بُرا نہ ماننا۔ آئی ایم ویری سوری لیکن مجھے دس ڈالر ضرور دے کر جانا۔"

"مادام میں دس ڈالر تم پر خرچ کر سکتا ہوں مگر نقد نہیں دوں گا، مجھے تم سے ہمدردی ضرور ہو گئی ہے مگر میں غریب آدمی ہوں۔ تم یہ بتاؤ تم بار بار اس طرح رقم کیوں مانگتی ہو۔ اگر تم طوائف ہو تو بازار آدمیوں سے بھرا پڑا ہے۔"

"آہ معاف کرنا میں تمھیں ستا رہی ہوں مگر میرے پاس وقت نہیں ہے، بازار میں آدمی کی تلاش میں خاصی دیر لگ جاتی ہے اور۔ اور" ان کی آنکھوں میں پھر آنسو نظر آنے لگے۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔

"مگر ابھی تو بہت وقت ہے ابھی تو پوری طرح شام بھی نہیں ہوئی۔"

"آہ تم نہیں سمجھ سکتے۔ مجھے وقت پر دوا کھانی ہوتی ہے۔"

"تو کھالو۔"

"اوہ یو فول تم نہیں سمجھتے۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

"تو دس ڈالر کی کون سی دوا آتی ہے ابھی تو تم نے پانچ ڈالر لئے تھے۔"

"اوہ فولش ایشین۔ اب میں کیسے بتاؤں۔ اچھا تمھاری کوئی مذہبی کتاب ہے۔"

"ہے۔"

"اچھا اس کی قسم کھاؤ کہ یہ بات شکاگو میں کسی سے نہیں کہو گے۔"

"میں یہاں رہتا کب ہوں"

www.taemeernews.com

"اچھا۔ اچھا۔ مطلب یہ ہے کہ پولیس سے نہیں کہو گے۔"

"نہیں کہوں گا۔"

"میں ہیروئن کا ٹیکا لیتی ہوں۔ دو بجے بھی میرا وقت تھا' اب سات بجے بھی وقت ہو رہا ہے' اگر میں نے آدھے گھنٹے بعد ٹیکا نہ لیا تو میں تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گی۔"

واقعی مادام کا چہرہ زردی سے سفید ہو رہا تھا۔ میں گھبرایا' پہلے تو میں نے سوچا کہ ہاتھ چھڑا کر ایک دم بھاگ پڑوں مگر پھر نہ جانے کیوں مجھے سنسنی خیزی کی سوجھی۔

"اچھا تو تم میرے سامنے ٹیکا لو۔ میں خود دیکھوں گا۔" میں نے مادام کے سامنے اپنی تجویز پیش کر دی جس پر وہ حیران ہو گئیں۔

"تم دیکھ کر کیا کرو گے"

"کچھ نہیں بس دیکھوں گا۔"

وہ چپ کھڑی رہیں۔ ان کے چہرے کا رنگ بار بار بدل رہا تھا۔ اُن کی آنکھوں میں مُردنی چھا رہی تھی پھر انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

ہم ایک ٹیکسی میں بھاگم بھاگ مرچنڈائز مارٹ پہنچے جو امریکیوں کے بقول دنیا بھر کی سب سے بڑی دکان ہے۔ ٹیکسی وہیں چھوڑ دی گئی۔ مادام نے دوبارہ پانچ ڈالر لئے۔ مجھے دکان کے اندر گھوم کر دس منٹ بعد باہر آ جانے کا حکم دیا اور خود کسی اور گلی میں غائب ہو گئیں۔ میں باہر نکلا تو وہ بہت بےچین کھڑی تھیں۔

"تم نے پندرہ منٹ لگا دیئے میری حالت خراب ہو رہی ہے اب فوراً ٹیکسی لو خرچ کی پروا نہ کرو۔"

دوسری ٹیکسی لے کر نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتے ہوئے ہم کوئی دس بارہ منٹ میں ایک تنگ تاریک گلی میں پہنچے۔ ٹیکسی نے تین ڈالر لئے۔ بقراط کی روح مجھے کوس رہی تھی اور چنگیز خاں بھی کسی اور مہم کے لیے روانہ ہو چکا تھا کیونکہ مجھے تین ڈالر کا یہ خرچ بہت ہی کھلا۔

اب ہم ایک خاصی بوسیدہ عمارت کی پانچویں منزل پر لفٹ کے بغیر پہنچے۔ میرا دم بالکل پھول گیا۔ مادام بھی نڈھال ہو کر تقریباً ہانپ رہی تھیں۔ مگر وہ ایک کشش کے زور سے چڑھے جا رہی تھیں۔ پانچویں منزل پر انھوں نے اپنے کمرے کو جلدی سے کھولا اور اندر داخل ہو کر بتی جلائی

میرے نزدیک آج بھی وہ کمرہ دنیا کا غلیظ ترین کمرہ ہے' اس میں غربت و افلاس کا کوئی دخل نہ تھا بلکہ نفس بے پروائی اور بے توجہی کی کارفرمائی تھی۔ کمرہ بہت مختصر تھا۔ ایک بستر' منہ دھونے کا بیسن اور گیس یا بجلی

کا ایک چولھا جس کے پاس ایک پلیٹ اور ایک پیالی رکھی ہوئی تھی۔ مادام نے داخل ہوتے ہی سامنے سے پیالی اٹھائی اور اس میں پانی ڈال کر چولھے پر رکھ دیا۔ اس وقت تک ان کی حالت خاصی غیر ہو چکی تھی، وہ بار بار زمین پر پاؤں مارتی تھیں۔ شاید ان کے منہ سے کف بھی نکل رہا تھا۔ ایک خاصی قبول صورت عورت چڑیل بنی ہوئی تھی۔ میں اس پورے ماحول میں گم سم ایک طلسماتی منظر دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے میں انھوں نے اپنے بٹوے میں سے سرنج نکالی اور دوسری بار سوئی نکال کر اس میں لگادی۔ نہ سوئی کو دھویا نہ گرم کیا۔ وہ سخت بیقرار تھیں اور کمرے میں چاروں طرف دیوانہ وار گھوم رہی تھیں پھر یکایک انھوں نے بٹوے میں سے ایک چھوٹی سی پڑیا نکالی۔ وہ پڑیا بہت چھوٹی تھی اور اس میں کوئی رتی بھر سفوف بھرا ہوا تھا، وہ سفوف انھوں نے پیالی میں ڈال دیا اور پھر اس میں انگلی ڈالی۔ بے سوچے سمجھے میں بھی آگے بڑھا اور میں نے بھی پیالی میں انگلی ڈالی، پانی نیم گرم تھا، دوا پیالی کی تہہ میں جمی ہوئی معلوم ہو رہی تھی، یکایک مادام نے ایک جھٹکے سے میرا ہاتھ کھینچ لیا۔

"ہٹ جاؤ۔ کتے۔ حرامزادے وہاں سے ہٹ جاؤ" وہ ہذیانی کیفیت میں چیخنے لگیں، میں ڈر کر بھاگا تو بند دروازے سے ٹکرا گیا۔ سنبھل کر میں دروازہ کھولنے ہی والا تھا کہ مادام دھم سے زمین پر گر پڑیں اور کبوتر کی طرح لوٹنے لگیں، گھبراہٹ میں مجھ سے دروازہ بھی نہ کھلا میں نے مڑ کر انھیں پکڑنا چاہا مگر وہ میرے قبضے میں نہ آئیں، میں نے چاہا کہ انھیں اٹھا کر کم از کم بستر پر لٹادوں مگر وہ تڑپ کر میرے ہاتھوں سے نکل گئیں۔

"کتے، ایشیائی گندے کتے۔ حرامزادے۔ اتنی دیر کردی۔ تو میرے خون کا ذمے دار ہوگا۔ تو پکڑا جائیگا۔ تجھے پھانسی ہوگی۔ تو کتا ہے۔ تو حرامزادہ ہے" مادام لوٹتی جاتی تھیں اور گالیاں دیتی جاتی تھیں۔ انھوں نے ان گالیوں کے علاوہ اور بہت سی گالیاں بھی دیں جنھیں دہرانا کوئی معقول بات نہیں اور مجھے سخت غصہ بھی آیا لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔ شاید میں بھاگ سکتا تھا مگر نہ جانے میں کیوں نہیں بھاگا۔

"کیا پانی گرم ہو گیا" یکایک انھوں نے آواز دی، میں نے دوڑ کر پیالی میں انگلی ڈالی۔ پانی خاصا گرم ہو گیا تھا۔

"خوب گرم ہے" میں نے جواباً کہا۔

"پیالی ہٹا کر الگ رکھ دو۔"

اب مادام ساکت ہو گئیں۔ ان کے بال بکھر چکے تھے، ان کا پاؤڈر پسینے نے بہا دیا تھا، ان کی آنکھیں آدھی بند ہو چکی تھیں مگر وہ چپ چاپ اس میلے گندے فرش پر لیٹی چھت کی طرف تکتی رہیں۔

"کیا تم کو انجکشن لگانا آتا ہے۔"

"نہیں۔"

www.taemeernews.com

"اچھا تو تم مجھے اٹھاؤ۔"

میں نے انھیں آہستہ سے اٹھایا۔ انھوں نے بمشکل سرنج میں پیالی والا پانی بھرا اور پھر گویا بجلی کی تیزی سے اپنے اُلٹے بازو میں سرنج گھونپ دیا پھر انھوں نے تھوڑا سا پانی اپنی رگ میں بھرا اور ایک دم ہی اُسے واپس کھینچ لیا۔ میں نے دیکھا کہ پانی کے ساتھ ساتھ خون بھی آیا ہے۔ سرنج دفعتاً سُرخ ہوگئی' مجھے جیسے قے آنے لگی' میری چیخ نکل گئی۔ اسی باعث انھوں نے پھر سرنج جما کر اندر ٹھولنسی اور اس کا پانی رگ میں اُتار دیا۔ پھر انھوں نے سرنج ایک دم واپس کھینچ لی اور میں نے دیکھا کہ جہاں سوئی لگی تھی وہاں خون کے بہت سے قطرے جمع ہو گئے ہیں۔

"یا خدا تیری پناہ" میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

دو منٹ بعد مادام کے چہرے پر بحالی آگئی۔ انھوں نے آنکھیں کھول کر مجھے بڑے پیار سے دیکھا

"آئی۔ ایم سوری مسٹر۔ تم خون دیکھ کر گھبرا گئے تو میں نے بھی جلدی کی ورنہ یوں بار بار خون کھینچ کر ملانے سے زیادہ مزا آتا ہے۔"

"ضرور ضرور۔ آئی ایم سوری" میں اس وقت ایک بہت مصیبت زدہ قیدی کی طرح تھا۔

اب وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئیں اور اپنے بال درست کرنے لگیں۔ میں نے اپنا ہیٹ دوبارہ سر پر اچھی طرح جمایا اور اندر قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈالا جس میں دس دس ڈالر کے تین نوٹ تھے۔

"آؤ اب چل کر کچھ کھائیں پئیں۔ بس اب تم مجھے دس ڈالر اور دے دینا میں ایک انجکشن رات کو لوں گی اور ایک صبح۔"

"اور پھر"

"پھر کوئی اور مل جائے گا۔"

"اچھا مادام۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی" میں نے دروازہ کھول کر تقریباً چیختے ہوئے کہا "افسوس ہے کہ وہ آدمی میں نہیں ہوسکتا۔"

ارے ٹھیرو ٹھیرو بات تو سنو' وہ میرے پیچھے بھاگیں۔ مگر میں نے فرش پر تینوں نوٹ پھینک دیے۔ وہ فوراً انھیں اٹھانے مڑ گئیں۔

میں جلدی جلدی نیچے اُترا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی بھاگتی ہوئی آئیں گی۔ مگر زینے میں کوئی آواز نہ ہوئی۔ جب میں گلی میں تیز تیز جا رہا تھا تو اوپر سے دھڑ دھڑ کرتی ہوئی ایک کھڑکی کھلی اور مادام نے سر باہر نکالا۔ بے منہ کی بجتے لے میری رفتار تیز ہوگئی۔

www.taemeernews.com

"ہے مسٹر۔ اِدھر دیکھو۔" میں نے گردن موڑ لی

"تھینک یو" انھوں نے اپنے ہونٹوں پر دو انگلیاں رکھ کر ایک بوسہ پھینکا میں چلتے چلتے بگٹٹ بھاگنے لگا۔

www.taemeernews.com

انسان سب پر غالب آجائیگا

کیا آپ نے بوسٹن ٹی پارٹی کا ذکر سنا ہے۔ میرا خیال ہے ضرور سنا ہوگا۔ لنتنے دن امریکی گیہوں کھایا، امریکی ناچ دیکھے، امریکہ پڑھا، امریکہ پیا، امریکہ سوچا، امریکی لہجے کے سہارے سوسائٹی میں جگہ بنائی، یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ امریکہ کے قدیم اور مشہور شہر بوسٹن کے بلکہ پورے امریکہ کے سب سے بڑے تاریخی واقعے سے ناواقف رہ گئے ہوں۔

مگر یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے کھانے گانے اور لہجہ بنانے ہی کو کافی جانا ہو اور کبھی بوسٹن ٹی پارٹی کا نام نہ سنا ہو۔ اگر کھانا، پینا، ناچنا، گانا پڑھے پڑھائے بغیر ملتا رہے تو پڑھنے پڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔

بہرحال میں اپنی عادت سے مجبور ہوں جس کا کھاؤں گا اس کا گاؤں گا اور آپ کو بوسٹن دکھانے سے پہلے بوسٹن ٹی پارٹی کا واقعہ ضرور یاد دلاؤں گا کیونکہ امریکی بوسٹن ٹی پارٹی کو تاریخ انسانی میں بہت بڑی جگہ دیتے ہیں۔ وہ برطانوی غلامی سے اپنی آزادی کا پہلا قدم اس واقعے کو قرار دیتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ وہ اپنے ملک کی آزادی کو انسانی تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ سمجھتے ہیں، اگر اسے نہیں سمجھیں گے تو کیا ہماری آزادی کو سمجھیں گے یا چینی انقلاب کو اہمیت دیں گے۔

مگر یہ سچ ہے کہ امریکہ کی آزادی امریکہ کی خودمختاری اور امریکی دستور کی تشکیل پوری انسانی تہذیب کے ارتقا میں نہایت عظیم الشان واقعات ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ ایک طرح ان کی ابتدا بوسٹن ٹی پارٹی سے ہوئی۔

بوسٹن انگریز آبادکاروں نے بسایا تھا۔ یہ ساحل اوقیانوس سے صرف چھ میل دور ہے اور دریائے چارلس کے کنارے واقع ہے، یہ دریا انگریزی بادشاہ چارلس کے نام سے منسوب ہے، خدا جانے اس کا اصل نام کیا تھا۔ مفتوحوں اور مقبوضات کے نام آقاؤں کی مرضی پر منحصر ہوتے ہیں۔

جب یہاں برطانوی قوموں کو بسے ہوئے ڈیڑھ سو برس کے لگ بھگ گزر گئے اور ان کے پاؤں جم گئے

www.taemeernews.com

تو انھیں محسوس ہونا شروع ہوا کہ انھوں نے اور ان کے آباؤ اجداد نے اتنی محنت سے نیا ملک بسایا، تجارت پھیلائی، سُرخ ہندیوں سے جنگیں کیں، اپنی بستیاں بسائیں، اور اب کہیں جا کر تھوڑی بہت فراغت نصیب ہوئی ہے لیکن ان کی محنت اور لیاقت سے فائدہ برطانیہ عظمیٰ ہی اٹھائے جاتی ہے۔ اس زمانے میں برطانوی امریکہ زیادہ تر مشرقی ساحل پر آباد اور کل تیرہ ریاستوں پر مشتمل تھا جن پر تاج برطانیہ اپنے افسروں کے ذریعہ حکومت کرتا تھا۔ بوسٹن میں ایک گورنر بہادر کا راج تھا جو برطانوی قوانین کو نافذ کرتا تھا، ٹیکس جمع کرتا تھا اور ٹیکس کا روپیہ ملک معظم کی حکومت کو بھیجتا تھا۔

۲۲ دسمبر ۱۷۷۳ء کی شام تھی۔ بوسٹن یوں بھی دسمبر میں سخت سرد ہوتا ہے، طرّہ یہ کہ بارش بھی ہو رہی تھی، اولے پڑ رہے تھے مگر سات ہزار شہری گریفن وارف پر جمع تھے اور حکومت کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ بظاہر ان کا مطالبہ بہت سادہ تھا اور وہ یہ تھا کہ تین برطانوی جہاز جو جزائر شرق الہند سے چائے لاتے ہیں انھیں واپس کر دیا جائے۔ اس مطالبے کی تہہ میں جذبہ یہ تھا کہ چونکہ نوآبادیات کی نمائندگی برطانوی پارلیمنٹ میں نہیں ہوتی، ٹیکس زیادہ لگائے جاتے ہیں اور ٹیکس لگاتے وقت نوآبادیوں سے مشورہ نہیں لیا جاتا، اس لیے حکومت برطانیہ کو اہلِ بوسٹن پر حکم چلانے کا حق نہیں ہے۔ دیکھا آپ نے ساری بات لے دے کر ٹیکس پر آجاتی ہے، ٹیکس جس کا فلسفہ یہ ہے کہ وہ عوام کی مرضی سے عوام کی حفاظت اور ان کی ترقی کے لیے نافذ کیا جائے، کم از کم پہلے یہی فلسفہ تھا، اب دنیا بہت بدل گئی ہے، خود اختیارات کا فلسفہ بدل گیا ہے۔ پتا نہیں کس بات کے کیا معنی ہوں، مگر ہاں اس وقت کہانی بوسٹن ٹی پارٹی کی بیان ہو رہی ہے۔ ۶ بجے کے قریب معلوم ہوا کہ گورنر بہادر نے عوامی مطالبہ مسترد کر دیا ہے۔ یہ اعلان ہوتے ہی ایک قانون پسند شریف شہری جناب سیموئل ایڈمز نے جو اس مجمع کے لیڈر بھی تھے اپنا سر پکڑ لیا اور فرمایا — "اب یہ جلسہ ملک کو بچانے کے لیے اور کچھ نہیں کر سکتا۔"

ظاہر ہے سیموئل ایڈمز صاحب نے بات بڑی سیدھی اور سچی کہی تھی۔ گورنر حاکم ہے، وہ کسی قانون کے تحت حاکم مقرر کیا گیا ہے، اس کے اختیارات واضح ہیں، اس نے آپ کی عرضداشت سنی اور آپ کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اب ٹھنڈے ٹھنڈے گھر جائیے زیادہ سے زیادہ اپنے مطالبے اور اس کی نامنظوری پر مجلسی گفتگوئیں کیجیے، بہت لگن ہو تو حضور ملک معظم کو ایک اپیل براہ راست بھیج دیجیے اور پھر ان کے حکم کا انتظار کیجیے کیونکہ آپ اور کچھ نہیں کر سکتے۔

لیکن اگر ایسا ہوا ہوتا تو آج امریکہ کی تاریخ مختلف ہوتی، ترقی ہوتی ہی نہیں یا شاید ایسی ہی ہوتی جیسی برِ صغیر پاک و ہند میں سلطنت برطانیہ کے زیر سایہ ہوئی یا دیگر مقبوضات کی ہو رہی ہے۔

www.taemeernews.com

سو ہوا یہ کہ سیموئل ایڈمز صاحب کا نعرہ ختم ہوتے ہی مجمع میں انقلاب اور آزادی کے نعرے لگنے لگے اور بہت سے امریکی جو سُرخ ہندیوں کا بھیس بدلے ہوئے تھے ایک دم ان جہازوں پر چڑھ گئے، انھوں نے چائے کی تین سو چالیس پیٹیاں توڑ دیں اور ساری چائے سمندر میں ڈبو دی۔

اسے بوسٹن ٹی پارٹی کہتے ہیں۔ اسی پارٹی سے امریکی جنگ آزادی کا آغاز ہوا جو کئی برس لڑی گئی اور جس کا نتیجہ برطانیہ کی شکست ہی نکلا۔

لطیفہ: یہ جہاز ایسٹ انڈیا کمپنی کے تھے ہماری آپ کی ایسٹ انڈیا کمپنی جس کے سہارے انگریز ہمارے برصغیر میں آیا ہوا تھا کہ حکومت برطانیہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ساری نوآبادیوں میں چائے بھیجنے کی اجارہ داری دے دی تھی اور امریکیوں سے نہ مشورہ کیا تھا نہ انھیں کوئی رعایت دی تھی قیمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ جس دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی ایک نوآبادی کھو رہی تھی اسی زمانے میں ہندوستان میں اس کے قدم جمتے جاتے تھے۔

تو یہ بوسٹن ٹی پارٹی تھی جس میں بمشکل سات آدمی ہلاک اور زخمی ہوئے تھے۔ امریکی حب الوطنی دیکھیے کہ یہ واقعہ ایک ایک بچے کی زبان پر رہتا ہے۔ یار لوگوں نے چائے کی پیٹیوں کی تعداد تک تاریخ میں شامل کر دی ہے۔ یہاں آپ کے بچوں کو تو کیا، آپ کو بھی جلیانوالہ باغ کے ہزاروں مقتولوں کی تعداد معلوم نہیں ہوگی، خود مجھے معلوم نہیں، اجی اس کی ضرورت ہی کیا ہے، کون سالا انعام مل جاتا ہے تاریخ پڑھنے پڑھانے سے۔

تو یہ بوسٹن ہے۔ اس شہر نے امریکہ کو تین صدر دیے۔ جان ایڈمس۔ جان کوئنسی ایڈمز اور جان ایف۔ کینیڈی۔ یہ شہر امریکہ کی جدید اور روز بدلتی ہوئی زندگی میں قدیم انگریز تاریخ و معاشرت کا محافظ ہے۔ ایک اور بڑی ریاست یعنی میساچوسٹس کا صدر مقام ہے، ایک بڑا صنعتی مرکز ہے اور سب سے بڑھ کر وہ مقام ہے جس نے ہارورڈ یونیورسٹی کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے، یوں قانوناً ہارورڈ ایک علیحدہ شہر یا قصبے میں واقع ہے جس کا نام انگریزی کیمبرج کی نسبت سے کیمبرج ہے مگر کیمبرج ایک چھوٹی سی جگہ ہے۔ ہارورڈ کو اگر کسی بڑی جگہ سے نسبت دی جا سکتی ہے تو وہ بوسٹن ہی ہے۔ ہارورڈ کے زیر زمین اسٹیشن سے بوسٹن پہنچنے میں سات آٹھ منٹ لگتے ہیں وہ گرچارلس سٹیشن پر اتر جائیں تو شاید چار ہی منٹ کا راستہ ہو مگر ہارورڈ کی بات بعد میں ہوگی، ہارورڈ میں ایک ٹی ی ضروری ہے۔ اس وقت تو بوسٹن پر ایک طائرانہ نظر ڈال لیجیے، غائرانہ نظر ڈالنے کا نہ وقت ہے نہ اس سے کوئی فائدہ ہو گا بلکہ آج کل تو طائرانہ نظر ہی جچتی ہے کسی شہر، کسی بات، کسی معاملے پر غائرانہ نظر ڈالنے میں نقصان ہی نقصان ہے۔

یہ بوسٹن کا ہوائی منظر ہے۔ یہ سب سے اونچی سفید عمارت شاید اٹھائیس منزل کی ہے اور ایک انشورنس

www.taemeernews.com

کمپنی کی ملکیت ہے۔ یا اللہ تعمیر کیا۔ ہے کہ عام طور پر بڑی بڑی عمارتیں انشورنس کمپنیوں ہی کی ملکیت ہوتی ہیں۔ لوگ بیمہ کراتے ہیں موت کے خوف سے اور یار لوگ ان کی زندگیوں سے نفع کما کما کر اونچی اونچی عمارتیں بنا لیتے ہیں۔

اور شہر کے مرکز میں جو یہ کھلے کھلے میدان ہیں یہ پبلک گارڈن یعنی عوامی باغ ہیں۔ چلو انشورنس والوں نے اونچی عمارت بنائی تو عوام نے اپنے لیے وسیع و عریض باغ بنا لیے۔ آنسو کچھ نہ کچھ پونچھ گئے۔ آخر کیہ نہیں پاکستان تو نہیں کہ عمارتیں بلند ہوتی جاتی ہیں اور عوامی میدان سکڑتے جاتے ہیں۔ باغوں کا ذکر چھوڑیئے بس باغوں میں شالامار کا نام بہت ہے، باہر والا اسی کو دیکھ کر مرعوب ہو جاتا ہے۔!!

باغ کی بات چل پڑی ہے تو ذرا یہ قطعۂ زمین بھی ملاحظہ فرمایئے۔ دریائے چارلس کے کنارے یہ اونچے اونچے مجمع کے اردگرد گھومتے ہیں۔ تلے ہوئے اخروٹ اور بادام۔ اُبلے ہوئے بھٹے خوانوں پر قرینے سے رکھے ہوتے ہیں۔ لوگ کھاتے پیتے اور موسیقی سنتے رہتے ہیں جس سے جسم و جاں میں فرحت آتی ہے۔ موسیقی جس کی کوئی قیمت ادا کرنی نہیں پڑتی۔ اسی بوسٹن میں مہنگے مہنگے کنسرٹ بال بھی ہیں۔ ایک ایک نشست بیس بیس ڈالر کی بھی ہے مگر وہ انشورنس بلڈنگ والا معاملہ ہے یہ عوامی باغ ہے یہاں عمدہ سے عمدہ آرکسٹرا کو بلدیہ کے خرچ پر لایا جاتا ہے اور شہریوں سے الگ قیمت نہیں لی جاتی۔

اگر آپ غور سے ملاحظہ کریں تو دیکھیں گے کہ پل پر چلنے والے بھی رک کر موسیقی سن رہے ہیں۔ موسیقی خدا کی نعمتوں میں سے ہے اس کا فیضان عام ہی ہونا چاہیئے۔ بدنصیب ہیں وہ زمینیں جہاں یہ ممکن نہیں ہے۔

اور یہ گھنی آبادی والا مقام وہ ہے جہاں ۱۷۷۰ء میں بوسٹن کا قتل عام ہوا تھا۔ اس وقت یہ جگہ فوجیوں کا تربیتی میدان تھی اور یہاں "سرخ کوٹوں" یعنی برطانوی فوجیوں سے بوسٹن والوں نے کچھ تلخ ترش باتیں کی تھیں تو فوجیوں نے نہتے مجمع پر ایک باڑھ مار دی تھی۔ اس جھگڑے میں پانچ امریکی مارے گئے اور انگریز گوری قوم کے ——— ۔ اس ضمن میں یہ مرقع ملاحظہ کیجیئے جو کچھ مرقع چغتائی جیسا لگتا ہے۔ یہ مرقع امریکی تاریخ میں بڑے احترام سے محفوظ رکھا گیا ہے۔ اور اس کی لاکھوں نقلیں ہر قابل ذکر مقام پر موجود ہیں۔ اس کا مصور ہے گرانٹ ووڈ اور اس مرقع کا ہیرو ہے پال رے ور۔ پال رے ور تحریک آزادی کے زمانے میں ایک گھڑسوار تھا جو امریکی نوآبادیات میں ایک جگہ سے دوسری جگہ حریت پسندوں کے خطوط اور پیغام پہنچاتا تھا۔ وہ ایک تیز رفتار اور نڈر شہسوار تھا اور مہینوں کی منزلیں ہفتوں میں طے کر لیتا تھا۔ معلوم نہیں اس کی زندگی میں کیا انعام ملا شاید کچھ بھی نہیں۔ اس وقت انعام لینے اور دینے کی فرصت کسے تھی مگر بعد میں قوم نے اس کی یاد میں یہ مرقع ایک لازوال تحفے کی صورت میں پیش کر دیا۔ اس مرقع میں رات کے وقت پال رے ور ایک روشن شاہراہ پر تیزی سے گھوڑا دوڑاتے ہوئے گزر رہا ہے۔

www.taemeernews.com

بھی عظیم پاکستانی مصور ۔۔ معاف کرنا کیا تم مجھے اپنا ایک شاہکار " بھی دکھا سکتے ہو جس میں پاکستانی تحریک آزادی کا کوئی منظر بنایا گیا ہو۔ تمھارے تجریدی شاہکار مارٹیسو ابورکے تم تو مجھے بہت پسند ہیں مگر

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

اے لیجیے عظیم مصوروں کی تیوریاں چڑھ گئیں اور انھوں نے مجھے نہایت نفرت اور حقارت سے گھورا اور گھور کر منہ پھیر لیا۔ یہ عظیم مصور عظیم افسروں کی طرح ہیں اور زیادہ تر انھی کی سرپرستی میں کام بھی کرتے ہیں کسی قسم کی پبلک "یعنی تھرڈ کلاس یعنی میری جیسی گفتگو پر دونوں طبقوں کا ردعمل ایک جیسا ہوتا ہے۔ سو بھائی صاحب مجھے بھی یہیں جینا ہے اس لیے میں پالریورا اور اس کے مرقع پر لعنت بھیج کر آپ کو بوسٹن کی واشنگٹن اسٹریٹ لیے چلتا ہوں جو اس شہر کی ایک تنگ مگر بہت بارونق سڑک ہے اور جہاں بڑی بڑی دکانوں کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے پکوان بھی موجود ہیں۔

اگر آپ واشنگٹن اسٹریٹ میں زیرزمین واشنگٹن اسٹیشن اُتریں تو پہلے تو پلیٹ فارم ہی ایک شہر کی مارکیٹ کی طرح نظر آنے گا۔ اصل میں یہ پلیٹ فارم نہیں بلکہ پلیٹ فارم سے ملحق ایک عظیم الشان ڈیپارٹمنٹل اسٹور ہے۔ خریدار کو سڑک پر جانے کی ضرورت ہی نہیں سیدھے ٹرین سے اُتر کر سامنے والے دروازے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ کپڑا فرنیچر آرائش کا سامان۔ سائیکل موٹر سب اس دکان کی کئی منزلوں میں بھرا پڑا ہے بس گوشت ترکاری نہیں باقی سب کچھ ہے یعنی " وہ " بھی ہیں جو شعرا اور مصوروں کے اعصاب پر سوار رہتی ہیں۔ ویسے اگر " ان " کا انتخاب کرنا ہے تو واشنگٹن اسٹریٹ میں بائیں ہاتھ کو مڑ جائیے۔ دائیں ہاتھ کو نہ جائیے گا کیونکہ ادھر بڑی بڑی دکانیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اُلٹے ہاتھ کو چھوٹے چھوٹے ریستوران اور نائٹ کلب قسم کے بار ہیں۔ جہاں کھردری معمولی معمولی میزوں اور سخت سخت کرسیوں کے درمیان

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا

مشکل یہ ہے کہ ان مقامات پر سفید فام خواتین کے ارد گرد سیاہ فام حضرات خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ روایت ہے کہ یہ ان کے " محافظین " ہیں۔ یہ حقیر فقیر دو تین ایسے مقامات تک پہنچا ضرور، مگر طائرانہ نظر کے علاوہ زیادہ معلومات حاصل نہ کرسکا۔

دل ہی تو ہے سیاست درباں سے ڈر گیا

" میں کسی کو بڑا یا چھوٹا نہیں مانتا۔ "

واہ یہ کیا مقولہ ہے۔ ارے میاں عالی صاحب یہ تمھارے اپنے احساس کمتری کا آئینہ دار ہے چونکہ تم

www.taemeernews.com

خود بڑے نہ بن سکے اس لیے کسی کو بڑا ماننا نہیں چاہتے اور چونکہ تم خود چھوٹے ہو اس لیے تم نے ذراشاعرانہ انداز میں چھٹ پن کو بھی کالعدم قرار دے دیا ۔ ہی ہی ہی !!!

مگر بدقسمتی سے یہ مقولہ میرا نہیں بلکہ عظیم امریکی شاعر والٹ وٹھمین کا ایک مصرع ہے ۔ والٹ وٹھمین جو بڑا ہر دل عزیز اور ہر دلعزیز آدمی تھا اور جو آپ کے بقول میری طرح کسی احساس کمتری کا شکار نہیں تھا ۔

لیکن نہیں اصل میں یہ مصرع پورے قدیم امریکہ کا ترجمان حیات ہے ۔ آج کا امریکہ تو یقیناً چھوٹے بڑوں پر مشتمل ہے اور جیمی ریٹ نام کے قضیئے میں مبتلا ہو گیا ہے لیکن اصل امریکہ یعنی ابتدائی امریکہ ایسا ہی تھا جس میں چھوٹے بڑے کی تفریق تہذیبی سطح پر قطعی نہیں تھی اور پورا ملک ایک عجیب سرجوشی کے عالم میں تازہ گلاب کی طرح چمک رہا تھا' پھیل رہا تھا اور خوبصورت لگ رہا تھا ۔

" میں کسی کو چھوٹا یا بڑا نہیں مانتا ۔

اگر ابتدائی امریکی چھوٹے کو چھوٹا اور بڑے کو بڑا مانے جاتے تو آج امریکہ تھوڑے سے بڑے زمینداروں اور خاصی تعداد میں مزارعوں پر مشتمل ہوتا ۔ جمہوری صدروں کی بجائے بادشاہ اور شہزادے راج کرتے' تیز رفتار ہوائی جہاز اور موٹروں کی بجائے اصیل گھوڑے چہل قدمی کرتے نظر آتے اور ۔۔ اور ۔۔ خیر آگے چھوڑیئے آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ بڑے چند ہوں تو چھوٹے بہت سے ہوتے ہیں اور جہاں بڑے چند اور چھوٹے زیادہ ہوتے ہیں وہاں اور کیا کیا معاملات پیش آتے رہتے ہیں ۔

اور اگر آپ اب بھی نہیں سمجھے تو آپ سے خدا سمجھے !!!

آج میں بوسٹن کے دریائے چارلس پر بہت دیر سے بیٹھا ہوں' بلکہ لیٹا ہوں اور امریکہ کے بارے میں سوچ رہا ہوں ۔ یہ زمین تو بہت بڑی ہے جیسے یورپ ہے مگر یہ ملک اتنا بڑا اور اتنا طاقتور کیوں ہو گیا ہے جبکہ یورپ میں قدم قدم پہ ایک نئے ملک کی سرحد شروع ہو جاتی ہے ۔

اس سوال کے بہت سے جواب ہیں مگر اب تک شاید سب سے بڑا جواب وٹھمین کا یہ مصرع ہی ملا ہے ۔

" میں کسی کو چھوٹا یا بڑا نہیں مانتا "

امریکہ بسانے والے امریکی کسی کو چھوٹا یا بڑا نہیں مانتے تھے' ہر فرد اور طبقے کو دوسرے فرد اور طبقے کی ضرورت اور اہمیت کا احساس تھا' خدا نے کھلی زمین اور وافر وسائل دیئے تھے' لوگ کام کرتے اور کام کرنے دیتے تھے' اور امریکہ پھلتا پھولتا اور پھیلتا جاتا تھا ۔

لیکن اگر کوئی چھوٹا نہیں' کوئی بڑا نہیں تو پھر معاشرے میں ترتیب کار کیسے ہوتی تھی ۔ کیسے ہو گی ۔

www.taemeernews.com

اس بات کا جواب بھی وٹمین ہی نے دیا ہے اور خوب دیا ہے، کہتا ہے :

"ہر وہ شے جو اپنے وقت اور مقام کے تقاضے پورے کرے کسی بھی دوسری شے کے برابر ہے۔"

پانی کی کیا حیثیت ہے اور کوہ نور ہیرے کی کیا بات ہے، مگر آپ ایک لق و دق صحرا میں چلتے چلتے تھک گئے ہیں، میلوں چشمے کا نشان نہ ہو۔ جان ہونٹوں پر آ چکی ہو اور ایک طرف کوہ نور رکھ دیا جائے اور دوسری طرف کوزہ بھر پانی تو آپ کیا اٹھائیں گے۔

چلیے یہ مثال بالکل فرسٹ کلاس نہ ہو تو خود کوئی اچھی سی مثال ڈھونڈ لیجیے مگر والٹ وٹمین کی بات ضرور سمجھیے :

"ہر وہ شے جو اپنے وقت اور مقام کے تقاضے پورے کرے کسی بھی دوسری شے کے برابر ہے۔"

اسی رو میں پھر ابراہام لنکن کی تصویر ابھرتی ہے۔ یہ تصویر آپ کبھی پہلے بھی دیکھ چکے ہیں مگر

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

ایک بار اور دیکھ لیجیے اس میں نازنینانِ مغرب کے تیکھے ترچھے نقوش نہیں۔ بازوؤں کی گولائی نہیں، کمر کا خم نہیں، رنگت کا نکھار نہیں، مگر عروسِ انسانیت کا ایک لازمی زیور ضرور موجود ہے۔ یہ تصویر شہر واشنگٹن والے لنکن میموریل کی ہے جہاں سے ابراہام لنکن کا مجسمہ جدید امریکی سیاست کا تماشا دیکھتا ہے۔ وہ ابراہام لنکن جس نے کہا تھا کہ :

"یہ قوم ایک نئی آزادی سے ہمکنار ہوگی اور دنیا میں عوام کی حکومت عوام کی جانب سے اور عوام کے لیے ہمیشہ باقی رہے گی۔"

"عوام کی حکومت عوام کی جانب سے عوام کے لیے" یہ فقرہ تاریخِ عالم میں داخل ہو کر کئی قوموں، کئی ملکوں کی سندیں، مشعلِ راہ بن چکا ہے۔ مگر لوگ بھول چکے اور بھولتے جاتے ہیں کہ یہ فقرہ صدر ابراہام لنکن کا ہے جس نے ۱۸۶۳ء میں منشورِ حریت جاری کرکے امریکی حبشیوں کو غلامی سے قانونی طور پر آزاد کر دیا تھا اور جو امریکی یکجہتی کی خاطر ایک خانہ جنگی میں فتح حاصل کرکے ایک امریکی کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

دیکھیے تو ہزار میل دور بسنے والوں کو ایک عظیم امریکی کا قول یاد دلا رہا ہوں، خود امریکی قوم یہ قول بھول چکی ہے۔ اس نے آج تک اپنے محبوب اور عظیم صدر کے منشورِ آزادی کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا۔ امریکی حبشی قانوناً آزاد ہوتے ہوئے بھی سفید امریکی معاشرے کا خادم ہے۔

دریائے پوٹومک بہت آہستہ آہستہ بہہ رہا ہے۔ شاید میرے ذہن کے سوتے بہت شدت سے پھوٹ

www.taemeernews.com

سب ہے یہ ہیں جتنا امریکی شاہیر کے بارے میں سوچتا ہوں مجھے پاکستانی غیر مشاہیر یاد آتے جاتے ہیں وہ جو اور آپ کی ناقدری کے ہاتھوں اس طرح دبے ہوئے ہیں کہ ملک کو ان سے کوئی فائدہ پہنچنے نہیں پاتا۔

کھی کھی کھی۔ ایک طرف سے بیساختہ تحقیر آمیز ہنسی کی آواز آتی ہے اور میں احتیاطاً پھر اپنے آپ کو امریکی دیواروں میں مقید کر لیتا ہوں۔

اُبھرتی ہوئی سفید امریکی قوم کی روشنی میں جو بیشمار خون کے دھبے نظر آتے ہیں ان میں یہ "سرخ ہندی" چہرہ بہت نمایاں ہے۔ یہ چہرہ پوری سرخ ہندی قوم کا نمائندہ ہے۔ جسے سفید نو آبادکاروں نے مار مار کر ختم کر دیا۔ یہ تصویر سردار سِٹنگ بُل کی ہے جو ایک سُرخ ہندی بہادر تھے اور جنھوں نے ایک امریکی جنرل جارج کسٹر کو "بگ بارن" کے مقام پر ایک عبرتناک شکست دی تھی۔ یہ واقعہ اٹھارویں صدی میں پیش نہیں آیا جب نو آبادکاروں کے پاس جدید اسلحہ نہیں تھا بلکہ یہ ۱۸۷۶ء کی بات ہے جب امریکہ ایک بڑی طاقت بننا چاہتا تھا۔ گولے بارود اور جدید اسلحہ تیزی سے بن رہے تھے اور سرخ ہندی قبائل ایک ایک کر کے ختم ہوتے جاتے تھے۔

سردار سِٹنگ بل کی فوج نے "بگ بارن" پر ہزاروں امریکیوں کو ختم کر دیا تھا لیکن ان کی عدیم المثال بہادری کی یادواحترام میں سفید امریکی آج تک اپنے قصے کہانیوں میں ان کا ذکر کرتے ہیں ان کی تصویریں اپنے گھروں میں لگاتے ہیں۔ اور ان کو اپنے تاریخی ادب میں ایک باعزت جگہ دیتے ہیں۔ یہ امریکی قوم کی ایک نہ سمجھ میں آنے والی خصوصیت ہے۔ مجھے خود یہ بات دیکھ کر حیرت ہوئی اور اب مزید حیرت یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ ایسی کشادہ دل قوم آج ایشیا بھر کو بزدلوں اور بھکاریوں کا میدان بنانے پر تلی ہوئی ہے۔!!!

مگر بقول کسے یہ دوسری کہانی ہے۔

لیے لیجیے ٹیلیفون پر شاعری سنیئے یعنی ٹیلیفون کے بارے میں خود ٹیلیفون کے موجد سے ایک شاعرانہ بیان سنیئے آج ٹیلیفون زندگی کا ایک معمولی جزو بن گیا ہے مگر یہ بھی ایک امریکی کی ایجاد ہے اور امریکہ کی تعمیر و ترقی میں ٹیلیفون کا بہت بڑا حصہ ہے۔ دریائے چارلس کی لہروں سے آہستہ آہستہ الگزینڈر گراہم بل کی آواز بلند ہو رہی ہے۔

"ٹیلیفون کے تاروں کی سرسراہٹ کبھی بند نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس سرسراہٹ میں زندگی کی داستان پوشیدہ ہے۔ اور زندگی ہمیشہ رواں دواں ہے۔"

اب یہ الگ بات ہے کہ مجھے اس قول کے آخری حصے سے اختلاف ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ زندگی ہمیشہ رواں دواں نہیں ہے بلکہ ایک دن قیامت آجائے گی اور زندگی اور ٹیلیفون سب ختم ہو جائیں گے۔ میں ہوتا تو یوں کہتا کہ جب تک زندگی ہے ٹیلیفون کی سرسراہٹ بند نہیں ہوگی کیونکہ ......

www.taemeernews.com

لیکن میں ایگزینڈر گراہم بل ہوتا ہی کیوں اور اگر ہو بھی جاتا تو کراچی میں مجھے ٹیلیفون ایجاد کون کرنے دیتا؟ اوّل تو ہمسائے اور یار رُوگ ہی مار پیٹ کر ٹھنڈا کر دیتے کہ سالے تو ہوتا کون ہے موجد بننے والا کبھی ہمارے ہاں کوئی ایجاد ہوئی ہے ایجاد سخت کفر ہے اور فرض کیجیے کہ میں ایجاد کر بھی لیتا تو اسے عام کرنے کی رقم کہاں سے آتی ظاہر ہے کہ میں اسے سیٹھ سونا بھائی چاندی بھائی کے ہاتھ پانچ سو یا ہزار روپے ماہوار کی نوکری لے کر بیچ دیتا اور موجد کی حیثیت سے نام سیٹھ سونا بھائی چاندی بھائی کا ہوتا۔

اچھا ہے کہ ٹیلیفون میری ایجاد نہیں، ورنہ آج میں گراہم بل کی کہانی سنانے کی بجائے اپنی داستانِ غم لکھ رہا ہوتا جسے کوئی پڑھنے والا بھی نہیں ملتا۔

اب — معاف کیجیے گا — ایک اور شاعر کا مرقع اُبھرتا ہے مگر اس کا قول عشقیہ شاعری نہیں بلکہ علامہ اقبال کی شاعری سے قریب ہے، مجھے امریکی شاعری زیادہ پسند نہیں مگر ذرا یہ بات سن لیجیے یہ نظم کا نہیں نثر کا ٹکڑا ہے۔ سیدھا سادہ معمولی مگر عظیم اور امریکی مزاج کی غمازی کرتا ہے۔

"مجھے یقین ہے کہ آزادی کے لیے جد وجہد درکار ہوتی ہے، مسلسل محنت اور جد وجہد — آزادی شدید آزمائشوں اور تکالیف ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔"

ملاحظہ کیا آپ نے۔ یہ حضرت ہیں کارل سینڈبرگ، شاعر اور سوانح نگار۔ روایتاً انھیں کسی حسینہ نازنین کے چکر میں مبتلا رہنا چاہیے تھا مگر انھوں نے ابراہام لنکن کی حیات لکھی سخت سخت الفاظ پر مشتمل گرم گرم نظمیں کہیں یہاں تک کہ قصاب خانوں تک پر شعر فرمائے۔ یہ شاعرِ عمل ہیں۔ جد وجہد کے فلاسفر۔

"اجی لاحول ولا قوۃ کہیں اسے شاعری کہتے ہیں" پھر ایک آواز اُبھری اور کسی نے زور سے پیک کی پچکاری ماری:

ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

اور اب میری نظر پھر ایک خالص نثر نگار پر آکر ٹھہرتی ہیں، ان کا نام ہے

ولیم فاکنر جنھیں ۱۹۵۰ء میں ادب کا نوبل انعام ملا۔ یہ ابھی حال ہی میں مرے ہیں۔ ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے تھے بہت دن گوشۂ گمنامی میں رہے، خاموش کم آمیز، ملنسار آدمی تھے، پھر ان کے بہت سے ناول بہت مشہور ہوئے۔ فرصت ملے تو انھیں پڑھیے گا اور

دیر تک سر دُھنیے گا

لیکن فی الحال ان کی تقریر سے ایک فقرہ سنیے۔ یہ تقریر انھوں نے نوبل ادبی انعام کی تقریب پر کی تھی۔ میں یقیناً اس وقت موجود نہیں تھا کیونکہ وہ تقریر سویڈن میں ہوئی اور ۱۹۵۰ء میں ہوئی جبکہ میں کراچی کی

www.taemeernews.com

کبھی کبھی سردیوں میں ہر ہفتے مشاعروں میں شریک ہوتا اور اپنی تصرف کلاسیکی غزلیں پڑھتا تھا لیکن میں نے ان کا یہ بیان پڑھا ہے اور چاہتا ہوں کہ ہو سکے تو آپ بھی پڑھ لیں۔

"مجھے یقین ہے کہ انسان سب پر غالب آ جائے گا"

www.taemeernews.com

جمیل الدین عالیؔ

دنیا مرے آگے

- ایران، عراق، لبنان، مصر، دہلی، روس، برطانیہ اور فرانس کی عجیب و غریب کہانیاں
- وہی منفرد انداز، وہی دلآویز اظہار و بیان
- مطالعے، مشاہدے اور تجزیے کے رنگ برنگے پہلو
- وہ داستان جو بین الاقوامی بھی ہے اور قومی بھی

شیخ غلام علی اینڈ سنز - لاہور